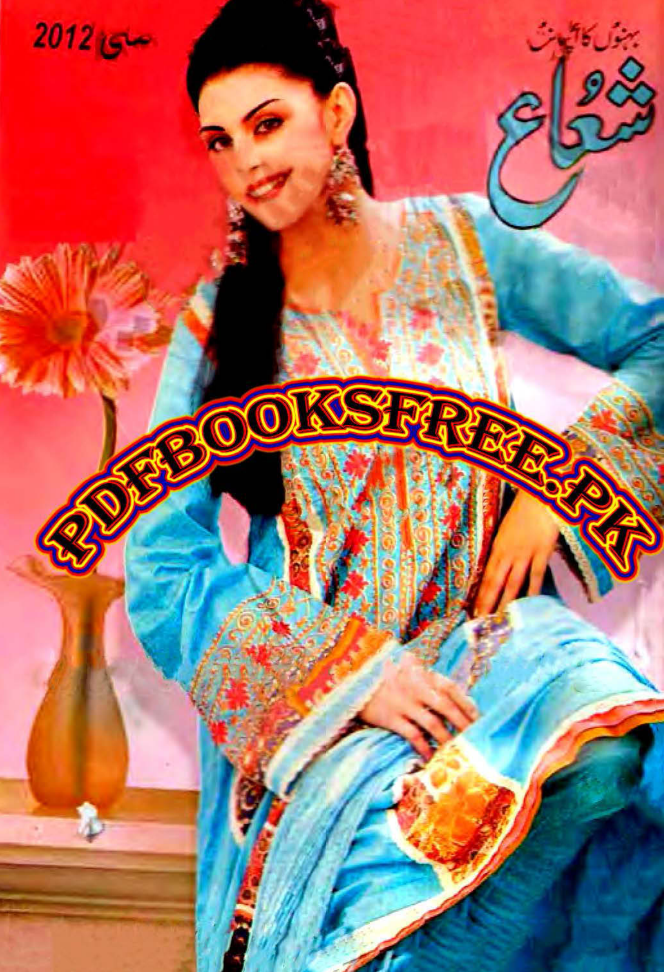

مئی 2012
بہنوں کا ڈائجسٹ
شعاع
PDFBOOKSFREE.PK



مستقل سلسلے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مئی 2012

جلد 26 شمارہ 9

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: بی 2 ، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: ahuaamonthly@yahoo.com, info@khawateandigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا مئی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کا دھارا بہتا جا رہا ہے۔

ایک موسم کی رخصتی دوسرے موسم کی آمد آمد ہے۔ بدلتے موسم وقت کے تغیر و تبدل کا استعارہ ہیں۔ اس فانی دنیا میں کسی شے کو بھی دوام حاصل نہیں۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اس کا واپس جانا مقدر ہے۔ ایک ایسی اٹل حقیقت جو کسی کے بھی چاہنے سے نہیں بدل سکتی۔ دنیا کے کام اسی طرح چلتے رہتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کچھ لوگ ایسی زندگی گزار کر جاتے ہیں کہ ان کی کمی کو ایک زمانہ محسوس کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے تاریک راہوں میں دیے جلائے ہوں۔ یہ لوگ دنیا سے رخصت ہو بھی جائیں تو ان کی یادیں زندہ رہتی ہیں۔

مئی کا مہینہ آیا ہے تو ذہن میں بے شمار یادوں کے نقوش ابھر آئے ہیں۔

محمود ریاض بظاہر ایک شخصیت لیکن درحقیقت ایک ادارہ تھے۔

خواتین ڈائجسٹ کا اجراء کرتے ہوئے ان کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا۔ ایک ایسے پرچے کا اجراء جو خواتین کو علم آگہی اور شعور دینے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے صاف ستھری تفریح کا ذریعہ بھی ہو۔ وہ ساری زندگی اسی مقصد پر کاربند رہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے بعد کرن اور شعاع کا اجراء اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ آج بے شمار قارئین اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی ذہنی تربیت میں ان پرچوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔

انسان فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان کے اعمال، ان کے کیے کام باقی رہتے ہیں۔ محمود ریاض صاحب نے جو چراغ روشن کیے ہیں، ان کی روشنی سے ایک جہاں منور ہے۔ ان کے لگائے پودے آج تناور درخت بن چکے ہیں۔ جو لاکھوں لوگوں کو سایہ مہیا کر رہے ہیں۔

10 مئی کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین۔

ایک نئی سنڈریلا،

فائزہ افتخار کا شمار قارئین کی پسندیدہ ترین مصنفین میں ہوتا ہے۔ زندگی کی تلخ اور سنگین حقیقتیں ہوں یا مزاح کی شگفتہ بیانیاں، فائزہ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، پورا انصاف کیا۔ انتہائی حساس قلم کار جن کے ہاں زندگی کا ہر رنگ پوری دلکشی اور خوبصورتی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ سنجیدہ موضوعات پر لکھتی ہیں تو پڑھنے والوں کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں پڑھیں تو ہنسی رکنے کا نام نہیں لیتی۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی جو انہیں دیگر مصنفین سے منفرد کرتی ہے بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ موضوعات کا تنوع ہے۔ اس بار فائزہ نے ایک مختلف اور منفرد موضوع پر لکھا ہے۔ ان کا ناول "ایک نئی سنڈریلا" موصول ہو چکا ہے۔ ان شاء اللہ جون کے شمارے میں شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد کا مکمل ناول ۔ جنت کے پتے،
- سائرہ رضا کا مکمل ناول ۔ تیسری محبت،
- سونیا نوید کے طویل ناولٹ تجدید وفا کی آخری قسط،
- اُم مریم کا ناولٹ ۔ وہ محتسب ہے،
- آمنہ مفتی، صباحت یاسمین، بشریٰ احمد، عزہ خالد، سنیعہ زاہد حسین اور ایلیا الیقین کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- فائق خان اور ثانیہ فائق خان کا بندھن،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبویؐ کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شادی مبارک ہو اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

ہر اک امکاں کا عنواں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو
بڑے تخلیق ساماں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

ہر اک صورت سے ظاہر ہو رہی ہیں صورتیں کیا کیا
عجب صورت پریشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

کہاں ہے راز ہر اک آنکھ روشن کیسے ہوتی ہے
بہر سو نور افشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

مسلسل پھوٹتی رہتی ہیں شاخیں زندگانی کی
فروغ باغ امکاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

وگرنہ کچھ ثبوت اپنے بھی ہونے کا نہیں ملتا
جواز اصل ایماں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

زمین و آسماں میں ہے بپا اک جشن موسیقی
ازل سے زمزمہ خواں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

روحی کنجاہی

نعت رسول مقبول ﷺ

نعت حضرتؐ مری پہچان ہے سبحان اللہ
یہی دنیا، یہی ایمان ہے سبحان اللہ

جس سے پہلے کسی تخلیق کا عنوان بھی نہ تھا
وہ مرے شعر کا عنوان ہے سبحان اللہ

میں گناہ گار، وہ ملا کا رحمت ان کی یاد
مہرباں مجھ پہ سر آن ہے سبحان اللہ

جس پہ مرکوز ہیں سب نکتہ وروں کی نظریں
ایک اُمّی کا دبستان ہے سبحان اللہ

جو بنو سعد کے ریوڑ کا محافظ تھا کبھی
وہ دو عالم کا نگہبان ہے سبحان اللہ

جو چٹائی پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھا ہے
دین و دنیا کا وہ سلطان ہے سبحان اللہ

یاد ہے بات مجھے حضرت صدیقہؓ کی
آپؐ کا خلق بھی قرآن ہے سبحان اللہ

حفیظ تائب

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

توبہ

حضرت ابو سعید سعد بن مالک سنان خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا' اس نے ننانوے قتل کیے۔ پھر اس نے روئے زمین کے سب سے بڑے عالم کے بارے میں لوگوں سے پوچھا تو اسے ایک راہب (پادری) کا پتا بتلایا گیا۔ اس نے اس سے جاکر پوچھا۔"

"میں نے ننانوے قتل کیے ہیں' کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟"

اس نے کہا۔ "نہیں۔"

اس نے اس پادری کو بھی قتل کر کے سو کی تعداد پوری کرلی۔

اس نے پھر پوچھا کہ "مجھے سب سے بڑا عالم بتلاؤ۔" اسے ایک عالم کی نشان دہی کی گئی۔ اس نے اس سے جاکر پوچھا۔ کہ اس نے سو آدمی قتل کیے ہیں' کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

اس عالم نے کہا۔ "ہاں' کون ہے جو اس کے اور اس کی توبہ کے درمیان حائل ہو؟ جا' فلاں زمین (علاقے) میں چلا جا! بلاشبہ وہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تو بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کر اور اپنی زمین کی طرف واپس نہ آنا' یہ برائی کی زمین ہے۔"

چنانچہ اس نے نیکوں کی اس بستی کی طرف سفر شروع کر دیا' ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آگئی۔ (اس کی روح کو لینے کے لیے) رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے (دونوں ہی) آگئے اور ان کے مابین جھگڑا شروع ہو گیا۔

ملائکہ رحمت نے کہا۔ "وہ تائب ہو کر اور دل کی پوری توجہ اللہ طرف کر کے آرہا تھا۔"

عذاب کے فرشتے بولے۔ "اس نے کبھی بھلائی کا کام نہیں کیا۔"

(اس لیے وہ عذاب کا مستحق ہے) ان فرشتوں کے مابین یہ جھگڑا جاری ہی تھا۔

کہ ایک فرشتہ' آدمی کی شکل میں آیا' اسے انہوں نے اپنا حکم بنالیا۔ اس نے فیصلہ دیا۔

"دونوں زمینوں کے مابین مسافت کو ناپو۔ (یعنی جس علاقے سے وہ آیا تھا وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ اور یہاں سے نیکوں کے علاقے کا فاصلہ' دونوں کی پیمائش کرو۔) ان دونوں میں سے وہ جس کے قریب ہو' وہی اس کا حکم ہو گا۔"

چنانچہ انہوں نے پیمائش کی تو انہوں نے اس زمین کو زیادہ قریب پایا' جس کی طرف وہ ارادہ کیے جا رہا تھا' چنانچہ اسے رحمت کے فرشتوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔"

صحیح (مسلم) کی ایک اور روایت میں اس طرح ہے۔

"پیمائش میں وہ نیکوں کی بستی کی طرف ایک بالشت زیادہ قریب نکلا' چنانچہ اسے اس بستی کے نیک لوگوں میں سے کر دیا گیا۔"

نیز صحیح (بخاری) کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔

"اللہ نے اس زمین کو (جہاں سے وہ آرہا تھا) حکم دیا کہ تو دور ہو جا۔ اور ارض صالحین کو (جس کی طرف جا رہا تھا) حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔ اور فرمایا۔ ان دونوں کے مابین فاصلہ ناپو۔ جب انہوں نے ناپا تو ارض صالحین کی طرف اسے ایک بالشت زیادہ قریب پایا۔ چنانچہ اسے بخش دیا گیا۔"

اور ایک روایت میں ہے۔ "وہ اپنے سینے کے سہارے (بطور کرامت) سرک کر پہلی زمین سے دور ہو کر (تھوڑا سا) دوسری طرف ہو گیا۔"

فوائد و مسائل

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار ترین شخص کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کی توبہ قبول فرماتا ہے بشرطیکہ توبہ خالص ہو۔

2۔ علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسئلہ بتلاتے وقت سائل کی نفسیات اور اس کی مشکلات کو سامنے رکھیں اور ایسی حکمت عملی اختیار کریں جس سے نہ تو اللہ کے حکم میں تبدیلی آئے اور نہ سائل اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر گناہوں پر مزید دلیر ہو۔

3۔ نیک لوگوں کے ساتھ رہنا بہتر اور بدوں کے ساتھ رہنا خطرناک ہے۔

4۔ بوقت ضرورت فرشتے اللہ کے حکم سے انسانی صورت میں آتے ہیں۔

5۔ کسی آدمی کے جنتی یا جہنمی ہونے کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے' اس لیے کسی مسلمان پر جنتی یا جہنمی ہونے کا حکم نہیں لگانا چاہیے' البتہ اپنے خیالات کا اظہار ظاہر کے مطابق کرنا چاہیے۔

6۔ ماحول کی تبدیلی عادات بدلنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ بسا اوقات ماحول اور محفل تبدیل نہ ہو تو انسان توبہ پر قائم نہیں رہ سکتا اور دوبارہ گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے' اس لیے توبہ کرنے کے بعد صحبت بھی تبدیل کرنی چاہیے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید سعد بن مالک بن سنان الخدری رضی اللہ عنہ ان کی کنیت ابو سعید ہے اور یہ اپنی کنیت ہی سے معروف ہیں۔ خزرج کے ایک چھوٹے قبیلے خدرہ کی طرف نسبت کی وجہ سے خدری کہلائے۔ مشہور اور فضلاء صحابہ کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں 12 غزوات میں حصہ لیا۔ کثیر الروایہ ہیں۔ ان سے صحابہ کرام' جن میں جابر' زید بن ثابت' ابن عباس' انس' ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں' نے روایت کی ہے۔

مدینہ منورہ میں 64 ہجری کو فوت ہوئے جبکہ صاحب اسد الغابہ نے ان کا سن وفات 74 ہجری لکھا ہے۔ جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔ کتب احادیث میں ان سے 1170 احادیث مروی ہیں۔

توبہ

حضرت ابو نجید (نون پر پیش اور جیم پر زبر) عمران بن حصین خزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جہینہ قبیلے کی ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ زنا سے حاملہ تھی۔ اس نے (آکر) کہا۔

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے حد والے گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر حد قائم فرما دیجیے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ولی (وارث) قریبی رشتے دار کو بلایا اور فرمایا۔

"اس کو اچھے طریقے سے اپنے پاس رکھو اور جب یہ بچہ جن لے تو اس کے بعد اس کو لے آنا۔"

"چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اللہ کے پیغمبر نے اس کے بارے میں حکم دیا تو اس کے کپڑے اس پر مضبوطی سے باندھ دیے گئے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اسے رجم کر دیا گیا' پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔"

"اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس بدکاری کرنے والی عورت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ پڑھتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عمر! تمہیں نہیں معلوم' اس عورت نے ایسی (خالص) توبہ کی ہے کہ اگر اسے اہل مدینہ کے ستر آدمیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان کو کافی ہو جائے۔

کیا اس سے بھی افضل کوئی بات ہے کہ اللہ عزوجل کی رضا کے لیے اس نے اپنی جان تک قربان کردی؟؟"

مال و دولت

حضرت ابن عباس ؓ اور انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر انسان کے پاس ایک وادی سونے کی ہو تو وہ (اس پر قناعت نہیں کرے گا بلکہ) چاہے گا کہ اس کے پاس دو وادیاں ہوں' اس کا منہ تو (قبر کی) مٹی ہی بھرے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر رجوع فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے (یعنی توبہ کرنے والے کی توبہ قبول فرماتا ہے۔)"

فوائد و مسائل

1۔ اس میں انسان کی حرص اور مال سے اس کی شدید محبت کا ذکر ہے' جس سے صرف وہی بچ سکتا ہے جو ایمان میں کامل ہو۔

2۔ دنیا کی رنگینیاں نہایت پُرفریب ہیں اور انسان کی تمنائیں زندگی کی حدود سے تجاوز کرجاتی ہیں۔ انسان کے پاس مال و زر کتنا بھی زیادہ ہو' اس کی حرص بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور طلب کثرت کی یہ بیماری انسان کو حیات جاودانی سے غافل کردیتی ہے۔ اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو انسان اس فتنے سے محفوظ نہیں ہوسکتا۔ جب دنیا کی ہوس شدید ہوجائے تو انسان غیر دانستہ طور پر بھی اللہ کی نافرمانی کر بیٹھتا ہے' اس لیے اللہ کی طرف رجوع اور توبہ کی ہروقت ضرورت رہتی ہے۔

دنیا کے تمام فسادات کی بنیاد پیٹ اور شرمگاہ ہے۔ انسان کا پیٹ دنیا میں بھرنا مشکل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ "آدمی کے پیٹ سے بڑا کوئی برتن نہیں بھرتا۔ آدمی کو تو چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر سیدھی رہے۔ اور اگر لامحالہ زیادہ کھانا ہی چاہے تو ایک تہائی کھانے کے لیے' ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے (رکھ لے)"

توبہ

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے' جن میں سے ایک' دوسرے کو قتل کرتا ہے' وہ دونوں جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ قتل ہونے والا اللہ کے راستے میں لڑتا لڑتا قتل (شہید) کیا جاتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اس کافر قاتل کو بھی توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اور وہ مسلمان ہوکر اللہ کی راہ میں شہید ہوجاتا ہے۔"

فوائد و مسائل

1۔ توبہ سے بڑے سے بڑا گناہ اور قبول اسلام سے سابقہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

2۔ ہنسنا بھی اللہ کی صفت ہے' جس پر ایمان رکھنا ضروری ہے مگر اس کی کیفیت سے ہم آگاہ ہیں نہ آگاہ ہوسکتے ہیں۔

کسی کو امان دے کر قتل کرنے والے کا بیان

حضرت رفاعہ بن شداد قتبانی رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔

"اگر میں نے حضرت عمرو بن حمق خزاعی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نہ سنی ہوتی تو مختار ثقفی کے سر اور دھڑ کے درمیان چلتا (اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیتا) میں نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص سے کوئی اپنا خون محفوظ سمجھتا ہو اور وہ اسے قتل کر ڈالے تو قیامت کے دن وہ (قاتل) عہد شکنی کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہوگا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ کسی کو امان دے کر قتل کردینا بہت بڑا گناہ ہے۔

2۔ عہد شکنی اتنا بڑا جرم ہے کہ قیامت کے دن ایسے مجرم کے جسم پر جھنڈا نصب ہوگا' جس سے ہر شخص کو معلوم ہوجائے گا کہ فلاں شخص عہد شکن ہے۔ اس طرح اس کی سخت بدنامی ہوگی۔

3۔ مختار بن عبید ثقفی نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کے انتقام کا نعرہ بلند کیا اور اس طرح عوام کی ہمدردیاں حاصل کیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے انتقام لینے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اسے عوام کی محبت اور ہمدردی حاصل ہوگئی ہے تو نبوت کا دعوا کردیا اور لوگوں کو گمراہ کیا۔ حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کرکے اس فتنے کا خاتمہ کیا۔

حضرت رفاعہ رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔

"میں مختار ثقفی کے پاس اس کے محل میں گیا۔ اس نے کہا۔

"جبرائیل (علیہ السلام) ابھی ابھی میرے پاس سے اٹھ کر گئے ہیں۔"

میں صرف اس لیے اسے قتل نہ کرسکا کہ میں نے حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی شخص تجھ سے اپنے خون کے بارے میں مطمئن ہو (اسے یقین ہو کہ اس کے ہاتھ سے میری جان محفوظ ہے) تو اسے قتل نہ کر۔" اسی (فرمان) نے مجھے اس (کو قتل کرنے) سے روک دیا۔

قاتل کو معاف کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں ایک شخص نے قتل کردیا۔ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مقتول کے وارث کے سپرد کردیا۔ قاتل نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! قسم ہے اللہ کی' میرا اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے وارث سے فرمایا۔

"سنو! اگر وہ سچا ہوا' پھر بھی تم نے اسے قتل کردیا تو تم جہنم میں جاؤ گے۔"

اس نے اسے آزاد کردیا۔

راوی نے بیان کیا: اس کے بازو چمڑے کی رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ (اس کے چھوڑ دینے پر) وہ رسی کھینچتا ہوا نکلا' (اس لیے) اسے ذونسعہ (تسمے والا) کہا جانے لگا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ایک شخص اپنے ولی (قریبی رشتے دار) کے قاتل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"معاف کردو۔" اس نے انکار کردیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خون بہا لے لو۔" اس نے انکار کردیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جاؤ! اسے قتل کردو' تم بھی اس جیسے ہو۔"

ایک آدمی اس کے پیچھے جاکر اسے ملا اور اسے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"اسے قتل کردو' تم بھی اس جیسے ہو۔" اس نے (فوراً) اسے چھوڑ دیا۔

راوی کہتے ہیں' میں نے دیکھا کہ وہ شخص تسمہ (چمڑے کی رسی) کھینچتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ (راوی کے اس لفظ سے) معلوم ہوتا ہے کہ مقتول کے وارث نے اسے باندھا ہوا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم رحمتہ اللہ نے فرمایا۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں "اسے قتل کردے' تو بھی اس جیسا

ہے۔"

فوائدومسائل :

1۔ مقتول کے وارث کو حق حاصل ہے کہ قاتل سے قصاص لے یا معاف کردے۔

2۔ قتل خطا کی صورت میں قصاص لینا درست نہیں' دیت لی جاسکتی ہے یا معاف کیا جاسکتا ہے۔

3۔ قتل خطا کی صورت میں قصاص لینا خود قتل کرنے کے برابر گناہ ہے۔

4۔ مقتول کے وارث نے پہلے یہ لفظ نہیں سنا تھا "تو بھی اسی کی طرح ہے" اس لیے وہ قصاص کی نیت سے لے کر چلا۔ جب ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوا تو فوراً" چھوڑ دیا۔

5۔ نسعتہ سے مراد چمڑے کا پتلا اور لمبا ٹکڑا ہے جو رسی کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں اسے تسمہ بھی کہتے ہیں۔

6۔ حضرت عبدالرحمٰن بن قاسم رحمتہ اللہ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل کا عذر تسلیم کرلیا تھا' اس لیے قصاص کے طور پر قتل کرنے سے منع فرمایا۔ ہم ظاہر پر عمل کے مکلف ہیں۔ اگر ایسے قرائن و دلائل موجود نہ ہوں جن سے اس کا قتل خطا ثابت ہو تو محض مجرم کے کہنے سے قتل خطا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

قصاص معاف کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب بھی کوئی ایسا مقدمہ پیش کیا گیا جس میں قصاص ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کرنے کا حکم دیا۔

فوائدومسائل :

1۔ قصاص لینا جائز ہے' لیکن معاف کردینا افضل ہے۔

2۔ حاکم فریقین کو معافی یا صلح کا مشورہ دے سکتا ہے' لیکن متعلقہ فریق کے لیے ضروری نہیں کہ اس مشورے کو تسلیم کرے۔

معاف کرنا افضل ہے

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے۔ "جس کو جسم میں کوئی تکلیف پہنچے' پھر وہ اس (تکلیف پہنچانے والے) کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔"

مشروب کا بیان

مشروب پینے سے پہلے بسم اللہ اور پینے کے بعد الحمدللہ پڑھنا چاہیے۔

جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا' ان کا دودھ پینا بھی حرام ہے۔

ایسا جوس یا نبیذ جس میں نشے کے اثرات پیدا ہوچکے ہوں' پینا حرام ہے۔

مشروب کھڑے ہوکر پینا مکروہ ہے' البتہ بوقت ضرورت کھڑے ہوکر پینا جائز ہے۔ مثلاً" بیٹھنے کی مناسب جگہ نہ ہو یا بارش وغیرہ کی وجہ سے لیکن بیٹھ کر مشروب پینا افضل ہے۔

مشروب کو تین سانسوں میں پینا سنت ہے۔ سانس لینے کے لیے برتن کو منہ سے ہٹالینا چاہیے۔

اگر مشروب میں کوئی تنکا وغیرہ نظر آئے تو پھونک مارنا منع ہے' البتہ مشروب بہا کر اسے نکالا جاسکتا ہے۔

اگر پینے والے کچھ افراد ہوں تو دائیں جانب سے شروع کرنا چاہیے۔

مشروب پلانے والا خود سب سے آخر میں پیے۔

ہمیشہ دائیں ہاتھ سے مشروب پینا چاہیے کیونکہ بائیں ہاتھ سے شیطان پیتا ہے۔



رنج کتنا بھی کریں ان کا زمانے والے
جانے والے تو نہیں لوٹ کے آنے والے
کیسی بے فیض سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

اپنا کھو گیا کوئی

نازیہ کنول نازی

کیوں خاک اوڑھ کے چپ چاپ سو گیا کوئی
دلوں پہ چوٹ لگی اپنا کھو گیا کوئی

جلتی سلگتی دوپہروں کی سوغات لیے مئی کا مہینہ پھر سے پرانی یادوں کے رستے زخم تازہ کرنے آپہنچا ہے۔

سب ہی جانتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے' اسے ہر صورت واپس لوٹنا ہے۔ زندگی کے اس پلیٹ فارم پر انسان کی مثال ایسے مسافر کی مانند ہے جو یہاں آتا ہے' تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے اور پھر اپنے نام کی پکار پر خاموشی سے اٹھ کر اپنے اعمال کا سامان سمیٹتے ہوئے موت کی چلتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو جاتا ہے۔

اپنی باتیں' اپنی یادیں' پیچھے رہ جانے والوں کے لیے چھوڑ جاتا ہے' مگر خود پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ موت برحق ہے۔ نظام قدرت میں یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جسے چاہیں بھی تو جھٹلا نہیں سکتے۔ جان سے پیاروں کی رخصتی پر بلکتے ہوئے قدرت کے اس تکلیف دہ نظام کو بدلنا بھی چاہیں تو نہیں بدل سکتے۔ کوئی کتنا ہی عزیز ہو' ہنستی مسکراتی زندگی کے لیے کتنا ہی ضروری ہو' ہمیں خود اپنے ہاتھوں سے اس پیاری' عزیز ہستی کو خاک کے سپرد کرتے ہوئے صبر کے کڑوے گھونٹ پینا ہی پڑتے ہیں۔

مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا' لیکن کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن سے بچھڑ کر' ہم سانس لیتے ہوئے بھی زندہ نہیں ہوتے۔ آنسو بہاتی آنکھوں میں ان ہستیوں کے ساتھ گزارا ایک ایک لمحہ جیسے ٹھہر سا جاتا ہے۔ اندر کہیں ان کے نہ ہونے سے زندگی کا احساس تھکنے لگتا ہے۔ ان کے لیے کبھی کبھی دل شدت سے مچل کر یہ ضد کر بیٹھتا ہے۔

"نہیں آواز دو' انہیں واپس بلاؤ' انہیں کہو کہ ان کے بغیر ہمارا زندگی میں دل نہیں لگ رہا۔"

مگر شہر خموشاں میں جانے والوں نے بھلا کب پیچھے پلٹ کر دیکھا ہے؟ کب بلکتی صداؤں پر کان دھرے ہیں؟ خوشبو کی مانند' فضاؤں میں بکھر جانے والے لوگ بھلا کب لوٹ کر واپس آیا کرتے ہیں؟ آنکھیں برستی رہ جاتی ہیں' احساسات مچلتے رہ جاتے ہیں' دل تڑپتا رہ جاتا ہے' مگر جانے والے واپس پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ ایسی ہی شخصیات کے لیے شاید یہ کہا جاتا ہے کہ۔

بس اٹھ کے چل دیے چپ چاپ' کچھ کہا نہ سنا
کوئی طریقہ ہے یہ' اس طرح بچھڑتے ہیں

میں نے ریاض صاحب کے لیے کچھ لکھنے کا وعدہ تو کرلیا تھا مگر جب لکھنے بیٹھی تو بے اختیار میرا ذہن مختلف سوچوں کے گھیراؤ میں آگیا۔ ریاض صاحب جیسی "عہد ساز شخصیت" کے لیے' کچھ بھی لکھنا مجھے بہت دشوار لگا۔ بھلا مجھ جیسی ادنیٰ' رائٹر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس قابل کہاں کہ میں پیکر محبت وشفقت' ہمت وحوصلے کی روشن مثال جناب ریاض صاحب کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ مگر پھر بھی میں نے کوشش کی۔ حوصلہ بنتا اور بکھرتا رہا۔ جانے کیا کیا لکھتی رہی اور لکھ کر پھاڑتی رہی۔

وہ پیاری ہستی کہ جن سے کبھی میرا رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ ادب کی دنیا میں وارد ہونے کے فقط ایک سال بعد ہی جن کی وفات کی خبر پڑھ کر میں دلی طور پر ازحد رنجور ہو گئی تھی۔ وہ جن کی پر شفقت میٹھی آواز



کبھی میری سماعتوں کی زینت ہی نہیں بن سکی تھی۔ جنہیں میں نے قریب سے دیکھا اور جانا ہی نہیں تھا۔ بھلا اس عظیم شخصیت کے لیے کچھ بھی لکھنا اتنا آسان کہاں تھا؟

مگر۔۔۔ زندگی میں ہم ہمیشہ ان ہی لوگوں کے لیے تو نہیں روتے کہ جن سے صرف خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ کچھ رشتے دل سے بھی جڑے ہوتے ہیں۔ ان کا اپنا تعلق ہوتا ہے۔ کچھ خوشبو سی شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن سے خون کا یا تعلق کا کوئی رشتہ ہو یا نہ ہو' دل ان کی خوشی میں خوش ہوتا ہے اور ان کے دکھ پر خون کے آنسو روتا ہے' یہ ہی دل کا رشتہ ہوتا ہے۔

نین بھیا کے بعد خاور بھیا کی رحلت پہ میرا دل درد سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ میں تو ان سے کبھی نہیں ملی تھی۔ انہیں بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ بس فون پر ایک' دو بار بڑی شائستہ سی گفتگو ہوئی تھی' مگر اس کے باوجود ان کی رحلت پر میری آنکھیں برس رہی تھیں۔ اس وقت بھی مجھے اپنی ذات ریاض صاحب کی فیملی سے جڑی محسوس ہوئی تھی۔

دل میں دھڑکن کا احساس بن کر دھڑکتے بابر بھیا کو کھو دینے کے بعد بردبار سے سلجھے ہوئے خاور بھیا کی موت پر وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔ ہر زخم صبر سے برداشت کرنے والی یہ عظیم شخصیت ایک باپ کی حیثیت سے اپنے دو پیارے بیٹوں کی جدائی پر اندر سے ختم ہو گئی۔ زندگی کے ہر دکھ' ہر مصیبت کا بہادری سے سامنا کرنے والے محمود ریاض صاحب زیست کے اس موڑ پر بالآخر ہار گئے۔

نہیں! بلکہ بابر بھیا اور خاور بھیا کی وفات کے المناک صدمے کے بعد محض وہ ختم نہیں ہوئے' ایک تاریخ ختم ہو گئی۔ ادب کی دنیا کا ایک روشن باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ نہ زمین پہ بھونچال آیا' نہ آسمان کا

دل کلنا' وہ چپ چاپ شہر خموشاں میں جا سوئے۔
ریاض صاحب جیسی عظیم اور گراں قدر' پیاری شخصیت کے بارے میں اگر اختصار کے ساتھ کچھ کہا جائے تو قلم اس کے سوا اور کیا لکھے کہ دنیائے ادب کے آسمان پر ہزاروں روشن ستاروں کے مابین دیکھتے ہی دیکھتے ایک روشن چاند طلوع ہوا' جس نے اپنی روشنی سے اس دنیا کو منور کیا اور ایک روز چپ چاپ جانے کن بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔
ریاض صاحب جیسی ناقابل فراموش شخصیت کی وفات کے بعد صرف ان کے بچے ہی سایہ پدری سے محروم نہیں ہوئے' بلکہ "چاند نگر گروپ آف پبلکیشنز" سے وابستہ وہ تمام مصنفین بھی اپنا محسن' غمگسار' مشفق دوست گنوا بیٹھیں کہ جن کے قدرتی فن کو نکھار بخش کر دنیا کے سامنے لانے والی پیاری ذات' خود ریاض صاحب کی تھی۔
مئی کی جلتی سلگتی دوپہروں نے محض ایک بشر کو نہیں' بلکہ ایک ایسی شخصیت کو ہم سے چھین لیا کہ جن کے ہونے سے بہت سی زندگیوں کا بھرم قائم تھا۔ جو اپنی رائٹرز کے لیے کبھی بھی ایک مدیر ثابت نہیں ہوئے تھے' بلکہ ایک مشفق باپ' ایک حوصلہ بڑھانے والے بھائی ثابت ہوئے تھے۔
شاید ایسی ہی شخصیات کے لیے کہا جاتا ہے کہ
"جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں۔"
ادب کی دنیا میں جو خلا ان کے جانے سے پیدا ہوا' وہ شاید اب کبھی نہ بھر سکے گا' جو نقصان ان کی دائمی جدائی سے ان کے چاہنے والوں کو اٹھانا پڑا ہے۔ اس کی تلافی شاید اب کبھی نہیں ہو سکے گی۔ شاید اب کبھی ادب کی دنیا کو کوئی دوسرا محمود ریاض نصیب نہیں ہو گا۔ مئی کا مہینہ ہر سال یوں ہی آتا رہے گا۔ یوں ہی دلوں کے زخم ادھڑیں گے۔ یوں ہی آنکھیں خون کے آنسو لٹاتی رہیں گی۔ ان کی عظیم شخصیت کے لیے یوں ہی ہر سال مختلف قلم اپنی اپنی سوچ کے مطابق لفظ بکھیرتے رہیں گے۔ مگر۔
ان کے اچانک دنیا سے چلے جانے پر ہونے والے نقصان کی تلافی کبھی نہ ہو سکے گی۔ اس پیاری شخصیت کے لیے ہمارا درد' ہمارے آنسو' ہمارے تعریفی کلمات ایک طرف۔ مگر تاہم اگر ہم سب ہر روز کچھ نہ کچھ پڑھ کر ان کی روح کے لیے نذرانہ خلوص بھیجتے رہیں تو شاید ان کے ساتھ ہماری بے لوث محبتوں کا تھوڑا سا حق ضرور ادا ہو جائے گا۔
جناب ریاض صاحب کے لیے اس وقت ذہن میں ایک نظم گردش کر رہی ہے کہ۔

اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں
وہ جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی ہیں
آئینے جس کو ڈھونڈتے تھے خود
ایسا بے مثل آئینہ گر تھا وہ
سارے کانٹے سمیٹ لیتا تھا
ایسا انمول ہم سفر تھا وہ
اپنے دل میں سنبھال کر اس کو
اپنے ہاتھوں سے کھو رہے ہیں اسے
ہچکیاں بندھ گئی ہیں لفظوں کی
آئینہ خانے رو رہے ہیں اسے
اس کو کس روشنی میں دفنائیں
اس کو کس خواب کا بدن ہم دیں
وہ جو خوشبو میں ڈھل گیا یارو
اس کو کس پھول کا کفن ہم دیں۔

اپنی تحریر کے اختتام پر مجھے بشریٰ رحمان آپا کے چند خوب صورت لفظ یاد آ رہے ہیں' جو انہوں نے شاید ریاض انکل کی رحلت پر ہی لکھے تھے کہ۔ "شہر خموشاں میں جانے والے' وہاں جا کر اتنے بے پروا کیوں ہو جاتے ہیں۔ جا کر کوئی خیر خیریت کی خبر کیوں نہیں بھیجتے۔ خوابوں میں آتے ہیں تو کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟ سارے سلسلے مٹی کے ایک ڈھیر سے کیوں وابستہ ہو جاتے ہیں؟"
ہماری دعا ہے کہ اللہ کی پاک و بے نیاز ذات اخروی زندگی میں ریاض صاحب کو راحتوں سے ہمکنار کرے۔ جنت الفردوس میں آپ کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

جو ہمت و شجاعت کا پیکر تھے' آخر کیوں ٹوٹ گئے وہ
ہم ان سے محبت کرتے تھے' کیوں ہم سے روٹھ گئے وہ



شادی مبارک ہو

محمد احمد رضا ہمراہ گل ناز سلیمان

سائرہ رضا

امی کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ انہیں پہلے پھیرے ہی میں لڑکی بے حد پسند آچکی تھی اور آج لڑکی کی اماں ان کے بیٹے کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف جوش و خروش دیدنی تھا۔ درمیان میں تپائی پر شام کی چائے سجی تھی۔ بیٹا عصر کی نماز پڑھنے گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ انتظار کوفت میں بدلتا، موصوف حاضر ہوگئے۔ اماں سموسہ کھا رہی تھیں۔ ہاتھ جہاں کا تہاں رہ گیا اور جو منہ میں تھا، حلق میں پھنس گیا۔ بمشکل جھٹکے سے جیسے سنبھل کر سموسہ نگلا۔ ہاتھ والا واپس رکھ دیا اور رخصت کو تیار۔۔۔

اگلے روز ان کا جواب حاضر تھا۔ "ٹخنوں سے اونچی شلوار، سر پر کروشیا کی ٹوپی اور طالبان جیسی داڑھی۔۔۔ ایسے لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اندر بند کرکے مارتے ہیں۔ تنگ نظر قدامت پرست وغیرہ وغیرہ۔"

امی حق دق رہ گئیں۔ ہم نے تسلی دی۔

"ارے! میرے بیٹے کا امیج خراب ہوگیا ہے۔ اتنا نرم دل، روشن خیال پینٹ شرٹ پہن کر آفس جاتا ہے۔ نماز پڑھنے جائے گا تو ٹوپی بھی ہوگی اور شلوار اونچی بھی۔ عجیب عورت۔۔۔"

امی جلے پیر کی بلی بن گئیں۔ ان کی چھٹی حس درست کہہ رہی تھی ۔ آغاز اچھا نہیں ہوا تھا اور پھر

پورے تین سال لگ گئے ہمیں بھابھی کی تلاش میں۔۔۔ لڑکیاں تو لڑکیاں ان کی اماں پہلے منع کر دیتیں۔ حد تو یہ داڑھی والے والد بزرگوار منہ بناتے۔

"احمد! میری مان لے استرا پھیر لے۔ شادی کے بعد رکھ لینا۔" امی رو پڑیں۔

"توبہ استغفار، کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

"لوگوں کی جوتیاں گھستی ہیں، میرے پیر گھس گئے ہیں۔" امی کا غصہ مزید بڑھا۔

"دیکھیے اگر داڑھی کی وجہ سے میرا رشتہ نہیں ہو رہا یا کبھی ہوگا نہیں، تو کوئی بات نہیں۔ اگر داڑھی رکاوٹ ہے تو میں ساری زندگی کنوارہ رہ لوں گا، مجھے منظور، مگر کٹوا دینا لاحول ولا استغفار۔"

احمد رضا قطعیت سے کہہ کر واک آؤٹ کر گئے۔

بڑے بھائی تیمور کلین شیو، گورے چٹے، ہری آنکھیں۔ (میری جیسی)

اکثر ایسا ہوا۔ آنے والوں نے کہا۔

"وہ جو دوسرا لڑکا تھا اس سے کروا دیں۔"

میں نے کہا۔ "بھئی! ایسوں کو تو چھپا دینے کا سنا ہے، اب ہم تیمور کو چھپائیں گے۔"

ایسے ایسے قصے سنے کہ ان پر باقاعدہ ایک افسانہ لکھا جائے گا۔ (انتظار کریں)

اور پھر آزمائش ختم ہوئی۔ گلناز کے بھائی کامران، بہن مہناز اور بعد میں والدین نے داڑھی دیکھنے کے بعد بھی احمد کو پسند کر لیا۔

ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ ہمارے معیارات بدل چکے ہیں، ہمیں اس کا خوب تجربہ ہوا۔

دوسرے احمد کی واحد شرط "پڑھی لکھی لڑکی" بھی پوری ہوگئی۔ گلناز کیمسٹری میں ایم ایس سی ہے۔ احمد کو ماں (اسکول ٹیچر) اور بہنوں جیسی پڑھی لکھی لڑکی درکار تھی۔ (آہم)

بہر حال! یہ بیس فروری بروز جمعہ ہے۔ میں صبح چار بجے اٹھ کر بری کا بکسہ بنا رہی ہوں۔ امی اپنا گھر شفٹ کر چکی ہیں۔ (دراصل امی کا اپنا گھر چھوٹا ہے اور اسے ان شاء اللہ بنانے کا ارادہ ہے، سو امی نے چھ ماہ پہلے ہی شفٹنگ کر لی کہ بار بار کی اٹھا پٹخ سے ساز و سامان ٹوٹے گا۔)

ہمارے ہاں بری دکھانے کا رواج نہیں اور پھر امی نے آج سے کم از کم بیس برس پہلے عہد کیا تھا کہ وہ نہ دیکھیں گی، نہ دکھائیں گی۔ (اس کی وجہ پر بھی افسانہ لکھا جائے گا۔)

مگر دوسری طرف بھابھی کے گھر والوں کا اصرار تھا۔ جس پر امی بہت خفا تھیں۔ (امی! افغانستان ہوں یونان میں جہیز دکھایا جاتا ہے۔ دعوت دے کر بلاتے ہیں اور افریقہ میں ساری بری دکھاتے ہیں۔ خاندان کے مرد زیور ہاتھوں میں تولتے ہیں۔)

امی کے نئے گھر کو کوئی نہیں جانتا، اس لیے مہندی اپنے گھر سے لے کر جانی تھی۔ میں خالی مکان میں مہندی کے تھال سجا کر اپنی بیٹیوں کے ہمراہ اکیلی بیٹھی ہوں اور دل بہت خراب ہو رہا ہے، تاآنکہ میری دوست رانی اور شہناز گاڑی بھر کے آگئیں۔ ان کے بچے اور گلی محلے کی لڑکیاں۔۔۔ یکدم رونق ہوگئی۔

ہم سب گاڑی میں سوار ہوئے اور نئے گھر سے امی، حمیرا، بھائی و دیگر کو لے کر روانہ ہوئے۔ یہاں خوب رونق ہے۔ دو بہنوں کی شادی ہے اور شدید سردی بھی۔ ٹھنڈی یخ ہوائیں نہ جانے کہاں سے گھس آئیں۔ سب بازو بغلوں میں دبیے سوسو سی کر رہے ہیں۔

رانی کے بچے ابوبکر، ابوذر، ارحم سفید سوٹ پر پیلے دوپٹے، ماہا، رافعہ، حرمت سبز و پیلے سوٹ، اقرا، آبگین اعناب، ترکی سرخ و پیلے کپڑوں میں مہندی کے تھال اٹھائے بے حد پیارے لگ رہے ہیں۔ سب سے بڑا تھال حمیرا کے ہاتھ میں ہے جو گلابی نیٹ کی لانگ شرٹ اور ٹراؤزر میں اچھی مگر پریشان لگ رہی ہے۔ حرمت کو بخار اور موشنز ہیں۔

میں نے آتشی گلابی چمکیلے شلوار قمیص پر پیور سلک کاسنی بلو دوپٹا جس پر گلابی و سنہرا ریشم و تلے کا کام ہے، پہن رکھا ہے۔ مگر۔۔۔ مگر میں بالکل اچھی نہیں لگ

رہی ہے'ایک دم بکواس' آخر کیوں... ذرا سوچیے!...

میں رانی کی مدد سے بری دکھا رہی ہوں۔ تب میرے کانوں میں جملہ پڑا۔

"بہت تیز ہیں۔ کہانیاں لکھتی ہیں۔" کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ میری پیاری لکھاری بہنو! ہماری ہیروئن تو ایک کی دس سنانے کے بعد آخر میں جوتا بھی اتار لیا کرتی ہیں' جبکہ ہم... ہم... آہ! حسرت ان غنچوں پر۔)

گلناز ہماری طرف کے پیلے ہرے بنارسی شرارے پر لمبی قمیص کے ساتھ لمبا گھونگھٹ نکالے چلی آرہی ہے۔ اس کا چہرہ چھپا ہوا ہے۔ مگر مجھے اس پر ٹوٹ کے پیار آرہا ہے۔ (میرے بھائی کی دلہن ماشاءاللہ) وہ کپکپا رہی ہے۔ شرم سے' سردی سے یا پھولوں کے زیور سے؟

ہماری رسم کے بعد چھوٹی بہن سمیرا کو رسم کے لیے بلایا گیا۔ وہ خالہ زاد عامر سے بیاہی جارہی ہے۔ کامران بھائی اور عمران نے جب رسم کے بعد دونوں بہنوں کو بازوؤں میں بھر کے ان کی پیشانی کے بوسے لیے تو ہر آنکھ اشکبار ہوگئی۔ شدید سردی میں باربی کیو کی خوشبو مست تھی' مگر گولا کباب میرے حلق میں گولے کی طرح اٹک گیا۔ حمیرا کا لقمہ بناتا ہاتھ رک گیا۔ احمد فون پر چیخ رہا ہے۔

"تم لوگوں نے مجھے چابی نہیں دی۔ میں دروازے پر بیٹھا ہوں۔ رات کا ایک بج رہا ہے۔ سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں اور میں نے صبح کا ناشتا ہی کیا ہوا ہے۔"

(ہائے! میرا بھائی' میرا بھولا بھائی چچ چچ۔)

گلناز کی امی نے حسب عادت احمد کے لیے کھانا باندھ کر دیا۔ اب مجھے گھر جاکر اس کے ساتھ سکون سے بیٹھ کر کھانا ہے' مگر ترکی کا ہاتھ بائیک کے سائلنسر پر لگ گیا' چھالے بن گئے۔ اوپر سے اس کی فریادیں۔

"مما! اس درد کو کھمم (ختم) کردیں۔ مما میلا ہاتھ چھی (صحیح) کردیں۔"

وہ ساری رات جسمانی طور پر ہم سب ذہنی طور پر تڑپتے رہے۔

21 فروری بروز ہفتہ

یہ گیپ تھا اور صبح صبح ماموں گل نواز' ممانی شگفتہ' معزہ گل اور اشعر گل' صادق آباد سے آگئے۔ وہ اگلے دن متوقع تھے۔ معزہ آتے ہی خفا ہو کر رونے بیٹھ گئی۔

"میرے بغیر مہندی کرلی' ہونہہ' ہونہہ' ہونہہ!" بمشکل منایا۔

(احمد لڑکے کو ابٹن مہندی لگانے' دوپٹا پہن کر بٹھانے کو انتہائی احمقانہ مضحکہ خیز مردانگی کی توہین سمجھتے ہیں۔)

22 فروری بروز اتوار۔

مہینوں پہلے کی جانے والی تیاریوں کے بعد بھی آج کا دن بازار کے چکر سے شروع ہوا۔ بے حد مصروفیت اور ہڑبونگ میں امی کے پرانے گھر آچکی ہوں اور یہ بوجھ میرے کندھوں پر ہی ہے کہ مجھے بارات نکالنی ہے۔ آج خالی گھر میں میرے ساتھ احمد ہے۔ وہ تیار ہو کر عشاء کے لیے چلا گیا۔

تب مہمان آنا شروع ہوئے۔ امی' حمیرا' شمس رضا' تیمور اور ماموں جان نئے گھر سے یہاں آگئے۔ ڈھول کی تھاپ امی کے چہرے پر رنگ بن کر چمک رہی ہے۔ یہاں میں نے اور اشتیاق نے ہر چیز مکمل کر رکھی ہے۔

ماموں جان نے جب خود ہی آگے بڑھ کر احمد کو میرون شیروانی پہنائی' بٹن بند کیے' پگڑ سیٹ کیا' ممانی جان نے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر پیسے وارے تو اس منظر کی خوب صورتی میرے قلم سے تحریر نہیں ہوسکے گی۔ امی کی' میری' حمیرا کی آنکھیں بھر آئیں۔ بارات نکلنے کو تیار اور شمس ناراض۔

"تم میرا دوپٹا نہیں لائیں' اب میں بھنگڑا کیسے ڈالوں۔"

"آپ میرا دوپٹا لے لیں۔ مگر اب میں آپ کو دوپٹا لاکر نہیں دے سکتی۔"

حمیرا جل کر کہہ رہی ہے۔

وہ میجنٹا اور اورنج کلر کے شفون کرنکل سوٹ میں بہت جچ رہی ہے اور ہاں! جامنی عنیوزی چنری سوٹ اور چوڑی دار پاجامہ میں آج میں بھی بہت اچھی لگ رہی ہوں۔

شمس کے ساتھ میں ڈبل رشتے کے مزے لوٹتی ہوں اور وہ بھی... میرا بھائی وہ رشتے میں اور عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ پیارے چچا کا پیارا بیٹا اور پیاری بہن کا شوہر۔

"میں لاتی ہوں دوپٹا۔" بائیک پر اسی کے ساتھ اپنے گھر آئی اور گولڈن دوپٹا برآمد کیا' جسے بعد میں شمس نے دونوں پلو ہاتھوں میں پکڑے ایک ٹانگ اٹھا کر بھنگڑا کرتے ہوئے اپنے اندر کے فنکار کو باہر نکال دیا۔

حرمت' ابا کے پیروں میں لڑھک رہی ہے۔ (میرے پاپا کو یہ ہو کیا گیا ہے۔) بعد میں وہ ماں کو دیکھ کر حیران رہ گئی' جسے بمشکل ہاتھ پکڑ پکڑ کر منت ترلے اور ڈرا دھمکا کر سیٹ پر ٹکایا۔

"پیچھے مرد بیٹھے ہیں' شرم کر۔" مگر وہ باز آتے آتے بھی کام دکھا گئی۔

معزہ سرخ سوٹ میں نو دمیدہ گلاب لگ رہی ہے۔

"وہ تو آپ منع کررہی ہیں' ورنہ میرے اندر کا فنکار۔ اف! ہاتھ پیر اس نے بھی چلا لیے تھے۔"

"ہم بس میں گانے گاتے گئے' چاچو نسیم فاروق' عرشیہ سید کے باہر موجود ہیں۔ شکریہ ابی اور حضری کو دیکھ کر خوشی مکمل ہوگئی۔ آبگینہ اعناب کریں فراک اور ترکی اورنج میں بہت کیوٹ دکھ رہی ہیں۔ ہال پہنچ کر ایک بار پھر ڈھول کی تھاپ پر بھنگڑے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس بار اشعر گل اور شمس رضا کی جوڑی ہے۔ احمد کے دوستوں نے تیمور کو بھی گھسیٹ کر خوب نچوایا۔ یہاں قہقہے ہیں۔ خوشی ہے۔ رنگ ہے۔ خوشبو اور محبت۔ رستہ روکے مہناز' جہانگیر اور مہ جبین کھڑی ہیں۔ نکاح کے بعد گلناز کو لایا گیا۔ وہ میرون لہنگے میں بے حد پیاری لگ رہی ہے۔ (آپ تصویر دیکھ ہی رہے ہیں۔)

احمد کے چہرے پر بے پناہ روپ ہے۔ ممانی جان نے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔

"یہ اندر کی خوب صورتی اور پاکیزگی ہے، جو چہرے پر نور بن کر جھلک رہی ہے۔"

امی خاموش ہیں، مگر خوش ہیں بے پناہ۔

"شادی شادی۔۔۔ لیں! ہو گئی احمد کی شادی۔"

اسٹیج پر دودھ پلائی کا جھگڑا ہے، پر میں امی کے ساتھ صوفے پر ٹک گئی ہوں۔ مشتاق ہیں ہیلپو کے طور پر احمد کے ساتھ۔۔۔ سمیرا اور گلناز بے حد پیاری لگ رہی ہیں۔ زیادہ کون؟ مشکل فیصلہ ہے۔

(شادی کی سب سے اہم چیز سادگی اور کوئی احمقانہ اور ہندووانہ رسموں کا نہ ہونا بھی رہا۔)

23 فروری بروز پیر۔

میں آج صرف آرام کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میری ایسی قسمت کہاں۔ شمس کے تھری پیس کی شرٹ لانی ہے۔ میرے میچنگ بندے اور دلہن کو پارلر لے کر جانا ہے۔ حبیب بینک پر بنا فلائی اوور شام کا شدید ٹریفک جام۔ حل۔۔۔ حل؟

گلناز موٹر سائیکل پر میاں کے ساتھ پارلر جائے گی۔ (ہیں! کیا ارے؟) میرج لان میں مہمان ہم سے پہلے موجود تھے۔ حمیرا سرخ نیٹ کی کمیس کے ساتھ بنارسی چوڑی دار پاجامہ میں کھلا گلاب لگ رہی ہے، جان محفل۔ کو میچنگ جیولری پہننا بھول گئی ہے۔ مگر پھر بھی وہ سب پر بھاری ہے۔ حرمت کرے کرم سوٹ میں پانڈا لگ رہی ہے۔

میری بیٹیاں سیاہ گلابی اورنج لانگ میکسی میں خود کو سنڈریلا سمجھ رہی ہیں اور سب سے پیاری بھی۔۔۔ میں پتا نہیں کیسی لگ رہی ہوں۔ گلابی لانگ شرٹ ٹراؤزر کام بنا ہوا، مگر تھکی ہوئی نڈھال۔ دفع کریں۔ میں نے ایک گھنٹہ شرارہ میں اٹک جانے والی گلناز کی انگوٹھی کو ڈھونڈا ہے۔

احمد گلناز کا ہاتھ پکڑ کے اسے اسٹیج پر لایا۔ گلناز گلابی اور سی گرین شرارے میں گلابی گلاب کی کلیاں بالوں میں لگائے بے حد دلکش لگ رہی ہے۔ تھری پیس میں میرا بھائی تو بے حد پیارا۔ گلناز کے گھر والوں خصوصاً امی ابو کا اس سے ملنا ایک بے حد جذباتی لمحہ ہے۔

ممانی جان نے سال بھر پہلے دونوں گھٹنوں کا آپریشن کرایا ہے۔ سفر اور بے آرامی نے آج انہیں بخار میں مبتلا کر دیا۔ وہ برائیڈل روم میں نیم دراز ہیں۔ ماموں جان معتزہ اور اشعر پریشان ہیں۔ بہرحال سب کچھ بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچا، آپ سب سے فقط دعا کی استدعا ہے۔

خدا میری امی کو اولاد کی خوشیاں اور سکھ دکھائے۔ (آمین)

شادی میں میری ہڑبونگ نے مسٹر بین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ دوست رانی نے حالت دیکھی۔ پارو کو ایک پلیٹ دے کر بھیجا۔ اس میں چار مختلف کریمیں تھیں۔

"بیٹا! اس کا کیا کرنا ہے؟"

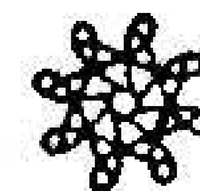
"ممانے کہا ہے، انہیں منہ پر مل لیں۔"

مہندی تک نہ لگائی۔ نیا پرس اپنے گھر میں بھول گئی اور ہاں! شکریہ ادا کروں گی اپنی دوستوں کا، رانی شاکر، شہناز اکبر اور صائمہ جنہیں میں ترپائیاں، ٹکائیاں دے کر آئی تھی اور وہ خوشی خوشی سب کیا کرتی تھیں۔ خدا انہیں خوش رکھے۔ بے حد تھکان بھرے دنوں میں یہ میری ہمت تھیں۔

اور کیا آپ کو پتا لگ گیا کہ میں ماموں کے روز اچھی کیوں نہیں لگ رہی تھی؟ میرے کپڑوں میں چمک اور گریس کیوں نہیں تھی؟

اب دماغ پر زور نہ ڈالیں۔

وہ الٹا سلا ہوا تھا۔ (میں نے خود سیا تھا۔ مجھے خبر تھی۔ مگر سیدھا کرنے کا وقت کس کے پاس تھا۔ جانے دو۔) ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔ ہاہا۔





بندھن

فائق خان ھمراہ ثانیہ فائق خان

کاشف خان

شادی ایک ایسا بندھن ہے جو دو اجنبیوں کو ایک کر دیتا ہے اور پھر دلوں میں ایسی محبت ڈال دیتا ہے کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر گزارا مشکل ہو جاتا ہے۔ محبتیں قائم رہیں یونہی ہم آہنگی ہو جائے تو پھر یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ شادی کو کامیاب بنانے یا ناکام بنانے میں ان ہی دونوں کا ہاتھ ہوتا ہے جو اس بندھن میں بندھتے ہیں۔

آج آپ کی ملاقات ایک نئے جوڑے سے کروا رہے ہیں۔ فائق خان۔۔۔ جنہیں آپ نہ صرف ڈراموں میں دیکھتے ہیں بلکہ کمرشلز میں بھی دیکھتے ہیں۔ فائق نے وعدہ کیا تھا ہم سے کہ جب پرنٹ میڈیا کو انٹرویو دوں گا تو پہلے آپ کو دوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ فائق کے بارے میں کہنا چاہوں گی کہ یہ نوجوان بہت ہی ادب و احترام کے ساتھ بات کرتا ہے۔ اسی لیے مجھے اس سے بات کرنا اچھا لگتا ہے۔

"شادی مبارک ہو۔ میری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے۔"

"جی بہت شکریہ۔"

"کیسے ہو۔۔۔ اور آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ٹھاک اور آج کل کام ہو رہا ہے۔ سکس سگما کا پروجیکٹ کر رہا ہوں، آیوری ریڈی کا ایک شو کر رہا ہوں۔ ٹی وی ون پہ ڈرامہ سیریل 'دو کیلی' چل رہا ہے۔ یوں سمجھیے کہ کافی کام ہو رہا ہے۔"

"صابن کے کمرشل میں آپ ڈاکٹر کے روپ میں آتے ہیں اس میں تو آپ سچ مچ ڈاکٹر لگتے ہیں۔"

"جی شکریہ اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں لائف

بوائے کا برانڈ ایمبیسڈر ہوں پاکستان میں۔“
”کتنے مہینے ہوگئے ہیں شادی کو؟“
”30 دسمبر 2011ء کو ہمارا نکاح اور شام کو مہندی کی رسم ہوئی اور 2 جنوری 2012ء کو رخصتی ہوئی۔“
”ثانیہ آفندی سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی اور کوئی رشتے داری ہے کیا؟“
”نہیں جی کوئی رشتے داری نہیں ہے۔ غیروں میں شادی ہوئی ہے اور میری پسند ہے گزشتہ سات سال سے میں اسے جانتا تھا میں نے اسے پہلی بار عاطف اسلم کے کنسرٹ میں دیکھا تھا۔۔۔ اور مزے کی بات یہ کہ یہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں گرتی پڑتی آرہی تھی اور میرے قریب آتے ہی دھڑام سے گری تو میں نے سنبھال لیا۔ بس اس وقت پہلی نظر میں یہ مجھے اچھی لگی اور میں نے سوچا کہ یہی میری شریک سفر ہونی چاہیے۔“
”یہ تو فلمی سین ہوگیا۔“
”بالکل جی! فلمی سین ہوگیا۔ انہوں نے ہم سے آٹوگراف لیا۔ ہم نے آٹوگراف دیا اور ساتھ ہی ای میل ایڈریس بھی دے دیا۔۔۔ بس پھر بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر میں نے پروپوز کردیا۔ دوسری طرف سے بھی اچھا رسپانس ملا۔۔۔ اور مجھے ایک ڈیڑھ مہینے میں ہی اندازہ ہوگیا کہ ان کی فیملی بہت اچھی ہے۔“
”اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔“
”ہم پٹھان کہلاتے ہیں۔ انڈیا سے ہمارا تعلق ہے لیکن میں نے اور میری بہنوں نے کراچی پاکستان میں جنم لیا۔ چھوٹی سی فیملی ہے۔ والدین کے علاوہ ایک بڑی بہن اور ایک چھوٹی بہن ہے۔“
”منگنی یا دوستی کتنا عرصہ رہی؟“
”دوستی تقریباً“ ساڑھے چھ سال رہی۔ ساتویں سال میرا رشتہ پکا ہوا۔ مجھے بہت صبر کرنا پڑا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو یہ عمر میں بہت چھوٹی تھی اور میں بھی کوئی بہت بڑا نہیں تھا، پھر میرا ابھی آگے بڑھنے اور جدوجہد کرنے کا پیریڈ تھا۔ ثانیہ نے مائیکروبیالوجی میں ماسٹرز کرنا تھا اور مجھے بتادیا گیا تھا کہ اس کے ماسٹرز کرنے تک کوئی بات نہیں ہوگی شادی بیاہ کی اور جب اس کا ماسٹرز مکمل ہوا پھر ہم لوگ رشتہ لے کر گئے۔ فنکار کا گھرانہ خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، رشتے کے وقت تھوڑی بہت پرابلم تو ہوتی ہی ہے اور اس رشتے کے لیے میرے والد اور ثانیہ کی والدہ نے اہم رول ادا کیا۔ بے شک بات چیت کے دوران (رشتے کے سلسلے) کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ بس میرے سسر نے سوچنے میں تھوڑا ٹائم لیا۔۔۔ پھر میں نے اور میرے والد نے ان کے گھر والوں کو کنوینس کیا اور ثانیہ کی والدہ کو معلوم تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے اس رشتے کے لیے بہت سپورٹ کیا۔“
”اور پھر کب بات پکی ہوئی؟“
”13 مارچ 2011ء کو بات پکی ہوئی تھی ساتھ ہی شادی کی تاریخ بھی فکس ہوگئی میں تو شوٹ پہ گیا ہوا تھا۔ میری غیر حاضری میں گھر والے ان کے گھر گئے اور مٹھائی کھا کے آگئے۔“
”دوستی کے دوران ملاقاتیں ہوتی تھیں؟“
”دوستی کے دوران ڈیٹ پہ جانے کا کوئی چکر نہیں ہوا۔ جب ویسے بات ہو جاتی تھی تو اس چیز کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ البتہ جب بات پکی ہوگئی اور شادی کی شاپنگ شروع ہوگئی تب ہم ایک ساتھ جاتے تھے شاپنگ کے لیے کیونکہ میری امی نے کہا کہ ثانیہ کی پسند کی شاپنگ ہونی چاہیے۔“
”اتنے عرصے میں ایک دوسرے کے مزاجوں سے بھی واقف ہوگئے ہوگے تو شادی کے بعد ویسا ہی پایا یا کچھ چینج لگا؟“
”ایک دوسرے کے مزاجوں کے بارے میں بہت اچھی طرح جان گئے تھے لیکن جب آپ سات سال کسی کا انتظار کریں اور پھر اس سے شادی ہو جائے تو ایک دفعہ تو یقین ہی نہیں آتا کہ شادی ہوگئی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ ڈیڑھ مہینہ لگا اس بات پہ یقین کرنے میں کہ میں جس لڑکی کو چاہتا تھا، اس سے میری شادی

ہی ہوگئی ہے۔ اب تھوڑا تھوڑا یقین ہو چلا ہے کہ میری شادی ہوگئی ہے۔“
”تو پھر کیا خیال ہے کہ لو میرج ہونی چاہیے یا ارینج؟“
”بات یہ ہے کہ جہاں انڈراسٹینڈنگ ہو، وہی شادی کامیاب رہتی ہے۔ خواہ لو ہو یا ارینج ہو۔“
”شادی کے بعد لڑکوں کی آزادی پہلے جیسی نہیں رہتی ہے۔ تمہارے ساتھ ایسا ہوا؟“
”شادی کے بعد آزادی میں بہت فرق پڑتا ہے۔ آپ پابند ہو جاتے ہو۔ کیونکہ گھر سے ابھی نکلنے ہی لگو تو بیگم پوچھتی ہیں کہ کب آئیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ بھئی پہلے نکلنے تو دو۔“
”پہلے والی زندگی یاد آتی ہے؟ اور کون سی زندگی بہتر لگتی ہے؟“
”بالکل آتی ہے۔۔۔ اور زندگی تو دونوں طرح سے ہی اچھی ہے خواہ شادی ہو یا نہ ہو، بات ضرورت کی ہوتی ہے۔ پہلے والی لائف میں بیگم نہیں تھیں، دوست تھے۔ اب دوست نہیں ہیں، بیگم ہے۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔“
”شادی زندگی کے لیے کتنی ضروری ہے؟“
”بہت ضروری ہے۔ بندہ ذمہ دار ہوجاتا ہے۔ لائف سیٹل ہو جاتی ہے۔ اچھا لگتا ہے، انسان کا بچہ بن جاتا ہے۔ فیملی لائف شروع ہو جاتی ہے۔“
”ثانیہ مزاج کی کیسی ہے؟“
”بہت معصوم ہے۔ کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ چاکلیٹ دلادیں، چپس دلادیں۔ بچوں والی فرمائشیں ہیں اس کی۔“
”ثانیہ نے مائیکروبیالوجی میں ماسٹرز کیا ہے۔ جاب کرتی ہیں اور تم چاہو گے کہ تمہاری فیلڈ میں آئیں؟“
”یہ جاب نہیں کرتی، شادی سے پہلے پریکٹس کرتی تھی اور میں تو نہیں چاہوں گا کہ یہ جاب کرے، بلکہ میری خواہش ہے کہ یہ گھر پر ہی رہے اور یہ بھی کبھی نہیں چاہوں گا کہ یہ اس فیلڈ میں آئے کیونکہ اگر مجھے کسی اداکارہ سے شادی کرنی ہوتی تو میں اس سے شادی کیوں کرتا اور جاب بھی لڑکیوں کو اس وقت کرنی چاہیے، جب بہت مجبوری ہو۔“
”ہنی مون کہاں منانے گئے تھے؟“
”ہنی مون منانے اب جاؤں گا۔ ایک کمرشل کے سلسلے میں ملائیشیا جانا ہے تو ساتھ میں بیگم کو بھی لے جاؤں گا۔ ہنی مون بھی ہو جائے گا اور کام بھی ہو جائے گا۔“
”ثانیہ کی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ۔“
”اچھی عادت تو یہ ہے کہ بہت رحم دل ہے۔ ہمدردی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بری عادت یہ کہ تھوڑی ضدی ہے۔ انا پرست بہت ہے مگر اب شادی کے بعد حساس بہت ہوگئی ہے۔ پہلے جیسی ضد اور انا نہیں رہی ہے۔“
فضول خرچ ہو؟“
”فضول خرچی کا تو سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ مہنگائی بہت ہے۔ جب سے شادی ہوئی ہے صرف تین مرتبہ گھر سے باہر ڈنر کرنے گئے ہیں۔ سینما ہاؤس بھی نہیں جاتے۔“
”تمہارے ڈرامے پسند کرتی ہیں اور شادی کی رسمیں دونوں طرف کی ایک جیسی تھیں کیا؟“
”نظر آجائے تو دیکھ لیتی ہے اور رسمیں تھوڑی سی مختلف تھیں۔ ہماری انڈین ٹائپ کی رسمیں تھیں اور ان کی الگ ٹائپ کی تھیں۔ مجھے ابٹن کی رسم زیادہ اچھی لگی تھی۔“
”شادی کی صحیح عمر کیا ہونی چاہیے اور لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟“
”دیکھیں جی، خوب صورتی تو بہت سی لڑکیوں میں ہوتی ہے لیکن بات یہ ہوتی ہے کہ آپ کو کسی کی ادا پسند آجائے۔ مجھے اس کی معصومیت زیادہ پسند آئی تھی۔ اب اس سے زیادہ معصومیت کیا ہوگی کہ کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ ایک مچھر مجھے تنگ کر رہا تھا اب ثانیہ نے ایک دم میرے منہ کے سامنے اسپرے کردیا۔۔۔ میں نے تھوڑی خفگی سے کہہ دیا کہ ”یہ کیا طریقہ

ہے۔" بس اتنا کہنا تھا کہ اس نے رونا شروع کر دیا۔"

ثانیہ آفندی

"ثانیہ! کیسی ہیں آپ؟ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔"

"جی میں ٹھیک ہوں۔ میرے والد لائر ہیں اور ان کا نام غضنفر آفندی ہے جبکہ امی کا نام نازنین ہے اور وہ ہاؤس وائف ہیں۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے۔ پھر میں ہوں اور مجھ سے چھوٹی بہن ہے۔ بھائی اے سی سی کر رہا ہے اور بہن بی فارمیسی میں ہے۔"

"اور زندگی کیسی گزر رہی ہے اور تمہاری اور فائق کی دوستی کس طرح ہوئی؟"

"بہت اچھی گزر رہی ہے اور ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چل رہا ہے اور دوستی اس طرح ہوئی کہ میں ان کی فین تھی اور ہم ایک کنسرٹ میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے انہیں دیکھا اور ان سے آٹوگراف لیا اور میری بہن نے ان سے ان کا آئی ڈی مانگ لیا۔۔۔ پھر ایک دو سال کا گیپ آگیا۔ اس کے بعد ہماری چیٹ ہوئی اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پروپوز کیا۔۔۔ پھر انہوں نے گھر والوں سے بات کی۔ ان دنوں میرے ابو امریکا میں تھے پھر جب ابو سے بات کی تو انہوں نے پہلے تو تھوڑا ایشو بنایا۔ پھر ان کی فیملی سے ملے۔ فائق سے ملے تو ابو کو یہ اچھے لگے۔ اور پھر وہ رشتے پہ رضامند ہوئے۔"

"جوائنٹ فیملی میں آئیں تو گھر کا ماحول کیسا لگا؟"

"جی بالکل۔۔۔ ان کے امی ابو ہیں اور دو بہنیں ہیں اور ماشاء اللہ ان کے گھر کا ماحول بہت اچھا ہے۔ مجھے سسرال میں آکر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔"

"شادی کی رسموں کے بارے میں بتاؤ۔۔۔ یہ بتاؤ کہ نکاح کے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"مجھے شادی کی رسمیں اچھی لگتی ہیں اور مہندی کی رسم خاص طور پر جو کہ میں نے خود بھی انجوائے کی اور نکاح سے پہلے میں بہت ریلیکس تھی اور مجھے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ میرا نکاح ہو رہا پھر جب نکاح ہو گیا تو ایک دم سے رونا آگیا اور رخصتی کے وقت تو میں کافی اپ سیٹ تھی اور روئی بھی تھی۔۔۔ مگر پھر دوسرے دن ہی سیٹ ہو گئی تھی۔"

"یوں تو چیٹ ہوتی تھی لیکن جب فائق شریک سفر بن گئے تو کیسا پایا عادت اطوار میں؟"

"عادت و اطوار میں بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں اور کمپرومائزنگ بھی بہت ہیں۔ البتہ غصے کے تیز ہیں اور چھوٹی چھوٹی بات پر ڈانٹ دیتے ہیں۔"

"گھر کے کاموں میں تمہارا ساتھ دیتے ہیں؟"

"ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ رات کو جب میں برتن دھونے جا رہی ہوتی ہوں تو کہتے ہیں کہ لاؤ میں دھو دیتا ہوں اور زبردستی میرے ہاتھ سے چھین کر خود دھو دیتے ہیں برتن۔"

"سسرال میں سب رشتے کیسے لگے؟"

"سسرال میں سب بہت اچھے ہیں اور خاص طور پر ساس تو بہت اچھی ہیں۔ بہت معصوم سی ہیں۔ ساسوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ ایسی ہوتی ہیں ویسی ہوتی ہیں تو میں سوچتی تھی کہ پتا نہیں میری ساس کیسی ہوں گی۔ لیکن شکر اللہ کا میری ساس تو بہت اچھی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ یہ ساس ہیں بالکل ماں کی طرح لگتی ہیں اور نندیں بھی بہت اچھی ہیں۔ سسر بھی بہت پیار کرتے ہیں۔"

"ابھی تو شادی کو بہت کم وقت ہوا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سب رشتے تمہیں ہمیشہ ایسے ہی اچھے لگیں۔ تم بتا رہی ہو کہ تھوڑے غصے کے تیز ہیں تو کن باتوں پہ غصہ آتا ہے؟"

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ آتا ہے۔ جیسے اب مجھے "ناخن کترنے" کی عادت ہے تو اس بات پہ غصہ کرتے ہیں۔ اسپرے والی غلطی پہ بہت ڈانٹ پڑی تھی۔ کوئی چیز ادھر سے ادھر رکھ دی تو غصہ آجاتا ہے۔"

"تم بتا رہی ہو کہ تم ان کی فین تھیں تو کون سا ڈراما دیکھا تھا اور اب تمہارا دل چاہتا ہے کہ تم بھی اس فیلڈ میں آؤ؟"

"میں نے ان کا ڈراما "شیشے کا گھر" دل آباد' دیکھا تھا آج کل ان کا ڈراما "اجنبی شہر کے اجنبی راستے" بہت اچھا ہے۔ اس طرح "لیلیٰ" بہت اچھا ہے اور ڈراموں میں کام کرنے کا میرا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی میرا دل چاہتا ہے۔ ہاں اگر کمرشل کی آفر آئی اور وہ بھی ان کے ساتھ تو ضرور کروں گی۔ ویسے ان کے ساتھ فوٹو شوٹ کروا چکی ہوں۔"

"شادی اور ولیمہ کا جوڑا کس کی طرف سے تھا اور پسند کس کی تھی؛ شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی؟"

"جی! شادی کی شاپنگ فائق کے ساتھ کی تھی اور شادی اور ولیمہ کا جوڑا سسرال کی طرف سے ہی تھا لیکن پسند میری تھی۔۔۔ شادی کا جوڑا تو سرخ تھا اور ولیمہ کا گرین کلر کا تھا۔"

"تم پڑھی لکھی ہو مائیکرو بیالوجی میں ماسٹرز ڈگری لی ہے۔ جاب کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"نہیں! دل تو نہیں چاہتا لیکن کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں تاکہ پڑھا ہوا بھول نہ جاؤں۔ پریکٹس میں رہنا چاہتی ہوں۔"

"مشہور بندے سے شادی کرنے میں نقصان یا فائدہ؟"

"فائدہ ہے۔ اب کیا فائدہ ہے' یہ تو نہیں معلوم' لیکن بس اچھا لگ رہا ہے کیونکہ بیگم بھی مشہور ہو جاتی ہے اور اب تو لوگ مجھے بھی پہچاننے لگے ہیں۔"

"فائق کتنے رومانٹک ہیں اور منانے میں پہل کون کرتا ہے؟"

"جی۔۔۔ رومانٹک مزاج ہیں اور کبھی وہ پہل کر لیتے ہیں منانے میں کبھی میں کر لیتی ہوں۔ جس کی غلطی ہوتی ہے' وہ ہی پہل کرتا ہے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور اگر تمہارا موڈ خراب ہے تو فائق کی کس بات سے تمہارا موڈ فوراً" ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"منہ دکھائی میں مجھے بریسلٹ ملا تھا اور جب یہ پیار سے بات کر لیتے ہیں تو میرا موڈ فوراً" ٹھیک ہو جاتا ہے اور یہ اگر پروا نہ کریں تو پھر میرا موڈ اور زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔"

"رات کو فائق کے گھر آنے پر سارا دن کی روداد سناتی ہو؟"

"نہیں جی! ٹائم ہی نہیں ملتا۔۔۔ کیونکہ یہ بہت دیر سے آتے ہیں۔ پھر میں ان سے ہی پوچھتی ہوں کہ آپ نے سارا دن کیا کیا' دن کیسا گزرا آپ کا۔"

"سادگی پسند ہو یا فیشن اچھا لگتا ہے؟"

"میں تو سادگی پسند ہوں اور ان کو بھی میں سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ لیکن چونکہ ابھی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں تھوڑی سجی بنی رہا کروں۔"

"جس فیلڈ سے فائق کا تعلق ہے' وہ ایک خطرناک فیلڈ ہے۔ ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔ ایک تو میں انہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں اور پھر فیلڈ کے سب لوگوں کو ہماری شادی کے بارے میں پتا ہے۔"

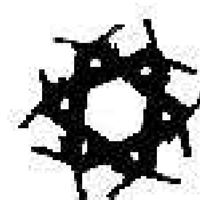
"اگر ان کا دل کسی اور لڑکی پہ آگیا اور دوسری شادی کرنے کا سوچ لیا تو کیا ردعمل ہو گا تمہارا؟"

"میں انہیں کرنے ہی نہیں دوں گی اور میری اجازت کے بغیر یہ کر بھی کیسے سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔"

اس دوران فائق کی آواز آئی۔

"اس مہنگائی کے دور میں کوئی بھی دو شادیاں افورڈ نہیں کر سکتا۔"

اور ان دونوں کے قہقہوں کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔





دستک دستک دستک

شاہین رشید

ایمن طارق

"کیسی ہو.... کمال کی اداکارہ ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں اور کیا مطلب کہ میں کمال کی اداکارہ ہوں؟"

"کمال کی اداکاری اس لیے کہا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ تم ہر قسم کا کردار بہت آسانی اور عمدگی سے کرلیتی ہو۔"

"شکریہ .... آپ کو میرا کون سا کردار بہت اچھا لگا۔"

"مجھے تو سارے ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ لڑکیاں تو کوئی کردار لیتے وقت اپنی خوب صورتی کا بہت خیال رکھتی ہیں مگر تم نہیں.... کیوں؟"

"آپ کا اشارہ "دل تو بھٹکے گا" اور "میری صبح کا ستارہ" سے ہے تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں کہ مجھے اپنی خوب صورتی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔ کیونکہ میں ایک فنکارہ ہوں اور اپنی اداکاری سے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتی ہوں' اپنی خوب صورتی سے نہیں۔"

"بات تو یہ ٹھیک ہے.... میری صبح کا ستارہ میں بھی ایک سانولی لڑکی کا رول کیا اور دل تو بھٹکے گا میں ایک نوکرانی کا' جو کہ کافی بدصورت دکھائی گئی ہے' کا رول کیا۔ اس بارے میں کسی نے بھی کچھ کہا؟"

"ہاں.... بالکل کہا کہ ایسے رول کیوں کرتی ہو تو میں یہی کہتی ہوں کہ اگر میں اپنی بیوٹی کا خیال رکھوں تو پھر مجھ میں اور دیگر لڑکیوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ ایک اداکارہ کا کمال تو یہ ہے کہ وہ 'وہ' نظر آئے' جو وہ نہیں ہے۔ اور آپ یقین کریں کہ مجھے میری اداکاری کے حوالے سے بہت لوگ پسند کررہے ہیں اور جب کوئی پسند کرنے لگے تو محنت وصول ہو جاتی ہے۔"

"آئندہ بھی ایسے ہی رول کرنے ہیں؟"

"ایسے ہی رول سے مراد سانولی اور کالی لڑکی کے رول ہیں تو ایسا نہیں ہے آئندہ ایسے رول کروں گی جو میرے لیے چیلنجنگ ہوں گے میں چاہتی ہوں کہ میرا ہر کردار دوسرے کردار سے مختلف ہو میں ناظرین کو مختلف انداز میں نظر آنا چاہتی ہوں۔"

"گڈ.... آج کل کیا کیا آن ایئر ہے؟"

"دل تو بھٹکے گا' مجھے روٹھنے نہ دینا' جنت سے نکالی گئی عورت' اور اس وقت یاد نہیں آرہے۔ اس طرح انڈر پروڈکشن بھی کافی کام ہو رہا ہے۔"

"تم ان ہی مصروفیات کی وجہ سے ہاتھ نہیں آتیں۔"

"کیا کروں' سب کو یہی شکایت ہے۔ گھر والوں کو بھی یہی شکایت ہے۔ ان کو بھی کئی کئی دن میری شکل نظر نہیں آتی۔"

"کیوں....؟"

"کسی ایک شہر میں ریکارڈنگ تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ آج اس شہر میں تو کل اس شہر میں۔ بس اس وجہ سے گھر میں رہنے کا اتفاق ذرا کم ہی ہوتا ہے۔"

"اچھا ہے نا۔ سب جگہ گھومنے پھرنے کو مل جاتا ہے۔"

"گھومنے پھرنے کا مزا تو اس وقت آتا ہے' جب فیملی ساتھ ہو' فرصت کے اوقات ہوں' کوئی مصروفیت نہ ہو' کوئی ٹینشن نہ ہو۔"

"تم نے سوپ بھی کیے' سیریلز بھی' مزا کس میں آتا ہے؟"

"مزا کام میں آتا ہے۔ (قہقہہ) سوپ کا کام طویل ہوتا ہے۔ کہانی روز کے روز چل رہی ہوتی ہے۔ لمبی لمبی اقساط یعنی سوڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوتیں' جبکہ سیریل زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس اقساط تک ہوتا ہے۔ مجھے تو کام کرنا ہے خواہ سیریل ہو یا سوپ۔"

"ویسے تو تم ماشاء اللہ بہت اچھی فنکارہ ہو مگر کبھی کسی نے کہا کہ فلاں ڈرامے میں آپ اچھا پرفارم نہیں کررہیں؟"

"نہیں' ایسا کسی نے نہیں کہا اور مسئلہ یہ ہے کہ یہاں منہ پر تو کوئی تنقید کرتا ہی نہیں ہے۔ آگے پیچھے بہت تنقید ہوتی ہے کہ ایسا کردیا ویسا کردیا وغیرہ وغیرہ۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ مجھ پہ ایسی کڑی تنقید ہوئی نہیں۔ اور ویسے بھی میں تعمیری تنقید کو پسند کرتی ہوں۔ صرف یہ کہہ دینا کہ آپ اچھا کررہی ہو یا آپ برا کررہی ہیں۔ کافی نہیں ہوتا۔"

"اتنی مصروفیات کے بعد نیند بھی اچھی آتی ہوگی اور ٹینشن بھی نہیں ہوتی ہوگی؟"

"ٹینشن نہیں ہوتی؟ یہ کیسی بات کردی آپ نے' مجھے تو ٹینشن بھی ہوتی ہے اور ڈپریشن بھی بہت ہوتا ہے۔ بے شک نیند اچھی آجاتی ہے لیکن اگلے دن کی ٹینشن بھی بہت ہوتی ہے۔"

"تم نے اس فیلڈ میں کافی کام کیا ہے۔ آسان کون سا شعبہ لگتا ہے۔ ماڈلنگ' اداکاری یا تھیٹر؟"

"سب سے آسان تو مجھے تھیٹر لگتا ہے بشرطیکہ آپ بولڈ ہیں اور آپ کو اپنے اوپر پورا بھروسا ہے کہ آپ پبلک کے سامنے سب کچھ آسانی سے کرلیں گے۔ تھیٹر میں فوراً "اندازہ ہو جاتا ہے اپنی کارکردگی کا اور اپنی صلاحیتوں کا۔ ٹی وی میڈیا اس لیے مشکل ہے کہ ہر کردار کے لیے موڈ کو سچویشن کو اور کہانی کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔"

"تھیٹر کے لیے تم انڈیا بھی جاچکی ہو؟"

"جی' بالکل جاچکی ہوں اور ایک مرتبہ نہیں' کئی مرتبہ جاچکی ہوں اور ناپا کے پلیٹ فارم سے ہی گئی ہوں اور اب تک کلکتہ' امرتسر اور دہلی جاچکی ہوں۔"

"اپنی کوئی خامی بتانا چاہوگی؟"

"جی' مجھے غصہ بہت آتا ہے۔ میں بہت حساس طبیعت کی مالک ہوں۔ چھوٹی سی بات بھی میرے دل کو لگ جائے تو گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ اپنی ان خامیوں کو دور کرنا چاہتی ہوں۔"

✲ ✲ ✲

کنور ارسلان

"کنور کیسے ہو؟ تمہارا نام لوگ صحیح تلفظ کے ساتھ لیتے ہیں؟"

"جی میں ٹھیک ہوں.... اور آپ نے ٹھیک کہا کہ اکثر لوگ میرا نام غلط لیتے ہیں۔ لیکن کیا کریں جو غلط لیتا ہے' اس کو تو بتا دیتے ہیں کہ اس طرح نہیں' اس طرح ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ لکھنے والے بھی خیال نہیں رکھتے۔"

"آج کل کم کم نظر آرہے ہو' کیوں؟"

"بس اتفاق ہے۔ جب کام آن ایئر ہوتا ہے تو ایک ساتھ ہی ہو جاتا ہے اور جب کم ہوتا ہے تو ایک ساتھ

بقیہ صفحہ 284 پر

عالیہ بخاری

دیوارِ شب

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور للہ نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتلائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو میڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گمشدہ آملی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھرم سا ٹوٹ جانے کا دُکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو۔ رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دُعا گو ہیں۔

دہ سرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زدبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصۂ دراز



سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی امارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاماہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ نگیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر نگیتی کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لاٹے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور رانجو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر نگیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔

سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آنا فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں وہ ایسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۵۱

اکیاونویں قسط

یوسف کمال کی نگاہ اسی ایک سمت پر ساکن ہوئی۔ نانی ستارہ کا وہ وسیع آرائشی برآمدہ، اطراف میں جھوم کر شور مچاتی برسات، سب ہی کچھ کہیں فضاؤں میں تحلیل ہوئے تھے۔

صرف وہ تھے اور سامنے دیوار پر لگی حقیقت سے پردہ اٹھاتی وہ بڑی سی تصویر۔

بادل بہت زور سے گرجا تھا۔ انہوں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔

برآمدے میں وہ اکیلے کھڑے تھے۔ نگینہ یا نانی ستارہ میں سے کسی نے بھی انہیں دروازے تک چھوڑنے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ کوئی معزز مہمان نہیں تھے بلکہ وہ تو کسی عام سے ملاقاتی کی بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

یوسف کمال نے شکر ادا کیا کہ وہ اس وقت یہاں اکیلے تھے ورنہ شاید کبھی بھی...

چند قدم آگے بڑھ کر وہ اس کمرے کے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے یہاں بھی کوئی نہیں تھا مگر وہ تصویر اب اور بھی نمایاں تھی۔ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اس تصویر کے بالکل قریب آگئے تھے۔

"یہ وہی تھا۔"

وہی سنہری رنگت، وہی براؤن آنکھیں، جن کی اداسی اس تصویر میں بھی نمایاں ہو رہی تھی اور چہرے پر وہی زمانے بھر سے لاتعلقی کا گہرا تاثر!

یوسف کمال کی شاید پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔

اب کوئی جلتے انگاروں پر بھی کھڑا ہو کر حلف اٹھائے کہ ان کا بیٹا مر چکا ہے تو وہ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

وہ جسے محض چار سال کی عمر میں اس بیمار، تھکی ہاری فیروزہ کے سپرد کر کے، وہ ان دونوں کے سارے حقوق و فرائض سے اپنے طور پر بری الذمہ ہو گئے تھے۔

وہ ننھا سا بچہ ان کی بے حسی، ماں سے محرومی اور زمانے کی ٹھوکروں کے باوجود بھی زندہ رہا اور آج ایک بھرپور حقیقت بن کر سامنے آگیا۔

انہیں خیام کی سخت جانی پر حیرت ہوئی قدرت کی بے نیازی اور کارگری، دونوں ہی بیک وقت عجیب انداز میں ان کے نصیب کا حصہ تھیں۔

"پتا نہیں انہیں اپنی خوش نصیبی کا جشن منانا چاہیے یا اپنی بدنصیبی کا ماتم کرنا چاہیے۔"

ایک ساتھ بہت سے آنسو یوسف کمال کے چہرے کو بھگوتے قمیص میں جذب ہو گئے۔

ہتھیلی سے چہرہ خشک کر کے وہ بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آئے۔

برآمدہ ابھی بھی خالی تھا۔ تیز ہوا کے جھونکے جالی کے گلابی، کاسنی پردوں کو اڑائے لیے جا رہے تھے اور برستی بارش کا پانی برآمدے کا آدھے سے زیادہ فرش گیلا کر چکا تھا۔

اندر نانی ستارہ کے کمرے میں ان کے اور نگینہ کے بیچ موضوع گفتگو یوسف کمال ہی تھے۔

"بے غیرت، کمینہ... ہمت تو دیکھیں اس کی، کیسے آکر سر پر کھڑا ہو گیا جواب طلبی کرنے... مری ہوئی بہن کی قسم کھا کر کہتی ہوں اماں! کہ میں..." نگینہ کے کڑواہٹ میں ڈوبے الفاظ ادھورے مفہوم کے باوجود سمجھ میں آتے تھے۔

دروازے کی چوکھٹ میں وہ بے غیرت، کمینہ پھر سے آکھڑا ہوا تھا۔

"تم نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا نگینہ!" دو قدم آگے بڑھ کر وہ ٹھیک اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔ چہرے پر ایسی عجیب سی کیفیت تھی کہ نگینہ جیسی دبنگ عورت کو بھی ایک بار آنکھ چرانا ہی پڑی۔

"کیوں آخر؟ تم اگر اسے مجھ سے ملنے نہیں دینا چاہتی ہو تو تم مجھے صاف لفظوں میں بھی منع کر سکتی تھیں۔

شاید وہ خود بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ مگر اتنا بھیانک جھوٹ..... اولاد ہے وہ میری۔"

تگینہ اور یوسف کمال دونوں ہی نے خود کو اپنی اپنی جگہ کمپوز کیا۔

"شرم آنی چاہیے تمہیں!" یوسف کمال نے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا یا اپنے احساس جرم کا۔

"شرم!" خود پر کمال کی لاتعلقی طاری کیے بیٹھی نانی ستارہ نے چونک کر اس شخص کی طرف دیکھا جس کے لیے ان کے پاس کوئی گھٹیا سے گھٹیا لفظ بھی اب باقی نہیں رہا تھا۔ نہ وہ اس کی شکل دیکھنا چاہتی تھیں اور نہ ہی آواز سننا چاہتی تھیں، مگر اب جب وہ پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کے گھر میں کھڑے ہو کر جواب طلبی کر ہی رہا تھا تو جواب دینا بھی لازم ٹھہرا تھا۔

"خود صاحب اولاد ہو کر کسی کے بچے کو جیتے جی مار دینا، تم لوگوں کے ہاں شاید معمول کا قصہ ہو، مگر ہم شریف لوگ....."

"بس! اب ایک اور لفظ آگے نہیں یوسف کمال!" ایک اضطراب کے عالم میں وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تگینہ کی طرف رخ موڑ کر کھڑے یوسف کمال نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

نانی ستارہ کی گلابی رنگت سرخی مائل ہو رہی تھی۔ وہ ان کے جاہ و جلال کے زمانہ عروج کے گواہ تھے۔

"ہمیں ہماری اوقات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے یوسف کمال! ہمارے ہاں تو تم جیسے شریفوں کی اولادوں کا پلنا بھی معمول کا قصہ ہے، سو یہاں کھڑے ہو کر اپنی شرافت کی دہائی دینے سے بہتر ہے کہ تم ان ہی قدموں پر واپس چلے جاؤ، ورنہ تمہیں باہر تک پہنچانے کے لیے مجھے کسی کو آواز دینی پڑے گی۔"

اور وہ جو کچھ کہتی تھیں، خالی دھمکی نہیں ہوتی تھی۔ محلے کے سب سے شان دار اور سب سے وضع دار چوبارے پر ستارہ جان کی زوال پذیر حکومت اب بھی اچھے اچھوں کے چھکے چھڑا سکتی تھی۔

"اور ان کی قسمت کا چکر تھا کہ زندگی کی دوسری بڑی خواہش نے انہیں دوبارہ اسی چوبارے کی سیڑھیاں چڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"میں ابھی چلا جاؤں گا۔ آپ مجھے بس خیام کا پتا دے دیں۔ آپ اسے مجھ سے چھین نہیں سکتیں۔ وہ میرا بیٹا ہے اور یہ حقیقت....."

نانی ستارہ سے نگاہ چراتے ہوئے وہ ایک سانس میں جو کچھ کہے جا رہے تھے۔ ایک تلخ ترین باب کو کھولنے کا سبب بن رہا تھا۔

"فیروزہ بھی میری بیٹی تھی یوسف کمال! لاکھوں میں ایک، ہیرے موتیوں میں تولے جانے کے لائق اس کے قدموں کے نیچے دل رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ میرا سب سے قیمتی اثاثہ تھی وہ، جسے تم پوری مکاری سے لے اڑے۔ مفلس کر دیا ہمیں۔ ہماری زندگیوں کا پورا نقشہ بدل گیا فیروزہ کے بعد۔ جلتے انگاروں پر سفر تھا، جو میری تگینہ کے حصے میں آیا، مگر....."

"رہنے دیں اماں!" بے آواز آنسو بہاتی تگینہ نے بے ساختہ ان کی طرف دیکھا۔ "قاتل کے آگے رونے نہیں روئے جاتے۔ چلا کریں اس آدمی کو بس فیروزہ کا ماتم کرنے کے لیے ہم اکیلے ہی کافی ہیں۔"

"وہ اپنی مرضی سے میرے ساتھ گئی تھی نکاح کیا تھا پورے عزت و احترام کے ساتھ میں نے اس سے..... بہت محبت کرتے تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے۔"

"کیسی محبت تھی تمہاری یوسف! جو میری بچی کو جلا کر راکھ کر گئی؟ زندہ لاش کی صورت وہ میرے پاس واپس آ گئی تھی۔ محض گنتی کی سانسیں تھیں اس کے پاس۔ کیا نہیں کیا میں نے اسے بچانے کے لیے، مگر وہ تو زندوں میں تھی ہی نہیں۔ تم سے جدا ہوتے وقت اس کی روح بھی جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی..... ہمارے پاس صرف فیروزہ کا

ماہ آیا تھا سو وہ بھی مختصر سے عرصے میں معدوم ہوا۔ چپ چاپ قبر میں جا لیٹی۔ مٹی کا رزق ہوئی۔"

نانی ستارہ کی خوں رنگ آنکھوں سے آنسو گرے تھے یا لہو کے قطرے۔ ایک ایک لفظ میں ہزار ہا بین کرتی نہیں کراہیں۔

باہر زور و شور سے بارش برساتے بادلوں کا رنگ اور بھی گہرا ہوا تھا۔

کمرے میں اترتے سرمئی اندھیرے میں زندگی صرف اور صرف غم کا عنوان ٹھہری تھی۔

یوسف کمال کے لیے زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے کھڑا رہنا مشکل تر ہوا تھا۔ ٹانگوں میں ہوتی خفیف سی لرزش پر قابو پانے میں ناکام ہوتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل جھکے۔ نانی ستارہ نے دونوں ہاتھ جوڑے گھٹنوں کے بل بیٹھے اس شخص کی طرف محض ایک نگاہ ڈال کر رخ پھیر لیا۔

"چلے جاؤ تم یہاں سے یوسف! تمہاری تسلی کے لیے اتنا بتا دیتی ہوں کہ خیام چار سال پہلے یہاں سے جا چکا ہے۔ اب وہ کہاں ہے، ہمیں نہیں معلوم۔ بس یا کچھ اور؟"

"چلا گیا؟ مگر کیوں؟ آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟" وہ ابھی تک نیچے ہی بیٹھے تھے اور ہاتھ اسی بے بسی کے ساتھ بندھے تھے۔

نانی ستارہ کے چہرے پر آئی مسکراہٹ کی ایک جھلک ہزار ہا آنسوؤں سے کشید کی ہوئی تھی۔

"یہ میری قسمت کا لکھا ہے شاید..... جن جن کو میں نے دل و جان سے چاہا، وہ یوں ہی مجھ سے ہاتھ چھڑا کر فرار ہوئے۔ وہ بھی تو آخر فیروزہ کا ہی بیٹا تھا۔"

باہر برستی بارش کا شور اور بھی بڑھا۔

"آپ نے اسے ڈھونڈا نہیں؟"

"ڈھونڈا انہیں جاتا ہے، جو کھو جائیں۔ ہم نے فیروزہ کو کب تلاش کیا تھا؟ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ قسمت کی مار کھا کر واپس آئی تھی۔"

وہ چند لمحے نانی ستارہ کے چہرے کو تکتے گئے، ایسے جیسے کچھ کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

"وہ بد نصیب بھی تقدیر کی مار کھا رہا ہے۔ پتا نہیں لوٹ بھی سکے گا یا پھر وہیں کہیں ٹھوکروں میں زندگی کی بازی ہار....."

ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی تھی۔ نانی ستارہ کا دل بہت زور سے دھڑکا۔

"تم..... تم نے دیکھا اسے؟ کہاں تھا وہ؟"

اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے بے ساختہ قریب رکھی کرسی کو تھاما تھا۔

"اماں!" تگینہ تیزی سے آگے بڑھی مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے فاصلے پر ہی روک دیا۔

"اب جھوٹ تم بول رہے ہو یوسف! کہاں دیکھا ہو گا تم نے اسے، تم اسے پہچانتے کب ہو؟ کبھی پلٹ کر دیکھا تک نہیں تھا خیام کو، پھر کیسے دعوا کرتے ہو کہ..؟"

"ٹھیک کہتی ہیں آپ، میں نے تو کبھی اسے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا، نہ اسے اور نہ اس کی ماں کو۔ اتنے ناراض ہیں وہ دونوں مجھ سے کہ وہ میرے خواب تک میں آنا گوارا نہیں کرتے مگر..... مگر پھر بھی جب وہ میرے سامنے آیا تو مجھے اسے پہچاننے میں پل بھر کی بھی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی آنکھیں، ان کا سنہرا پن، سب گواہی دیتے ہیں کہ وہ فیروزہ کا بیٹا ہے، ایک کھلا سچ ہے، وہ بذات خود! اور اب وہ کمرے میں لگی تصویر۔"

کمرے میں چند لمحوں کے لیے بڑی بوجھل سی خاموشی اتری۔ نانی ستارہ، تگینہ اور یوسف کمال۔

تینوں کے پاس اب تردید، تصدیق کے لیے کچھ بھی باقی نہیں تھا۔

چلتا ہوں۔" بنا کسی بھی طرف دیکھے، وہ دھیمے لہجے میں کہہ کر دروازے کی طرف مڑے۔
نانی ستارہ نے پیچھے کھڑی نگینہ کے ہاتھ کا دباؤ اپنے کندھے پر محسوس کر کے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
نگینہ کا سر ہلکے سے نفی میں ہلا تھا۔
"نہیں اماں۔۔۔ اب اور نہیں!" ایک خاموش مگر واضح پیغام نگینہ کی آنکھ کے اشارے نے انہیں دیا تھا۔
انہوں نے بے بسی سے کمرے سے نکلتے یوسف کمال کو دیکھا اور پھر چشم تصور میں اسے برآمدے کی آرائشی محرابوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے بھی۔
پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی۔۔۔۔
اور پھر چند لمحوں بعد وہ سیڑھیاں اتر کر اس بھری دنیا میں ایک بار پھر کھو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی خیام کو زندگی میں ایک بار پھر دیکھ لینے امید بھی۔
اس آخری بات کے ساتھ ہی ساری مصلحتیں بالائے طاق ہوئیں۔
"یوسف کمال!" ان کی آواز محرابی برآمدے میں یہاں سے وہاں تک گونج اٹھی۔



آج چوتھا دن تھا اسے یہاں آتے ہوئے۔ یہاں اس گھر میں اسلام صاحب کے ساتھ بیٹھ کر وہ ایک انوکھی خوشی اور سکون بھرے احساس میں مبتلا تھا۔ جتنی محبت اور احترام وہ معاذ کا کرتا تھا اس سے کہیں۔۔۔ کہیں زیادہ وہ اسلام صاحب کا کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ اتنے پیارے انسان تھے کہ۔۔۔۔!
"معاذ بھائی کے والد کو ایسا ہی تو ہونا چاہیے تھا۔"
پہلے ہی دن یہاں سے واپسی پر اس نے خود سے کہا تھا، سو نہ وہ اس گھر پر چھائے سنہرے پن پر حیران ہو سکا اور نہ ہی پرانے فرنیچر سے سجے اس کھلے روشن کمرے کے سکون بھرے احساس پر۔
یہ نیکی اور سچائی کی طاقت تھی، جو منتخب دلوں کے حصے میں آتی ہے اور پھر اطراف کو نور بن کر جگمگاتی ہے۔ سو جہاں کہیں بھی ایسے لوگ ہوں گے وہ جگہ یوں ہی اپنے نور سے نہاتی ہوگی۔ خیام کو پورا یقین ہو چلا تھا۔
اسلام صاحب ابھی کسی کام سے اٹھ کر باہر گئے تھے۔ خیام نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے خود کو خوش قسمتوں میں شمار کیا، جو یہاں اس گھر تک آسکا اور ان بے حد پیارے لوگوں کی زندگی کے کچھ لمحوں میں حصے دار بن پایا۔
باہر تپتے جھلکتے دن سے بالکل مختلف سکون بھری ٹھنڈک گھر کے اندرونی حصے میں پھیلی تھی۔ پچھلے احاطے کی طرف کھلنے والی کھڑکی آج پوری کھلی تھی اور تیز ہوا سے پردہ اڑا جا رہا تھا۔
وہ پردہ ٹھیک کر کے کھڑکی بند کرنے لگا تھا کہ نگاہ بے ارادہ ہی چمپا کے پودے کے قریب کھڑی اس لڑکی پر پڑی۔
بالکل سادہ سے حلیے میں وہ بڑی توجہ سے پودوں میں پانی ڈال رہی تھی۔ تیز ہوا سے اس کے بالوں کی لٹیں ہیر بینڈ سے نکل کر چہرے پر بکھرتی جا رہی تھیں۔ عجیب سی کشش تھی اس میں کہ وہ چند لمحوں کے لیے اسے بے اختیار ہی دیکھے گیا۔ کچھ ایسا تھا جو کیتی کی یاد دلا رہا تھا۔ شاید اس کا چھوٹا پھر وہ غضب کی سادگی اور معصومیت شاید۔۔۔ اس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔
باہر کچھ آہٹ ہوئی تھی۔ وہ چونک کر تیزی سے واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔
"کیا حرکت تھی بھلا؟ کسی کو اس طرح دیکھنا اور وہ بھی اپنے محسن کے گھر آکر۔"
اس نے بے ساختہ خود کو شرم دلانا چاہی مگر دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس طرح شاید اس نے کبھی کسی لڑکی کو

نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو کیتی سے بھی نظر چرا کر ہی چلا تھا اب تک۔ گھر سے نکلتے وقت بھی جب اس نے دل سے التجا بھی کی تھی کہ وہ اسے ایک نظر بھر کر دیکھ لے، وہ دل کی آواز زیر کان دھرے بغیر نکل آیا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ اگر وہ اسے دیکھے گا تو وہاں سے نکلنے کا ہر راستہ خود پر بند پائے گا۔ مگر آج۔۔۔۔!
اس نے میز پر رکھی کتاب یوں ہی خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے اپنے سامنے کھول کر رکھ لی مگر۔۔۔۔
کمرے میں کوئی نہیں آیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اس طرف دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔
چمپا کے جھنڈ کے نیچے اب کوئی نہیں تھا۔ بلکہ اِدھر اُدھر بھی نہیں۔ پانی کا پائپ وہیں زمین پر رکھا تھا۔ خیام کو اپنی مایوسی پر تھوڑی حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ دروازے سے اسلام صاحب اندر آرہے تھے۔
"معاف کرنا۔ خیام بیٹا! مجھے تھوڑی دیر ہوئی!"
"نہیں سر! ایسی کیا بات ہے؟" وہ شرمندہ سا کھڑا ہوا۔
"بیٹھو بیٹھو!" انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "اور یہ تم مجھے سر کیوں کہتے ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے بچوں کی طرح ہو تم بھی بیٹا۔" ان کے لہجے میں بڑی محبت تھی۔
"جی!" خیام نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
وہ ہلکے سے مسکرائے۔ معاذ سے اس کی تنہائی اور غیر معمولی رویہ کے بارے میں جان کر انہیں بے حد دکھ ہوا تھا۔
"پھر میں آپ کو کیا کہا کروں؟" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔
"بھئی جیسے معاذ ابا کہتا ہے، تم بھی ابا ہی کہا کرو، مجھے بہت خوشی ہوگی۔" ان کے سرسری سے انداز میں کہی بات نے خیام کو چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش کر دیا تھا۔ اسلام صاحب دانستہ اپنے سامنے رکھی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف ہوئے۔
"میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ کو اتنے محترم رشتے سے پکاروں۔" اس کی نگاہ جھکی ہوئی تھی اور لہجے میں اعتراف جرم کی سی کیفیت۔
"تم کسی قابل ہو یا نہیں ہو، یہ فیصلہ دنیا کو کرنے دو، وہی بہتر فیصلہ کرتی ہے۔ ہم تم اپنے بارے میں کبھی ٹھیک دعوا نہیں کر سکتے ہیں بیٹا!"
"مگر انسان کے لیے اپنی اوقات کو یاد رکھنا بھی ضروری ہے سر! ورنہ وہ کہیں کا نہیں رہتا ہے۔" خیام کا سر کچھ اور بھی جھکا تھا۔
اسلام صاحب کا دل دکھ سے بھرنے لگا۔ "کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکیں۔" انہوں نے بہت دل سے خواہش کی۔
"ایسا مت سوچا کرو خیام! کسی کے پاس محض چند پیسے زیادہ یا کم ہو جانے سے کسی کی اوقات طے نہیں ہوتی۔ خدا نے سب کو برابر پیدا کیا ہے۔" شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے اس کی تلخی کو کم کرنا چاہا۔ مگر یہ دو چار دن کی دین نہیں تھی۔ عمر بھر کا قصہ تھی۔
"کہاں برابر پیدا کیا ہے خدا نے۔ بنگلوں محلوں میں پیدا ہونے والے کا کچرے کے ڈھیر میں پیدا ہونے والے سے کیا مقابلہ ہے سر! اصل میں آپ اور معاذ بھائی دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔"
اس بار اس نے اسلام صاحب کی طرف دیکھ کر بات کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی گہری اداسی تھی کہ وہ مشکل ہی خود کو سنبھال پائے۔
"میں پھر اپنی بات دہراؤں گا خیام! کوئی کہیں بھی پیدا ہو، خدا کے نزدیک ہر انسان برابر ہے۔ یہ طبقاتی فرق تو اس

دنیا کے نظام کا حصہ ہے بیٹا! اس کی اتنی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ بس خدا کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرتے رہو۔ وہ بڑا مہربان ہے' کسی کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتا' سارا فخر' سارا غرور اسی کو زیبا ہے۔"

خلوص دل سے کہے گئے الفاظ کی اثر انگیزی غضب کی تھی۔

"یہی ہیں وہ جن کے آگے وہ اپنے دل کا سارا بوجھ اتار سکتا ہے۔" خیام کے دل نے اپنی ساری زندگی میں پہلی بار پوری شدت سے اس طرح آرزو کی۔ وہ ایک بار تو پورا کا پورا کانپ اٹھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری!" اسلام صاحب نے اسے فکر مندی سے دیکھا۔

خیام کے ہونٹوں کی ہلکی سی لرزش اور چہرے پر آتا پسینہ۔ وہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"خیام بیٹا!" اسلام صاحب نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر خود سے قریب کیا۔

"جی! میں ٹھیک ہوں۔" چہرے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے بمشکل مسکرایا۔

"بس چلتا ہوں۔" اس نے مڑ کر میز پر سے کتابیں اٹھائیں۔

اسلام صاحب اسے روکنا چاہ رہے تھے۔ ان کے خیال میں وہ ٹھیک نہیں تھا' لیکن وہ خود پر کمال ضبط کا مظاہرہ کیے گیا۔

"باہر دھوپ ہے' آپ تکلیف مت کریں۔" جب وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے گھر کے بیرونی احاطے کی طرف آرہے تھے' تب خیام نے انہیں منع بھی کرنا چاہا۔

"میں اتنا بھی بوڑھا نہیں ہو گیا ہوں کہ چار قدم چل کر تھک جاؤں گا۔ معاذ بھی ہر وقت یہی ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے کہ میں اب زیادہ کام کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں اور اب تم بھی۔" انہوں نے دانستہ خوش دلی سے ناراضی جتائی۔ اس بار خیام کی مسکراہٹ بھی بے ساختہ تھی۔

"معاذ بھائی کی تو کیا بات ہے' ان جیسا کون ہوگا۔" معاذ سے اس کی محبت' عقیدت میں بدلنے لگی تھی۔ ابا خوش ہونے کے بجائے سنجیدہ سے ہوئے۔ خیام ان کو رکتا دیکھ کر فوراً" ہی خود بھی رکا۔

"معاذ جیسے ہزاروں لاکھوں ہوں گے اس ملک میں خیام! یہ میرا یقین ہے' اور وہ جہاں بھی ہیں' اپنے حصے کا کام کر رہے ہوں گے۔ معاذ سے بھی کہیں زیادہ بہتر طریقے سے اور میری دعا ہے کہ آنے والے دنوں میں تم بھی معاذ سے کہیں آگے نکل جاؤ۔ نیکی کا چھوٹے سے چھوٹا موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا بیٹا! کیونکہ نیکی صرف نیکی ہوتی ہے' چھوٹی یا بڑی نہیں۔ اس راہ میں سبقت لے جانے کی توفیق تمہیں ضرور اللہ کی طرف سے ملے گی۔"

ایک بھاری ذمہ داری انہوں نے پورے یقین کے ساتھ اسے سونپی۔ خیام نے ایک گہری سانس لی۔ اندر پھیلی تپش پر سکون کا ٹھنڈا سا احساس محیط ہونے لگا۔

"ان شاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔۔۔ ابا!" اپنے الفاظ پر وہ اب حیران بھی نہیں ہوا۔ ذات کی تبدیلی کا عمل اب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

"ان شاءاللہ!" انہوں نے اسے بہت محبت سے گلے لگایا اور جب وہ ان سے الگ ہوا تو اس بار اس کی آنکھوں میں دکھ کے نہیں' خوشی کے آنسو تھے' جنہیں صاف کرتے ہوئے وہ جھینپا نہیں' مسکرایا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گا' جب بھی وقت ملے آجانا۔" جب وہ بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا' تب انہوں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا ابا! بہت ساری باتیں کرنی ہیں مجھے آپ سے۔"

اس نے پورے اعتماد سے کہا اور خدا حافظ کہہ کر بائیک اسٹارٹ کرکے گیٹ سے نکلتا چلا گیا' تب ہی وہ اسے

ایک بار پھر اچانک سامنے نظر آئی۔ کسی دوسری لڑکی کے ساتھ وہ گھر میں واپس داخل ہو رہی تھی۔ شاید کسی قریبی اسٹور تک کچھ لینے گئی تھی۔

خیام نے اگر فوراً" ہی بریک نہ لگائے ہوتے تو شاید وہ اس کی زد میں آجاتی۔

"معاف کیجیے گا!" خیام نے گھبرائی ہوئی آواز میں اسے کہتے ہوئے سنا۔

"غلطی تو میری ہے' مجھے دیکھنا چاہیے تھا۔ چوٹ تو نہیں لگی؟"

جواباً" اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر پھیلی شرم اور گھبراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ لڑکوں سے زیادہ بات کرنے کی عادی بھی نہیں ہے۔

"ویسے آپ نے بڑے وقت پر بریک لگائی' ورنہ ربیعہ باجی تو گئی تھیں کام سے۔۔۔" ساتھ والی لڑکی نے بڑا بے تکلفی بھرا تبصرہ کیا۔

"ربیعہ!" خیام نے زیر لب دہرایا۔ "یہ نام بہت جانا پہچانا تھا۔" اتنے دنوں میں وہ جان چکا تھا کہ ربیعہ' معاذ کی بہن کا نام ہے۔ جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہے۔ اس بار خیام کی نگاہ احتراماً" جھکی۔

"چلو نا' اب کیا یہیں کھڑی رہو گی زری!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر تقریباً" کھینچتی ہوئی اندر چلی آئی۔

"اتنا بے تکا کیوں بولتی ہو تم' اچھا لگتا ہے کیا باہر کھڑے ہو کر اس طرح کسی سے بحث کرنا!"

"میں نے بحث نہیں کی' میں تو اس کی تعریف کی تھی۔۔۔ بے چارے نے کیسے پھرتی سے آپ کو بچایا!"

"اللہ بچاتا ہے!" ربیعہ نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔

"ہاں' مگر ذریعہ تو بندوں کو ہی بناتا ہے' جیسے مجھے دارالامان جانے سے بچانے کے لیے معاذ ذریعہ بنے۔ ویسے یہ لڑکا مجھے بہت دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا۔ شاید ادھر ہمارے پرانے محلے میں۔۔۔" زری کی نگاہوں میں الجھن تھی۔ وہ دونوں احاطہ پار کرکے برآمدے کی سیڑھیوں کے نیچے آکر رکی تھیں۔

"آپ کو نام پتا ہے اس کا؟" وہ ربیعہ سے پوچھ رہی تھی۔

"ان کا نام خیام ہے' معاذ کے اسکول میں ہی پڑھاتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔"

"خیام۔۔۔!" زری نے نام دہراتے ہوئے یاد کرنا چاہا۔ "خیام' خیام۔۔۔ ارے یہ تو وہی لڑکا ہے' جو خالہ بتول کے ساجد کے پاس ایک آدھ بار آیا تھا' تب ہی میں نے اسے دیکھا تھا۔۔۔ ویسے ہے کتنا خوبصورت' ہے نا؟"

زری نے اپنی الجھن مٹاتے مٹاتے ربیعہ سے رائے طلب کی۔

"پتا نہیں۔ میں نے بہت غور سے نہیں دیکھا۔" وہ کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"کیسے نہیں دیکھا' باہر اتنی دیر تو کھڑے ہو کر بات کی ہے۔" زری پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"دماغ خراب ہے تمہارا زری! کیا بات کی ہے میں نے' شاید ایک منٹ بھی نہیں لگا ہوگا۔" ربیعہ نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کسی کو دیکھنے کے لیے تو ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے' آپ کو تو اچھا خاصا ٹائم ملا تھا۔" وہ اسے چھیڑنے پر تلی تھی' سو بحث سے پرہیز بہتر تھا۔

"میری بات غور سے سنو زری! اپنی زبان اور سوچ دونوں ہی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرو۔ بھابھی آرہی ہیں چند دن میں۔ تمہاری' یہ لڑکوں وڑکوں کی باتیں انہوں نے سن لیں تو پتا نہیں۔۔۔"

بات دانستہ ادھوری چھوڑ کر ربیعہ آگے بڑھ گئی تھی۔

"بھابھی۔۔۔ ہونہہ!" زری نے منہ بنا کر کہا جیسے کوئی کڑوی شے نگلی تھی۔

☆ ☆ ☆

کورٹ کے پرہجوم احاطے سے بمشکل راستہ بناتی، وہ فریدالدین تک پہنچی تھی۔

"ارے آپ... میں تو صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ اسے دیکھ کر کھل سا گیا۔ "دو بار فون بھی کیا مسلمان کو بھی اور آپ کی بڑی بہن بھابھی گل کو بھی... انہوں نے بتایا کہ آپ خاصی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہیں خیریت تو تھی نا؟" وہ کسی قریبی عزیز کی طرح اپنی فکر کا اظہار کر رہا تھا۔ جویا کو اس کے الفاظ اور لہجہ دونوں ہی سے سخت کوفت ہوئی تھی۔

"راستہ خاصا لمبا ہے وکیل صاحب! اور ٹریفک کا مسئلہ بھی۔ آپ بتائیں کیس کس وقت چلے گا۔"

"کیس تو نہیں چلے گا آج، میں نے اگلی تاریخ لے لی ہے۔ تقریباً بیس بائیس دن کے بعد کی۔"

"کیا؟" جویا کو اپنی ساری ہمت رخصت ہوتی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے تو اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔

"میں نے سوچا ہے کہ اگلی پیشی تک ہمیں زیادہ وقت مل جائے گا، میں نے کچھ لوگوں سے بات کی ہے اس بارے میں۔" وہ ایک لاحاصل سی تفصیل سنا رہا تھا۔ جویا نے مایوسی سے سر جھکا لیا تھا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا... میں آپ کے لیے ٹھنڈا منگواتا ہوں۔ گرمی بھی تو بہت ہے۔" وہ مہمان نوازی برتنے لگا، مگر جویا نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں، میں چلوں گی۔ اگر آپ پہلے ہی بتا دیتے کہ آپ یہ کرنے والے ہیں تو میں آنے سے بچ جاتی۔"

اسے آج کی چھٹی ضائع ہونے کا بھی رنج تھا اور اس سے کہیں زیادہ اظہار صاحب سے نہ مل پانے کا اور اس سے بھی زیادہ اس کیس میں کوئی بھی مثبت پیش رفت نہ ہونے کا۔

"ارے! ایسے کیسے جا سکتی ہیں آپ، تھوڑی دیر تو رکنا ہی پڑے گا آپ کو۔ مجھے آپ سے کچھ تفصیلات ڈسکس کرنی ہیں۔"

جویا نے سوالیہ نگاہوں سے فریدالدین کی طرف دیکھا۔

وہ بڑے اشتیاق سے اسی پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ آنکھوں کا گدلا پن، ہونٹوں پر چھاتی سی مسکراہٹ، سب ہی کچھ اتنا نمایاں کہ... وہ سمٹ سی گئی۔

"مسلمان بھائی آ کر آپ سے بات کریں گے، مجھے جلدی ہے۔"

اپنے گرد لپٹی چادر کو اور بھی مضبوطی سے تھام کر وہ جانے کے لیے مڑی، مگر وہ بڑی پھرتی سے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"مسلمان کو فرصت کب ملتی ہے۔ وہ نہیں آئے گا۔ یہ تو آپ مجھ سے لکھوالیں۔ یہ سب کچھ تو آپ ہی کو دیکھنا ہوگا مس جویا!" بات سچ تھی مگر پتا نہیں، جویا کو کیوں ایسا لگا جیسے وہ اسے اس کی حیثیت جتا رہا ہے۔

"مجھے پتا ہے کہ آپ بہت باہمت ہیں، ساری ذمہ داری آپ نے ہی اٹھا رکھی ہے۔ بھابھی گل آپ کی بہت تعریف کرتی ہیں۔"

فریدالدین کی بات ختم نہیں ہوئی تھی، مگر وہ کچھ سننے کی خواہش مند نہیں تھی۔

"مجھے راستہ دیجیے پلیز!"

"لگتا ہے آپ ناراض ہو گئیں۔" جویا کے سخت لہجے نے اسے تھوڑا سا پریشان کیا تھا۔ جویا اس کے قریب سے نکلتی چلی گئی۔ کوریڈور میں ہونے والے رش نے اسے تیزی سے آگے بڑھنے کی آسانی فراہم نہیں کی تھی۔

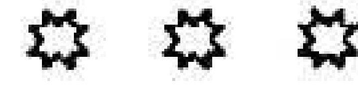
فریدالدین چند کاغذ اٹھائے اگلے چند لمحوں میں پھر اس کے اعصاب کا امتحان لینے کے لیے آ چکا تھا۔

"یہ کچھ فوٹو کاپیز کروا کر رکھی تھیں میں نے آپ کے لیے، آپ اپنے پاس رکھیے انہیں، کام کی ہیں۔" اس بار اس نے ذرا پروفیشنل سا انداز اختیار کیا۔ کیس کے سلسلے کے کچھ کاغذات تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی جویا کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھانا پڑا۔

"آپ بالکل فکر مت کریں، میں آپ کے والد کی رہائی کی پوری ذمہ داری لیتا ہوں۔" کاغذ اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ جب کہہ رہا تھا تو جویا نے اپنے ہاتھ پر اس کی انگلیاں سرسراتی محسوس کی تھیں۔

شاید نادانستہ...! اس نے اپنے کانپتے ہوئے دل کو سہارا دینے کے لیے حرف تسلی ڈھونڈا تھا۔

فریدالدین کی نگاہ اس وقت تک جویا پر جمی رہی، جب تک وہ اس کی نظروں سے غائب نہ ہوئی۔



نگینہ نے بڑی آہستگی سے آگے بڑھ کر نانی ستارہ کا ماتھا چھوا۔ بخار کا زور ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا، مگر وہ پھر بھی بڑی فکرمندی سے ان کے چہرے کو دیکھے گئی۔

دواؤں کے زیر اثر وہ اس وقت گہری نیند میں تھیں۔ نگینہ دبے قدموں کمرے سے باہر نکل آئی، تب ہی اسے برآمدے کے آخری سرے سے گلناز آتی دکھائی دی۔

گلناز کو زور سے ہنسنے اور زور سے ہی بولنے کی عادت تھی۔ یہاں تک آتی تو ضرور ہی نانی کے آرام میں مخل ہوتی۔ سو وہ تیزی سے خود ہی آگے بڑھ گئی۔

"سو کام پڑے ہیں آج کل، تجھے تو پتا ہی ہے نگینہ! پر خالہ ستارہ کی فکر ایسی دل کو لگی کہ کہیں دل نہیں لگ رہا۔" وہ دور سے ہی بولتی ہوئی آ رہی تھی۔ جب سے نانی بیمار ہوئی تھیں وہ دن میں کئی چکر لگا رہی تھی اور اس کے اس خلوص پر نگینہ کو ذرا بھی شبہ نہیں تھا۔

"اماں سو رہی ہیں گلناز! چل ہم اس طرف بیٹھتے ہیں۔" نگینہ اسے لیے پچھلے صحن میں بنی سہ دری میں آ بیٹھی۔

"بس پانچ دس منٹ ہی بیٹھوں گی۔ یہ بتا ڈاکٹر نے کیا کہا خالہ کی طبیعت کے بارے میں، یہ اچانک ہی اتنا تیز بخار... ان کے تو کبھی سر میں بھی درد نہیں ہوتا تھا ماشاءاللہ۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

کچھ جھجکتے ہوئے گلناز نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"دیکھ! بہن ہوں تیری اور خالہ ماں کی جگہ ہیں بلکہ میرے لیے تو ماں سے بھی زیادہ، مجھ سے مت چھپا نگینہ دیکھ، بتا خالہ کو کیا ٹینشن ہوئی ہے؟"

نگینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ جس فکرمندی اور اپنائیت سے پوچھ رہی تھی، اسے نظرانداز کرنا آسان نہیں تھا۔ نگینہ نے بڑی صفائی سے نگاہ چرائی۔

"بتایا تو تھا تجھے، ٹھنڈ لگی ہے اماں کو، پچھلے ہفتے سے بارش بھی تو کتنی پڑی ہے، اوپر سے شامانے دال بھرے پراٹھے پکا لیے۔ ان کے ساتھ آم اور لیموں کا اچار، فوراً ہی گلا پکڑ لیا۔ اب اس عمر میں کہاں برداشت ہو سکتی ہیں یہ سب چیزیں۔" نانی کی بیماری کے بارے میں وہ اپنے گزشتہ بیان پر ہی قائم رہی۔ گلناز کو مایوسی ہوئی۔

"خالہ نے تو اچار کبھی منہ میں نہیں رکھا تھا۔ ہم لوگوں پر بھی کتنا خفا ہوا کرتی تھیں... یاد ہے۔"

"انسان ہیں، کبھی تو دل چاہ ہی جاتا ہے۔" نگینہ نے بات دانستہ بدلنی چاہی۔ "تو سنا، کچھ بات بڑھی الماس کی، کیا کہہ رہا ہے وہ، شادی کرے گا یا پھر...؟"

گلناز نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ابھی تو شادی کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی، دو چار دن ہی ہوئے ہیں آتے ہوئے، لیکن اس بار میں اس کی واپسی سے پہلے کوئی فیصلہ کرواؤں گی، یہ تو میں نے سوچ لیا ہے۔ ویسے تحفے تحائف تو بہت دیے ہیں الماس کو اس نے، پہلے سے بھی زیادہ۔"

گلناز کے لہجے میں امید اور بے یقینی کے درمیان والی کیفیت تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو نگینہ بہت دلچسپی سے اسے کوئی مشورہ دے سکتی تھی، مگر آج کل ہر بات سے دل اٹھا ہوا تھا۔ یوں ہی چپ چاپ بیٹھی رہی۔ گلناز نے بھی اس کی بے دلی کو بخوبی نوٹ کیا تھا، سو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر کسی وقت آؤں گی، اس وقت تو مجھے بھی جلدی ہے اور تو بھی خالہ کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہے۔ خدا کرے، وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔" وہ گلے مل کر رخصت ہونے لگی تھی۔ تب ہی کچھ یاد آیا۔

"گیتی کا فون آئے تو میری دعا پیار کہنا اسے، کہنا بھی خالہ کو بھی یاد کر لیا کرے۔" نگینہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

شاما چائے لے کر آئی تو وہ وہیں سہ دری کے تخت پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"باجی گلناز چلی بھی گئیں؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

"ہوں! جلدی تھی اسے۔"

"ظاہر ہے، جلدی تو ہوگی ہی۔ بچے گاڑیاں جو آنا شروع ہو گئی ہیں۔" شاما کی دی ہوئی اطلاع میں مسالا تھا مگر بہت سی باتیں وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی ختم کر رہی تھیں۔

"اماں کو پوچھنے آئی تھی بے چاری، بڑی فکر مند ہے ان کے لیے۔" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے نگینہ نے دھیرے سے اتنا ہی کہا۔

"نانی نے بستر بھی تو ایک دم پکڑ لیا ہے باجی! کبھی ایسی بیمار نہیں پڑی تھیں۔ مجھے تو لگتا ہے نظر ہوئی ہے انہیں، میں تو سوچ رہی ہوں کہ آج جا کر اتار کرنے والی کو لے کر آؤں۔ ساری رونق ان ہی کے دم سے ہے ہمارے گھر میں تو۔"

"مقام شکر تھا کہ ان کے ہاں محبتوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔" گھونٹ گھونٹ لے کر چائے پیتی نگینہ کا دل بھر آنے لگا۔

صندل اٹھ گئی۔ اپنی جذباتیت پر آج کل وہ بار بار قابو پا رہی تھی۔ نانی ستارہ کی بیماری نے پچھلے دنوں میں ہونے والے سارے اچھے برے واقعات میں سب سے زیادہ اس کے دل کو دکھایا تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ نانی ایک دم ہی کیوں...؟"

"جا۔ تو جا کر صندل کو دیکھ، اسے کسی شے کی ضرورت نہ ہو۔" بے ساختہ بات کاٹتے ہوئے نگینہ کی آواز قدرے اونچی ہوئی تھی۔

شاما نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ نگینہ کی بد مزاجی، پھٹکار، بد زبانی، سب ہی کی وہ عادی تھی، مگر یہ رنگ اجنبیت۔

کچھ تو ہے، جو باجی نگینہ اور نانی دونوں کو پریشان کیے ہوئے ہے اور وہ بھی اتنا کہ۔ زندگی میں پہلی بار اسے نگینہ تک پہنچنا از حد مشکل لگا تھا۔ سہ دری سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر نگینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی سر جھکائے وہیں تخت کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔

"پتا نہیں کیا۔ جو مجھ سے بھی چھپایا باجی نے۔" تخت کے کنارے بیٹھی نگینہ نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر اپنی یخ ہوتی ہتھیلیاں رکھیں۔

کتنی راتوں سے وہ جاگ رہی تھی۔ نانی کی بیماری کے ان دنوں میں وہ بڑے بڑے پریشر میں آئی تھی۔ پاؤں تلے انگارے لیے چلتے ہوئے جو سفر اس نے کاٹا تھا۔۔۔ اس کی ساری ہمت اور طاقت نانی ستارہ سے ہی مستعار لی ہوئی تھی۔ وہی تھیں، جن کی موجودگی کا احساس بڑا ہی عافیت بھرا تھا۔

"اور جو خدا نہ کرے اماں کو کچھ۔۔۔" وہ کسی چھوٹی سی بچی کی طرح خوف زدہ ہوئی۔

"بڑا غرق ہو اس یوسف کمال کا، معلوم نہیں کہاں سے آ گیا ہماری زندگی میں، اتنے برسوں ہی کے بعد، سمجھے لوگ مرے ہوں گے اتنے سالوں میں، یہ بھی کہیں مرکھپ جاتا تو پھر یوں زخم ہرے کرنے تو نہ آتا اور ساتھ میں بلا یا بھی تو اس منحوس خیام کی خبر۔ ہماری بلا سے کہیں دھکے کھائے، آ جائے کسی گاڑی کے۔۔۔"

ہفتے سے اوپر ہونے کو آیا تھا مگر کڑواہٹ تھی کہ کم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی، شاید اس لیے بھی کہ وہ اسے اب تک کسی کے بھی ساتھ شیئر نہیں کر پائی تھی۔ نانی ستارہ نے سختی سے منع کیا تھا کہ یوسف کمال کی آمد کا ذکر کسی سے بھی نہ ہو، شاما تک سے نہیں۔ سو اس سنسان دوپہر میں آیا یوسف کمال اب تک کسی بریکنگ نیوز کی طرح نشر نہیں ہو سکا تھا۔

"نانی اٹھ گئی ہیں، آپ کو بلا رہی ہیں۔"

شاما نے دور سے ہی پکار کر اسے اطلاع دی تو وہ فوراً ہی اٹھ کر تیز قدموں سے برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

نانی ستارہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھیں، نگینہ کو آتا دیکھ کر ہلکے سے مسکرائیں۔

"اب کیسی طبیعت ہے اماں؟" وہ کہتی ہوئی ان کے پاس آ کر بیٹھی۔

"ٹھیک ہوں، شکر ہے خدا کا، یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا نگینہ! مجھے تو تم بیمار لگ رہی ہو۔"

بیماری کی نقاہت ان کے لہجے میں نمایاں تھی، مگر لہجے میں مخصوص سکون اور مضبوطی۔

نگینہ کو بخوبی اندازہ تھا کہ ان پریشانی بھرے دنوں میں وہ کتنی خستہ حال دکھائی دے رہی ہوگی مگر اپنی طرف دیکھنے کا ہوش ہی کسے تھا۔

ان کے اطمینان کے لیے وہ مسکرائی۔ "بس ایسے ہی اماں! اصل میں آپ بیمار تھیں تو بس دل ہی نہیں چاہا کسی بات کو۔" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

نانی نے بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ سر جھکائے پلکیں جھپک جھپک کر جس طرح وہ اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک رہی تھی، وہ انداز بڑا دل چھو لینے والا تھا۔

"پاگل ہوئی ہے کیا، میری بیماری پر اس طرح ہوش حواس گم کرے گی تو جب میں مروں گی تب۔۔۔"

"نہیں اماں! نہیں، بس۔۔۔" ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ بے اختیار ہی نانی ستارہ کے گلے لگ کر روئی تھی۔

نگینہ کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی نانی ستارہ نے چند منٹ دانستہ اسے رونے دیا۔ "تو تو میری باہمت اور بڑے حوصلے والی بیٹی ہے نگینہ! سارے گھر کو سنبھال کر چلنے والی۔ میرا فخر، میرا مان، سب ہی کچھ تو ہے۔" نگینہ کی ہچکیاں ہلکے ہلکے کم ہوتی گئیں۔ شاما نے خاموشی سے سائیڈ ٹیبل پر لا کر پانی کا گلاس رکھا اور واپس پلٹ گئی۔

"میں اب ٹھیک ہوں، سچ کہہ رہی ہوں، سو تم بھی خود کو سنبھالو، سمجھیں۔"

جب پانی کا گلاس ختم کر کے اپنی آنکھیں خشک کر چکی تو وہ کہنا شروع ہوئیں۔ "دس مسئلے ہیں تمہاری توجہ کے منتظر۔ یہ بیماری آزاری تو چلتی رہتی ہے انسان کے ساتھ، اب ہم گناہ گار بندے اتنے بھی مضبوط نہیں کہ ساری عمر ہمیں یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں نہ ستائیں، ہم تو بہت کمزور لوگ ہیں نگینہ۔۔۔"

وہ سعادت مندی سے سر جھکائے سنے گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ، گیتی کو تو میری بیماری کی اطلاع نہیں کی تھی نا؟"

"نہیں، آپ نے منع جو کر دیا تھا۔"

"بہت اچھا کیا، یہاں کی ذرا ذرا سی باتوں کی وہاں اطلاع دینا مناسب ہے بھی نہیں۔ گیتی آنے کی ضد کرتی، پتا نہیں سالار کے لیے بھی ابھی اسے لانا آسان بھی ہو تا یا نہیں۔"

"جی۔"

"اور یوسف کے آنے کا بھی۔۔۔ کسی کو بتایا تو نہیں نا تم نے؟" ان کے لہجے میں پھر سے اضطراب تھا۔

"مت نام لیں اس کمینے کا' پتا نہیں کہاں سے آمرا۔ وہی بیمار ڈال کر گیا ہے آپ کو' پہلے ہمارے گھر کو آگ لگا چکا ہے' اب پھر رخ کیا ہے یہاں کا' اگلی بار آیا تو ہاتھ پاؤں تڑوا کر گلی سے باہر پھینکوا دوں گی۔" وہ تلملا ہی تو گئی۔

"میں نے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔"

"نہیں! مگر میں صاف کہہ رہی ہوں کہ آئندہ اسے یہاں نہیں گھسنے دوں گی اور نہ ہی اس بدبخت خیام کو۔ اگر وہ کبھی آیا۔" نانی کی طبیعت سنبھلنے کے ساتھ ہی نگینہ کی ساری کڑواہٹ اس کے لہجے اور الفاظ دونوں میں گھلنے لگی تھی۔ نانی ستارہ نے تاسف سے اس کی طرف دیکھا۔

"بتا تو گیا ہے اس کا باپ کہ وہ دیکھ چکا ہے اسے وہاں سڑکوں پر رلتے ہوئے' کہاں بھٹک رہا ہوگا' کیسے کیسے عذاب سہ چکا ہوگا' بھانجا ہے تمہارا نگینہ! ایمان داری سے کہو کہ دل نہیں دکھتا کیا؟"

"نہیں! میرا نہیں دکھتا' یوسف اور فیروزہ جیسے خود غرضوں کی اولاد ہے خیام' اس کے ساتھ جو بھی ہو' وہ کم ہے۔"

وہی زہر بھری کڑواہٹ' وہی سخت دل۔۔۔ نگینہ نانی ستارہ کی بیماری ویماری سب کچھ بھولنے لگی۔ "اور اماں' اتنے سال بعد اگر یوسف نے اسے برے حالوں میں دیکھا ہے تو یہ قدرت کی سزا ہے۔ اب اسے اپنے بنگلوں' گاڑیوں میں ایک پل کا بھی چین نصیب نہیں ہوگا' میں تو دعا کرتی ہوں کہ ساری عمر اسے خیام نہ ملے' پاگل دیوانہ ہو کر مرے ہماری طرف سے۔"

نانی ستارہ نے بے ساختہ اپنے ماتھے کو چھوا۔ "تو نہیں بدلے گی نگینہ! قدرت کا اپنا حساب کتاب ہے' جب یہ سمجھتی ہے پھر کیوں اپنی رائے' اپنی بددعا مسلط کر رہی ہے' خیر کے الفاظ منہ سے نکالا کر۔"

"تو آپ کیوں گئی تھیں اس یوسف کے پیچھے کہ خیام مل جائے تو وہ اسے آپ کے پاس لے کر آئے۔ کیا ضرورت تھی خود کو کمزور دکھانے کی۔"

ہفتہ بھر سے دل میں پن کی طرح چبھی بات گلے کی صورت نگینہ کے لبوں پر آئی۔

"میں اسے ایک بار دیکھنا چاہتی ہوں نگینہ! گلے لگا کر پیار کرنا چاہتی ہوں' پھر چاہے وہ کبھی نہ آئے۔ رہے اپنے باپ کے پاس خوش و خرم' میری فیروزہ کی روح کو چین آجائے گا بس۔"

ان کے چہرے پر خیام اور فیروزہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے جیسی محبت بھری چمک پھیلتی تھی' نگینہ کو ہمیشہ ہی منہ چڑاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

"مری ہوئی فیروزہ کی روح کی بھی فکر اور میں جس نے اپنی ہڈیاں گھلا ڈالیں میرے لیے۔ بس پیار بھری تھپکی؟"

اگر نانی ستارہ کی بیماری کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ شاید فوراً" ہی الجھن جتا بھی دیتی مگر تب ہی صندل کمرے میں چلی آئی۔

"کیسی ہیں آپ نانی!" وہ سیدھی ان کے گلے آ کر لگی۔ نانی ستارہ نے بڑی محبت سے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔

صندل آج بہتر موڈ اور بہتر حلیے میں تھی۔ نانی اور نگینہ دونوں ہی کو اچھا لگا تھا۔

"آج صبح ہی مجھے پتا چلا ہے کہ بالی نے اس نئی لڑکی کو اپنے دونوں پروجیکٹ سے الگ کر دیا ہے اور اب وہ مجھے ہی سائن کرنے والے ہیں۔" وہ کسی ٹیلیفونک خوش خبری کی اطلاع نانی کو دیتے ہوئے بڑی مطمئن محسوس ہو رہی تھی۔

خبر اچھی تھی' لیکن نامکمل اور غیر مصدقہ!

"کس نے بتایا تمہیں؟" الجھن بھرے انداز میں نگینہ نے صندل کی طرف دیکھا۔ "لوگ یوں ہی اڑاتے بھی ہیں۔"

"مخالف کیمپ سے ہی خبر آئی ہے۔ میں وہاں میرے بھی کچھ خیر خواہ' آپ ہر وقت یوں ہی شک مت کرتی رہا کریں ہر ایک پر۔ ایک مقام ہے میرا انڈسٹری میں' مجھ سے مذاق کی ہمت بہرحال نہیں ہے کسی میں۔"

صندل کا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ نگینہ کی آنکھوں میں ابھی بھی الجھن باقی تھی۔

"یہاں کوئی کسی کا خیر خواہ نہیں ہے۔ یہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی کیا تمہارے؟"

صندل نے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ کے اشارے سے نگینہ کی بات کو رد کیا۔ خود نانی ستارہ کو بھی اس کا انداز اچھا نہیں لگا۔

"ماں کی بات کو سنجیدگی سے لو صندل! اس کا تجربہ انڈسٹری کے بارے میں تم سے کہیں زیادہ ہے بلکہ تمہارے خیر خواہوں سے بھی کہیں زیادہ۔"

نگینہ نے تشکر بھری نگاہ سے نانی ستارہ کو دیکھا لیکن نمبرون کی دعوے دار کے لیے فی الوقت کوئی نصیحت کارگر نہیں تھی۔

اس کے چہرے سے وہ طنزیہ سی مسکراہٹ بھی غائب ہوئی۔

"زمانہ بہت بدل گیا ہے نانی! اور امی بے چاری کا تو کیا تجربہ۔ ساری زندگی ایکسٹراز میں دھکے کھاتے گروپ ڈانس کی آخری لائن میں کھڑے ہوتے کے لیے بھی منتیں' خوشامدیں' ہیروئن کے انتظار میں گھنٹوں سوکھنا' ان کا تجربہ تو یوں ہی ڈرا سہما' وسوسوں سے بھرا ہی ہوتا ہے نا۔ مگر یہاں تو شکر ہے کہ پہلی فلم ہی سپرہٹ ہوئی ہے نمبرون ہیروئن تسلیم کیا گیا اور۔۔۔"

"ہاں! لیکن اس غریب' کم او قات ماں کی جوتیوں کے صدقے سے۔" نانی ستارہ کے انداز میں بڑی ہی تکلیف دہ چبھن تھی۔ صندل کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔

"شاما' شاما!" مزید کچھ اور کہے بنا نانی ستارہ نے شاما کو آواز دی تھی' آج ان کی آواز میں آیا بدلاؤ' شاما کو بھی سرپٹ دوڑا کر لایا تھا۔

"جی نانی!"

"وہ لفافہ صندل کو دے دو' جو چند دن پہلے بالی کا ڈرائیور دے کر گیا تھا۔"

"کیسا لفافہ اماں! مجھے تو کچھ نہیں بتایا تھا آپ نے۔"

شاما کو نانی کی الماری کی طرف مڑتا دیکھ کر نگینہ نے حیرت سے نانی ستارہ سے پوچھا۔ وہ جواباً" خاموش ہی رہیں۔ ان کے اشارے پر ہی وہ لفافہ' صندل کو پکڑا کر شاما خاموشی سے باہر نکل گئی۔

نگینہ بے تابی سے صندل کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کوٹھی پر بقایا قرضہ کے کاغذات' ملازمین کی بقایا تنخواہیں' پلس وہ رقم جو صندل کے اخراجات کی مد میں صندل کی طرف نکل رہی تھی اور منسوخ شدہ کانٹریکٹ۔

صندل کے چہرے پر آنسوؤں کی باریک سی لکیر پھیل رہی تھی' ایک بار پھر پاؤں تلے سے سیڑھی کھسکنے کا تکلیف دہ تجربہ۔

نگینہ کا دل بری طرح دکھا۔ "کیا تھا جو اماں' یہ سب صندل سے چھپا لیتیں۔" صندل کی ساری نافرمانی اور بدتمیزی کو یکسر بھلا کر اس نے شکایت بھری نگاہ ماں پر ڈالی۔

"زندگی بالی کی فلموں سے کہیں آگے نکلنے والی شے ہے۔ میں نے صرف تمہاری دل شکنی کے خیال سے نہیں

بتانا چاہا تھا، مگر اب چھپانا بھی بے سود تھا۔"

نائی ستارہ، صندل سے مخاطب تھیں۔ "سب سے پہلے اپنے پاؤں زمین پر ٹکانا اور سر کو جھکانا سیکھو صندل! ورنہ بار بار گرتی رہو گی۔" کمرے میں اب صرف ان ہی کی آواز کی گونج تھی۔

☆ ☆ ☆

"جویا!" شاکرہ امی نے کمرے کا دروازہ کھول کر اسے آواز دی تو دھوپ کی روشن لکیر کھلے دروازے سے کمرے کے وسط تک چلی آئی۔

شاکرہ امی اسی لکیر پر چلتی ہوئی اندر آئیں اور اس کے قریب آکھڑی ہوئیں۔

"ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"

"جی!" اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی طرف۔

بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے خالی الذہن کے عالم میں وہ کب سے اسی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی، سویہ کوئی ایسی قابل اعتراض بات تو نہ تھی۔

"بھائی پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔ تیز بخار چڑھا ہے غریب کو، گل کب سے بیٹھی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی ہے مگر تم نے آکر جھانکا تک نہیں کہ گھر میں کیسی پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔" زوبیہ کی طرف سے آئے نوٹس کا غم تا حال تازہ تھا۔

بات شکوے سے شروع ہوئی اور اس کی کوتاہی کو جتاتے ہوئے ختم ہوئی۔ اور ختم بھی کہاں...؟

"اور کچھ نہیں تو گل کو ناشتا ہی بنا دیتیں، صبح نو بجے کی آئی بیٹھی ہے، اب ساڑھے دس بج رہے ہیں۔"

"میں سمجھی وہ ناشتا کر کے آئی ہیں۔"

"بھائی کی پریشانی میں کہاں کھایا گیا ہوگا اس سے۔ تم خود ہی ہر بات فرض کر لیتی ہو، کم از کم پوچھ ہی لیتیں اس سے، بڑی بہن ہے آخر۔" اس کا بے تاثر سا انداز شاکرہ امی کو اور بھی کھلا تھا۔

جویا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "یہ ان کا اپنا گھر ہے امی! ناشتا، کھانا جو چاہیں، خود بھی بنا کر کھا سکتی ہیں۔"

شاکرہ امی کچھ گڑبڑا سی گئیں۔ جویا کی بات سے متفق ہونے کا مطلب، آنے والے دنوں میں اس کی مستقل خدمت گزاری سے ہاتھ دھو لینے کے مترادف تھا۔

"تمہاری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے، اس لیے تمہیں اس بات کا اندازہ نہیں، شادی شدہ بیٹی کی حیثیت مہمان کی سی ہوتی ہے، از خود کچھ بھی کرنے سے وہ جھجکنے لگتی ہے۔ گل بے چاری بھی بظاہر کتنی فری ہو، لیکن پھر بھی ہے تو اب پرائی۔"

معلوم نہیں وہ کیوں بحث کر رہی ہے، جبکہ جانتی بھی ہے کہ اس کی ہر بات خواہ وہ کتنی درست ہو، اسی طرح رد کرتی جاتی رہے گی۔ اس بار سر جھکا کر اس نے صرف اتنا ہی سوچا تھا۔

"چلو اٹھو، ناشتا بنا لو، میں نے نیچے والوں کے لڑکے سے گوشت بھی منگوا لیا ہے، دوپہر کے لیے بھی کچھ اچھا سا پکا لو، سلمان بے چارہ شاید تھوڑا بہت کھا ہی لے پسند کی چیز دیکھ کر، ورنہ تو..."

سلمان کی حالت زار کے خیال سے ان کا دل بار بار بھر آ رہا تھا۔ سو وہ بات ادھوری چھوڑ کر آنسو صاف کرتی ہوئی واپس باہر نکل گئیں۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

چند لمحے وہ یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے اندر آتی دھوپ کی اس چمکتی لکیر کو دیکھے گئی۔

زوبیہ کی طرف سے آئے خلع کے نوٹس کے بعد گھر میں جو رنج و غم کی سی کیفیت پیدا ہوئی تھی، اس میں اب

تک کوئی کمی واقع ہونے کے آثار نہیں تھے۔

سلمان کی تو خیر شاکرہ امی کے بقول، زندگی ہی برباد ہو گئی تھی، لیکن آپا گل بھی اپنی ابتدائی خوشی پر شرمندہ ہو کر اب اس کے غم میں برابر کی شریک تھیں۔ زوبیہ کے ساتھ سلمان کی مصالحت سے انہیں اپنے میکے کا گرتا ہوا مورال، سرحال اوپر ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سو اب یہ امید بھی غارت ہوئی تھی۔

گھر میں صرف زویا تھی، جو کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوئی تھی۔ جویا کے لیے اب سب ہی کچھ یکساں تھا۔

وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ سلمان کے کمرے کے دروازے میں سے شاکرہ امی اور آپا گل دونوں ہی نے اسے کچن میں جاتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

"خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہی کرتا ہے، تب ہی دیکھ لیں کہ اگر اس وقت جویا کی شادی اس کم بخت اعجاز کے ساتھ ہو گئی ہوتی تو اس وقت اس گھر کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ ابو جیل جا کر بیٹھ گئے اور بے چارہ سلمان..."

آپا گل نے سلمان کی طرف دیکھ کر تاسف سے سر ہلایا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر تھوڑا سا غافل ہوا تھا۔

"خیر، وہ تو وقت ہی اور تھا، کیا پتا جویا کی شادی ہو گئی ہوتی تو تمہارے ابو کے خلاف مقدمہ بھی نہیں بنتا۔ سارے معاملات درست بھی تو رہ سکتے تھے، یہ مستقل جگ ہنسائی تو نہ ہو رہی ہوتی۔ کیسی سہل زندگی ہوتی۔"

شاکرہ امی کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔

"سارا زمانہ رشوت لے رہا ہے، کیا حکمران کیا عوام، مگر سب چین کی بانسری بجاتے ہیں۔ ایک ہمارا ہی گھر ہے، جہاں سب کام بے عقلی کے ہوتے ہیں۔ ابو بھی اگر ذرا سمجھ داری سے کام لیتے تو یہ کچھ نہ ہوتا۔ جواب سب بھگت رہے ہیں۔"

اب سارے پچھتاوے بھی گئی گزری سی بات لگتے تھے۔ شاکرہ امی، جو پہلے اولاد کی اس بے حسی اور ناشکری پر اپنی خفگی کا اظہار کر لیا کرتی تھیں، اب خاموش رہنے لگی تھیں۔

ان کی حیثیت اب معزول ملکہ کی سی تھی۔

"پرانی کہاوت ہے کہ نہ پریشانی کبھی اکیلی آتی ہے، نہ خوشی، دونوں ہی کے ساتھ مزید سامان بندھا چلا آتا ہے، خوشی کا بھی اور تکلیف کا بھی... ہمارے اپنے گھر کی مثال سامنے ہے۔"

اِدھر اُدھر سے پڑھی اور سنی گئی باتوں کو آپا گل مہارت سے اپنے مطلب معنوں میں استعمال کر لیا کرتی تھیں۔ مگر اس وقت یہ کس بات کی تمہید تھی؟

شاکرہ امی نے بے تاثر سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"اب یہی دیکھ لیں، ابو کی گرفتاری، گھر کا بکنا، زیور سامان کا بک جانا اس منحوس جرمانے کو بھرنے میں ہی کیا کم تھا کہ سلمان بھی اپنی برباد زندگی لیے واپس آگیا۔ پتا نہیں کیا لکھا ہے اب اس غریب کی قسمت میں، فی الحال تو کوئی اچھی امید نظر نہیں آتی۔"

ان کے الفاظ اور لہجے میں ایسی ہی رقت اور مایوسی تھی، جیسی کسی مظلوم اور لٹی پٹی لڑکی کے لیے ہو سکتی تھی۔

سر کو تھامے بیٹھی شاکرہ امی نے ایک سرد آہ بھری۔

"بڑا ہی خطرناک سفلی کروایا ہے اس بار دشمنوں نے۔ سختی ہے کہ ٹل ہی نہیں رہی۔ ابھی آگے اور کیا دیکھنا لکھا ہے۔ کچھ پتا نہیں۔" اتنی سی بات کے دوران ہی ان کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگا تھا۔

جتنی دیر میں انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر ختم کیا، آپا گل پرسوچ سی نگاہوں سے ان کی شکل دیکھ گئیں۔

"خود کو سنبھالیے' اب ساری عمر روتے ہی تو نہیں رہنا' آگے کی فکر کریں امی! ہمارے گھر کی بہتری کے لیے کوئی بڑا قدم خود اٹھانا ہو گا' کوئی ایک راستہ کھل گیا تو سمجھ لیں' راستے پر راستہ کھلتا چلا جائے گا۔"

وہ باتوں باتوں میں پہیلی بوجھنے لگیں' شاکرہ امی کی ذرا جو کچھ سمجھ میں آیا ہو۔ "پہلے تمہارے ابو جیل سے چھوٹیں' اس کے بعد ہی کچھ..."

"جب آنا ہو گا' آ جائیں گے وہ' اب اپنے ہاتھ میں تو ہے نہیں' قانونی معاملہ ہے آخر۔" آپا گل جھنجلا سی گئیں۔ جو بات وہ کرنے جا رہی تھیں اس میں اظہار صاحب کی قید یا رہائی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ "اب ان کے انتظار میں زندگی کے باقی سب کام روک تھوڑی لیے جائیں گے۔ آپ بھی نا بس..."

بہت قریب سے مزے دار سی خوشبو اڑی تھی۔ بات ادھوری چھوڑ کر انہوں نے سامنے دیکھا۔ جویا ٹرے لیے کمرے میں آئی تھی۔

پراٹھے' چار شامی کباب اور غالباً' ایک انڈے کا آملیٹ۔ آپا گل نے ایک نگاہ میں جائزہ لیا۔

"یہ کباب کب بنائے تم نے؟"

"دو' تین دن پہلے بنا کر فریز کیے تھے' امی نے بتایا کہ آپ نے ناشتا نہیں کیا تو..."

"بہن ہو تو تم جیسی۔ دیکھا امی! جویا کو کتنا خیال ہے میرا' یہی بے چاری ہے جو سب کی فکر کر لیتی ہے' ورنہ تو آپ کے ہاں ہمیشہ نفسا نفسی کا ہی دور رہا ہے۔" ہاتھ پکڑ کر جویا کو اپنے قریب بٹھاتے ہوئے آپا گل کے منہ سے ایک سچ بے ساختہ ہی ادا ہوا تھا۔ جویا نے غیر محسوس انداز میں ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آج کل وہ پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف رویہ رکھے ہوئے تھیں۔ اتنا مختلف کہ جویا کو خوف سا آنے لگا تھا۔

"بہت ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں... دیکھ لینا تمہارا شوہر بہت خوش رہے گا تم سے۔ مرد چاہے جیسے بھی ہوں' اچھا کھانا پکانے والی بیوی کی ہمیشہ قدر کرتے ہیں۔"

ان کا اپنا کبھی کچن سے کوئی خاص ربط نہیں رہا تھا' مگر وہ پھر بھی اکبر بھائی پر برسوں سے راج کر رہی تھیں اور بہت سی باتوں کی طرح جویا انہیں یہ بھی نہ یاد دلا سکی۔ چپ چاپ انہیں کباب پراٹھوں کا صفایا کرتے دیکھے گئی۔

"کل فرید بھائی آئے تھے ہمارے ہاں خاص طور پر۔"

"کون فرید بھائی؟" اسے بالکل یاد نہیں آیا کہ خاندان میں اس نام کا کوئی شخص ہے۔ آپا گل کو اس کی غیر حاضر دماغی پر ذرا سا افسوس بھی ہوا۔ "فرید الدین ایڈووکیٹ۔"

جویا نے بے ساختہ نچلا لب دانت تلے دبایا۔

یہ نام آپا گل کی باتوں میں آج کل بار بار آ رہا تھا۔ پھر بھی وہ یاد نہیں رکھ پا رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ انہیں وکیل صاحب کہتی تھی اور اس لیے بھی کہ وہ لوگوں کے چہروں اور ناموں کو یاد رکھنے کی قطعی خواہش مند نہیں رہی تھی اور خاص طور پر یہ نام... اور یہ چہرہ...

"بے چارے' بہت ہی اچھے آدمی ہیں' جب بھی آتے ہیں' بچوں کے لیے چاکلیٹ اور جوس کے ڈبے ضرور لے کر آتے ہیں۔ کل تو تم لوگوں کے لیے بھی لے کر آئے تھے' یہ لو۔" انہوں نے ذرا رک کر اپنے ساتھ لائے ہوئے شاپر میں سے چند پیکٹ نکال کر میز پر بڑے فخریہ انداز میں رکھے۔ "انہوں نے کہا تھا کہ یہ آپ کی بہنوں کے لیے ہیں خاص طور پر..."

"کیوں' ہمارے لیے کیوں؟ آپ کو ان سے لینے بھی نہیں چاہیے تھے۔ واپس کر دیجیے گا فوراً۔ ہمارا کوئی ایسا تعلق نہیں کہ وہ ہمارے گھر تحفے بھیجیں۔ ان کی ہمت کیسے ہوئی؟"

جویا ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔

شاکرہ امی اور آپا گل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا اور آواز قدرے اونچی۔ آپا گل کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی پڑی تھی۔

"تعلق بنائے جاتے ہیں' تم تو بے کار میں جذباتی ہو جاتی ہو۔ ارے مذہب میں بھی ایک دوسرے کو تحفے تحائف دینے کو پسند کیا گیا ہے۔ اگر بے چارے فرید الدین نے دو' چار چیزیں بھجوا دیں تو کون سی قیامت آ گئی۔"

"آپ یہ چیزیں ابھی اسی وقت یہاں سے لے جائیے گا۔ اپنے بچوں کو دیں یا اس آدمی کو واپس کریں... مگر ہمارے گھر میں اس حوالے سے کچھ مت لائیے گا۔ یہ میں آپ سے آخری بار کہہ رہی ہوں۔"

وہ ان کے وضاحتی بیان سے ذرا بھی متفق نہیں ہوئی بلکہ ایک عرصے بعد اس کا وہی اکھڑا اکھڑا سا انداز سامنے آیا تھا۔ جس سے انہیں سخت نفرت تھی۔

"تمیز سے بات..."

اس نے انہیں بات پوری کرنے کی بھی مہلت نہیں دی تھی۔ کمرے سے نکل کر وہ بڑی تیزی سے صحن سے گزرتی ہوئی اپنے اور زویا کے مشترکہ کمرے کی طرف گئی اور... دروازہ خاصے زور سے بند ہوا تھا۔

شاکرہ امی نے بے ساختہ ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔

"دیکھ رہی ہیں نا اس کے انداز' آ رہی ہے واپس اپنی بد تمیزیوں پر' مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ یہ معاذ سے باہر کا ملنا جلنا رنگ لا کر رہے گا ہر بار وہی اس کے دماغ کا فتور بنتا ہے۔"

آپا گل کی آواز غصے سے پھٹی جا رہی تھی۔ سلمان اس سارے شور شرابے میں پوری طرح اٹھ چکا تھا اور صورت حال سے واقف بھی۔

"خیر معاذ کا تو نام مت لو' کہاں ملتی ہے وہ اس سے' وہ تو بس کورٹ میں ہی..." شاکرہ امی کی طرف سے کمزور سی صفائی کی کوشش بھی رائیگاں گئی' آپا گل کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

"کورٹ کی ملاقات پر ہی تو پابندی لگ گئی ہے فرید الدین کے آنے سے' آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں آخر... یہ بچی کچھی عزت رہ گئی ہے۔ اسے بھی داؤ پر لگانے والی ہے یا پھر لگا ہی چکی۔"

ان کے لہجے میں غضب کی سرد مہری اور یقین تھا۔ شاکرہ امی نے بنا کچھ کہے ان کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"جان سے مار دوں گا میں اس جویا کو' چاہے پھر مجھے بھی جا کر جیل میں بیٹھنا پڑ جائے۔" وقتی طور پر اپنا غم بھول کر سلمان اٹھ بیٹھا تھا اور اتنا بڑا دعوا کر کے فرید الدین کی لائی ہوئی چاکلیٹ کا ڈبا کھول چکا تھا۔

"تو ہی کوئی راہ نکال گل! میرے تو بس کا کچھ بھی نہیں' یہ پھر سے معاذ کا قصہ کیوں آ گیا ہمارے بیچ۔ تمہارے ابو نے کچھ ایسا ویسا سن لیا تو..." حسب معمول شاکرہ امی کے اعصاب نے جواب دینا شروع کیا تھا۔

آپا گل نے دانستہ چند لمحوں کی خاموشی اختیار کی۔ ان کے حسب مرضی ماحول ایک بار پھر بن چکا تھا۔

"فرید الدین ابو کے کیس پر بڑی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" انہوں نے خبر نشر کی۔

مگر سلمان ایک دم ہی ہنس پڑا۔ "فرید الدین خرچ کرے گا' حال دیکھا ہے اس کا...؟ بالکل پھٹیچر۔ تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے آپا گل!"

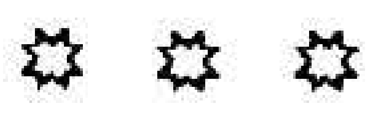
آپا گل نے ایک قہر آلود نگاہ سلمان پر ڈالی۔ جو بات وہ کرنے جا رہی تھیں' سلمان کے منہ لگنے سے اس سے زیادہ اہم تھی۔

"ڈیڑھ کروڑ سے اوپر کی زمین بیچی ہے ابھی اس نے اپنی ادھر اندرون سندھ میں۔ سادگی سے رہنے کا عادی ہے' ورنہ اسے اس وکالت کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو یہ کہیے کہ مہا کنجوس ہے۔ ایسا آدمی جو خود پر خرچ کرنا نہیں جانتا' وہ ابو پر فی سبیل اللہ تو نیکی کرنے سے

رہا۔" سلمان اب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔
آپا گل کے چہرے پر اس بار پراسرار سی مسکراہٹ ابھری تھی۔
"ٹھیک کہا تم نے سلمان! فرید الدین بھی نیکی نہیں کاروبار کر رہا ہے۔ جویا کا رشتہ مانگا ہے اس نے بدلے میں۔"
سلمان اور شاکرہ امی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں ہی کے چہروں کے تاثرات کچھ ایسے خوشگوار نہیں تھے۔
"خیر! جویا سے اس کا کوئی جوڑ نہیں ہے، یہ بات تو رہنے ہی دیں۔" سلمان نے بے زاری سے ہاتھ ہلا کر فی الفور آپا گل کی بات کو رد کیا۔
"اور ویسے بھی فی الحال تو جویا نے گھر سنبھال رکھا ہے۔ وہ چلی گئی تو ہم سب کیا ہوا پھانکیں گے۔ اوپر سے ابو بھی یہاں گھر آکر بیٹھ جائیں گے خالی ہاتھ۔" اس کے اپنے تحفظات تھے۔
آپا گل کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ انہوں نے بات شروع ہی غلط نوٹ سے کی تھی۔
گھر میں اب اظہار صاحب کی رہائی ترجیح نہیں تھی بلکہ بنا کسی رکاوٹ کے گھر کے اخراجات کا پورا ہونا تھا۔
سلمان اب جس بے نیازی سے چاکلیٹ کھا رہا تھا، صاف لگ رہا تھا اپنی طرف سے وہ یہ قصہ ختم کر چکا ہے۔
مگر پکچر ابھی باقی تھی۔
"فرید الدین کے دو فلیٹ ہیں، تین بیڈ روم والے ایک وہ تم لوگوں کو دے دے گا اور شاید ایک چھوٹی سی گاڑی بھی... اور بھی سپورٹ کر سکتا ہے، مگر پہلے بات تو کی جائے۔" سلمان کا منہ کی طرف جاتا ہوا ہاتھ یک بارگی رکا تھا۔ آپا گل کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ اتری۔
"اور ویسے بھی زویا کا بھی یہ آخری سال ہے میڈیکل کا، پھر تو وہ جویا سے کہیں زیادہ اکیلی کمائے گی۔ اب تو فکر کی ایسی کوئی بات نہیں، میرا تو خیال ہے کہ ایک بار فرید الدین کے بارے میں غور کر لینے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"
اس بار وہ چپ رہا۔
"ہمیں حالات کو درست کرنے کے لیے کوئی بڑا قدم اب اٹھانا ہی ہوگا سلمان! ورنہ ساری زندگی کے لیے یہی خستہ حالی مسلط رہے گی۔ اب تو تمہارے پاس بھی کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ ذرا عقل سے کام لو میرے بھائی! میں تم لوگوں کی دشمن نہیں۔" وہ سرک کر سلمان کے قریب ہو کر بیٹھی تھیں۔ ان کی محبت اپنائیت بھی اپنی جگہ حقیقت تھی۔
"مگر جویا... وہ کہاں راضی ہوگی، دیکھا تو ہے نا، ابھی کتنی نارض ہو کر گئی ہے۔ جبکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔" سلمان کی نیم رضامندی ظاہر ہو رہی تھی۔
"اسے بھی سمجھنا پڑے گا۔ یوں ہی کب تک دھکے کھائے گی۔ کوئی اچھا تھوڑی لگتا ہے۔ پیسے والا شوہر ہوگا تو عیش آرام سے رہتا اسے بھی سب کچھ بھلا دے گا۔ میں اپنی بہن پر الزام کبھی نہیں لگانا چاہتی مگر خود سوچو، جوان لڑکی ہے اکیلی حالات کا دباؤ سہہ رہی ہے۔ کسی کے ورغلانے میں آسانی سے آسکتی ہے۔"
وہ جویا کا بھی بھلا ہی چاہتی تھیں۔ سلمان کو اس بار پورا یقین ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے، غور کر لیتے ہیں اس بات پر، آپ بھی ذرا اس آدمی کو چیک کریں کہ واقعی وہ یہ سب کچھ کر سکتا ہے، جو آپ کہہ رہی ہیں۔"
"اکبر کی پرانی دوستی ہے۔ وہ خود ہر بات کی پوری ذمہ داری لے رہے ہیں۔ تم بالکل بے فکر رہو۔"
ٹھوک بجانے والے انداز میں انہوں نے اپنی طرف سے بات کو نقطۂ اختتام پر پہنچایا۔ "تم اور امی کسی دن

چل کر ان کا گھر بھی دیکھ لو، کیوں امی! ٹھیک ہے نا؟"
اتنی دیر میں پہلی بار وہ شاکرہ امی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ وہ عرصہ ہوا گھر کے منظرنامے سے حاضر غائب کی کیفیت میں تھیں۔ بے تاثر سے انداز میں سرہلا کر رہ گئیں۔



معاذ آج بہت خوش تھا۔
اپنی ذاتی خوشی کو بالائے طاق رکھ دینے کے بعد طویل عرصے سے وہ صرف اجتماعی خوشیوں پر ہی خوش ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ سو آج کی خوشی اتنی بڑی تھی کہ اسے کوشش بھی نہیں کرنی پڑی تھی۔
"میرا سب سے دیرینہ خواب... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی پورا ہو جائے گا۔ میں بہت بہت شکر گزار ہوں۔" اس ہزار گز کے ڈبل اسٹوری گھر کے آگے کھڑے ہو کر اس نے پورے دل سے سالار سے کہا تھا۔ جو اب اسکول کے لیے مختص ہونے کے لیے تیار تھا۔
جواباً" سالار نے مصنوعی ناراضی سے اس کی طرف دیکھا تھا، معاذ ہنسنے لگا۔
"اچھا! نہیں کہتا شکریہ، لیکن اب یہ سب میرے بس کی بات نہیں ہے، پورا بورڈ بنے گا، جو اس کو چلائے گا۔ چیئرمین آپ ہوں گے اور افتتاح بھی آپ ہی کو کرنا ہے۔"
سالار نے لاپروائی سے نفی میں سرہلایا۔
"نہ میں چیئرمین بن رہا ہوں اور نہ ہی افتتاح کر رہا ہوں۔ یہ دونوں کام اسلام انکل ہی کریں گے۔ وہی ڈیزرو بھی کرتے ہیں۔"
"پاپا آپ سے ہی کروائیں گے۔ یہ ان کی خواہش ہے کہ آپ اور کیتی بھابھی دونوں ایک ساتھ اس فنکشن میں آئیں۔"
"کیتی کی اچھی کہی، اس کا بس چلے تو وہ آج سے ہی تمہارا اسکول جوائن کر لے، ویسے یہ مجھے پتا ہے کہ وہ بہت اچھی ٹیچر ثابت ہوگی۔ بچے جلد ہی اس سے مانوس ہو جائیں گے۔ بہت ہی سوفٹ نیچر ہے اس کی۔"
کیتی کا ذکر کرتے ہوئے جو خوشی سالار کی آنکھوں میں اتری تھی، معاذ نے بخوبی نوٹ کی تھی۔
"بہت محبت کرتے ہیں آپ کیتی بھابھی سے۔"
"ہاں!" وہ خوش دلی سے مسکرایا "اتنی کہ اگر وہ مجھے نہ ملتی تو شاید میں یہاں کھڑا ہوا بھی تمہیں نہ ملتا۔ کھو جاتا کہیں دنیا کی ان بھول بھلیوں میں، زندگی کے کوئی اور مطلب معنی نہیں تھے میرے پاس معاذ!"
"بہت سے لوگ اپنی زندگی کے مطلب معنی کھو دیتے ہیں سالار! مگر ان کے پاس تو کھو جانے کی آسانی بھی نہیں ہوتی، آپ ماشاءاللہ خوش قسمت ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔"
بات کے اختتام تک وہ اپنی افسردگی پر قابو پا کر پورے خلوص سے مسکرایا۔ سالار بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"تم نے کسے کھویا ہے؟"
"میں اپنی بات نہیں کر رہا، ایسے ہی ایک مثال دے رہا ہوں۔" وہ دانستہ ذرا سا رخ موڑ کر اس عمارت کو دیکھنے لگا، جو اب اسکول کی ملکیت تھی۔
"مجھے بے وقوف سمجھتے ہو یا پھر اعتبار نہیں کرتے؟ ہوں!" معاذ نے بے اختیار ہی پلٹ کر سالار کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ پر بھی اعتماد نہیں کروں گا تو میری بدقسمتی میں کیا شک رہ جائے گا مگر آج میں بہت خوش ہوں۔ بہت مدت بعد اتنا سکون بھرا احساس حاصل ہوا ہے اور یہ آپ کی وجہ سے۔"

"اف!" سالار نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ "میرا خیال ہے اب ہم دونوں کو چل دینا چاہیے کیونکہ میں اب ایک بار پھر تم سے اپنی تعریف سننے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔" معاذ بے اختیار ہی ہنس پڑا۔

"چلیں! پھر ٹھیک ہے کل ہی ملتے ہیں ان شاءاللہ۔"

"ایک منٹ!" سالار نے اسے روکا۔ "یہ تمہاری امانت!" اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھی گھر کی چابی اٹھا کر اس نے معاذ کی طرف بڑھائی۔ "اور پلیز اب کوئی تعریفی نوٹ نہیں۔"

معاذ نے بنا کچھ کہے چابی اس کے ہاتھ سے لی تھی۔ وہ جانتا تھا بعض عمل بعض لوگ کسی تعریف و توصیف کے محتاج نہیں ہوتے اور سالار ان ہی میں سے ایک تھا۔

سالار سے رخصت ہوتے وقت اس کا ارادہ تھا کہ وہ خیام کو لا کر یہ گھر دکھائے گا لیکن تب ہی پروگرام میں عجیب سا ردوبدل ہوا۔

گھر پر کوئی غیر معمولی صورت حال اچانک ہی پیش آگئی تھی۔ سو ربیعہ نے اسے فوراً ہی گھر پہنچنے کے لیے کال کی تھی۔

"کچھ مہمان آئے بیٹھے ہیں جن سے نمٹنے کے لیے تمہاری موجودگی ضروری ہے۔" اس کی پریشانی کم کرنے کے لیے ربیعہ نے اتنی سی وضاحت دی اور فون بند۔

معاذ کی بائیک غیر ارادی طور پر تیز ہوتی چلی گئی۔ گھر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ بائیک کھڑی کر کے وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اندر آیا تو سامنے بڑے ہال کے کھلے دروازے میں سے وہ سب اسے نظر آگئے۔

زری کی بھابھی سعیدہ اس کے ساتھ آئے ہوئے ایک آدمی اور عورت اور سعیدہ کے دونوں بچے۔ ان کے علاوہ جملہ اہل خانہ کوئی زوردار بحث تھی جو اس کے اندر آنے پر ذرا تھمی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" سلام کے بعد اس نے پہلی بات یہی کی تھی۔

جس کے جواب میں ایک ایسا ملا جلا سا شور اٹھا جس میں سے کسی ایک کا بھی مطلب اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن سعیدہ اور اس کے ساتھ آئے لوگوں کے چہروں کے تاثرات سے وہ یہ اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب رہا کہ وہ سب بے حد غصے میں ہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر معاذ دادی اور ابا کے قریب ان سب کے بیچ جا کر بیٹھ چکا تھا۔

"لڑکی کو لینے آئے ہیں اور وہ ہے کہ جانے کو تیار نہیں۔"

دادی نے ایک مختصر سے جملے میں اسے صورت حال سمجھائی تھی۔ سو جب وہ سب چپ ہوئے تو معاذ نے فوری طور پر بات آگے بڑھائی۔

"سعیدہ بھابھی!" وہ اسے ہی جانتا تھا سو سب سے پہلے اسے ہی مخاطب کیا۔ "آپ ان لوگوں کو لے کر ہمارے ہاں مہمان آئی ہیں پھر یہ غصہ ناراضی کس بات کی ہے۔ جو بھی ہے آرام سے بھی تو کہا سنا جا سکتا ہے۔ ہماری آپ کی خدانہ کرے۔ کوئی لڑائی تو نہیں جو یہ اتنی چیخ و پکار ہو رہی ہے؟"

ابا نے مطمئن سی نگاہوں سے معاذ کی طرف دیکھا۔ وہ خود ابھی آئے تھے اور فطرتاً لڑائی جھگڑوں سے گھبراتے تھے۔ "نہیں معاذ بھائی! آپ سے کیسا جھگڑا سارا فساد تو اس لڑکی نے ڈالا ہے۔" سعیدہ قدرے شرمندہ ہوئی تھی۔ "اگر یہ خوشی خوشی ہمارے ساتھ چلے تو ابھی شام کی بس سے ہم واپس نکل جائیں سکھر کے لیے۔"

"میں نہیں جاؤں گی تمہارے ساتھ کہہ دیا نا میں نے پھر کیوں بیٹھے ہو یہاں جاؤ اپنے گھر۔" معاذ کے کچھ

بھی کہنے سے پہلے زری بہت زور سے چلائی۔

"آہستہ بولو شریف گھرانوں میں اس طرح بات نہیں کی جاتی۔" امی نے ناراضی سے ان کی طرف دیکھا اور پھر معاذ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"اس لڑکی کو ان کے ساتھ روانہ کرو معاذ! میں خود بھی اس کی ذمہ داری زیادہ دن نہیں لے سکتی اور یہ رشتے داروں کے پاس نہیں جائے گی تو کہاں جائے گی۔"

"وہاں سکھر میں سارے خاندان والے ہیں جی سب نے ناک میں دم کر دیا ہے طعنے دے دے کر کہتے ہیں جوان لڑکی پتا نہیں کن لوگوں کے گھر چھوڑ دی جس کے پیسے کھا رہے ہیں ہم۔" سعیدہ کے ساتھ والے آدمی نے تڑپ کر حالت زار بیان کی۔ "ہم تو سچ مچ ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں سارے میں۔"

شاید وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا لیکن معاذ کو سارا غصہ سعیدہ اور زری پر آرہا تھا۔ معاملہ تھا بھی ان ہی دونوں کا۔

"جس وقت آپ اسے دارالامان بھیج رہی تھیں اس وقت آپ نے ایسا کیوں نہیں سوچا سعیدہ بھابھی! میں نے کتنی درخواست کی تھی آپ سے کہ آپ اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ مگر اس وقت تو آپ۔۔۔"

بے حد کوفت سے معاذ نے بات ادھوری چھوڑی۔ زری کو ساتھ لا کر جو مستقل ٹینشن اس نے خاموشی سے جھیلی تھی وہ اپنی جگہ اور امی کا مستقل غصہ ایک الگ کہانی۔

"میں نہیں جاؤں گی اور اگر زبردستی کوئی مجھے لے کر گیا تو میں راستے میں سے ہی بھاگ جاؤں گی سن لیں کان کھول کر۔"

زری ایک بار پھر بدتمیزی سے چیخی تھی۔ معاذ کو اس کا رویہ بہت برا لگ رہا تھا۔

سعیدہ اس کے ساتھ آئے مرد اور عورت تینوں ایک ساتھ پھر بولنے لگے تھے۔ معاذ نے بے بسی کے ساتھ ابا کی طرف دیکھا۔ وہ خود بھی قدرے فکرمند سے تھے۔ معاذ بمشکل ان سب کو چپ کرانے میں کامیاب ہوا۔

"اس طرح معاملہ کیسے سلجھے گا میرے بھائی! کوئی ایسی راہ نکالیں جو آپ کے لیے بھی قابل قبول ہو اور اس بچی کے لیے بھی ہمیں کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہم تو خود چاہتے ہیں کہ زری کے مسئلے کا کوئی حل نکلے۔"

ابا نے ساتھ آئے اس مرد کو مخاطب کیا تو اس نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا۔

"حل تو ایک ہی ہے بڑے صاحب! آپ اس کی کہیں شادی کر دیں ہم بھی لوگوں کو کہہ سکیں گے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور۔۔۔"

"میں نہیں کروں گی شادی۔" وہ یک بارگی اٹھی اور اپنا فیصلہ سنا کر باہر نکل گئی۔ سب ہی کے چہروں پر ناخوشگوار سی کیفیت ابھری تھی۔ معاذ اٹھ کر اس کے پیچھے آیا تھا۔ زری برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھی مل گئی۔

"یہ کیا طریقہ ہے زری! سب لوگوں کو تم نے کتنا پریشان کر دیا ہے کچھ احساس ہے تمہیں؟ میری ہی بے وقوفی تھی جو میں نے تمہاری ذمہ داری قبول کی ورنہ اسی دن۔۔۔" بے حد غصے میں بولتا ہوا وہ سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

تب ہی اس پر زری کے رونے کا انکشاف ہوا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ معاذ کو باوجود غصے کے تھوڑا سا افسوس بھی ہوا۔

"دیکھو زری! میرے لیے پریشانیاں مت بڑھاؤ میری زندگی میں پہلے ہی بہت الجھنیں ہیں جن کے ختم ہونے کے آثار بھی نہیں ہیں کم از کم تم تو رحم کرو مجھ پر۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں اس سے ذرا ہٹ کر سیڑھیوں پر ہی بیٹھا۔

اندر سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی سی آواز یہاں تک آرہی تھی۔ زری نے دوپٹے سے اپنا چہرہ خشک کرتے ہوئے بڑی حسرت سے معاذ کی طرف دیکھا۔

پتا نہیں کس بری گھڑی میں وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی۔ ایک ٹھنڈی سانس نے اندر ہی کہیں دم توڑا۔ وہ جس تک جانے کی ہر راہ پر "یہ شاہراہ عام نہیں ہے" کا بورڈ کب سے آویزاں تھا۔ زری کو اس ان دیکھی جویا پر کبھی تو بڑا ہی رشک آتا اور کبھی بے حساب حسد محسوس ہوتا تھا۔

معاذ کے چہرے پر نگاہ جمائے وہ پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچی تھی۔ تب ہی اس نے مڑ کر زری کی طرف دیکھا۔

"تمہارے دل میں میری اگر ذرا سی بھی جگہ ہے زری! تو تمہیں میری بات ماننی ہی ہوگی۔ میں تمہیں حکم نہیں دے رہا' ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہا ہوں۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا جس کی پوجا وہ خود پر کب سے فرض کیے ہوئے تھی۔ سو یہ کتنی بڑی بے ادبی تھی۔ دکھ بھری حیرت کے ساتھ اس نے معاذ کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر بے اختیار ہی ہاتھ رکھا۔ بنا کوئی لفظ کہے بہت سے آنسو چہرے پر پھیلتے چلے گئے۔

"تم شادی کر لو زری! میرے دل پر تمہاری طرف سے بڑا بوجھ ہے۔ میں تمہیں تمہارے شوہر کے ساتھ بہت خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ کسی اور کا نہیں' میری خواہش کا احترام کر لو۔"

وہ اس کے چہرے کی طرف اس طرح دیکھے گئی جیسے سزائے موت کا مجرم' سزا سننے کے بعد بھی رحم کی امید پر منصف کی طرف۔

اور اس نے سزا سنا دینے کے بعد کسی اصول پسند منصف کی طرح ہی نگاہ چرائی۔ زری افسردگی سے مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے' میں شادی کر لیتی ہوں' مگر خوش رہنے کی شرط مت لگائیے۔"

معاذ نے کچھ کہنا چاہا' مگر زری نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"لیکن یہ شادی آپ کی مرضی سے ہوگی' اسی گھر سے' اسی شہر میں' میں کہیں دور نہیں جاؤں گی۔" جدائی کے راستے پر قدم رکھتے اس نے ایک آخری رعایت اپنے لیے ڈھونڈی تھی۔

"ٹھیک ہے' ایسا ہی ہوگا۔" معاذ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ "اندر چلو اب اور بس اب خاموش رہنا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے ایک سوال کا جواب دیں گے۔" وہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھی تھی۔

"ہاں... بولو" معاذ نے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ جویا سے بہت محبت کرتے ہیں؟"

اس بار وہ بری طرح چونکا تھا۔

"بتائیے نا معاذ...! آپ جویا سے بہت محبت کرتے ہیں کیا؟" اس نے پھر اپنی بات دوہرائی۔

نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے معاذ نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں' میں جویا سے بہت محبت کرتا ہوں زری!" اس نے زری کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ صاف محسوس کیا تھا۔

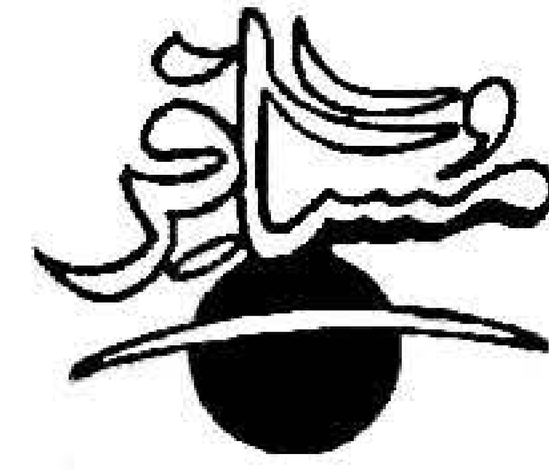
"مگر یہ آخری احسان تھا' جو وہ اس پر کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ امید کی اس آخری کرن کے بجھنے کے بعد ہی وہ اپنی زندگی میں آگے بہتر طور پر دیکھنے کے قابل ہو سکے گی۔ "آ جاؤ سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" وہ کہتا ہوا آگے ہال کی طرف چلا گیا۔

اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ جو اقرار اس نے آج تک کسی کے سامنے نہیں کیا۔ وہ زری کے سامنے...

"دھت!" دکھ بھری ہنسی اس کے لبوں پر آئی' مگر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنا غم منانے کے بجائے ایک مناسب لڑکے کا سوال دل میں اٹھ رہا تھا۔ "کون ہو سکتا تھا مناسب ترین لڑکا زری کے لیے...؟"

—— (اگلی قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آمنہ مفتی



مسافر

سورج آسمان کے بیچوں بیچ چمک رہا تھا۔ پسینہ سر کے بالوں سے سرسراتا ہوا قلموں سے کندھوں پہ ٹپک رہا تھا۔ گلی دور تک ویران تھی۔ کھڑنجے کا اکھڑا ہوا فرش جس میں جا بجا گڑھے بنے ہوئے تھے۔ دروازے کھلے ہوئے تھے۔ نانک شاہی اینٹوں سے بنے مکان ایک دوسرے کے ساتھ جڑے کھڑے تھے۔ کسی کسی دروازے کے دائیں بائیں چراغ جلانے کے طاقچے ابھی تک سلامت تھے۔ نکڑ والے مکان کا صدر دروازہ بھائیں بھائیں کھلا ہوا تھا اور اس میں پڑا پھول دار پردہ بالکل ساکن تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں کنگورے جھڑے گرگرے طاقچے تھے جن میں جمی موم کی موٹی تہہ پہ گرد اور جالے جم چکے تھے۔ ان طاقچوں میں بچے چودہ اگست اور بارہ ربیع الاول کو شوقیہ موم بتیاں جلایا کرتے تھے اور اگلے روز سب لوگوں کے جاگنے سے پہلے کوڑے والا ادھ جلی موم بتیاں سمیٹ کر لے جاتا تھا اور پوچھنے پر نہایت معصومیت سے کہتا تھا کہ۔

"ناں بھائی! ہم نے تو دیکھی بھی نہیں ماڈبتی۔"

اس نے پردے پہ ہاتھ مارا اور نیم اندھیری ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ چھنن چھنن کر کے کوئی چیز جاگی اور کونوں سے "ہائے اللہ، اوئی اللہ" کی سرگوشیاں ابھریں۔ اس سے پہلے کہ وہ اس نیم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوتا، کسی نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی اس کے سر پہ اوندھا دی۔ سرگوشیاں قہقہوں میں بدل گئیں اور بہت سے سائے ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے باہر کی طرف دوڑے۔

وہ بھنا گیا۔ چاہا کہ دوڑ کر گدھوں کے اس گروہ کے سرغنہ کو پکڑ لے۔ لیکن برآمدے میں بیٹھی آپا کو دیکھ کر ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے بھیگا چوہا بنا دیکھ کر آپا نے مسکراہٹ دبائی۔

"ارے ارے! تم تو بالکل بھیگ گئے۔ فاطمہ! ابھی تولیہ لاؤ۔ شمیم بھائی کے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں۔"

شمیم وہیں پلنگ کے کونے پر بستر الٹا کے بیٹھ گیا۔ فاطمہ اندر سے تولیہ لے آئی۔

"لو سر پونچھ لو۔ بہت ہی بد تمیز ہو گئے ہیں یہ بچے ۔۔۔ ذرا شرم نہیں۔ بتاؤ اگر بارش نہیں ہو رہی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر آئے گئے پہ پانی پھینکو۔"

ان کی آواز میں ہنسی اور سرزنش گھلی ملی تھی۔ اتنی گرمی میں پانی کی ٹھنڈک سے نہ نہ کرتے ہوئے بھی اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا اور وہ یوں ہی بے وجہ ہنس پڑا۔

"نہیں آپا! کچھ نہیں۔ بچے ہی تو ہیں۔" اس نے سر پونچھتے ہوئے کہا۔ سامنے صحن میں ایک مینا چونچ کھولے، سوکھے نل کے نیچے آ بیٹھی۔

"ان بے چاریوں کو بھی تو پانی چاہیے۔ فاطمہ! بیٹا، کونڈی میں پانی ڈال دو۔" فاطمہ اسی طرح چپ چاپ آئی اور کونڈی میں پانی کا کٹورا الٹ کے واپس چلی گئی۔

"تم سناؤ؟ اچھے رہ رہے ہو؟ دل لگ گیا؟"

شمیم کو لگا آپا کچھ اور کہنا چاہ رہی تھیں مگر کہہ کچھ اور گئیں۔ کپڑوں سے پانی نچڑ نچڑ کے پلنگ کے بان کو بھگوتا ہوا برآمدے کے فرش پہ پھیل رہا تھا۔

"فاطمہ بیٹا! ٹاکی لا کے فرش تو سونت دو۔" فاطمہ آئی اور ٹاٹ کے پوچے سے فرش صاف کر کے واپس

لوٹ گئی۔ شمیم نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ مینا پھدک کے کونڈی کے کنارے پہ جا بیٹھی تھی اور پانی پی رہی تھی۔

"کپڑے بدلو گے؟ نکلوا دوں؟"

"ارے نہیں آپا! سوکھ جائیں گے۔"

"ہاں بھئی، گرمی بھی تو بلا کی ہے۔ اور وہاں تمہارے ٹورنٹو میں تو موسم بڑا اچھا ہوتا ہو گا؟" آپا جیسے بڑی ہمت سے بولیں۔ اوپر کی چھت پہ کوئی دگڑ دگڑ دوڑا اور ڈیوڑھی والی ہنسیاں منڈیر سے سنائی دینے لگیں۔

"پاگل ہیں۔ چھٹیوں میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ تو بس ۔۔۔ تمہاری چھٹیاں ۔۔۔ بچے اور بیوی نہیں آئے؟"

مینا کو نہ جانے کیا بات ناگوار گزری "پرل" کر کے پرے ہوئی اور ایک دم اڑ کے نیم کی ٹہنی پہ جا بیٹھی۔

"یہ کیا سی رہی ہیں آپا؟" اس نے نیم کے درخت سے نظریں چرائیں جیسے وہ درخت نہ ہو بلکہ میڈوسا ہو



اور وہ یہیں پتھر کا ہو جائے گا۔

"مسافر۔۔۔ یاد ہے نا' ہمارے بچپن میں جب بارش نہیں رکتی تھی تو اماں مسافر بنا کے اس کے کندھے پہ لکڑی اور لکڑی کے سرے پہ پوٹلی باندھ کے لٹکا دیا کرتی تھیں۔"

"ہاں۔۔۔!" وہ کھویا کھویا بولا۔ "بارشیں بھی تو کتنی ہوتی تھیں۔ دو دن جم کے گری پڑتی تھی اور پھر اچانک نہ جانے کہاں کہاں سے کالے بادل مستائے ہاتھیوں کی طرح آسمان پہ چھا جاتے تھے۔ اتنی بارش ہوتی تھی' اتنی بارش کہ پرنالے' ندی نالے بن جاتے تھے۔ گلی میں گھٹنوں' گھٹنوں پانی کھڑا ہو جاتا تھا۔ گلی میں اس سرے سے اس سرے تک پکوان تلے جانے کی خوشبو پھیلنے لگتی تھی' پھر رات پڑتے پڑتے جب کسی طرح بارش نہ رکتی تو اماں متوحش سی شکل بنا کے آسمان کی طرف دیکھتیں' پھر منہ ہی منہ میں کچھ بولتی ہوئی اندر پلٹ جاتیں اور کچھ دیر کھٹ پٹ کرنے کے بعد ایک بے ہنگم سا گڈا جس کے کندھے پہ لمبی سی سونٹی کے سرے پہ گٹھڑی لٹک رہی ہوتی تھی' لیے برآمد ہوتی تھیں۔

"لے چھجے! ذرا یہ مسافر توشہ نشین پہ کھڑا کر آ۔" وہ بڑی لجاجت سے کہتیں۔

"اونہہ! مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ آپ خود چلی جائیں۔" وہ کتاب میں ناک دیے نخوت سے جواب دیتا' جس پہ وہ خود ہی بوری کو برساتی کی طرح اوڑھ کے سیڑھیاں چڑھتیں اور برستی بارش میں مدھم بلب کی روشنی میں ان کا سایہ دوسری دیوار پہ "نوٹرے ڈیم کے کبڑے" کی طرح نظر آتا۔

ہوا کا ایک جھونکا سا آیا اور نیم کے درخت سے کتنے ہی زرد پتے ٹوٹ کے جیسے اس سے گلے ملنے والہانہ سے انداز میں برآمدے تک آئے اور پھر کسی انجانی دہشت سے وہیں پہلی سیڑھی پہ گر گئے۔

چھت پہ پھر کوئی دوڑا اور گرد آلود ہوا کا ایک زوردار جھونکا آیا۔

"اچھا تو مسافر بنا رہی ہیں۔۔۔ مگر آپا اتنی دھوپ میں؟" اس نے جیسے بات برائے بات کی۔

"نجیم!" آپا جیسے ایک دم دکھی سی ہو کر بولیں اس نے حیرت سے آپا کو دیکھا۔

"بارش تو ہوگی نا نجیم! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بارش نہ ہو۔" ان کی آواز میں واضح شکوہ تھا۔ وہ مزید شرمندہ ہو گیا۔

"ہاں آپا بارش تو ہوگی۔"

"اور جب بارش ہوگی تو۔۔۔" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑا۔ آندھی کا بڑا سا بگولہ ہزاروں شاپر' خس و خاشاک اور بہت سی گرد اپنے جلو میں لیے مکانوں کی چھتوں سے کپڑے اتارتا' بالٹیاں اوندھاتا' چلمنیں پھٹپھٹاتا اس طرف بڑھا۔ نیم کا درخت زور سے کانپا۔ ایک کوا پیرا گلائیڈر کی طرح توازن قائم رکھتا ہوا نیم کی شاخوں میں کہیں جا گھسا۔

"دیکھا! بارش ہوگی۔" آپا کے لہجے میں فخر تھا۔ چھت پر دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔

"مگر آپا! کیا ضروری ہے کہ بارش اتنی ہو کہ۔۔۔"

"اتنی ہی ہوگی بارش۔۔۔ نجیم! یہاں اتنی ہی بارش ہوتی ہے۔" آپا کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ آسمان پر بادلوں کی گڑگڑاہٹ گونجی۔

"لو آ گئے۔۔۔" آپا کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

"فاطمہ! اری بچی فاطمہ' اوپر کچریاں سوکھنے رکھی تھیں۔ اتار لا۔۔۔ جا بھاگ جا بیٹا!"

فاطمہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ بارش کی پہلی بوندیں ٹپکیں۔ پھر ایک دم تواتر سے موسلادھار بارش برسنے لگی۔ نجیم کے کندھے پر ایک موٹی سی بوند گری نظر اٹھا کے اوپر دیکھا۔ چھت سے پانی ٹپک رہا تھا۔

"اوہو! میاں تم اندر چلے چلو۔ یہ برآمدہ تو ٹپکتا ہے' پچھلی کئی برساتوں سے۔ اصل میں جب تم باہر گئے تھے تو اس سال اماں نے پرنالے ٹھیک نہیں کرائے۔ بارش ہوئی تو چھت پہ پانی کھڑا ہو گیا۔ بس تب ہی سے ساری چھت چھلنی کی طرح ٹپکتی ہے۔" آپا نے صفائی دی۔

اندر کمرے میں حبس تھا۔ نجیم نے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ جالی کے پار بارش زور سے برس رہی تھی اور کھڑکی کھولتے ہی ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو کا جھونکا آیا۔ آپا وہیں کونے میں ستارے والی دری پہ ٹک گئیں۔ مسافر تیار ہو چکا تھا۔

"آپا! آپ لوگوں نے یہ دری ابھی تک سنبھال کے رکھی ہوئی ہے؟"

"یہ دری؟" آپا نے دری پہ پیار سے ہاتھ پھیرا جیسے وہ دری نہ ہو بلکہ جیتا جاگتا انسان ہو۔ "نجیم! یہ دری ہٹا دیں گے تو نیچے کا فرش بڑا معمولی سا ہے۔"

اس نے جیسے زبردستی خود کو بولنے سے روکا کہ "آپا! فرش گندا ہے تو کیا ہوا؟ نیا فرش لگوائیں' ٹائلیں' وینائل فلورنگ یونیم اٹ' ہر طرح کا فرش دستیاب ہے۔" لیکن وہ چپ رہا۔

"بیوی بچے نہیں آئے؟" آپا نے بڑی ہمت سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے باہر دیکھتا رہا۔ گلی کے مانوس مکان۔۔۔ سامنے کا دریچہ کھلا ہوا تھا اور اس میں پلاسٹر آف پیرس کا بڑا سا سنہری گلدان دور سے تانبے کا لگ رہا تھا۔ پلاسٹک کے چمچماتے رنگوں والے پھول پھوہڑپن سے ٹھونکے ہوئے تھے۔

"یہاں کہاں آنا چاہتے ہوں گے۔" آپا کے لہجے میں دبی دبی خود اذیتی تھی۔

وہ چپ رہا اور جالی سے ناک چپکا دی۔ دو تین سیڑھیاں چڑھ کے فضل الٰہی کا مکان تھا۔ جس میں ایک کمرے کی الماری پہ سرخ سرخ گالوں والے رام جی کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ فضل کی اماں ان تصویروں پہ لئی سے اخبار چپکا دیا کرتی تھیں۔ برسات میں لئی سیل جاتی تھی اور اخبار نیچے گر جاتے تھے۔ تب نجیم اور فضل' چپکے چپکے جا کے رام' لکشمن اور سیتا کی تصویروں کو دیکھتے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں' گھونگھریالے بال اور معصوم مسکراہٹ والے دیوی دیوتا بادلوں سے بھرے آسمان پہ پانی کی پچکاریاں لیے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے پھرتے تھے اور کبھی کوئی شرارتی کنہیا ہیرے کی کنی جیسا پانی کسی شعاع کے راستے میں اچھال دیتی تھی تو کاسنی بادلوں سے ڈھکے آسمان پہ اندر کے کمان کے ساتھ رنگ یہاں سے وہاں پھیل جاتے تھے۔

فضل الٰہی کی ماں' توبہ توبہ کرتی جھریوں بھرے ہاتھوں سے دونوں گال پیٹتی اور آٹے کی نئی لئی بنا کر ان شدید کافرانہ تصویروں کو چھپا دیتی۔

"بڑی لڑکی کی تو شادی کر دی ہوگی؟" آپا کے لہجے میں رشک تھا۔

نجیم نے جیسے سہارے کے لیے کھڑکی کی سلاخوں کو کس کر پکڑ لیا۔ فضل الٰہی کے کوٹھے سے پیچھے پھیلے برگد کی جھولتی جٹائیں تمام کر پچھلے میدان میں اتر جاؤ تو آگے فٹ بال گراؤنڈ کی سیڑھیاں تھیں۔ نیم دائرے میں پھیلی ہوئی۔ جن پہ محلے کے سارے بچے اونچ نیچ کھیلا کرتے تھے اور بارش کے بعد یہ سیڑھیاں کیچوؤں سے بھر جاتی تھیں۔ فضل الٰہی یہ سارے کیچوے بوتلوں میں بھر بھر کے کھیتوں میں ڈال آتا تھا۔ فضل الٰہی کے ابا جی زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور کیچوؤں کے عاشق تھے۔

"میرے بچو! کیچوا کسان کا دوست ہے' انسان کا دوست ہے۔ ہم جو کچھ بھی کھاتے ہیں وہ کیچوؤں کے فضلے کی وجہ سے کھاتے ہیں۔"

نجیم کو ان کی اس بات پر ابکائی آ جاتی تھی۔ مگر فضل الٰہی بڑا بیبا بچہ تھا۔ برسات کے دنوں میں جب سب بچے فٹ بال گراؤنڈ میں اونچ نیچ کھیلتے تھے اور مینڈکوں کے ننھے ننھے بچے پکڑ کے ایک دوسرے کی قمیصوں میں ڈالتے تھے تو فضل الٰہی چپ چاپ شیشے کی بوتلوں میں کیچوے جمع کرتا رہتا تھا' ایک بار فضل کے ابا نے ان دونوں کو کیچوے کی ڈائسیکشن کر کے دکھائی تھی۔ اس رات وہ نیند میں بڑبڑاتا رہا تھا اور اسے بڑی بڑی جناتی مینخوں کے سائے نظر آتے رہے تھے۔ اگلے دن امی نے اس کا فضل کے گھر جانا بند کرا دیا۔

"ناس پیٹے ہندوؤں کا گھر ہے۔ الٹی سیدھی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ بھائی توفیق سے اتنا نہیں ہوتا۔ ایک کوچی اور دس روپے کا چونا لے کے ان تصویروں

پہ پھیریں اندر کا ہندو نہیں جاتا۔"

کتنے ہی دن وہ اداس پھرتا رہا تھا۔ پھر ایک دن جب اماں فوارے کے پاس والے تخت پر سو رہی تھیں تو وہ چپکے چپکے فضل کے گھر چلا گیا تھا۔ فضل کے ابا شہد کی مکھیوں کی کسی نسل پہ تحقیق کر رہے تھے۔ ایک ننھا سا ڈبہ چار ٹانگوں پہ برآمدے میں کھڑا تھا۔

"یہ مکھیوں کا فارم ہے۔" فضل نے اسے بتایا تھا۔

کئی گملوں اور کیاریوں میں گلاب کے پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ دلچسپی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا ایک دم ساری مکھیاں بھن بھن کرتی اس کے چہرے' بازوؤں' ہاتھوں اور پیروں پہ لپٹ گئیں۔

کئی دن بخار' سوجن' گلے کی سوزش ___ جھیلنے کے بعد اسے پتا چلا کہ فضل الہٰی کے گھر کی طرف کھلنے والا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ اب آمدورفت کے لیے پچھلی متروکہ ڈیوڑھی استعمال کی جائے گی جو بازار کے رخ تھی اور پردے کی غرض سے اس میں ایک پرانی الماری ایسے رکھ دی گئی کہ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ فضل الہٰی کے گھر جانا بند کر دیا گیا مگر اماں کی بدگمانیوں اور بددعاؤں کا رخ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فضل الہٰی کے گھر کی طرف ہو گیا۔

"سفلی کرتے ہیں دونوں میاں بیوی' جلتے ہیں ہم سے۔ خیر سے بھرا پرا گھر ہے۔ ان کے گھر کی طرح نہیں۔ ایک لڑکی ہے' سوات بیاہ دی۔ بتاؤ! سوات بھی کوئی جگہ ہے بیاہنے کی؟"

"آپا! فضل الہٰی کی بہن ___" وہ ایک دم مڑا۔ لیکن آدھے جملے کے بعد ساکت ہو گیا۔ آپا کے چہرے پہ برہمی تھی۔

"وہیں سوات میں ہے۔ سنا ہے تخت بھائی کے پاس کوئی گاؤں ہے' وہاں بہت گھرتی ہے۔ اماں ٹھیک کہتی تھیں' اندر کا ہندو نہیں مرتا۔"

"اوہ!" نہ جانے یہ سکون کا سانس تھا یا دکھ کا ہو گا؟ اس نے دوبارہ گلی میں جھانکا۔ بارش کا جھالا زور سے برسا اور ننھی ننھی بوندیں جالی سے چھن چھن کر شمیم کے چہرے سے ٹکرائیں۔

"دیکھو تو کتنے بدتمیز بچے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کہ اتنے عرصے بعد ماموں گھر آیا ہے' مل لیں ___ سلام بھی نہیں کیا۔" آپا بڑبڑائیں۔

"چھوڑیں آپا! بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"ہاں' مگر پھر بھی ___ اچھا تو بڑی کا نہیں بتایا۔ کہاں کی شادی؟" آپا کے لہجے میں ٹوہ تھی۔

شمیم نے دوبارہ باہر جھانکا۔ گلی میں اتنا پانی تھا کہ دور سے وہ وینس کی کوئی گلی لگ رہی تھی۔ فضل الہٰی کے مکان کی دو سیڑھیاں پانی میں ڈوب چکی تھیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور طاقچے کے اوپر بارش کی بوچھاڑ سے دھلنے والی دیوار پہ ایک مدھم سا نشان نظر آ رہا تھا۔ ننھی سی ہتھیلی' لمبی لمبی انگلیاں' لاکھ سے بنا ہوا نشان۔ اسے ایک دم جھرجھری سی آ گئی۔

"اوہو' دھیان ہی نہیں رہا۔ چائے بنواتی ہوں تمہارے کپڑے بھی تو گیلے ہیں۔ بدل لو' دیکھو یہیں الماری میں ابا کے تہہ بند اور کرتے رکھے ہیں۔" آپا کی ترغیب اتنی دلنشین تھی کہ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ ابا کے کپڑوں میں سے خس کے عطر کی پرانی باس آ رہی تھی اور ململ کا کرتا بار بار دھلنے سے اتنا گھس چکا تھا کہ پہنتے پہنتے کندھے سے مسک گیا۔

"لو چائے پی لو۔" آپا نے چائے کی کشتی ستارے والی دری پہ رکھ دی۔ گلابی پھول والی چائے کی پیالیاں' سبز شکر دان اور ایک تشتری میں گھر کے بنے ہوئے چاروں مغز کے بسکٹ۔

"دیر ہو گئی۔ میں مسافر شہ نشین پہ رکھنے چلی گئی تھی۔ بارش تو دیکھو دو گھنٹے سے برس رہی ہے ___ اور تم نے جانا بھی ہو گا تو ___" آپا دوپٹے کا بھیگا ہوا آنچل ستارے والی دری سے دور کر کے نچوڑ رہی تھیں۔

"جانا بھی ہو گا۔" اسے لگا فضل الہٰی کے گھر میں رکھی شہد کی مکھیاں ایک بار پھر پاگل ہو کے اس کے گالوں اور کانوں کی لوؤں پہ ڈنک مارنے لگی ہوں۔

"بچے تو بارش کے دیوانے ہیں۔ چاہے دس گھنٹے ہوتی رہے مگر تمہیں تو جانا ہے نا۔ کیوں شمیم؟"

شمیم نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بارش کے تسلسل

میں ذرا کمی آئی تھی۔

"مسافر رکھا ہے نا' رک جائے گی۔ تھوڑی دیر کو ہی سہی۔" آپا کے لہجے میں عجلت تھی۔ "بڑی کی شادی کس سے کی تھی؟ اس کا نام جبرائیل کیوں ہے؟ وہ مردہ خانے کی وین کیوں چلاتا ہے؟ لڑکی کا سسر پولش ہے تو کیا وہ ___؟"

سب سوال آپا کے چہرے پہ لکھے تھے۔ کھڑکی کے پار فضل الہٰی کے گھر کی تیسری سیڑھی پانی سے باہر تھی اور دائیں بائیں پٹوں پر کبھی کے کھدے ہوئے "شجو" اور "لاکھ" کے الفاظ سالہا سال کے پپڑائے ہوئے روغن کے نیچے سے واضح دکھائی دے رہے تھے اور طاقچے سے ذرا اوپر لاکھ سے بنا ہوا ہاتھ کا نشان۔

"آپا! یہ فضل الہٰی کی پردادی تھی ناں ___ جن کا یہ ہاتھ ہے ___ وہ ستی ___"

"اوہو شمیم! دیکھو بارش رک گئی ہے۔ دیکھنا پھر نہ شروع ہو جائے۔ تو تم جلدی سے چلے جاؤ۔ ہوٹل تک جانا ہو گا۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟ اچھا تو پھر کپڑے ___؟" آپا کے لہجے میں شدید عجلت تھی۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کے کھڑکی بند کر دی۔

آپا کے پائنچے گیلے تھے اور ان کے پیروں پہ نیم کا ایک پتا چپکا ہوا تھا۔

"میں اسد کو بلاتی ہوں۔ اس نے تم پہ پانی پھینکا تھا۔ لڑکیوں میں گھسا رہتا ہے۔ بس ___ کیا کروں ابا نے لاڈ میں بگاڑ دیا۔ سمجھتے تھے تم بڑی سے ___ چلو چھوڑو میں بلاتی ہوں۔ موٹر سائیکل پہ چھوڑ آئے گا۔"

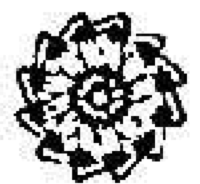
آپا کی آدھی ادھوری باتوں میں بہت تلخی تھی۔

"بڑی کے شوہر کا نام جبرائیل کیوں ہے؟" فضل الہٰی کے برآمدے میں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور آپا گیلی سیڑھیوں پہ بوری اوڑھے اوپر جا رہی تھیں۔ برستی بارش میں سامنے کی دیوار پہ ان کا سایہ "نوٹرے ڈیم کے کبڑے" کی طرح بے ہنگم لگ رہا تھا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

ترشح موقوف ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ گلی کے کہنہ مکانوں کے خستہ چھجے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔ گلی ویران تھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ بند دروازوں' جالی دار کھلی کھڑکیوں اور جھروکوں میں تنی شیر کی چلمنوں کے پیچھے سے عام گھریلو کام کاج کی آوازیں چھن چھن کر گلی میں آ رہی تھیں۔

وہ بازار والے دروازے سے گھوم کر گلی میں داخل ہوا تھا۔ مکان یہاں سے گلی کے نکڑ پہ پڑتا تھا۔ گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ ذرا سا رکا تھا۔ کسی مکان سے پکوڑے تلنے کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اپنے نتھنے سکیڑ کر اس خوشبو کو سونگھا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ فضل الہٰی کے گھر کی جالی دار کھڑکی کے اس پار کوئی ہنسا اور خس کے عطر کا تازہ جھونکا آیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ جانی پہچانی ہنسی۔ مانوس خوشبو۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا' گلی کی تنگی سے سرسراتا ہوا گزرا۔ کھڑکی کے اس پار کسی نے سرد ہوا سے جھرجھری لی اور پھٹ سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔

"صرف گلی ہی تو پار کرنا ہے۔" اس نے سوچا اور سر جھکا کے چلنے لگا۔ کھڑنجے کے فرش پہ جا بجا ننھے ننھے گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ ان گڑھوں میں بارش کا پانی کھڑا تھا اور اس پانی میں بادلوں بھرے آسمان کا عکس تیرتا تھا۔ گلی جلدی پار کرنے کی عجلت میں اس کا پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑا۔ پاؤں باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے اس گڑھے میں پانی کے بجائے فلش نما کٹی ہوئی برف بھری ہے اور وہ اس برف میں دھنستا جا رہا ہے۔ اس کے کانوں میں مسافر کے چیتھڑوں کی پھڑپھڑاہٹ گونجی۔ مسافرت' غربت اور بے مہری کی برف اس کے چاروں طرف شہ نشیں کی پردہ دیواروں کی طرح بلند ہونے لگی اور گلی کسی گلیشیر کا کلیار ابن گئی جس میں اجنبیت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔



صباحت یاسمین

کھیل تماشا

"شادی کے بعد پہلی بار آفس آیا ہوں۔ تم نے ایک بھی میسج نہیں کیا' کل کی تو خیر مجھے امید ہی نہ تھی۔" سروان نے پہلی فرصت میں اسے فون کیا اور چھوٹتے ہی شکوہ کر ڈالا۔

"آپ نے آتو جانا ہے نا شام کو' پھر خوامخواہ ہی ڈسٹرب کرتی؟" انعم نے بڑے سبھاؤ سے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی' پیار بھی' مگر شوخی مفقود تھی۔ اس کے اس دھیمے انداز پہ سروان کے شکوے سے چھلکتی شرارت اور لبوں پر رقصاں مستی نہ جانے کس کونے کھدرے میں جا چھپی۔

☼ ☼ ☼

سروان کی انگلیاں موسیقی کی لے کے ساتھ اسٹیئرنگ وہیل پہ تھرک رہی تھیں۔ وہ گاڑی میں بیٹھا انعم کا انتظار کر رہا تھا۔

"اتنا تیز میوزک؟"

انعم کی آمد اسے متوجہ نہیں کر سکی تھی' وہ نہ جانے کب آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کی ناگواری میں ڈوبی آواز نے ہی سروان کو اس کی آمد کی خبر دی۔

"تم ٹھیک سے تیار ہوتیں نا' کوئی اچھا سا نیا سوٹ پہنتیں۔" سروان نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے اس کی تیاری پہ تبصرہ کیا۔

"سروان! یہ ڈیزائنر ویئر ہے اور میں نے آج پہلی بار پہنا ہے۔" انعم نے تاسف سے کہا۔

"آ... اچھا؟ کلر بہت ڈل ہے' ہے نا...؟"

"سروان! تمہیں ایسے ہی شیڈز تو پسند تھے۔" انعم نے اس کی بات کاٹ کر اسے یاد دلانا چاہا۔

"مجھے... کب؟" وہ غائب دماغی سے بولا۔

"پتا نہیں۔" انعم نے دو لفظی پتھر کھینچ مارا۔

"مجھے تو ہمیشہ سے تتلی کے سے شوخ رنگ پسند تھے۔ جیسے ماہ نور پہنتی تھی۔"

وہ اپنی ہی رو میں کہے جا رہا تھا۔ شاید وہ بلا تکان بولتا رہتا' اگر انعم ٹھک سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نہ نکل جاتی۔

"انعم سوری!" اس نے تھکن زدہ انداز میں کہتے ہوئے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"نہیں' بلکہ سوری ٹو یو ماہ نور!" اس نے کرب سے خود کلامی کی۔ "میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی پری کی جان لے لی... اپنی آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے مرچیں بھر لیں اور انعم... انعم کی زندگی تباہ کر دی! میرے مزاج کے قریب تو تم ہی تھیں نور! تمہاری معصومیت سے تمہاری شرارتوں سے تمہاری زندہ دل ہنسی سے... محبوب تو وہی ہوتا ہے نا جس کی ہر ادا بھائے' تم ہی تو تھیں' جو مجھے ہر حال میں اچھی لگتی تھیں۔ روتی' منہ بسورتی' لڑتی جھگڑتی' شور مچاتی... اور انعم...! وہ ایک لمحے کا فسوں تھا جو مجھے مسحور کر گیا۔ میرے دل کی گہرائیوں تک جس کی جڑیں نہیں تھیں' یہ تو محض وہ کشش تھی جو صنف مخالف کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور میں... میں اپنی طلب کو محبت سمجھ بیٹھا۔ تمہارا کھیل تماشا مجھے تماشا بنا گیا ہے' زندگی گیم کر گئی میرے ساتھ۔ کتنی پشیمانیاں ہیں میرے اندر۔



تمہاری جان لینے کا دکھ ہے یا کچھ اور... میں نہیں جان پایا۔ بس ایک احساس زیاں ہے' جو مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ میں... میں اسے کیا نام دوں؟"

☼ ☼ ☼

"تمہیں کہا تھا نا مت کرو یہ سب۔ بھگتو اب' تمہارا بویا ہے' تم ہی کاٹو گی۔" انعم اس پہ چلا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے پریشانی ہویدا تھی۔ وہ یہ قصہ لے کر سیدھی انعم کے پاس آئی تھی۔ اس کو یہیں آنا تھا۔ اسی کے در پہ سر پٹخنا بنتا تھا۔ کھیل تماشے میں اس نے اپنی متاع کل انعم کی جھولی میں ڈالی تھی۔ کھیل ختم ہو گیا تھا' اب صرف تماشا رہ گیا تھا۔ دنیا کے دیکھنے کو اور اس کے دیکھنے کو تو وہ بھی نہیں رہا تھا' اس نے اپنی گود میں کپکپاتے ہاتھوں کو دیکھا اور ہتھیلی پھیلا کر نظروں کے سامنے کر لی۔ اس کے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک دوسرے سے الجھتی ہوئی لکیروں کے۔

☆ ☆ ☆

وہ جنگلے پر کہنیاں ٹکائے کھڑی تھی۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ہوئے وہ بڑی متانت سے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔ ماہ نور نے دور سے ہی اسے وہاں کھڑے دیکھ لیا' اس لیے دروازے کے قریب بنا آہٹ کیے چپل اتاری' بے آواز چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور ایک بے معنی' مگر نہایت اونچی سی آواز منہ سے نکال کر اسے ڈرانا چاہا۔

"تم؟" اسی پر سکون انداز میں وہ دھیرے سے پیچھے مڑی تھی۔

"میرا خیال تھا تم ڈر جاؤ گی' مگر تم چونکیں بھی نہیں۔" ماہ نور بد مزہ ہوئی۔

"کب آئیں تم؟" مبسم لہجے میں سوال کیا گیا۔

"کچھ ہی دیر پہلے' تم کیسے خود کو اتنا کمپوزر رکھ لیتی ہو' نہ ڈرتی ہو نہ گھبراتی ہو' نہ چونکتی ہو' نہ غصہ میں بے قابو ہوتی ہو؟" ماہ نور اس کے سوال کا جواب دے کر فوراً" اپنے مطلب کی بات پوچھنے لگی۔

"یہ رنگ بہت بچ رہا ہے تم پر۔" انعم اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے بولی۔

"سروان نے دلوایا ہے۔" ماہ نور نے مزہ لیتے ہوئے جتایا' پھر کچھ یاد آنے پہ اس کے چہرے کے زاویے ذرا سے بگڑ گئے اور وہ تھوڑا بد مزہ ہوتے ہوئے بولی۔ "بلکہ یوں سمجھو میں نے اس سے نکلوایا ہے' آخر کو منگیتر ہوں' اتنا تو حق بنتا ہے میرا' بنتا ہے نا؟" انعم نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"پتا ہے مجھے اس سوٹ میں دیکھ کر اس نے کیا کہا؟" ماہ نور نے انعم کی دلچسپی ابھارنے کی خاطر سوال کیا' مگر اسے پتا تھا کہ کم گو سی انعم شاید ہی کچھ بولے' جب ہی وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی شروع ہو گئی۔

"ماہ نور! تمہیں یہ کلر بہت سوٹ کر رہا ہے' مگر مجھے لائٹ کلر اچھے لگتے ہیں۔" اس نے ہو بہو سروان کے لہجے اور آواز کو کاپی کیا تھا۔

"اب میں اسے کمنٹ سمجھوں یا کمپلی منٹ؟" وہ مخمصے میں تھی۔ ماہ نور خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"ویسے انعم م م م۔۔۔!" کچھ توقف کے بعد وہ پر سوچ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "مجھے لگتا ہے کہ تمہارے جیسے کلر پہننے لگوں تو اسے زیادہ اچھی لگوں گی۔" انعم نے چونک کر اسے دیکھا' مگر ایسا کوئی رنگ وہاں نہیں تھا' جس کا عکس اس کے دل کے چور نے محسوس کیا تھا۔

ماہ نور اور انعم خالہ زاد تھیں۔ ان کی ماؤں کی شادیاں ایک ہی گھر کے دو بھائیوں کے ساتھ ہوئیں۔ شادی کے دوسرے ہی ہفتے ماہ نور کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں چل بسے۔ ماہ نور کے نانا' نانی نے بمشکل ماہ نور کی پیدائش کا انتظار کیا۔ اس کے پیدا ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد اس کی ماں کی کسی دوسری جگہ شادی کر دی۔

ماہ نور کو دادا' دادی نے پالا تھا' تسنیم پھوپھو جو اس کے باپ کی جڑواں بہن تھیں' اسے اپنی بہو بنانے کے لیے چن چکی تھیں۔ خاندان بھر کی لاڈلی' شوخ و چنچل سی' ماہ نور سے سروان کو اتنا ہی پیار تھا جتنا خاندان کے کسی بھی اور فرد کو' لیکن کبھی کبھی اس کی لاابالی طبیعت اور الٹے سیدھے مشاغل سے وہ اکتا جاتا۔

ماہ نور اور انعم ایک ساتھ پلی بڑھیں' دونوں کے گھر کی دیوار مشترکہ تھی' اسکول' مسجد' ٹیوشن' کالج' یونیورسٹی' ہر جگہ وہ ساتھ رہیں' مگر اس کے باوجود ان کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ انعم سنجیدہ اور بردبار سی تھی' جبکہ ماہ نور شرارتی جذباتی اور کسی حد تک سادہ مزاج بھی۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کی اچھی سہیلیاں تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ تو بہت اچھی بات ہے' انعم کو ضرور جانا چاہیے۔" دادا ابو نے انعم کے ہاتھ سے چائے کا کپ

لیتے ہوئے کہا۔ رات کی چائے وہ دونوں گھرانے ہمیشہ کسی ایک جگہ پر پیتے تھے' کبھی عابد رضا' بیوی اور بیٹی کو لیے والدین کی خیریت دریافت کرنے پہنچ جاتے اور کبھی رضا عثمان صاحب پوتی اور بیگم کے ہمراہ عابد رضا کے ہاں آن موجود ہوتے۔ ایک بات جو دونوں صورتوں میں مشترک ہوتی وہ تھی انعم کے ہاتھ کی چائے۔

اس وقت وہ سب افراد خانہ رضا عثمان صاحب کے گھر موجود تھے' جب عابد رضا نے اپنے والد کو بتایا کہ کسی یوتھ کمیٹی کے زیر اہتمام منعقد کروائی جانے والی آرٹ ایگزیبیشن میں انعم کو اپنی تین پینٹنگز کے ہمراہ شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

"مگر ابا جی! ہم اسے کیسے بھیجیں؟ عابد تو آج کل بہت ہی بزی ہیں۔" غالباً" صفیہ عابد' بیٹی کو انجان شہر میں نہیں بھیجنا چاہتی تھیں' جب ہی انہوں نے عذر پیش کیا۔

"تو بیٹا جی! آپ بھی تو نوننٹی فرسٹ سنچری دو من ہیں' آپ چلی جائیے ساتھ' بیٹی کے آگے بڑھنے میں اس کی معاونت کیجئے۔" رضا عثمان صاحب نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"م۔۔۔ میں۔۔۔ ابا جی وہ۔۔۔ یہ ایک ہی دن میں گھر تلپٹ کر دیں گے پیچھے سے۔" وہ سادہ لوح سی گھریلو خاتون تھیں جانے کا سن کر ہی گھبرا گئیں۔

"تو پھر میں چلا جاتا ہوں اپنی بیٹی کے ساتھ۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا۔

"نہیں دادا ابو! آپ نہیں' آپ تو پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتے اور ویسے بھی ابھی دو' چار دن ہیں' کوئی نہ کوئی ارینج ہو جائے گا۔" انعم نے سہولت سے منع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"لوگ تو اپنی منگیتروں کو اتنی اتنی لمبی کالز کرتے ہیں اور تمہیں میں نے دو' چار میسج کیا کر دیے' تم نے تو ڈانٹ شروع کر دی' کیا ہوا؟ خیریت؟ کسی نے ڈانٹا جو مجھے مس کر رہی ہو؟ کچھ چاہیے جو مجھے یاد کیا؟ حد ہو گئی' یعنی میں بغیر کسی وجہ کے تمہیں یاد بھی نہ کروں؟"

وہ کمبل میں دبکی اپنا فیورٹ ڈرامہ دیکھنے کے ساتھ ساتھ نمکین مونگ پھلیوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی' جب اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی اور اس نے سروان کے نمبر پر چند ایک دعائیہ اور مس یو والے ایس ایم ایس فارورڈ کر دیے' اس کی فوراً" کال آ گئی اور اس نے اس کی طبیعت' گھر کے ماحول' دادا' دادی کی صحت کے متعلق اتنے سوالات کر ڈالے کہ وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"او کے او کے ریلیکس' تمہیں پتا ہے نا' مجھے چڑ ہوتی ہے اس سب سے' موبائل ضرورت کی چیز ہے' کھلونا نہیں جو ہم ہر وقت اس سے کھیلتے رہیں۔" اس نے نرم سے انداز میں اسے سمجھایا۔

"اچھا اچھا۔ بھاشن مت دو' پہلے ہی میں بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ تنک کر بولی۔

"کیوں ڈسٹرب ہیں دیوی جی؟"

"آج بھائی کی کمی بہت فیل ہو رہی ہے۔"

"کہو تو پوری کر دوں؟" وہ شریر ہوا۔

"اب اتنی بھی فیل نہیں ہو رہی کہ تمہیں اپنی خدمات فراہم کرنی پڑیں۔"

"اچھا بابا اچھا' جتنی بھی ہو رہی تھی' ہوئی کیوں؟"

"گھر میں کوئی بھی انعم کے ساتھ اسلام آباد والی ایگزیبیشن میں جانے کے لیے دستیاب نہیں ہے' وہ ڈس ہارٹ تو ہوئی ہو گی نا؟ ویسے کہتی نہیں یہ اور بات ہے۔"

"بے وقوف ہو تم۔" اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیوں؟ انعم کے لیے پریشان ہونا بے وقوفی ہے؟"

"نہیں یار! مگر تم لوگ آ جاؤ نا' یہاں میرے فلیٹ میں آرام سے رہ لینا۔ اتنی بھی خبر نہیں تمہیں کہ تمہارے منگیتر نے زمانۂ طالب علمی میں ہاسٹل کے جھنجھٹ سے بچنے کے لیے فلیٹ خرید لیا تھا اور اب

دوران ملازمت بھی میں وہیں مقیم ہوں۔"

"تم۔ تمہارا اسلام آباد ٹرانسفر کب ہوا؟ پھوپھو نے پرامس کیا تھا' تم جوں ہی اسلام آباد آؤ گے مجھے پورے کا پورا کیپٹل سٹی دکھاؤ گے۔"

وہ اپنی لاعلمی اور پھوپھو کی وعدہ خلافی پہ روہانسی ہو گئی۔ سروان کہہ کر پچھتایا' کیونکہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے سبب اس نے امی سے درخواست کی تھی کہ وہ فی الحال ماہ نور کو اس کے تبادلے کے متعلق لاعلم ہی رہنے دیں۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ لہٰذا اب جیسے تیسے کر کے اس کو بات سنبھالنی تھی۔

"اسی ہفتے سوچا تھا ویک اینڈ پہ تمہیں آکر لے جاؤں گا' سرپرائز دینا چاہ رہا تھا نا!"

"اچھا!" اس کے منہ سے بے یقین سا اچھا نکلا۔

"اب ایسا کرو کہ اس وقت سو جاؤ اور صبح تم اور ماہ نور اپنی پیکنگ کر لینا یہاں آنے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے میں صبح صبح اٹھ جاؤں گی۔" وہ خوش ہو گئی تھی۔

"ہم نے کرل اور سنو فیصل آباد سے اسلام آباد شاید تم دونوں کو اکیلے ہی آنا پڑے۔"

"ہم دونوں اکیلی؟" اس نے پریشانی سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہاں ادھر سے عابد ماموں اسٹیشن تک چھوڑ دیں گے' یہاں سے میں پک کر لوں گا' ٹرین میں تو اتنے سارے لوگ ہوتے ہیں' ویسے بھی اب تو تم بڑی ہو گئی ہو اور سمجھ دار بھی۔"

آخری جملے کا اضافہ اس نے ماہ نور کی پریشانی کم کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر رہا۔ وہ فوراً ہی مطمئن ہو گئی اور فون بند کرنے کے کچھ ہی دیر بعد سو بھی گئی' جبکہ عموماً وہ رات گئے تک جاگنے کی عادی تھی۔

☼ ☼ ☼

سروان کا نام سن کر تو کسی کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہ بچی تھی۔ لہٰذا نہ صرف انہیں آسانی سے اجازت مل گئی' بلکہ وہ اسی روز اسلام آباد کے لیے روانہ بھی ہو گئیں۔

ماہ نور تو تھی ہی سدا کی لاپروا' تھل اور ایڈونچر پسند لہٰذا وہ بے فکری سے ٹرین کے سفر کو انجوائے کر رہی تھی' جبکہ انعم کو اگر کوئی گھبراہٹ تھی بھی تو اس کے چہرے سے اس چیز کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ البتہ ابو' دادا ابو' پھپھو اور سروان کی یکے بعد دیگرے آنے والی کالز سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ سب ان دونوں کے لیے کس قدر فکرمند تھے۔ مگر ان دونوں نے جس سکون اور رسانیت سے ان سب کو مطمئن کیا' اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا' ورنہ وہ جس رفتار سے فون کھڑکاتے جا رہے تھے' کوئی بعید نہیں تھا کہ سارا سفر موبائل ماہ نور اور انعم کے کان سے لگا رہتا۔

ماہ نور کی ضد تھی کہ آج اور ہر صورت میں آج ہی جانا ہے' سب نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار تو ڈال دیے' مگر انہیں تیاری اور پیکنگ کرتے کرتے نکلتے نکلتے شام ہو گئی اور اب تو ٹرین کو چلے ہوئے بھی گھنٹہ ڈیڑھ گزر گیا تھا' یعنی شام ڈھل چکی تھی اور رات اپنے پر پھیلا رہی تھی۔

انعم تو سرِ شام ہی سو جانے کی عادی تھی عشاء کی نماز کے بعد وہ صرف سب کو چائے دینے تک جاگا کرتی تھی اور اس کے فوراً بعد سو جاتی' کیونکہ اسے صبح بہت جلدی اٹھنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابھی بھی وہ کچھ دیر نیم غنودگی کی کیفیت میں ماہ نور کی باتوں پہ سر ہلاتی رہی اور پھر جلد ہی نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی۔ رات گئے تک جاگنے کی عادی ماہ نور کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اس نے کچھ دیر موبائل پہ گیم کھیلی' پھر فرینڈز کو میسجز کرتی رہی' مگر جلد ہی وہ ان دونوں مصروفیات سے اکتا گئی۔ وہ لیڈیز کے لیے مخصوص ڈبے میں تھیں۔ تقریباً سب ہی خواتین حسبِ توفیق باتیں بگھارنے کے بعد اونگھ رہی تھیں۔ ماہ نور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنے لیے کوئی دلچسپی ڈھونڈتی رہی' مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے وہ اپنا دل بہلا لیتی۔

"پتا نہیں یہ اس زلزلہ نما میں اتنے آرام سے کیسے سو گئی۔ اس نے سوچا تھا تب ہی کسی چیز نے اس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی تھی۔

☼ ☼ ☼

انعم کے شولڈر بیگ سے جھانکتی اس کی پرسنل ڈائری تھی۔ جسے اس نے اکثر انعم کے ہاتھ میں' اس کی رائٹنگ ٹیبل پہ' اس کے دراز میں دیکھا تھا۔ واہ یہ ڈائری اچھا ٹائم پاس ثابت ہو گی۔ اس نے بہت احتیاط سے پوری زپ کھولی اور ڈائری نکال کر ہاتھ میں پکڑنے کے بعد اسی احتیاط سے زپ بند کر کے بیگ انعم کے پہلو میں ڈال دیا۔ بیگ اس کے پاس رکھنے کے بعد اس نے ایک تجزیاتی نگاہ انعم پہ ڈالی' وہ یقیناً گہری نیند میں تھی۔ اس نے ذرا سا رخ موڑ کر انعم کی طرف پشت کر لی اور سیٹ پر جیسے تیسے کر کے آلتی پالتی مار لی۔ مارے تجسس کے اس نے کھٹ سے ڈائری کھولی تھی۔ اس میں سے کچھ نکل کر گرا' ماہ نور نے ذرا سا جھک کر اسے اٹھایا' یہ کوئی مڑی تڑی سی تصویر تھی جو کافی پرانی تھی اور اس کے کونوں کو اس مہارت سے موڑا گیا کہ لگ رہا تھا کہ درمیان میں موجود ساتھ ساتھ کھڑے دو افراد کے سوا کوئی چیز اس کا منظر کا حصہ نہیں ہے۔ ماہ نور نے تصویر کھول کر دیکھی اور حیرت سے سن رہ گئی' انعم نے کنارے موڑ کر سروان کے دائیں جانب کھڑی ماہ نور کو پس منظر کا حصہ بنایا تھا۔ اس کی نظریں بے اختیار اس صفحے پہ آٹھہریں جہاں سے تصویر نیچے گری تھی۔ بڑی خوب صورت لکھائی میں ایک ہی جملہ لکھا تھا۔

"شاید اس تصویر کے سوا ہم کبھی بھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

ماہ نور نے سیدھے کیے ہوئے کناروں کو آزاد چھوڑا تو وہ یک لخت پیچھے کی جانب مڑ گئے۔ ماہ نور ایک دفعہ پھر سے کٹ کر پس منظر میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"سنا تھا خالص جذبے اثر رکھتے ہیں' پھر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ میں اس کی کال ریسیو کروں تو وہ آواز بھی نہیں پہچان پاتا؟ سارے خاندان میں میرے ہاتھ کی چائے مشہور ہے اور وہ کہتا ہے۔ رہنے دو انعم' میں خود بنا لوں گا۔" دنیا میں کتنے ہی خوب رو اور ذہین مرد موجود ہیں' پھر میرے دل کے آنگن میں وہی کیوں بہار بن کر اترا جو میری بہن کا نصیب ہے' یہ دل ہمکا بھی تو کس کے نام پہ؟ کیسی ستم ظریفی ہے یہ قدرت کی؟ میں کروں تو کیا کروں؟ جاؤں تو کہاں جاؤں کہاں؟ مجھے تو وہ کبھی جی بھر کے دیکھنے کو بھی نہیں ملا' پھر کیوں اس کا نقش حفظ ہو گیا مجھے؟ اس نے تو کبھی مجھے نظر بھر کر دیکھا بھی نہیں' پھر کیوں میں اس کے من پسند رنگوں کے سوا کچھ پہن ہی نہیں سکتی؟ کتنی خواہش تھی میری کہ اس کے گھر کو دیکھوں' اس کے ساتھ بہت سارے دن رہوں' وہ دن میں کئی بار میرے سامنے آئے' میرا بار بار اس سے ٹکراؤ ہو' کبھی ناشتے کی میز پہ' کبھی لان میں بیٹھے ہوئے' کبھی ٹی وی دیکھنے کے دوران۔

کتنی بے وقوف ہوں نا میں ہمیشہ اس بات سے نظریں چراتی آئی ہوں کہ میرا اس سے رشتہ کیا ہے؟ میرے اندر کی شرم' میرے اندر کی غیرت شاید مر چکی ہے' جو میں ماہ نور کی مدد پر اس کی شکر گزار نہیں' بلکہ یہ سوچ رہی ہوں کہ کاش وہ منظر سے غائب ہو جائے' کاش یہ دن صرف ہم دونوں کے ہو جائیں۔

یہ سچ ہے کہ میرا دل اس حقیقت سے نظریں چراتا ہے کہ وہ میرا بہنوئی ہے' مگر میرے دماغ میں تو کوئی خلا نہیں' نہ میں بہن کا برا چاہتی ہوں' میں تو صرف اسے جی بھر کو دیکھنا چاہتی ہوں' اس کے ساتھ کو محسوس کرنا چاہتی ہوں' اس کے ساتھ' صرف اس کے ساتھ کچھ لمحے جینا چاہتی ہوں۔ جب صرف میں اور وہ ہوں۔ پھر چاہے وہ مجھے کبھی نہ ملے' میں اسے کبھی نہ دیکھ پاؤں' مگر کوئی یاد تو ہو گی نا میرے پاس اپنی محبت کی۔ اب تو کچھ بھی نہیں' میرے پاس' کوئی ایک خوشگوار لمحہ بھی ایسا نہیں' جس میں جھانکوں تو وہ ساتھ نظر آئے'

پاس دکھائی دے قریب محسوس ہو۔

اور میری بھولی بہن' میری معصوم سی ماہ نور' وہ شفاف آنکھوں والی ننھی پری اگر میرے دل کا میلا پن میری نظر کی چوری دیکھ لے تو میں کیسے نظریں ملاپاؤں گی اس سے؟ اگر وہ جان جائے تو نہ جانے کتنی قیامتیں ٹوٹ پڑیں اس پر۔"

آج کی تاریخ میں اتنے ہی صفحات لکھے گئے تھے۔ یہ بے ربط سے جملے اس بات کے شاہد تھے کہ انہیں بہت ابتر ذہنی حالت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ نہ جانے کب کس بات نے ماہ نور کی آنکھوں کو نم کردیا اور اب وہ بھیگی پلکوں کے ساتھ کبھی ڈائری پہ لکھے الفاظ کو اور کبھی ہاتھ میں دبی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"لیڈیز اے۔" ماہ نور کمبل میں دبکی بیٹھی تھی' جبکہ انعم زمین پر بیٹھی پاس رکھے اٹیچی کی بیرونی جیبیں کھنگال رہی تھی' جب سروان ایک ٹرے میں تین کپ چائے لے کر کمرے میں آیا۔ انعم کی چائے اس نے اس کے قریب موجود ٹیبل پر رکھی اور خود آکر بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھ گیا۔ چائے کی ٹرے اس نے اپنے اور ماہ نور کے درمیان رکھ لی تھی۔

"کیا ہوا؟ تھک گئی ہو؟" وہ اس کے لیے متفکر سا تھا۔

"نہیں... سر درد کررہا ہے بس۔" اس نے ناخن کھرچتے ہوئے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

"ٹیبلٹ لاتا ہوں۔" وہ فوراً" اٹھا تھا' مگر پھر کچھ سوچ کر مڑا۔

"تم نے تو ڈنر بھی نہیں کیا' ٹیبلٹ بھلا کیسے دوں تمہیں؟ اچھا یہ چائے ہی لے لو بس اور سو جاؤ' صبح تک ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے کہتے ہوئے چائے کا کپ ہاتھ میں لے کر اس کی طرف بڑھایا' پھر وہ انعم سے مخاطب ہوا۔

"انعم! اگر ابھی کرنے والا تمہارا کوئی کام ہے تو تم باہر لاؤنج میں کرلو۔" مختصر سی بات کرکے وہ اس کا جواب سننے کو بھی نہیں رکا تھا۔ اور پھر سے ماہ نور کی جانب متوجہ ہوگیا تھا "اور تم جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ' اجنبی لگ رہی ہو اتنی خاموش بیٹھی ہوئی۔"

ماہ نور اس کی بات پہ ہلکا سا مسکرائی' اس نے اٹھتے ہوئے گڈ نائٹ کہا اور روم سے باہر نکل گیا۔

"سر دبا دوں؟" اس کے فسوں سے آزاد ہوتے ہی وہ ماہ نور کے قریب آبیٹھی۔

"نہیں۔ اسے سنبھال لو۔" ماہ نور نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ہاتھ کمبل سے باہر نکال کر ڈائری اس کی گود میں رکھ دی۔ انعم کے لب ذرا سے وا ہوئے' مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکی۔ اس کا ذہن ضرور آندھیوں کی زد میں آیا تھا۔ مگر اسے خود پہ اتنا کنٹرول حاصل تھا کہ کوئی اس کے چہرے سے اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ابھی ابھی لگنے والا جھٹکا اس کے لیے کتنا شدید تھا۔

☼ ☼ ☼

کھڑکی پہ گرے دبیز پردوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی روشنی اس بات کی پیامبر تھی کہ دن چڑھ آیا ہے۔ ماہ نور کی نیند پوری ہوچکی تھی' مگر وہ پھر بھی ابھی تک سُست سی ہوئی کمبل میں پڑی تھی۔ با دلِ نخواستہ وہ اٹھی اور پاؤں میں چپل اڑس کر جمائیاں روکتی ہوئی باہر نکل آئی۔

سروان کا اپارٹمنٹ بہت مختصر سا تھا۔ دو ننھے سے کمرے جن میں سے ایک کو اس نے ڈرائنگ روم کی شکل دے رکھی تھی اور ایک بیڈ روم کے طور پر اس کے زیر استعمال تھا۔ کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ کچن بھی مختصر سا ہی تھا۔ اور ایک طرف ایک ننھی سی گیلری نما راہ داری تھی جو تازہ ہوا کے گزر کے لیے تھی۔ ماہ نور سیدھا کچن کی طرف آئی۔ لاؤنج کی طرح یہ بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ انعم کی تلاش میں سروان کے کمرے کی طرف بڑھی' مگر اچانک ایک منظر نے اس کی آنکھوں کو باندھ لیا۔ چوڑی سی سلیب کے سامنے دو اسٹول قریب قریب پڑے تھے۔ جیسے انہیں کرسی کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ سلیب پہ چائے کے دو خالی کپ بھی موجود تھے۔ نہ جانے کتنی دیر وہ وہیں کھڑی رہتی' مگر کسی آہٹ نے اسے اس منظر کے اثر سے آزاد کرادیا۔ وہ پیچھے کی طرف مڑی۔ انعم ہاتھ میں کوئی چیز لیے سروان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ ماہ نور کی گہری جانچتی نظروں نے اسے ذرا سا نروس کردیا۔

"وہ رات سروان نے ہمیں اپنے روم میں ٹھہرایا تھا اور خود اسے ڈرائنگ روم میں سونا پڑا تو صبح جاتے ہوئے وہ مجھے بتا گیا کہ کمرے میں کچھ چینجنگ کرکے اسے عارضی طور پر بیڈ روم بنا دوں۔"

انعم نے لمبی چوڑی وضاحت دی۔ ماہ نور کا دل تاسف سے بھر گیا۔ یہ کیسے حالات پیدا ہوگئے کہ اب انعم اسے اپنے اٹھنے بیٹھنے کی بھی وضاحت دینے لگی تھی۔ ماحول کی سختی کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے اسی شگفتہ سے لہجے میں پوچھا "آفس چلا گیا وہ؟"

"ہاں... ساڑھے آٹھ بجے ہی چلا گیا تھا۔"

"اچھا پھر میرا ناشتا بنادو۔" ماہ نور نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ اس کی اس بات پہ انعم کھل ہی اٹھی اور پھرتی سے اس کا ناشتا بنانے میں جت گئی۔

☼ ☼ ☼

کلرز' اسکیچز' ایزل' کینوس اور انعم کے مہارت سے چلتے ہاتھ... اس سب میں انعم کہیں کھو ہی گئی تھی۔ انہیں آج یہاں آئے تیسرا دن تھا۔ انعم اور سروان جاکر ایگزیبیشن کے لیے انٹری بھی کر آئے تھے اور وہ تھیم بھی لے آئے تھے۔ جس کو اسٹیپ وائز پینٹ کرکے تین پینٹنگز کی صورت ڈھلنے کرنا تھا۔ اسے لگا انعم مصروفیت کے بہانے اس سے فرار چاہ رہی تھی۔ ماہ نور کچھ دیر سوچتی رہی' پھر اپنے کمرے میں موجود ٹیلی فون اسٹینڈ کے پاس آگئی۔ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں فون کی جانب دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے نمبر ڈائل کر ہی لیا۔ غالباً" تیسری بیل پہ کال ریسیو کی گئی۔

"السلام علیکم پھپھو! کیسی ہیں آپ؟" وہ تسنیم پھپھو کی آواز سن کر کھل اٹھی۔

"ٹھیک ہوں میرے چاند' تمہارا دل لگا؟ پریشان کرکے رکھ دیا سب کو۔" وہ بیک وقت اسے پچکار بھی رہی تھیں اور اپنی فکرمندی کا اظہار بھی کررہی تھیں۔

"پھپھو! جہزی سے کہیں' مجھے آکر لے جائے۔" نم سی آواز میں درخواست کی گئی۔

"کہاں لے جائے میرے بچے؟"

"آپ کے پاس' میں آپ کی گود میں سر رکھنا چاہتی ہوں' پھپھو! یہاں نہیں رہا جارہا مجھ سے۔"

"بیٹا! تھوڑے سے ہی تو دن ہیں' جیسے تیسے کرکے گزار لو میری جان۔"

"ان تھوڑے سے دنوں میں میرا دم گھٹ گیا تو؟"

"نہیں چندا' اللہ نہ کرے۔"

"پھپھو! مجھے یہاں کی خاموشی سے خوف آنے لگا ہے' آپ کو پتا ہے نا تنہائی سے کتنی وحشت ہوتی ہے مجھے' پھپھو ان لوگوں کے پاس ٹائم نہیں اور میں ذہنی بیمار بن جاؤں گی ان کے بیچ رہ رہ کر۔"

"کب ٹائم نہیں ہوا نور؟ کتنی دفعہ تو سروان نے تمہیں باہر جانے کا کہا' تم ان کے ساتھ خود ہی نہیں گئیں۔"

"پھپھو! مجھ سے نہیں جایا جاتا ایسی جگہوں پہ جہاں ڈھیر سارے آفیشل یا کاغذی معاملات نمٹانے ہوں۔"

"تو میری لعل! پھر ان دونوں سے بدگمان تو مت ہو۔"

"پھپھو! آپ مجھے اپنے گھر نہیں بلوانا چاہتیں نا؟ گنتی کی ملاقاتیں ہوئی ہیں' ہماری منگنی کے بعد' خود تو آپ آتی نہیں' مجھ پر بھی پابندی لگادی۔" وہ پھٹ ہی پڑی۔

"میرے بچے! دنیا والوں کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے۔ سروان سے منسوب ہوکر ہمارے گھر آکر رہوگی تو لوگ باتیں کریں گے نا۔" انہوں نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"میں یہاں بھی تو سروان کے گھر ٹھہری ہوئی ہوں۔"

"لیکن بیٹا! اس گھر میں تمہارے قیام کی کسی کو خبر نہیں' سب کو یہ ہی پتا ہے کہ تم دونوں ہاسٹل میں رہ رہی ہو۔ اگر تم ٹیکسلا آگئیں تو یہاں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت فیصل آباد کے لیے رخت سفر باندھے رکھتا ہے' پھر ادھر کے رشتہ داروں کو پتا چل جائے گا اور کتنی غلط بات ہوگی نا؟"

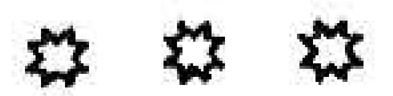
"کون سے رشتہ دار پھپھو؟ میرے ننھیال والے؟ آپ کے سسرالی یا فیصل آباد والے محلے دار؟ کیا ان میں سے کوئی بھی ماہ نور سے زیادہ اہم ہے؟"

"نہیں ہے۔" پھپھو نے ہار ماننے والے انداز میں کہا۔

"تو پھر جیدی کو بھیج دیں۔ میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی ورنہ۔"

"نور بیٹا! اتنا جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟"

"اس لیے کہ اتنی قریب آکر رہا نہیں جا رہا مجھ سے۔ پھپھو! لیلیٰ کسی کو پتا نہیں چلے گا' لیکن میں یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتی کوفت ہونے لگی ہے مجھے۔ پتا نہیں کتنی منفی سوچیں آتی رہتی ہیں' خالی دماغ میں اکیلے بیٹھ کر۔" اس کے پاس ان کی ہر بات کا جواب موجود تھا۔ اس نے یہ طے کرکے انہیں فون ملایا تھا کہ اپنی منوا کر ہی دم لے گی اور وہی ہوا۔ پھپھو نے یہ کہتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے کہ "اچھا میں جیدی کو بھیجتی ہوں آج ہی۔"



"تم کیوں جا رہی ہو؟" وہ مصروف سے انداز میں اپنے کپڑے مشترکہ اٹیچی سے نکال کر ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھ رہی تھی' جب انعم نے اس سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں خود کو یہاں مس فٹ فیل کر رہی ہوں۔"

"نور! ہم واپس چلے چلتے ہیں۔"

"کیوں؟ واپس کیوں؟ تم تو اس میریکل (معجزہ) کے انتظار میں تھیں نا کہ کوئی جادو کی چھڑی آئے اور مجھے منظر سے غائب کر دے تو دیکھو اللہ نے میرا دل اچاٹ کر دیا یہاں سے۔"

"اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو؟" وہ روہانسی ہوگئی۔

"ہونہہ۔۔۔ بدگمانی؟ تمہاری باگیں تڑاتی محبت سے بڑی حقیقت تو ہماری منگنی بھی نہیں اور تم اسے محض میرا گمان کہہ رہی ہو۔"

"مجھے معاف کردو' میرے باغی دل کی سرکشی کو اپنے ذہن سے جھٹک دو۔"

ماہ نور کے سخت لہجے پر انعم کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "جانتی ہو کتنا نامناسب ہے تمہارا جانا؟ کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو؟" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر انعم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "انعم!"

"کہو۔" یک لفظی اجازت۔

"کچھ الٹا ہو گیا تو تمہاری لک۔۔۔ سب سیدھا رہا تو میرا نور اور بخت!"

"اللہ نہ کرے۔" انعم دہل ہی گئی۔ "تمہارے ساتھ کچھ الٹا ہوگا تو میں اسے اپنی گڈلک سمجھوں گی؟ سوچ بھی کیسے لیا تم نے؟"

"جہاں ہماری سوچ ختم ہوتی ہے وہیں قسمت کا کھیل شروع ہوتا ہے نہ جانے یہ کھیل میری جھولی میں جیت ڈالے گا یا ہار۔"

"اوف۔۔۔ تو تم اس لیے منظر سے غائب ہو رہی ہو تاکہ حالات کو واقعات میں نقب زنی کا موقع ملے۔ کتنی عجیب ہو تم' اپنی متاعِ کل لگا رہی ہو اس کھیل تماشے میں؟"

انعم نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے سر جھکا لیا' مگر بولی کچھ نہیں۔

"کیوں یہ ظلم کرنے لگی ہو؟ میرے اور سروان کے ساتھ کیا دشمنی ہے تمہیں؟ جانتی ہو اگر اس کے رنگ ڈھنگ بدلے تو بددیانت کہلائے گا وہ' میں لڑکھڑائی تو

غاصب کے نام سے جانی جاؤں گی' کیوں اتنے بھاری اعمال کے بوجھ تلے لانا چاہتی ہو تم ہمیں؟"

انعم کے تلخ لہجے میں کیے گئے سوالات نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"یعنی تمہارے لاشعور میں بھی کہیں یہ ہے کہ اگر اس کھیل میں ماہ نور نے اپنے لیے حواری کا کردار منتخب کیا تو وہ فلاش ہو جائے گی؟" اس کے عجیب سے انداز میں کیے گئے سوال پہ انعم گڑبڑا کر رہ گئی۔

"نن۔۔۔ ن۔۔۔ نہیں۔" وہ اتنی حواس باختہ ہوگئی کہ تردید کرنا بھی مشکل لگنے لگا اسے۔

"سنو انعم عابد!" اس نے بہت بدلے انداز میں اسے مخاطب کیا۔ انعم کسی انہونی کے احساس سے بدک کر پیچھے ہٹی اور خوف زدہ نگاہوں سے ماہ نور کی جانب دیکھنے لگی' وہ کہہ رہی تھی۔

"اگر تم جیتیں تو سروان تمہارا' میں جیتی تو ماہ نور تمہاری۔"

"کک۔۔۔ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟" وہ واقعی سمجھ نہیں پائی۔

"میں تمہاری پاک دامنی کی' تمہارے مضبوط ارادوں کی' تمہارے ضبط نفس کی مرید ہو جاؤں گی اگر سروان میرا ہی رہا تو۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تھا' انعم کا حلق خشک ہو گیا۔

"نور! میں آج ہی واپس چلی جاتی ہوں۔" وہ بمشکل کہہ کر شاید بابا کو فون کرنے کے لیے مڑی تھی جب ماہ نور نے اسے کلائی سے دبوچ لیا۔ اس نے اتنی شدت سے انعم کی کلائی کو اپنی گرفت میں لیا تھا کہ مارے تکلیف کے انعم کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"ایسے نہیں انعم! مجھے کونسنگ وکٹری چاہیے' یوں تو میں ساری عمر تم سے خوف زدہ ہی رہوں گی کہ نہ جانے کب تمہاری محبت کا سحر چل جائے اور وہ تمہارے زیر اثر آجائے۔"

وہ آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے قطعی انداز میں کہہ رہی تھی' انعم روہانسی ہوگئی اور بولی۔

"اتنی کم ظرف نہیں ہوں کہ اسے تم سے چھینے کا۔"

"تمہارا ظرف ٹھیک سات روز بعد اپنی مجسم حالت میں میرے سامنے ہوگا۔" ماہ نور نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"زندگی کھیل نہیں ہے نور!" انعم نے بے بسی سے کہا۔

"کھیل نہیں' مگر مقابلہ ضرور ہے اور میں تم سے یہ احسان تو کبھی نہیں لوں گی کہ تم میرے لیے میدان خالی چھوڑ جاؤ اور میں بلا مقابلہ منتخب ہوں۔ مجھے اپنا وجود منوانا ہے' اپنی اہمیت تسلیم کرانی ہے تم سے بھیک نہیں لینی۔"

اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"نور! کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ وہ میرا تھا ہی کب جو میں اسے تم کو بھیک دوں گی' وہ تو ہے ہی تمہارا۔ میں تو تم دونوں کے درمیان کہیں ہوں ہی نہیں۔"

"کاش تم واقعی اتنی حقیقت پسند ہوتیں انعم بی بی!" ماہ نور نے طنز سے کہا۔

انعم ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی' ماہ نور کے انداز و اطوار نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ ضدی سی نور جو ٹھان چکی ہے وہی کرے گی۔ وہ بے بسی سے لب چبانے لگی۔

☆ ☆ ☆

دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی۔ چند لمحے اسے انتظار کرنا پڑا تھا' پھر انعم نے دروازہ کھول دیا۔

"انعم یو کین ٹرسٹ می۔" غالباً وہ چیخنی کی آواز سن چکا تھا۔ اگرچہ اس نے نرمی سے ہی کہا تھا' مگر اس کے لہجے میں جو تاسف تھا' اس نے انعم پہ گھڑوں پانی پھیر دیا۔

"وہ۔۔۔" اسے فوری طور پر کوئی بہانہ نہ سوجھا۔

"اٹس او کے۔" سروان نے اس کی مشکل آسان کردی۔ "مجھے بتاؤ' اندر آجاؤں یا یہیں سے ویٹرز کی طرح چائے دے کر لوٹ جاؤں؟" اسے دروازے سے ہٹتے ہی بنی۔

"چائے اچھی بناتا ہوں نا میں؟" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے دوستانہ سے انداز میں پوچھا' انعم نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ اثبات میں سرہلا دیا۔

"کتنا کام رہ گیا ہے تمہارا؟" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتا ہوا کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ انعم تمام آداب بھلا کر کونے میں پڑی چیئر پر جا بیٹھی تھی کیونکہ یہی ایک چیز تھی جو کاؤچ سے زیادہ سے زیادہ فاصلے پہ پڑی تھی۔

"آئی نو انعم! ہم میں کزنز والی روایتی بے تکلفی کبھی نہیں رہی' مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ ماہ نور کے جانے کے بعد تم کچھ زیادہ ہی ان ایزی ہوگئی ہو' میں تو صرف تمہیں ریلیکس کرنے کے لیے تم سے بات کرتا ہوں۔ نور تو یہاں کے ماحول سے گھبرا کر چلی گئی' مگر تمہارا یہاں ٹھہرنے رہنا تمہارے فیوچر کے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تم اتنی ڈسٹرب ہو تو میں کسی ہاسٹل میں یا ہوٹل میں ارینج کرا دیتا ہوں۔"

وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آہستہ آہستہ بولتا رہا' انعم نے جب اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کپ کو سختی سے ہاتھوں میں تھامے' کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ اسے اس سے وہ بہت کریس فل سی لگی۔ وہ یہاں پر بیٹھی اتنی جچ رہی تھی کہ اسے لگا' اگر وہ یہاں نہ ہوتی تو یہ کونہ ادھورا لگتا' وہ اتنی بے نیازی سے بیٹھی تھی کہ لگا جیسے کوئی مجسمہ نصب کر دیا گیا ہو' وہ کونہ جیسے اس کے وجود سے سج گیا تھا۔

"انعم!" اس نے اسے شریک گفتگو کرنا چاہا۔ انعم نے ذرا سا سر اوپر اٹھا کر اپنے ہمہ تن گوش ہونے کا ثبوت دیا۔

"تمہارا اور میرا مزاج بہت ملتا ہے' پسند ناپسند' سنجیدگی' متانت ہر بات۔ تم اتنی پرفیکٹ لگ رہی ہو یہاں بیٹھی ہوئی کہ یوں لگ رہا ہے تم اس منظر کا سب سے اہم حصہ ہو۔ یوں لگ رہا ہے کہ تم اٹھیں تو یہ جگہ ویران ہو جائے گی۔"

وہ اپنی ہی رو میں کہے گیا' یہ جانے بغیر کہ اس کے الفاظ انعم کے دل پر ہتھوڑے برسا رہے ہیں' اس نے گھبرا کر سر اٹھایا' پہلے خود کو اور پھر کمرے کے در و دیوار کو دیکھا' آخر میں اس کی نظریں سروان کے چہرے پر آرکیں' وہ اسی کی جانب متوجہ تھا۔ انعم سے نظریں چار ہونے پر اس کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ دھڑکن کی لے کیا بدلی' یکایک آنکھوں میں شوق کا اک جہان آباد ہو گیا۔

سروان کے لیے یہ لمحہ اثر تھا۔ کوئی جذبہ بہت ہی لطیف انداز میں اپنا وجود منوانے میں کامیاب ہوا تھا۔ جب ہی اس کے وجود کو سرشاری کی چمک نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ انعم کے لیے یہ لمحہ خبر تھا جو اسے ایک ایسی فتح کی نوید دے گیا تھا' جس نے اس کے جسم سے توانائی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ ان چاہی جیت اس کی ذات کو آندھیوں کے حوالے کر کے اسے بے جان سا کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ جو میرے ساتھ ہو رہا ہے کیا یہ انعم نے کیا؟" وہ گھٹنوں میں سر دیے سوچ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اضطراری کیفیت میں بائیں ہاتھ کی انگلی میں موجود چھلے کو حرکت دے رہی تھیں۔

"شاید نہیں۔ بلکہ وہ تو اس بات سے شاید خوش بھی نہیں ہے۔"

"پھر۔ پھر کیوں یہ ہو گیا؟ سروان؟ سروان تو کبھی اتنا دل پھینک نہیں رہا اور میں؟ مجھ میں کیا کمی ہے؟"

موبائل کی بپ نے اس کی سوچوں کا ارتکاز توڑ دیا تھا۔ سروان کی کال تھی۔

"کہو۔"

"نور! مجھے معاف کر دینا پلیز۔" ملتجی سا انداز تھا۔

"سروان! رشتے اتنے کچے تو نہیں ہوتے کہ ایک جھٹکے میں ٹوٹ جائیں۔"

"آئی نو لٹل گرل۔ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں' اتنا ہی جتنا کہ فیملی کا کوئی بھی اور فرد کرتا ہے' بٹ میں کیا کروں؟ میں تمہیں یہ تکلیف دینے پر مجبور ہوں۔ آئی ہیو نو اسپیشل فیلنگز فار یو۔ میں تمہارے اور

اپنے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا' تم مجھے بہت عزیز ہو۔"

"اپنی عزیز سے جینے کا جواز ہی چھیننا چاہتے ہو؟" وہ رو ہی پڑی۔

"نہیں میری گڑیا' میری دوست میری پیاری کزن' تم بہت اسپیشل ہو' آدھی ادھوری' بٹی ہوئی توجہ تمہارا مقدر کیسے بننے دوں؟ تم تو شدتوں اور وارفتگیوں کی حق دار ہو اور میں تقسیم ہو چکا ہوں۔ میں تمہیں خود سے منسوب کر کے تمہاری ذات میں خلا نہیں پیدا ہونے دینا چاہتا۔"

وہ اسے سنبھالا دیتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اپنے قطعی فیصلے کا یقین دلا رہا تھا۔

"سروان! مجھے ہر خلا منظور' جب تم میرے لیے اتنا سوچ سکتے ہو تو میں بھی تم سے کو آپریٹ کر سکتی ہوں' میں تمہیں سیٹل ہونے کا ٹائم دوں گی۔ تمہیں واپسی کے لیے جتنا وقت چاہیے میں۔۔۔"

"ماہ نور پلیز۔" اس نے شاید زندگی میں پہلی بار اس کی بات کاٹی۔ "میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے شرمندہ ضرور ہوں' مگر تمہارے متعلق میرے دل میں اس وقت جو واحد خواہش ہے' وہ یہ کہ تم مجھے معاف کر دو۔ اس کے سوا میرے پاس تم سے وابستہ کوئی تمنا تک نہیں' آئی ہیو نتھنگ فار یو۔"

"ایسا بھی کیا ہو گیا اتنے سے وقت میں کہ تمہارے پاس میرے لیے کچھ بھی نہیں رہا؟" آواز کی نمی چھپانے پہ اب اس کا اختیار نہیں رہا تھا۔

"بات سالوں' صدیوں کی نہیں ہوتی' یہ تو کوئی ایک لمحہ ہوتا ہے جو ہمارے ارد گرد اجالا کر دیتا ہے۔" سروان نے بڑے جذب کے عالم میں کہا۔

"اور آپ کسی کی دنیا تاریک کر دیتے ہیں۔" ماہ نور نے تلخی سے تبصرہ کیا۔

"دیکھو ماہ نور! میں بہت اسٹریٹ فارورڈ بندہ ہوں۔ یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا۔ نظر ثانی کی گنجائش نہیں ہے یار! میں خود بہت تکلیف سے گزرا ہوں اس بات کی وجہ سے۔ مگر غیر جانب دارانہ تجزیہ کرنے پر مجھے احساس ہوا کہ انعم نہ بھی ہوتی تب بھی میں اور تم خوش حال زندگی نہ گزار سکتے۔ ہم مشرق و مغرب ہیں۔ آئی نو کہ یہ باتیں مجھے بہت پہلے سوچنی چاہیے تھیں' مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ تم اس بات کو جتنی جلدی قبول کر لو گی اتنی ہی آسانی ہوگی تمہارے لیے' اور پلیز آئی ریکویسٹ یو' انعم کے خلاف کدورت مت رکھنا دل میں۔ شی رئیلی لوز یو۔" (وہ تم سے واقعی محبت کرتی ہے)

سروان نے خاصا وقت صرف کر کے بڑی مہارت سے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔ اب تو کوئی درز بھی نہ بچی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھیل تماشا اختتام پذیر ہوا۔ چاروں شانے چت سروان ہوا تھا اور شکست کا درد ماہ نور کو سہنا پڑا۔

انعم کا کردار خاموش تماشائی سے بھی کم متحرک رہا' مگر پھر بھی قسمت نے کسی کے دل کی رونق چھین کر اس کی مانگ میں ستارے سجا دیے۔ مگر وہ جس نے یہ تماشا سجایا تھا۔ وہ ٹوٹ گئی تھی' بکھر گئی تھی۔ موم کی بنی وہ لڑکی جو جیت کے یقینی احساس سے سرشار تھی' ہار کا سامنا کر نہ پائی تھی۔ وہ تو ماہ نور تھی' جو جلنا جانتی ہی نہ تھی۔ لمحہ بھر ہی تو لگا تھا اور حالات کے گرم تھپڑے اسے وجود سے لاش میں بدل گئے۔ حالات کی حدت نے اسے پلک جھپکنے میں نگل لیا۔ اس نے بساط ضرور سجائی تھی' مگر سروان پر اندھے اعتماد کے ساتھ۔ یہ اعتماد اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑا کرتا تھا' پھر بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس اعتماد کی موت کے بعد بھی وہ جیتی رہتی' وہ چلی گئی' مگر بڑی دھج کے ساتھ سروان کی انگوٹھی پہنے ہوئے۔ اس سے منسوب رہتے ہوئے۔ اس کی منگیتر کہلاتے ہوئے ہی۔

بازی عشق کی تھی تو اسے تھوڑا حوصلہ بھی چاہیے تھا۔ اس بازی میں ہارنے والوں کو مات کہاں ہوتی ہے مگر وہ چھوٹے سے دل کی مالک حوصلہ ہی ہار گئی۔ ☼

سائرہ رضا

تیری محبت

مسجد والی چڑھائی پر پہنچ کر اس نے سائیکل روکی اور طمانیت سے چاروں جانب نگاہ دوڑائی تو سارا کالج وسیع و عریض گراؤنڈ باؤنڈری وال اور باہر مین روڈ پر چلتی گاڑیاں سب نظروں کے سامنے سج گیا۔ احمر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ سائیکل لے کر باہر نکل آئی تھی۔ رات بھر شدید بارش ہوئی تھی اور صبح سے سورج بھی بادل اوڑھ چھپ بیٹھا تھا اس لیے کراچی کی سردی سے خائف لوگ کمبلوں رضائیوں میں خود کو چھپائے سردی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہیں کوئی اکا دکا بندہ بشر ہی باہر نکلا تھا۔

بڑا زمانہ ہی گزرا اس نے چڑھائی پر کھڑے ہو پیڈل پر دو چار پاؤں مار کے پھر ہاتھ سینے پر لپیٹ پاؤں پیڈل پر جما کر ڈھلوان کی طرف پھسلتی سائیکل نہیں چلائی تھی۔ اور جسے ایسی سائیکل چلانے کا تجربہ ہو وہی جانتا ہے اس میں کتنا مزا ہے۔

الٹے ہاتھ پر اسٹاف کالونی کے گھر جو پہاڑی کے اوپر تھے اور نیچے چٹیل میدان سے سیدھے ہاتھ پر کالج کی وسیع و عریض بلڈنگ کالج کے سامنے بڑا سا گراؤنڈ اور اس کے سامنے بل کھاتا گراؤنڈ میں اترتا رستہ۔ اس نے پیڈل پر پاؤں مار کے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ سائیکل ڈھلوان پر اترنے کے لیے اس سے زیادہ پرجوش تھی۔ مگر آہ۔ اب اللہ جانے پہلے وہ ڈری یا سائیکل۔ دونوں رک گئیں۔

اس نے تیزی سے پیر جمائے نکالے گیٹ سے اندر

مکمل ناول



آتے مون بھائی پر اسے یقین تھا کہ اتنی دور سے بھی وہ اسے دیکھ چکے ہیں۔ سیاہ جینز پر سیاہ جیکٹ کالر کھڑے تھے۔ یہ کوئی سرسبز و شاداب پہاڑی علاقہ تو تھا نہیں۔ کراچی کے سوکھے مٹی پہاڑ تھے جنہیں کاٹ کاٹ کر شہر کو پھیلاتے جا رہے تھے مگر اس وقت بارش کے بعد یہاں لگی جھاڑیاں اور خودرو ننھے پودے بھی دھل کر نکھر گئے تھے۔

اب جو ہو سو ہو۔ اس نے آگے بڑھتے مون بھائی کو دیکھا' پھر پیڈل پر تین چار پاؤں مار کے ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے اور بریک پر ہاتھ رکھا' جب اگلا پہیہ مون بھائی کے گھٹنے سے ٹکرایا۔ انہوں نے اپنا اور اس کا بچاؤ کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے ہینڈل پکڑا۔

"ہائے مون بھائی۔۔۔! اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا بڑا اچھا لگا۔"

"جھوٹ۔۔۔ بالکل جھوٹ۔" مون نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ تمہاری آنکھیں چغلی کھانے لگتی ہیں لڑکی!"

"کیا مطلب؟ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ بہت دنوں بعد نہیں آئے یا مجھے اچھا نہیں لگا؟" وہ ڈھٹائی پر اتر آئی۔

"اترو نیچے۔ تمہاری شامت یقینی ہے لڑھکتے نیچے گرو گی ورنہ احمر تو ہے ہی موقع کی تلاش میں۔"

وہ زور سے ہنس دی اور نیچے اتر آئی' اب سائیکل ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔ "اپنی پیش گوئیاں اپنے پاس رکھیں۔ آپ اتنے دن سے تھے کہاں۔۔۔ ڈیڑھ مہینہ تو ہو گیا ہے آپ کو آئے ہوئے بلکہ وہ بھی بشریٰ آنٹی کے ہاں' ولیمے میں ملے تھے۔ صحیح ہے نا؟"

"بالکل درست مگر میں مصروف تھا' ایگزام کی تیاری میں۔ اپنے بھی اور بچوں کے بھی۔۔۔"

مون اپنے اسٹوڈنٹس کو ہمیشہ بچے کہتے تھے۔

"اتنے عرصے بعد آتے ہیں لوگ بھولنے لگتے ہیں آپ کو۔۔۔" اس نے ذو معنی بات کی۔

"تم بھول گئی ہو؟" مون متانت سے مسکرائے۔

"میں "لوگ" تھوڑی ہوں۔" اس نے پورے دانتوں کی نمائش کی۔

مون چلتے چلتے رک گئے۔ "محاورہ تو سنا ہو گا' جسے بیٹھا نظر نہیں آیا اسے کھڑا بھی نظر نہیں آتا۔ یاد رکھنے کے لیے سامنے ہونے کی شرط نہیں' یاد ہونے کے لیے دھیان کا ہونا ضروری ہے۔ کتنی بے وقوفی بلکہ انسلٹنگ بات ہے کہ میں ہاتھ ہلا ہلا کر کہوں' ہیلو آئی ایم ہیئر پلیز لک ایٹ می تو بی لسنیور"

"مائی گاڈ!" عروہ نے اپنے ماتھے پر چپت لگائی۔

"اتنی انا!" مون کے دھیمے قطعی انداز پر وہ حیران رہ گئی۔

اپنے معیار سے گر کر تجھے کیسے چاہوں
سر تو دے سکتا ہوں' دستار نہیں دے سکتا

مون دھیرے سے بولے۔

"اوہ نو۔" عروہ نے سر پکڑا۔

ایک اور بھی ہے۔" مون نے شرارت سے اسے دیکھا۔

تجھ کو چاہا' تیری دہلیز پہ سجدہ نہ کیا
وہ میرا عشق تھا اور یہ میری خودداری ہے

"ہائے مجھے چکر آ رہے ہیں' ہائے میں گری۔" عروہ نے لہرا کر دکھایا۔

"آرام سے۔ آرام سے۔" مون نے اسے شانے سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ "انسان بن کر چلو۔"

"خاک انسان بنوں؟ میں تو جاندار بھی نہیں رہی۔ اتنے اٹل عزائم اتنے سوکھے بے رونق شعر میرا تو لہو ہو گیا ہے ایسی باتیں سن کر یا اللہ!" اس نے سائیکل اسٹینڈ پر لگائی اور سر پکڑ لیا۔

"اب بس کرو' بہت اوور ایکٹنگ ہو گئی۔" مون بھائی نے اسے گھورا۔ "بارش دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔"

"اب میں آپ کو شعر سناؤں گی سمجھے۔"

اونہوں! میں نے تمہارا موڈ خراب کیا ہے' میں ہی ٹھیک کروں گا۔" مون نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی بس منہ پھلا کر انہیں گھورا۔

یہ بادلوں کا شور' یہ کھنکھور قربتیں
بارش میں بھیگتے یہ دو راہ گیر کون ہیں

"واہ واہ مکرر ارشاد۔" عروہ سر دھننے لگی۔

"ایسے شعر کبھی ادھر بھی۔" اس نے آنکھوں سے اشارہ دیا۔

مون اس کے آنکھیں نچانے پر ہنس دیے۔

"سیدھی چلو اور اب تم یوں کرو' یہ میری جیکٹ پہن لو۔" مون نے بڑھتی بارش اور سردی کے پیش نظر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے۔" عروہ نے آنکھیں پھیلائیں۔

"مجھے غور سے دیکھیں میں آپ کی بہن عروہ احسان ہوں کہیں آپ مجھے علشبہ تو نہیں سمجھ رہے۔"

"ڈرامہ بند کرو اور سیدھی چلو اور مجھے یقین ہے احمر گھر میں نہیں ہے۔ لڑکی! باز آ جاؤ ان مشغلوں سے۔" مون بھائی کو دوبارہ سائیکل والا مسئلہ یاد آیا۔

"اوہ تو کیا اب آپ بھی سبق دیں گے یہ لڑکیوں کے لیے صحیح ہے غلط ہے۔" اس نے پیر پٹخے۔

"بالکل نہیں' میرے نزدیک یہ بے ضرر سا شوق ہے مگر لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ احمر ٹین ایج کو چھو رہا ہے' پھر اس کے دوست ہر مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ سو اسے ایسا ویسا کچھ کہیں گے تو وہ برداشت نہیں کرے گا۔ پروفیسر صاحب کا بیٹا شہریار کبھی نہیں کہے گا تمہاری بہن کیا کر رہی ہے مگر جہاں داد خان کا بیٹا زمان خان لازمی بولے گا۔"

"یار! تمہارا بہن سائیکل پر لڑکوں کی طرح گھومتا ہے یہ کوئی اچھا بات ہے۔ احمر انہیں ابھی دلیل سے قائل نہیں کر سکتا۔ لوگ آخری فیصلہ سنا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں' دلیل یا جواب سنتے ہی نہیں۔ باہر جواب دینا آئے گا نہیں' اندر تم مانو گی نہیں' ایسی سچویشن ایکسٹریم ازم کی طرف لے جاتی ہے۔" وہ بہت متانت سے سمجھا رہے تھے عروہ کو ان کا انداز اچھا لگ رہا تھا۔ وہ قائل بھی ہو گئی۔



باہر کی نسبت اندر امی کا کمرا خاصا گرم تھا مگر امی کی سی سی' ہائے ہائے گونج رہی تھی۔ اپنے کمبل کو پاؤں کے پاس سے ذرا اوپر اٹھایا اور مون کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"پیر اندر کر لو۔" مون نے مسکراتے ہوئے تعمیل کی۔ خالہ امی باقاعدہ کپکپا رہی تھیں۔ بیڈ کی پائنتی پر دو رضائیاں تہہ ہوئی پڑی تھیں' مون نے رضائیوں پر کہنی ٹکا لی۔

"عروہ۔ عروہ موم بتی لے آؤ۔ لائٹ نجانے کب آئے۔ سہ پہر کا وقت ہے اور بادلوں اور اس لائٹ جانے کے بعد تو جیسے آدھی رات ہو گئی ہو۔ موسم کا بھی پتا نہیں۔ کتنے دن رہے گی سردی۔۔۔ پرسوں لان کے کپڑے پہنے گھوم رہی تھی اور آج ہی گیارہ سال پہلے کا سلا ویلوٹ کا سوٹ پہننا پڑ گیا اور گیارہ سالوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو صرف پانچ' چھ بار ہی بے چارے کو بکسے سے نکلنا نصیب ہوا ہے۔" امی نے "مہمان سردی" کے اچھے خاصے لتے لے لیے مون دل کھول کر ہنس دیے۔

امی نے پاؤں رگڑے تو مون نے خالہ کو تشویش سے دیکھا۔ "آپ کو بخار وغیرہ تو نہیں چڑھ رہا کیونکہ جیسے آپ کپکپا رہی ہیں۔ سردی بہرحال اتنی نہیں ہے۔"

وہ ان کے پیروں کا لرزنا محسوس کر رہے تھے۔

"بخار نہیں ہے بیٹا!" امی بے چارگی سے گویا ہوئیں۔ "صبح کے کام سمیٹے تو وہ ماسی کم بخت پچھلا باتھ روم دھوئے بغیر بھاگ گئی سو جو دھونا شروع کیا تو پھر جت گئی کیا فرش تو کیا دیواریں... ماسی تو بس ڈھول جھونک کر جاتی ہے۔ اتنی دیر پانی میں رہی پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ اب کسی طور پر گرم ہونے میں آ نہیں رہے۔" امی نے بے بس لہجے میں کتھا سنائی۔

"تو جناب! آپ لوگوں کے لیے آ گئی ہے چائے۔ امی کے لیے ابلے انڈے آپ کے لیے کیک جو بالکل ایسا ہے کہ اگر میں کبھی بناؤں تو اتنا ہی مزے دار ہو اور یہ مسالے دار مونگ پھلی" اب سب اٹھ جائیں' علشبہ آپی اٹھو۔ اس نے اونچی آواز میں پکارا۔ مون نے غیر محسوس انداز میں دروازے کی سمت دیکھا۔

"ارے! پیر گرم کرنے کی تو کوئی گولی بھی نہیں۔" امی نے کہا۔

مون نے اپنے ہاتھ اندر کیے ذرا سا اور اندر گھسے اور خالہ امی کے دونوں پیر دبانے شروع کر دیے۔

"آپ کو اس عمر میں پانی کے کام نہیں کرنے چاہیے تھے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبا دیتا ہوں۔" اب وہ ایڑی مٹھیوں میں بھر بھر کے داب رہے تھے پھر آہستہ آہستہ اوپر ٹانگ سے ابھی ان کا ہاتھ تیچ ہی ہوا تھا۔ خالہ امی کا کمبل زوردار جھٹکے سے چھت تک اوپر اچھل گیا۔ پھر زمین بوس ہو گیا۔ امی چوکڑی مارے بیٹھی تھیں اور وہ اتنی دیر سے بصد احترام' لگن' ہمدردی' محبت کے ساتھ علشبہ کے پیر داب رہے تھے۔ جب تک بات ایڑی تک رہی۔ تب تک تو۔

دراصل پہلے تو گہری نیند کے باعث علشبہ کو احساس نہ ہوا پھر سکون بھی ملنے لگا اور سردی کم ہونے لگی تو وہ شرارت پر آمادہ ہوئی۔

مون کی انگلیاں جیسے ہی ایڑی سے اوپر اٹھیں' علشبہ ڈنک کھا کر اچھلی "یا اللہ!" مون نے ایک نظر علشبہ کے گورے ملائم پیر دیکھے اور ان پر جمی اپنی ہتھیلیاں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کرنٹ کھا کر سیدھے کھڑے ہو گئے علشبہ کو اور اس کے پیروں کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کوئی اژدھا بیڈ سے برآمد ہوا ہو۔ اور عروہ... وہ نیچے کارپٹ پر آلتی پالتی مار کے بیٹھی تھی صورت حال جب سمجھ میں آئی تو کارپٹ پر رول ہو گئی۔ پیٹ پکڑ کے ہنستے ہنستے اس کی سانسیں رکنے لگیں' آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"آپ کو ذرا فرق نہیں معلوم میرے اور امی کے پیروں میں؟" علشبہ نے الٹا چور کوتوال... منہ بنا کر سارا الزام ان پر تھوپ دیا۔

"مم... مم... مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم بھی اس کمرے میں... بلکہ اس بیڈ پر..." مون اٹک گئے۔

"بلکہ اس کمبل میں ہو" عروہ نے جملہ مکمل کیا۔

"آپ بیٹھ جائیں کھڑے کیوں ہیں۔ کسی نے سزا تو نہیں دی۔" علشبہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ وہ اپنی کلائی پر چڑھا بینڈ اپنے بالوں پر چڑھانے لگی۔

"میرے اوپر کمبل ڈال دو ورنہ میں گئی... اور تم اب میرے پاؤں دباؤ۔" امی نے مون کے اڑتے رنگ اور حواس باختگی کو دور کرنے کے لیے نارمل لہجے میں کہا۔

"اور دیکھ کے امی ہی کے پیر" عروہ نے ان کے اندر گھستے ہاتھوں کو دیکھا۔ مون نے ناراضی سے عروہ کا چہرہ دیکھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں صلح جویانہ انداز میں لہرائے۔ "بلکہ پاؤں چھوڑیں یہ چائے پکڑیں آپ۔" عروہ نے ان کی خجالت محسوس کرتے ہوئے خود ہی پلیٹ بنا دی۔

"میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ویسے تو آپ بڑے نخرے دکھاتی ہیں۔ شرم نہیں آتی اتنے بڑے ہیں وہ... یہ کوئی مذاق ہے۔" عروہ نے مون کے ہٹتے ہی لتے لیے۔ "دیکھ رہی ہیں امی آپ؟"

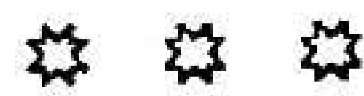
"اب میں کیا کہوں بظاہر تو شرارت ہے مگر علشبہ! مجھے اچھی نہیں لگی۔" امی کبھی ڈانتی نہیں تھیں بس

لہجے کے ٹھہراؤ' تیزی' سختی سے اپنی کیفیت کا اظہار کرتی تھیں۔ علشبہ کو پتنگے لگ گئے۔

"مجھے کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ ہی نے گھسایا تھا اندر۔ اب خوامخواہ۔ جائے دو مجھے۔" اس نے عروہ سے کہا۔ مون واپس آ گئے تھے اور بیڈ کے کنارے ایسے بیٹھے تھے جیسے بس میں ذرا سی سیٹ ملی ہو' ایک اباؤٹ ٹرن آیا اور بندہ نیچے۔

"صحیح طرح سے اوپر ہو کر بیٹھو۔" امی نے کمبل ان کے پیروں پر ڈالا۔ عروہ نے امی کے ساتھ کوئی دوسرا قصہ چھیڑ دیا۔ علشبہ کا دھیان بھی عروہ کی طرف ہو گیا۔

مون نے دزدیدہ نگاہوں سے علشبہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ مجسم خوب صورتی تھی' نوک پلک سے تیار' ملائم ریشمی بال اور۔ مون نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ بے خبری ہی میں سہی۔ بہت غیر محسوس سی مسکراہٹ ہونٹوں پر روشنی کی طرح پھیلی۔ مون نے ایک بار پھر "چوری" کی۔ موم بتیوں کی دھیمی روشنی میں اس کا چہرہ جھلمل کر رہا تھا۔ عارض پر لرزتی پلکوں کے سائے' جیسے دلہن کا کرن لگا دوپٹہ... جو چہرے پر تن جائے تو چہرہ چھپ جاتا ہے۔ پلکوں پر لگی اس کرن نے آنکھوں کو' ان کے تاثرات کو' ان کے رنگ سب کو چھپا لیا تھا۔ جیسے گھونگھٹ اٹھانے کی اجازت ملے گی۔ آنکھوں کی کرن اس کے لیے خود بخود اٹھ جائے گی اور وہ بھی امیدواروں میں سے تھے بلکہ نہیں وہ امیدوار نہیں' تھے' وہ طلب گار تھے۔ بصد احترام' بصد شوق' بصد محبت۔



"تو پھر فائنلی آپ زمیندارنی' ٹھیکیدارنی اور وہ کیا کہتے ہیں سرمایہ دارنی بننے کا فیصلہ کر چکی ہیں۔"

"اتنا بہت کچھ۔" علشبہ ہنسی۔ "میں نے تو صرف گھر والی بننے کا فیصلہ کیا ہے۔"

عروہ پیروں پر کمبل ڈالے کتاب پڑھ رہی تھی۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر علشبہ تھی۔ وہ بڑی فرصت

سے نائٹ کریم کا مساج کر رہی تھی۔ عروہ نے بہت سارے جملے جوڑے اور توڑے۔ وہ ابھی تک علشبہ کے فیصلے کے حوالے سے الجھن میں تھی۔

"پہلی بار ملتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ وہی ہے جس کی آپ کو تلاش تھی؟"

علشبہ کے مساج کرتے ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے آئینے میں ہی نگاہیں اٹھا کر عروہ کو دیکھا۔ "شاید۔"

"سب سے پہلے کیا چیز اچھی لگی تھی۔؟ بات چیت تو بہت دیر بعد ہوئی۔"

"مجھ سے اتنے سوال پوچھ رہی ہو۔ تم نے بھی تو فوراً "تعریف کی تھی۔ واؤ، ٹال، ہینڈسم۔" علشبہ نے اس کے انداز کی نقل اتار کے یاد کروایا۔

"تو وہ تو میں اب بھی کہہ رہی ہوں مگر پتا نہیں کیوں ان کو سر تا پا دیکھو تو "واؤ" ہی نکلتا ہے، پہلا ری ایکشن، پھر وہ ان کی بڑی سی گاڑی مجھے تو نام بھی نہیں معلوم۔ سیاہ شیشے اور جب گاڑی پر جھنڈا لگا ہو تو بندہ زمین سے دو فٹ اونچا ہی چلتا ہے۔ وہ خود تو بعد میں نظر آئے تھے، پہلے تو ہم جیسے گاڑی کی شوشا دیکھ کر ہی الرٹ ہو گئے تھے کہ اب اندر سے جو بھی نکلے گا اس کا احترام کرنا ہے۔ دراصل ان کی پیکنگ اتنی اعلا ہے کہ اندر کی چیز کی طرف دھیان جاتا ہی نہیں۔" عروہ آخر میں ہنس پڑی۔

علشبہ نے اسٹول موڑ لیا۔ اب وہ روبرو تھیں "تم نے اندر کو کیسے جانچ لیا؟" علشبہ کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"اندر کی بات نہیں ہے آپی! مگر مجھے وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ آئی مین۔" عروہ الجھ گئی۔ "مجھے وہ بہت کم علم، کم فہم سے انسان محسوس ہوئے صرف ہیڈ لائن پڑھنے والے۔ میرا نہیں خیال کہ انہوں نے کبھی کسی خبر کا بقیہ پڑھنے کے لیے صفحہ پلٹ کر نمبر ڈھونڈا ہو۔ میرا مطلب۔۔۔"

"بے وقوف ہو تم۔" علشبہ زور سے ہنس پڑی۔ "وہ تو باہر سے پڑھ کر آئے ہیں۔ پہلے ایبٹ آباد کی اسکولنگ اور باقی ساری پڑھائی باہر کی۔۔۔ تم سے۔۔۔"

"یہی۔۔۔ یہی تو میں کہنا چاہ رہی ہوں۔" عروہ نے اس کا جملہ کاٹا اور اچھل کر بولی۔ "وہ مجھے "باہر ہی کے پڑھے لگتے ہیں۔ انہوں نے "اندر" سے واقعی کچھ نہیں پڑھا۔" عروہ کا چہرہ جوشیلا ہو گیا۔ وہ اپنی سوچوں کو نام نہیں دے پا رہی تھی اب جیسے سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

"یہ کیسی فضول بات ہے۔" علشبہ کو برا لگا۔ "تم نے پہلی ملاقات میں یہ سب کیسے جان لیا کہ وہ ایسے ویسے ہیں جبکہ۔۔۔"

"اور آپ نے کیسے جان لیا کہ وہ "ایسے ویسے" نہیں ہیں۔" عروہ نے بات کاٹ کر تیزی سے ہاتھ ہلائے۔

"اس کے لیے دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔" علشبہ بات ختم کرنے کے غرض سے دوبارہ شیشے کی سمت گھوم گئی اس نے مزاحیہ لہجے میں جیسے اس کی کم عمری کو جتایا تھا کہ وہ اس بارے میں مزید بات نہ کرے۔ وہ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے اور بس۔۔۔

عروہ نے شیشے میں اس کے چہرے کا عکس دیکھا اور پل بھر کو خاموش ہو گئی۔

"سکندر سلیمان۔ ہوں۔۔۔ نام کا بہت اثر ہے۔ فوراً "دیدۂ بینا فعال ہو گئی کہ "اندر" چھپی ہوئی باتیں بھی عیاں ہو گئیں۔ مون بھائی بڑے ہی ٹھنڈے بھاگ لے کر آئے ہیں کہ آپ نے ان کی سمت نگاہ تک نہ کی۔"

"یہاں مون کا کیا ذکر؟" علشبہ کے مساج کرتے ہاتھ رک گئے۔ اس نے گردن گھمائے بغیر گھورا۔

"مون ہی کا ذکر ہے وہی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے محض دو ملاقاتوں میں فیصلہ سنا دیا جبکہ مون بھائی جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں جانتی ہوں کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور آپ۔ آپ کو۔۔۔" عروہ کی آواز رنج سے بوجھل ہو گئی۔

"عروہ! تم چھوٹی ہو اور تمہیں ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں اور نہ میں تمہیں اجازت دوں گی۔" علشبہ نے خفگی سے بڑا پن جتایا۔

"میں آپ سے چھوٹی ضرور ہوں مگر چھوٹی ہوں نہیں اور مجھے سچ کہنے کے لیے اجازت کی ضرورت بھی نہیں۔ میری چھٹی حس کہتی ہے وہ دوغلے ہیں۔ ان کا انداز، لہجہ، چہرہ آنکھوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ اندر سے کچھ اور ہیں رک رک کر بولتے ہیں جیسے سوچ رہے ہوں۔"

"تو میں نے بھی انہیں اینکر نہیں بنوانا کہ برجستگی اور تیزی ہو۔" علشبہ بھنا گئی۔

"جھوٹ زبان سے نکلنے سے پہلے دماغ میں تیار کیا جاتا ہے۔ سنوارا جاتا ہے۔ نوک پلک درست کرنی پڑتی ہے جبکہ سچا کھرا انسان وہی بولتا ہے جو سچ ہوتا ہے کیونکہ اس کے دل و دماغ میں بھی سچ ہوتا ہے سو پانی کی طرح بہتا ہے۔"

"تم صاف کہو کہنا کیا چاہتی ہو۔" علشبہ بیڈ کی پائنتی پر ٹک گئی۔

"صاف بات یہ ہے کہ آپ مون بھائی کو اگنور نہیں کر سکتیں اور وہ بھی سکندر سلیمان کے لیے نیور۔۔۔"

"مون کا یہاں کیا ذکر؟" علشبہ چڑ گئی۔

"مون ہی کا ذکر ہے آپی۔۔۔ وہ اتنے پولائٹ، سچے، رئیل مین ہیں۔ اتنا اچھا بولتے ہیں۔ اتنے دھیمے، اتنے قابل اور عہدے پیسے کو سائیڈ پر لگائیں تو سکندر سلیمان، مون بھائی کے مقابلے کچھ بھی نہیں۔" عروہ نے نفی میں سر ہلا کر جیسے علشبہ کی عقل پر ماتم کیا۔

"کیا دھیمے نرم خو، ہونہہ! مرد کو دبنگ ہونا چاہیے۔"

"کیوں اب کی بار دبنگ ٹو آپ بنائیں گی؟" عروہ نے جل کر کہا اور کتاب چہرے کے عین سامنے کر لی۔ علشبہ کچھ کہہ نہ سکی۔

☆ ☆ ☆

"لوگ کلاس بنک کر کے بالکل اسی انداز میں درخت کے نیچے بیٹھتے ہیں مگر تمہاری کہانی میں کمی یہ ہے کہ تم اکیلی بیٹھی ہو۔"

وہ آلتی پالتی مار کے کتابیں گود میں اور کولڈ ڈرنک سامنے رکھ کے بیٹھی تھی، جب مون بھائی کی آواز پر اچھل پڑی۔ ان پر نگاہ پڑی تو دل کھول کر مسکرائی۔

"آپ یہاں کیسے۔"

"کام سے آیا تھا بلکہ آئے تھے۔ میرے ساتھ کچھ اسٹوڈنٹس بھی ہیں۔ ابھی تھوڑا کام باقی ہے، میں تمہیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔"

"اور میں مل گئی۔ کینٹین چلتے ہیں۔ بریانی کھائیں گے۔" اس نے فوراً "پروگرام ترتیب دیا۔

"ٹھیک ہے مگر بل کون دے گا۔" مون نے چھیڑا۔

"آکورڈ لگے گا۔ آپ کی موجودگی میں میں پیسے نکالوں۔" اس نے فوراً "آنکھیں دکھائیں، مون ہنس دیے۔

"چلو پھر میرے پاس بھی تقریباً "گھنٹہ ہے۔"

بریانی ہمیشہ کی طرح لذیذ تھی۔ اس نے سیر ہو کر کھائی۔

"پیپرز کی وجہ سے میں گھر تک جا ہی نہیں سکا۔ اس سنڈے کا ارادہ ہے۔ خالو صاحب بھی کیا سوچتے ہوں گے۔" "پاپا بھی پیپرز کی وجہ سے چکر نہیں لگا پائے مگر آج کل کوئی کام نہیں تھا۔ ماربل لگ گیا ہے۔ گھسائی کرنی ہے اب پھر کلر کا مرحلہ اور باقی کام۔"

اس نے اپنے زیر تعمیر گھر جس کی ساری نگرانی مون بھائی کرتے تھے کے بارے میں تفصیلی جواب دیا۔

"سیمنٹ، بجری کا کام ختم ہو گا تو گرل اور ووڈ کا کام شروع کرواؤں گا۔ میرے ایک اسٹوڈنٹ کے فادر لکڑی کا بڑا اچھا کام کرتے ہیں۔"

"امی کہہ رہی تھیں پاپا سے۔۔۔ آپ تو بس خوامخواہ کا شور مچاتے ہیں۔ سارا کام میرے بھانجے نے کیا ہے پاپا کے سر پر جوں بھی نہ رینگی۔" "کہاں کا تمہارا بھانجا۔ میرا شاگرد اور صرف میرا شاگرد ہے ورنہ تمہارے بھانجے تو اور بھی ہیں۔ امی کے تو سر پر لگی اور کہیں نہ بجھی۔"

"یہ تو میرا فرض بنتا ہے گھر تو میرا بھی ہے۔ یا تم ایسا نہیں سمجھتیں۔"

"نہیں نہیں بالکل نہیں، آپ ہی کا گھر ہے اور

آپ ہی کو سب کام کرنے ہیں جیسے میرا ایڈمیشن احمر کے مسئلے' پاپا کے ساتھ گھر بنوانے میں ہیلپ کرنا' علشبہ کے مسائل' اے سی ٹھیک کرنے دینا' گیزر لانا' ہیٹر بدلوانا' عنقریب ضرورت پڑے گی ٹینٹ 'قناتیں' دیگیں' ڈھول والے 'بازار آنا جانا' لینا دینا۔۔۔ کارڈ بانٹنے۔"

وہ اپنا سارا وزن کرسی کی پچھلی دو ٹانگوں پر ڈال کر جھولنے لگی۔ مون کے ہاتھ میں پرچ اور کپ ہونٹوں سے لگا تھا۔ یکدم رک گئے اپنی سنجیدہ سادہ نظریں عروہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"کیا مطلب۔۔۔؟؟"

"مطلب کیا؟؟ آپ امی کا رائٹ ہینڈ اور وہ کیا پاپا کے دست راست اردو میں کہتے ہیں۔

ہمارے باہر کے سارے کام تو آپ ہی نے کرنے ہیں۔ آخرال ہمارے بڑے بھائی ہیں آپ۔"

"صاف بات کرو۔" مون نے کپ کھسکا کر کہنیاں ٹیبل پر لگائیں وہ کرسی کے اگلے دو پنجوں پر جھک آئے تھے۔ عروہ چند لمحے خاموش رہی پھر بالکل ان جیسی پوزیشن میں سامنے آرکی۔ اب وہ بغور مون کی آنکھیں دیکھ رہی تھی۔

"صاف بات تو یہ ہے۔" اس نے اپنے لہجے میں سنسنی پیدا کی۔ "سکندر کی فوج حملہ کرنے والی ہے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ عنقریب۔ دراصل ہماری سپاہ کے کچھ لوگ ان سے ملے ہوئے ہیں۔" آخر کار عروہ نے بول ہی دیا۔

"ان فیکٹ ہمارا سپہ سالار بھی اور۔۔۔"

"تمہارا مطلب ہے علشبہ۔۔۔ بھی؟"

"اوں ہونہہ" عروہ نے تصحیح کی۔ "علشبہ ہی۔"

"آہ!" مون نے ٹھنڈی سانس لی اور کرسی سیدھی کرلی۔ بازو سینے پر لپیٹے پھر اگلے پل ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ چھت پر دیکھا پنکھا چل رہا تھا اور موسم بہت پیارا تھا پھر یکدم گھبراہٹ کیسی۔ دونوں کے درمیان ٹیبل پر خاموشی پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ اور اتنی چوڑی اتنی موٹی کہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے سے بھی گئے۔

مون نے موبائل کو چیک کیا اپنی فائلز کو بلاوجہ ترتیب دیا۔ بیگ میں یونہی فضول جھانک کر دیکھا۔

"سب ٹھیک ہی ہے۔ مجھے دکھا رہے ہیں یا خود کو بتلا رہے ہیں۔" ان کی خود ساختہ مصروفیت کو عروہ نے جانچا۔

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ کھڑا ہونا چاہتے تھے عروہ نے سرعت سے دونوں بانہیں ٹیبل پر لٹا دیں بیگ اور فائلز نیچے کرلیے۔ "یقین کریں ابھی دیر نہیں ہوئی ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو عروہ!" مون اسے بچے ہی کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔

"وہی جو آپ چاہتے ہیں' پر منہ سے کہتے نہیں۔"

"میں کیا کروں؟" ان کی آواز میں بے چارگی اور مایوسی گھل گئی تھی۔ عروہ کو ان پر ٹوٹ کے پیار آگیا۔

"اظہار۔ اظہار مون بھائی! آپ کہہ دیں جو کہنا ہے۔"

"کس سے کہوں عروہ۔ کہا تو اس سے جاتا ہے جو جانتا نہیں۔" مون کا کھویا لہجہ زخمی تھا۔

"ہائیں!" عروہ بھونچکی رہ گئی۔ "یو مین! وہ سب کچھ جو میں اور آپ جانتے ہیں۔" "علشبہ کو سب کی خبر ہے کب سے۔۔۔؟"

"جب سے میں جانتا ہوں تب سے۔۔۔ تم یہ کل کی پیداوار ہویار۔"

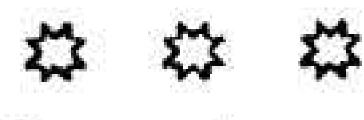
"مائی گاڈ!" عروہ نے سر پکڑ لیا۔ "میں تو انہیں بے خبر سمجھ کر مارجن دیتی رہی۔ کبھی کھل کر بتا ہی نہیں پائی۔ بڑی بہن ہیں نا تو میرے منہ سے نکلا ہی نہیں کہ مون بھائی۔۔۔ آئی ایم سرپرائزڈ۔" عروہ نے شانے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

"تمہارے لیے ایک مشورہ ہے بلکہ حکم سمجھو۔ اب اور کچھ نہ کہنا نہ مجھ سے اور نہ اس سے۔" مون نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" عروہ بگڑی۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' میں ان سے پوچھ کر رہوں گی' میری دوستیں تو اسکول کے زمانے سے آپ پر مرتی تھیں۔ وہ تو میں نے انہیں سمجھا بجھا بلکہ دھمکا کر باز رکھا کہ خبردار یہ میرے مون بھائی ہیں میرے ہونے والے بہنوئی۔۔۔ ورنہ وہ سب تو۔۔۔"

"تمہاری دوستوں نے ابھی تک سکندر سلیمان کو نہیں دیکھا نا۔" مون نے جیسے غلطی پکڑی۔

"ارے جانے دیں میری دوستیں ایسے مردوں سے اچھا خاصا چڑتی ہیں۔ ایسے بندے کی کیا اوقات جو چار بندے ساتھ لے کر نکلتا ہو اپنی حفاظت کے لیے۔" وہ جوش خطابت میں ہاتھ ہلا ہلا کر اونچا بولنے لگی۔ مون نے بے چارگی سے خود کو کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔



"اس نے حمایت بھائی صاحب کو بہت مایوس کیا ہے۔ بقول ان کے ساری کار آمد اولاد میں یہی ایک نکما ہے کچھ نہیں کرے گا۔ صاف کہہ رہے تھے نکما بنے گا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرنے والا۔ اس میں وہ جوش اور شوق ہے ہی نہیں جو باقی پانچوں میں ہے بلکہ اس سے چھوٹا والا تو بھائی صاحب کا چہیتا ہے' بالکل ان کا پرتو۔ کہہ رہے تھے یہ چھوٹا ہی میرا اصل جانشین ہے۔"

انیسہ نے سولہ سترہ برس کے سانولی رنگت اور بہت خوب صورت آنکھوں والے لڑکے کا میاں سے تعارف کروایا۔ میاں نے ناسمجھی کے عالم میں بیوی اور مصنوعی شفقت سے لڑکے کو دیکھا۔ لڑکا شرمندگی کے مارے پورا سر گریبان میں گھسائے ہوئے تھا۔

"اور بیوی کیا پاگل ہو گئی ہے' باپ نے نکھٹو کو گھر سے نکال دیا تو اب کیا ہم رکھیں گے میرا بیٹیوں والا گھر ہے۔" وہ بیٹیوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔

"میں نے کہہ دیا سارے شہر کو سدھارنے کا ٹھیکہ تو آل ریڈی ہمارے پاس ہے ہی۔ یہ بھی شامل ہوجائے صحیح کیا نا؟" انیسہ نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "آپ خود بڑھائیں گے۔ میں نے کہا' آپ اپنے پانچ سنبھال لیں' یہ ایک مجھے دے دیں' میرا کون سا کوئی بیٹا ہے۔ بس بھائی صاحب نے خود اٹھ کر اس کا بیگ بنا دیا۔" وہ اپنے کارنامے پر خوش تھیں۔

"یا مالک!" وہ بیگم کے جوش و خروش کو بس دیکھ کے رہ گئے۔

"دکھاؤ اپنے کاغذ!" انیسہ نے شرمیلے کو اشارہ کیا۔ اتنے کم عمر کو تو نوکری بھی نہیں ملے گی اور جب باپ اور پانچ بھائیوں سے نہیں سنبھلا تو میری کیا اوقات۔ نہ چاہتے ہوئے سرٹیفکیٹ پکڑا دو چٹکیوں سے۔۔۔

"ہائیں!" فوراً" دلیے کا پیالہ نیچے رکھا اور ماتھے پر ٹکا چشمہ ناک پر ٹھہرا لیا۔ "یہ تمہارے کاغذ ہیں؟" وہ مشکوک تھے۔

"جی۔۔۔ جی" وہ ہکلایا۔

انہوں نے ابا کا نام بغور پڑھا۔ "تم تو کہہ رہی تھیں یہ حد سے زیادہ۔۔۔" وہ انیسہ کی جانب مڑے۔

"نکما ہے۔ بھائی صاحب نے یہی کہہ کر روانہ کیا ہے۔" انیسہ ہنس دیں اور بے فکر ہو کر چھوٹی کے ساتھ لگ گئیں۔

"اوئے! یہ سارے نمبر تمہارے ہیں؟" وہ ابھی تک مشکوک تھے۔ شرمیلا جی بھر کے شرمندہ ہو گیا۔ سر بمشکل اثبات میں ہلا۔

"تم کہہ رہی تھیں' یہ نکما اور باپ کا ناخلف ہے۔" وہ منہ کھول اور آنکھیں پھاڑے بیوی کا چہرہ دیکھنے لگے جو چھوٹی بیٹی کو میتھ کا کام کروا رہی تھیں۔

"بھائی صاحب کے لیے نکما ہی ہے۔ ان کے بڑے پانچوں ماشاء اللہ پندرہ پندرہ برس کی عمر ہی سے باپ کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوئے اور بیس بیس برس تک اپنی دکانوں کے مالک ہو گئے۔ مین بازار میں پوری بارہ دکانیں بن گئیں اور اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ گز بڑا ہوتا ہے یا میٹر اور بر زیادہ ہو تو سوٹ کے لیے کتنا کپڑا دینا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ گز کم ہوتا ہے۔ میٹر زیادہ اور بر کو کیلکولیٹ کر سکتے ہیں۔"

وہ اتنی دیر سے اپنی ذات کا پوسٹ مارٹم ہوتا دیکھ رہا تھا' اچانک بول پڑا۔ انیسہ ایک بار پھر ہنس دیں۔

"تمہارے پتا ہونے اور ایک دکاندار کے پتا ہونے

میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔"
"ایک سال ضائع کیوں کیا؟" وہ اب پوری طرح متوجہ ہو گئے تھے۔
"وہاں ہمارے ایریا میں ویسا کوئی اسکول نہیں ہے جیسا میں چاہتا ہوں اور کالج تو بالکل مجھے پسند نہیں۔ پہلے تو ابا نے توجہ نہیں دی اور میں نے کراچی آنے کی بات کی تو کوئی راضی نہیں ہوا لیکن میں نے سال ضائع نہیں کیا لینگویج کورس کیا اور کمپیوٹر وغیرہ۔ اب بھی خالہ امی نے ابا کو راضی کیا ہے بلکہ ڈانٹا ہے تو ابا مان گئے۔"
وہ بہت تیزی سے صفائی دینے لگا۔
پروفیسر احسان دل کھول کر مسکرائے۔ یہ تھا منیب حمایت علی کا عروہ کے گھر میں تعارف۔
آج سے پندرہ سال پہلے سترہ برس کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد کراچی آکر پڑھنے لکھنے اور اب لیکچرر شپ کرنے والا منیب حمایت علی۔ عروہ نے اول روز اسے مون بھائی کہا۔ اس کے لیے ساری دنیا ایک طرف اور مون کی محبت ایک طرف۔
انیسہ کو اللہ نے بہت دعاؤں کے بعد اولاد سے نوازا تھا۔ شادی کے تین سال بعد علشبہ اور علشبہ سے آٹھ سال بعد عروہ اور مون کے گھر آنے کے محض آٹھ ماہ بعد احمر۔
سو مون کو بغیر کسی قانونی کارروائی اس گھر کے بڑے بیٹے کا رتبہ حاصل ہو گیا۔ سب کے درمیان خلوص اور محبت قائم ہو گیا۔ انیسہ کا وہ بھانجا تھا۔ احسان صاحب کے لیے اس کی ذہانت، شرافت، فرماں برداری محبت کا باعث تھی۔ احمر نے ہوش سنبھالتے ہی مان لیا کہ اس کی دو بہنیں اور ایک بڑے بھائی جان ہیں۔ رہی عروہ اور علشبہ۔
عروہ کے لیے دنیا چند لوگوں کے گرد سمٹی ہوئی تھی۔ امی، ابا، بہن، چھوٹا بھائی، تھوڑے سے فرینڈ، ٹیچرز اور مون بھائی، بھائی بھائی پیارے مون بھائی۔ اور رہ گئی علشبہ تو بات دراصل یہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

سرورات آک کے پھول جیسی تھی۔ خوش رنگ، خوشبودار، مگر کڑوی، چبھتی ہوئی۔ وہ کھلے آنگن میں کین کی کرسی پر خود کو کمبل میں لپیٹے سردی کو سونگھ رہی تھی۔ رات کی رانی، امرود کے پتوں کی کٹھی باس، کیکر اور آک کے پھولوں کی خوشبو سرد ہوا میں مدغم ہو کر نتھنوں سے ٹکراتی تھی۔ وہ ساری کمبل میں چھپی تھی، صرف تھوڑا سا چہرہ اور انگلیاں باہر تھیں۔ اندر عروہ سے منہ ماری ہو گئی تھی۔ وہ بڑی دعاؤں کے بعد انیسہ اور احسان کی زندگی کا حصہ بنی تھی۔ آٹھ سال تک اس نے اپنی اس حیثیت کا خوب فائدہ اٹھایا پھر عروہ کے بعد اس نے بہت مشکل سے اسے اپنی زندگی کا حصہ تسلیم کیا۔ وہ پیاری بھی لگتی تھی مگر اس کی موجودگی میں الجھن بھی ہوتی تھی۔ ایک پل اسے دیکھ خوش ہوتی تو اگلے منٹ ماں کی گود میں دیکھ جھنجلا جاتی ——— ابھی عروہ کی جگہ بنائی تھی کہ منیب حمایت علی گھر میں گھس آیا۔ پاپا کی ساری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ مون کی بے حد اچھی فطرت اس سے لگاؤ پر اکساتی تھی۔ وہ بے حد بے ضرر، خاموش، پڑھاکو اور سیدھا سادا لڑکا تھا۔ علشبہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی۔ پہلی بات یہ چبھی کہ مون اس سے بہت زیادہ اچھا تھا۔ پہلے انیسہ اسے رات کے کھانے کے بعد گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کروانے کے لیے کچن میں بلاتی تھیں تو وہ بہانہ بنا کر "پاپا کے ساتھ نیوز سن رہی ہوں" بچ نکلتی۔ پاپا بھی آوازیں دیتے "آؤ علشبہ! ادھر میرے ساتھ بیٹھو۔" وہ بڑے صوفے پر پاپا کے ساتھ براجمان ہو جاتی۔
پھر یوں ہوا کہ پاپا نے آوازیں دینا بند کر دیں۔ صوفے پر اس کی نشست پر مون پاپا کے ساتھ چائے کے گھونٹ لیتا اور دھیمے لہجے میں تبصرے کرتا۔ پاپا کے تو مانو مزے ہو گئے۔ وہ اچھا سامع تھا مگر جب بولتا تو بہت جچا تلا اور برمحل ——— علشبہ کچن کی کھڑکی سے پیچ و تاب کھا کر برتن دھوتے ہوئے اسے گھورتی اور پتیلیاں یوں مانجھتی جیسے مون کا منہ کھرچنا چاہتی ہو۔ سب سے بڑی مصیبت سر پر یہ پڑی کہ اسے دوپٹا پہننے کا حکم مل گیا۔

علشبہ کی تو مانو جان عذاب میں آ گئی۔ اسکول میں دی اور اسکارف تھا۔ گھر میں ایسے ہی گھومتی۔ پاپا کے آنے پر شانے پر کچھ بھی دھر لیتی۔ اب یہ پورا دوپٹا۔ وہ گرتی پڑتی اٹھتی ——— نہ یہ مصیبت گھر آتی نہ یہ "مصیبت" گلے پڑتی وہ بڑبڑائی۔
"اونہوں!" انیسہ خفگی سے ہنکارا بھرتیں ——— "ایسے نہیں کہتے بھائی ہے۔"
"ہونہہ بھائی ——— خوامخواہ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے۔ خالہ کا بیٹا بولیں۔" وہ پیر پٹختی۔
پھر گھر میں تبدیلی یہ آئی کہ انہیں اللہ نے اپنا چھوٹا سا بھائی دے دیا۔
مون اپنا فارغ وقت عروہ کو کندھوں اور احمر کو گود میں بٹھائے گزارتا اس کے دو کام تھے۔ یا پڑھ رہا ہے یا پھر دونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔
رہ گئی علشبہ تو گھر کے اندر کبھی یہ ماحول نہیں رہا تھا کہ وہ ہم عمر کزن کے ساتھ گھل مل جائے۔ پاپا کے سامنے "قطعاً" نہیں اور امی بھی پاپا کے مزاج اور احکامات سے متفق تھیں۔ احسان صاحب بڑی ہوتی بیٹی کی موجودگی میں جوان لڑکے کو گھر میں رکھنے کے "قطعاً" حق میں نہیں تھے۔ اس بات پر بحث بھی ہوئی۔
"آپ تھوڑے دن مہمان سمجھ کر رکھ لیں، نہیں مناسب لگے گا تو ہاسٹل میں جگہ دلوا دیجئے گا۔" انیسہ بہت مان سے بہنوئی سے لڑکھڑائی تھیں۔
"اتنا پڑھاکو نیک بچہ۔" احسان صاحب طوہاً کرہاً راضی ہوئے اور پھر مون کی دل موہ لینے والی فطرت و عادات نے انہیں اس کا گرویدہ کر دیا مگر ان کی سوچیں اندر سے وہی تھیں۔ بوائز کالج کے استاد تھے۔ نئی پود میں بڑھتی بداعمالیاں انہیں خوف زدہ کرتی تھیں۔
اور دوسری جانب انیسہ نے مون کو بھی شاید بہت کچھ سکھایا سمجھایا تھا کہ وہ بہت محتاط رہتا۔ علشبہ سے "قصداً" دور رہتا علشبہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ ——— لاڈلی لاپروا بچی ——— مگر اس کی سہیلیاں آفت کی پرکالہ

"ایک ہی گھر میں رہنا۔ اکٹھے چوبیس گھنٹے کا ساتھ، یار وہ کچھ تو کہتا ہی ہوگا۔" حرا بہت طرار تھی۔
"کون سے چوبیس گھنٹے ——— آٹھ سے دو تو کالج شام کو کوچنگ، رات کو پاپا کے ساتھ گوسپ اور گھر میں میں اور وہ اکیلے نہیں میرے امی پاپا اور بہن بھائی بھی رہتے ہیں "قاریو کائنڈ انفارمیشن۔" وہ تپ کر تصحیح کر گئی۔
"ارے نادان! کہنے والوں کے لیے موقع ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔"
"ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے۔ وہ پڑھنے آیا ہے اور بس ———"
"تو کیا جو لکھتے پڑھتے ہیں، وہ محبت نہیں کرتے۔" حرا بھنا کر بولی۔
"محبت؟ کون سی محبت؟" علشبہ اچھل پڑی۔
"کتنی پیاری ہو گوری چٹی، یہ بڑی بڑی آنکھیں، یہ لمبے بال اور" حرا کھو سی گئی۔
"یعنی وہ اس لیے محبت کرے گا کہ میں پیاری ہوں اور اگر میں پیاری نہ ہوں تو۔"
"پھر بھی کرے گا۔" ثمو جو خاموشی سے استاد و شاگرد کا مباحثہ سن رہی تھی بول پڑی۔
"ساتھ رہنے سے نزدیک ہونے سے محبت پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ اب تک ہوئی کیوں نہیں ——— وہ دو سال سے تمہارے گھر رہ رہا ہے یار!"
کچھ دوستوں کی باتیں، کچھ عمر کا تقاضا، نہ جانے کب دل کی زمین پر خود بخود ایک پودا اگ آیا۔ اس خوش رنگ پودے نے دل کے اندر تک جڑیں پکڑ لیں جو شکنجے میں بدل گئیں اور سارا وجود کسا گیا۔ اسے کن انکھیوں سے دیکھنا اور خود کو نوٹس کروانے کا احساس امربیل بن گیا۔ ساری ہریالی غائب ہو گئی اور جڑ سے سرے تک پیلے بے فیض رنگ بکھر گئے۔
پہلے دوستوں نے بھول پن میں جتایا، وہ حسین ہے اور چند نشانیاں دیں رنگ، بال، آنکھیں پھر آئینہ بولنے لگا جو سچائی کا علمبردار تھا، جو دیکھا من و عن بیان کر دیا۔ راستے بولنے لگے راہ گیر بھی ——— دوست کہنے لگے

دشمن بھی ماننے لگے۔ مگر اس سب کا کیا فائدہ' جب وہ ایک نگاہ غلط انداز بھی نہیں ڈالتا۔

وہ خود میں مگن منیب حمایت علی کو سب سے چھپ کر ایک گہری نگاہ سے دیکھتی۔ پہلے حیرانی' پھر حسرت اور بعد میں ہتک ــــ وہ جلبلا کر رہ گئی۔ محبت نفرت میں بدل سکتی ہے۔ حسرت ختم ہو سکتی ہے خواہش پوری ہونے پر مگر ہتک ــــ ہتک کا احساس پیدائشی عیب کی طرح ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی نہیں جاتا ــ وہ کینہ توز نگاہوں سے اس کا چہرہ جانچتی۔ اسکول ختم ہوا کالج ــــ کالج سے یونیورسٹی ــــ وہ اتنے لوگوں سے ملتی بچھڑتی رہی۔ اچھے لوگ برے لوگ۔ ایسے ویسے لوگ مگر دل کے اندر اک شجر تھا محبت کا جس کی دید گی کبھی کم نہ ہوئی۔ کبھی دل چاہتا وہ دل کھول کر رکھ دے

محبت میں "پہلے آپ" نہیں ہوتا لیکن تب جب محبت دونوں جانب ہو اور یہاں تو بس ــــ اور شاید وہ کہہ بھی دیتی۔ نتیجے سے بے پروا ہو کر جو ایک روز وہ سب نہ ہوا ہوتا ــــ جلتے توے پر پانی کے چھینٹے گرے۔ توے کو تو کوئی فرق نہ پڑا قطروں نے زندگی کھو دی۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ یہ سب جو تماشا اینڈ آل دیٹ ــــ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' آپ اسے کیسے برداشت کر رہی ہیں بلکہ اس کا حصہ بنی ہوئی ہیں۔"

اس نے شوکیس میں برتن رکھتی انیسہ سے پوچھا۔ اتنی بڑی دعوت تھی اور اس نے سچ مچ تنکا بھی الٹ کر نہ رکھا تھا۔ ناراضی سارے گھر سے' سب سے۔

"تماشا مطلب ــــ تمہاری بہن کا رشتہ طے کرنے میں کیا تماشا؟" امی نے معنوی بھول پن سے مگن انداز میں کہا۔

"امی! آپ کو سب معلوم ہی ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔" وہ تھکے ہارے انداز میں بولی۔ امی کچھ نہ بولیں خشک کپڑے سے پلیٹیں رگڑتی رہیں۔

"ستائیس اٹھائیس برس کی ہو گئیں آپی! کوئی رشتہ وشتہ نہیں اب اچانک سارے کام کرنے یاد آ گئے۔ رشتہ پیدا بھی ہو گیا۔ کیا کسی نے حکم دیا ہے' نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد۔ بس جو کرنا ابھی کر لو۔" وہ تپی بیٹھی تھی۔

"سب تو معلوم ہے تمہیں ــــ تمہارے پاپا کی ساری پروفیسری ایک طرف ــــ پہلے خاندان میں تلاشتے رہے۔ کنوؤں میں بانس ڈال دیے۔ اول لڑکے کم' ان میں سے آدھے نکمے' آدھے اچھے۔ اچھے رہنے کس نے دیے۔ لگتا ہے ماں کے پیٹوں میں ہی بک ہو گئے۔ ہم سے ہوئیں نہیں ایسی مکاریاں' کچھ کو ماؤں نے پھنسا دیا کچھ خود ہی ــــ بڑی مشکل سے راضی ہوئے کہ چلو اب باہر دیکھو مگر اس میں بھی شرط لگا دی اپنی ذات برادری' کوئی کمپرومائز نہیں ــــ ورنہ یہیں اپنے اردگرد کتنوں نے میرے آگے دامن پھیلایا۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ مگر جی نہیں' ہماری ذات کے نہیں تھے تو اب تو شکر ادا کرو خاندان کے اندر سے ہی رشتہ مل گیا۔"

اسے تفصیل بتاتے بتاتے آخر میں لہجہ خود کلامی میں بدل گیا۔

"ارے یہ سب معلوم ہے مجھے۔" وہ اکتائی۔ "وہ بتائیں جو پوچھنے بیٹھی ہوں ــــ مون بھائی کو کون سا گھن لگا ہے' آخر ایسا کون سا راز ہے۔ کون سا مسئلہ ہے۔ سامنے لڑکا موجود ہے' آپ کو نظر کیوں نہیں آتا؟"

وہ ٹیبل پر ہاتھ مار کے بولی۔

امی کے ہاتھ رک گئے۔ انہیں خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کیا بتاتیں اور پہلے بھی بحث ہو چکی تھی۔ لا حاصل ــــ

"کہیں وہ ہمارے سگے بھائی تو نہیں؟ ابا کی خفیہ شادی کوئی ادھر ادھر ــــ" امی کی پیشانی پر سوچوں کی لکیریں اور گمبھیر تا تھی۔ زور سے ہنسی نکل گئی۔

"یا پھر آپ نے کہیں ــــ وہ کیا کہتے ہیں' کہیں وہ ہمارے دودھ شریک وغیرہ بھائی تو نہیں ہیں۔" وہ جل کر وجہ ڈھونڈ رہی تھی۔

"پاگل ہو تم۔ جب وہ پیدا ہوا تو میری تو شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب باتیں بند کرو اور کچن دیکھ لو۔ تمہیں کام نہ کرنے کا بہانہ چاہیے۔"

بالکل نہیں' ایک غلط کام میں میری کسی قسم کی کوئی مد شامل نہیں ہو گی اور میں نے مون بھائی کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔" وہ حتمی انداز سے بولی۔

"بس کرو عروہ ــــ!" امی کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ کرسی پر نڈھال سی بیٹھ گئی تھیں۔ "میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" جب سے سکندر سلیمان کی دعوت کا شٹنا اٹھا تھا۔ وہ منہ پر ماسک لگائے گھوم رہی تھیں' جسے اب اتار پھینکا عروہ نے امی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے خیال میں ہمیں سنجیدگی سے وجہ معلوم کرنی پڑے گی۔ پاپا سے پوچھو دنیا کا سب سے بہترین نوجوان ان کی نظر میں؟ ترنت کہیں گے منیب۔ احمر کے لیے ایک ہی آئیڈیل' مون بھائی۔ میں مون بھائی کے لیے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ تک نہیں ــــ بلکہ مجھے لگتا ہے' میں علشبہ کی بہن نہیں ہوں' مون بھائی کی ہوں اور اپنے لیے علشبہ کو بھابھی چنا ہے اور آپ کے تو وہ بھانجے ہیں۔ ساری دنیا سے پیارے' مون بھائی سے پوچھو بلکہ پوچھنے کی ضرورت کیا ــــ اندھے کو بھی نظر آتا۔ وہ علشبہ کے لیے کیا سوچتے ہیں اور رہیں علشبہ آپی۔ وہ بھی مون بھائی کو پسند کرتی ہیں' بس جب پوچھو' منہ کیا کر لیں گی اب بند ــــ"

"کیا کہا تم نے' علشبہ بھی پسند کرتی ہے' تمہیں کیسے پتا؟" اس نے چونکنے کے انداز میں اسے ٹوکا۔

"میرا اندازہ ہے امی! بس مجھے گمان ہوتا ہے۔ وہ ان سے قصداً" کتراتی ہیں۔"

"جب مون نے مجھ سے کہا تو میں نے اسے کہہ دیا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس اپنے ابا کو لانے کی تیاری کرو' کہنے لگا آپ ایک بار پوچھ ضرور لیں میں لے۔"

"کیا مون بھائی نے ڈائریکٹ آپ سے کہا؟ کب ــــ کب کی بات ہے یہ؟" عروہ مانو اچھل پڑی۔

"ہو گئے ہیں کوئی تین سال۔" وہ ٹوکے جانے پر بدمزا ہوئی تھیں۔

"پھر پھر آپی کیا بولیں؟" اس پر عجلت سوار ہو گئی۔

"صاف منع کر دیا ــــ بلکہ مجھے' اپنی ماں کو جھاڑ دیا ــــ میں بڑے ارادے لے کر تمہارے پاپا کے پاس گئی۔ انہیں گھیرنے کی کوشش کی ــــ مون کا ذکر ہو اور وہ شروع نہ ہوں۔ اتنا اچھا فرماں بردار ــــ خاندانی پڑھا لکھا سرکاری ملازمت۔ ترقی کے چانسز ــــ واہ ــــ واہ۔ جھومنے لگے۔

"انکار کر دیا آپ کی بیٹی نے۔" میں نے جیسے دھماکہ کیا ــــ اور جل کے خاک بھی خود ہی ہوئی ــــ آرام سے فرمایا۔ "پڑھی لکھی' عاقل بالغ' سمجھ دار لڑکی ہے۔ جیسے اس کی مرضی۔" بیٹی کا انکار' باپ طرف دار اب پڑھی لکھی' عاقل بالغ' سمجھ دار نے اس سکندر ثانی کو پسند کر لیا ہے تو مجھے کیا۔ اچھا ہے ٹھیک ہے تمہارے پاپا خوش ہیں ذات برادری مل گئی۔ علشبہ بی بی کو خوابوں کی تعبیر۔" امی نے غصہ کو تاہ کیا۔

"اور ــــ اور مون بھائی کیا بولے۔ آپ نے بتایا انہیں۔" عروہ کو اپنی عقل و نظر پر بڑا گھمنڈ تھا' اب حیرانی و صدمہ ہوا تھا۔

"حیران ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔" امی کے چہرے پر مون کا چہرہ یاد کر کے تاسف بکھر گیا۔ "پھر شرمندہ ہو گیا بعد میں پتا نہیں کیا سوچ کر چلا گیا تھا۔ ایک دن علشبہ کے کالج پوچھنے کے لیے ــــ صفا جواب دے دیا ملکہ وکٹوریہ نے۔"

"ہائیں!" عروہ ربڑ بال کی طرح اچھلی۔

"مون بھائی اور علشبہ روبرو ــــ نہیں نہیں ــــ پھر ہوا کیا ــــ بولیں امی؟" اس نے ان کا شانہ زور سے ہلایا۔

☼ ☼ ☼

"اب تو خیر کوئی بات نہیں کرتا۔ گڑے مردے کون اکھاڑے۔ نئی نسل ہر معاملے میں "آئی ڈونٹ کیئر" کا موٹو اپنائے رہتی ہے۔"

وہ دونوں میکرو سے واپسی پر بہت ڈھیلے قدموں سے گھر کی طرف روانہ تھیں۔

کالج کے اندر بنے گھر پرانے تھے' ٹوٹے پھوٹے 'مگر لوگوں کی زندگیاں یہاں گزر گئی تھیں۔ عروہ کو ماضی دہرانا بہت پسند تھا۔ ابھی بھی بہت پرانا قصہ چھیڑے بیٹھے تھی۔

"پہلے جوائنٹ فیملی سسٹم ہی ہوتا تھا۔ الگ فیملی بہت کم ـــــ تمہارے پاپا کی تائی اپنے اچانک فوت ہونے والے بھائی کے گھر کے معاشی حالات سے بڑی پریشان رہتیں۔ ہر ممکن مدد کرتیں مگر یہ ـــــ شہر میں رہتے تھے اور وہ کسی دور دراز علاقے میں ـــــ بڑا مشکل وقت تھا' میکہ بھی سفید پوشی کی زندگی گزارتا تھا۔ ایک بیوہ اور پانچ بچوں کی کلی ذمے داری لینا بہت مشکل تھا بلکہ ناممکن۔ تائی اماں ہی معاشی طور پر مضبوط تھیں۔ تایا کہنے لگے ایسی مالی مدد کا کوئی فائدہ نہیں ہے کوئی اور حل ڈھونڈو ـــــ بڑی سوچوں کے بعد تائی انیس سالہ بھانجے کو اپنے یہاں لے آئیں کہ تایا کے ساتھ رہے گا۔ کام سمجھے گا تو یہ دیرپا مستقل حل اور مدد ہوگی۔

لڑکا تیز طرار تھا بڑی جلدی کام سمجھ میں آنے لگا تو گھر پیسے بھیجنے لگا۔ چرب زبان تھا پھر جوان جہان خبر ہی نہیں ہوئی۔ چھوٹے چچا کی بیٹی ـــــ کب ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے۔ انکل نے بچپن کی منگنی توڑ ڈالی ۔ چچا چچی نے فوری حل کے طور پر شادی کا اعلان کیا۔ بھانجے کو گھر سے نکالا۔

"ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا بھابھی ـــــ آپ کا لڑکا اس قابل کر دیا ہے اب یہیں کہیں کام کرلے گا۔ میں ہمدردی میں لے گئی۔ میرا تو اپنا گھر داؤ پر لگ گیا۔" تائی ردعملی ہو رہی تھیں۔

بھابھی ہاتھ جوڑتی ہیں۔ بھانجا بھی شرمندہ ہو گیا۔ معافی تلافی ہو گئی۔ تم وہاں خوش اور ہم ـــــ یہاں لڑکی بل کھائی ناگن بن گئی۔ عین نکاح کے وقت چیخ چیخ کر انکار کر دیا۔ تمہارے پاپا کہتے ہیں۔ میں چھوٹا ہی تھا مگر آج بھی وہ قیامت جیسا دن پوری جزئیات سے یاد ہے۔ پردے کا زمانہ تھا۔ سارے واقعہ کے بعد جو مشترکہ نوٹیفکیشن جاری ہوا وہ یہ تھا کہ

"یہ سب باہر سے لڑکا گھر میں گھسانے کا نتیجہ ہے۔ سو آج کے بعد کبھی ایسی ہمدردی یا مدد نہیں کی جائے گی۔"

تمہارے پاپا کے کچے ذہن میں واضح ہو گیا' اپنے گھر میں کوئی لڑکا نہیں رکھنا۔ وقت گزرنے کے بعد لچک پیدا ہو ہی جاتی ہے مگر ہم جب شادی ہو کر آئے۔ ابھی کالج میں گھر نہیں ملا تھا۔ وہاں ہمارے پڑوسی تھے۔ تین بھائی مل کر رہتے تھے۔ الگ الگ پورشنز تھے۔ میرا گھر تیسری منزل پر تھا کھلی کھڑکی سے ان کا سارا گھر اور کمرے وغیرہ دکھائی دیتے۔

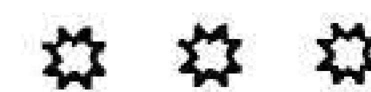
ایک روز تمہارے پاپا نے خود دیکھا بس نہ پوچھو چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ فیصلہ سنا دیا کہ وہ کبھی جوائنٹ فیملی سسٹم کا حصہ نہیں بنیں گے۔

"کان کھول کر سن لو انیسہ ہمارے گھر میں کبھی ایسا ماحول نہیں ہو گا۔ میں ہم اور ہمارے بچے بس۔" ان کا قطعی فیصلہ تھا تو مجھے کیا پڑی تھی کہ ـــــ"

عروہ بہت پہلے کا قصہ مزے سے سن رہی تھی' امی کے رکنے پر ہنس دی۔

"اور آپ لے آئیں مون بھائی کو زبردست ـــــ پھر پاپا کیسے مانے؟"

"ماننا کیا تھا ـــــ میں نے پہلے دن کہہ دیا۔ ایڈمیشن کروائیں پھر ہاسٹل بھیج دیں اور علشبہ بہت چھوٹی تھی' تیرہ چودہ برس کی مون بہت سیدھا ڈرا سہما بچہ تھا۔ میں نے شعوری کوشش سے دونوں کو کبھی اس طرح سے کھلنے ملنے دیا ہی نہیں اور پھر جب مجھے ایک دن شک ہوا تو ـــــ اس سے پہلے ہتھیلی خالی ہوتی میں نے مٹھی بھینچ لی۔"



"آپ اس کمرے میں بیٹھیں گی اور اس وقت تک باہر آنے کا سوچیں بھی مت کہ جب تک میں خود نہ آؤں۔" وہ علشبہ کو ہاتھ پکڑ کے باہر والے کمرے

میں لائی اور کھڑکی کے پاس صوفے پر شانوں پر دباؤ دے کر بٹھا دیا۔

"مگر بات کیا ہے؟" علشبہ ناسمجھی کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔

"یہ رہیں آپ کی کاپیاں جو آپ چیک کر رہی تھیں اور چائے کا کپ' بسکٹ بھی ہیں۔" اگلے منٹ میں پانی بندوبست بھی کر کے عروہ بی بی باہر سے کنڈی چڑھا گئیں۔

"یا اللہ!" علشبہ کاپیاں کھول کر چیک کرنے کے بجائے یونہی ورق پلٹنے لگی جب ہی عروہ کی زوردار ہنسی کی آواز آئی اس نے گردن موڑ پیچھے کھڑکی کی طرف دیکھا تو پردے گرے تھے مگر کھڑکی کھلی تھی' وہ تیزی سے پردہ ہٹانے والی تھی کہ کھڑکی کے بالکل ساتھ پلاسٹک کی کرسیوں پر مون اور عروہ براجمان تھے۔ مون کی پشت تھی۔ ٹیبل پر خوب اچھی سی شام کی چائے سرو کی گئی تھی۔

"وہ اتنی گوری چٹی نرم ملائم دکھتی تھی کہ جب خاموش بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تو میرا دل چاہتا' ہلا جلا کر دیکھوں گوشت پوست سے بنی لڑکی ہے یا خالہ نے کوئی گڑیا سجا کر رکھی ہے۔ تھوڑی موٹی 'بھولا بھالا چہرہ۔"

علشبہ آپی اور موٹی ـــــ!" عروہ نے حیرانی ظاہر کی۔

"موٹی نہیں بس اب جیسی پتلی نہیں تھی۔" مون کی آنکھوں میں نازک علشبہ کا سراپا گھوم گیا۔

"آپ کو موٹی بیوی پسند ہے؟" عروہ نے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔" مون چائے کا کپ رکھ کے ہنس دیے۔ "ایک لطیفہ سناتا ہوں' دبلی پتلی عورت کا شوہر کہے گا میرے پاس بس ایک بیوی ہے جبکہ موٹی بارہ من کی دھوبن کا میاں ـــــ جناب میرے پاس بہت زیادہ بیوی ہے۔"

عروہ کے منہ سے فوارہ چھوٹا کھڑکی میں کھڑی علشبہ بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر پائی۔

"اچھا چھوڑیں بیویوں کی قسمیں۔ آپ وہ بتائیں جو میں پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"مجھے آتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ علشبہ کو میرا اس گھر میں آنا ناگوار گزرا ہے وہ خالو صاحب کی سہیلی جیسی لاڈلی تھی۔ اب خالو صاحب میرے ساتھ رہنے لگے۔ تم ایک چڑچڑی' دبلی پتلی بچی تھیں۔ خالہ ہمہ وقت تمہیں اٹھائے پھرتیں۔ علشبہ کچھ خاموش' سب سے کٹی کٹی' خفا سی رہتی۔ میں بھی برا لگتا اور تم بھی۔" مون کی آنکھوں میں ماضی جھلک دکھلا رہا تھا۔

"آپ کو سب سے پہلے آپی کی کس بات نے متاثر کیا؟"

"آپی کی کس بات نے ـــــ رنگ نے ـــــ میں نے کبھی اتنی گوری رنگت بالکل سامنے اتنے قریب سے نہیں دیکھی تھی۔"

"اور ہمارے پورے خاندان میں سے کبھی کسی نے کوئلے کی دلالی نہیں کی مگر رنگت شب دیجور کو شرماتی ہے۔" مون نے بڑے دلچسپ پیرائے میں اپنے سانولے رنگ کو بیان کیا۔ عروہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا اچھا آگے ـــــ وہ امی والی بات بتائیں ناں ـــــ"

"میں گھر میں صرف علشبہ ہی سے ڈرتا تھا۔ اس کی موجودگی میں کمرے میں بیٹھنا مشکل لگتا اتنے پکے تاثرات کر کے تمہاری آپی بیٹھتی تھی کہ کیا بتاؤں۔"

"بتانے کی کیا ضرورت ہے وہ اب بھی اتنا ہی پکا منہ کر کے بیٹھی ہیں" عروہ نے خفگی ظاہر کی۔

"اس کی موجودگی میں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ پتا نہیں چلا کہ کب اس کا چہرہ دیکھنا بھی عادت بن گیا۔ وہ ایک نظر بھی نہیں ڈالتی۔ ساری دنیا سے بلکہ خود سے بھی چھپائے کن انکھیوں سے دیکھنا جاری رہتا کسے خبر ہے۔"

مون پل بھر کو رکے اور ہنس دیے۔

"خالہ بی نے ایک دن جا لیا ـــــ خالو صاحب کا نظریہ' سوچیں وجوہات بتائیں۔"

"مجھے شرمندہ نہ کروانا بیٹے! تم کہیں اور جا کر رہ لو گے۔ پڑھ لکھ جاؤ گے۔ اپنے حصے کی ہر چیز مل جائے گی ـــــ مگر تمہارے خالو صاحب اپنے صحیح غلط ملے جلے

نظریہ پر اور قائم ہو جائیں گے۔ ایک غلط روایت اور فیصلہ صادر ہو جائے گا۔ وہ تو پہلے ہی شدید مخالف تھے مگر تم نے اپنی اچھی فطرت کے باعث ان کے دل میں جگہ بنائی۔ اب اپنے مقام سے گرے تو تمہیں بھی چوٹ لگے گی اور میرا ہاتھ بھی تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔ میں بھی گر جاؤں گی' چکنا چور' بکھر جاؤں گی۔ ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ ابھی بس پڑھو لکھو اور میرا نہیں خیال مجھے دوبارہ کہنا ہو گا۔ تم میرے بھانجے ہو اور اپنے بچوں سے پہلے تمہارے ہی لاڈ اٹھاتی تھی۔ تو تم پہلے بچے ہوئے ناں۔۔۔"

خالہ نے میری پیشانی چومی' جو عرق ندامت سے تر تھی۔ سارا بدن پسینے ۔۔۔ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا۔ آنے جانے کے لیے یہ ڈرائنگ روم کا دروازہ یوز کرنے لگا۔ کوشش ہوتی کہ دسترخوان پر بھی کم سے کم جاؤں۔ پروفیسر صاحب مجھ سے بہت پیار کرنے لگے تھے۔ ہم دوستوں کی طرح رہتے اور اگر ان کی نظروں سے گر جاتا تو پھر۔۔۔"

مون نے ٹھنڈی چائے کے آخری گھونٹ سے حلق تر کیا۔ عروہ کو ہمیشہ سے مون بہت عظیم لگا کر اس کی پلکیں لرز گئیں۔

"اچھا وہ تو بتائیں ناں۔۔۔ جب آپ ان کے کالج گئے تھے تو کیا بولیں۔" عروہ کا تجسس ابھی تک قائم تھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ حیران' حیران اور بہت زیادہ حیران ہوئی۔ بہت دیر تک خاموش رہی۔۔۔ پھر کہنے لگی میں نے ایسے کبھی سوچا نہیں۔"

"تو اب سوچ لو۔" میں نے کہا۔

پھر طویل خاموشی "سوری نیب! آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ مگر ایسا ہوتا آئی مین۔۔۔ آئی ایم سوری میں سوچ سکتی بھی نہیں اب۔"

"تو آپ کیا اسٹوڈنٹ بن کر گئے تھے؟ وہ اپنے جذب دل کی شدتیں۔۔۔ آنکھوں کی مکاریاں' بے چینیاں کچھ تو بتاتے۔" عروہ کو اس کی شرافت نہ بھائی۔

"یہ باتیں بتانے کی نہیں محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔"

"آپ نے تو عرصہ ہوا ان کا چہرہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔" عروہ نے جل بھن کر کہا۔

"کس نے کیا چھوڑ دیا تھا؟" مون نے شرارت سے عروہ کو دیکھا۔

"پھر ہم محتاط ہو گئے تھے۔ بہت ہمت دکھاتے اگر خالہ عین موقع پر ٹوک نہ دیتیں۔۔۔ ہم تو فراز کے ماننے والے ہیں۔

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا رسوائیاں بھی ہوں

"یا اللہ!" عروہ پیٹ پکڑے دہری ہو گئی۔

"میں نے تمہیں کوئی مزاحیہ شاعری سنائی ہے۔" مون مصنوعی خفگی سے بولے۔

"ہنسی شعر پر نہیں آئی' آپ پر آئی۔ باتیں اتنی بڑی بڑی اور اتنی ہمت نہیں ہے کہ جا کر ہاتھ پکڑ لیں اور کہہ دیں۔ علشبہ ایسا مت کرو بلکہ تم کچھ نہ کرو۔ مجھے کرنے دو خاموش تماشا دیکھو۔۔۔ بلکہ ہاتھ بھی کیا پکڑنے۔۔۔ آپ پیر پکڑ لیتے۔۔۔ تجربہ تو خیر ہے ہی۔"

عروہ کی شرارت حد پر پہنچی۔ خفگی سے گھورتے مون کا بے ساختہ قہقہہ امرود کے پیڑ کی چڑیوں کو سہما گیا۔ اندر سانس روک کر کھڑی علشبہ پردہ چھوڑ کر صوفے پر جا بیٹھی اور چہرہ ہتھیلیوں سے چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

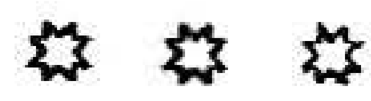
"اب بی بی عروہ! آپ نے اپنی عمر اور حیثیت سے بڑھ کر باتیں کر لیں' وہ بھی لاحاصل۔۔۔ اس ٹاپک کو یہیں ختم کریں۔ کسی نئے سرے کو مت ڈھونڈو۔ دھاگہ الجھ گیا تو کاٹنا پڑے گا سمجھیں تم۔۔۔" مون نے اپنے چہرے پر سنجیدگی تھوپ لی۔ عروہ نے سنی ان سنی کر دی۔

"سب کی باتیں قصے سچ جھوٹ اپنی جگہ' مگر میرا دل کہتا ہے کہ ابھی بھی کوئی پہلو ہے' جو میری نگاہ سے پوشیدہ ہے اور نتیجہ کچھ بھی ہو' میں معلوم تو کر کے رہوں گی۔" وہ پختہ لہجے میں بولی۔

"اونہوں!" مون نے تادیبی انگلی اٹھائی۔

"چھوڑیں چھوڑیں' آپ سے کون پوچھ رہا ہے۔" عروہ نے ذرا لفٹ نہ دی۔ "ہمیشہ آپ سناتے ہیں اب میں کچھ سناؤں۔" وہ مون کا چہرہ بغور دیکھنے لگی۔

وصی یقین ہے مجھ کو وہ لوٹ آئے گا.
اسے بھی اپنے کیے کا ملال ہوتا ہے



"تم چھوٹی تھیں۔ تائی نسیم کے ہاں گئے تھے میں اور بابا۔۔۔ میں نے انٹر پاس کیا تھا۔ فاروق اور شارق بھائی کی شادی تھی۔ پہلی بار لاہور جا رہی تھی۔ ہر چیز بڑی دلچسپ اور مزے دار تھی۔ ان کا بڑا سا گھر بہت سارے لوگ' چار بیٹے' تین بیٹیاں۔ اوپر سے سارا خاندان موجود تھا۔ بڑی والی رخسانہ باجی امی کی ہم عمر تھیں۔ پی آئی اے میں خوب زبردست پوسٹ پر فائز تھیں' پھر دو بھائی شادی شدہ' پھر فرزانہ آپی تیس سال کی تھیں اور شاندانہ ان سے بڑی کسی پرائیویٹ یونی ورسٹی میں پڑھاتی تھیں۔ رخسانہ باجی کے صرف دو بچے ایک دم ماڈ' کانونٹ میں پڑھنے والے۔ ان دونوں کے تو انداز ہی جدا تھے۔ ایک سے ایک اسٹائلش کپڑے' فل کٹ میں رہتیں اپنے آپ میں مگن پراؤڈ۔۔۔ اپنے حسن اور عہدے کے زعم میں مبتلا۔ بڑے چھوٹے آئے گئے کی کچھ خبر نہیں اور سب سے چھوٹی نمبر چار کی روشانہ اخبار میں کام کرتی تھیں۔ وہ تو سب سے الگ خود کو ماورائی مخلوق سمجھتی تھیں۔

ولیمہ کے اگلے روز جب دونوں جوڑے ہنی مون کے لیے روانہ ہوئے تو بڑے سے ہال کمرے میں سارا خاندان جمع تھا۔ تائی جی نے ماسیوں کو حکم جاری کیا۔ بہت اچھی چائے پیش کی جائے اور سارا پھیلاوا سمیٹ دیا جائے۔

"اتنے عرصے بعد سب سکون سے مل بیٹھے ہیں۔ ایسے موقعے کوئی روز روز تھوڑی آتے ہیں۔" وہ حاضرین محفل کو دیکھ کر مسکرائیں۔

علشبہ بابا کے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ تائی تایا۔۔۔ رخسانہ باجی: مہ میاں۔ سالوں بعد ملنے والی کزنز کے جھرمٹ میں بابا بہت خوش تھے۔ علشبہ کو ان کی خوشی اور مگن انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"فاروق دلہن لے کر دبئی چلا جائے گا۔ مجھے اپنی نوکری نہیں کروانی جہاں میاں وہاں بیوی۔۔۔ شارق چاہے تو یہیں رہے ورنہ سرگودھا لے جائے۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔ ہم تو بھئی بچوں کی سہولت دیکھتے ہیں اور ہماری کون سی ان پڑھ جاہل مڈل کلاس لڑکیاں ہیں جو ایسے قضیوں میں ٹائم خراب کریں گی۔ جن کے نہیں بس رہے نہ بسیں۔ دوسروں کو لاحاصل انتظار میں کیوں ڈالیں۔"

تائی بابا کے جھجکے سوال کے جواب میں شروع ہو چکی تھیں۔ بابا نے شادی کے کارڈ پڑھنے سے لے کر اب تک نجانے کیسے اس سوال کو روک رکھا تھا۔

"دو بڑی بہنیں کنواری اور چھوٹے بھائیوں کی شادی؟" احسان صاحب لڑکیوں کے معاملے میں بہت حساس تھے۔ پھونک پھونک کر سوچنے والے کہنے والے۔ اتنی عمریں ہو گئیں' وہ تینوں نہ لڑکیاں لگتیں نہ عورتیں' حلیے انداز بول چال سب کنواریوں جیسی مگر آنکھوں کے اندر تھکاوٹ اور مایوسی کی لکیریں جو گہرے کاجل سے دبائی جاتیں پلاسٹک کی گڑیاں۔۔۔

"میں خدانخواستہ بچیوں کو کچھ نہیں کہہ رہا۔ میں تو بس یہ کہنا چاہ رہا تھا آپ پہلے فرزانہ اور شاندانہ کا کرتیں۔ روشانہ تو خیر فاروق اور شارق سے چھوٹی ہے۔"

"ارے کیا خاک چھوٹے ہیں۔ تیس تیس سے اوپر کے ہو گئے دونوں۔ سر میں سفید بال آ گئے۔" تائی کا مزاج بگڑ گیا۔ آواز اونچی ہوئی تو سب متوجہ ہو گئے۔

"میں نے کیا جان بوجھ کر کیا یہ سب۔۔۔" تائی کی آواز پھٹ پڑی۔ "دونوں کی مہربانی کہ خاموشی سے ماں کا منہ دیکھتے رہے کہ اماں ہی کریں گی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں جو بیٹیوں کے لیے بیٹوں کی حق تلفی کر دیں۔ فاروق نے بچپن سے پسند کر لی تھی خالہ کی بیٹی۔ اب اس کی ماں صاف کہہ رہی تھی۔ بہن کرنا ہے تو کرو

میری بیٹی کے لیے رشتے بہت ..... چپ چپ رہنے والا فاروق جیسے راکٹ کی طرح اچھلا۔۔۔ میں اسے کیا کہتی بیٹے! پہلے بہنوں کا ڈھونڈو پھر اپنا سوچو۔۔۔"
"سوری بھابھی جان! میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ وہ کہتے ہیں دراصل بڑے بزرگوں سے سنا ہے ناں۔۔۔" بابا سٹپٹا گئے۔ "گھر میں بیٹیوں کی موجودگی میں ۔۔۔ دراصل۔"
"ارے جانے دو احسان! تمہاری پروفیسری۔" تائی جی نے ہاتھ نچایا۔ "وہ بڑے بزرگ گزر گئے اب ۔۔۔ اب خود ہی بنتا پڑتا ہے اتنا بڑا بزرگ ۔۔۔ کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں بڑی بہنوں کے لیے رشتے۔" تائی چبا کر 'بڑی بہنیں' بولیں۔
"اب خاندان میں کوئی دور دور تک نظر نہیں آتا۔ جو تھے' وہ پہلے ہی بک ہو گئے یا پھر نکموں کا ڈھیر ہے۔ اب یہ اتنی پڑھی لکھی لڑکیاں ۔۔۔ یہ مجھلی فرزانہ ۔۔۔ وہ کیا کام کرتی ہے بول لڑکی۔۔۔"
"ٹی ٹرانسلیٹر ترجمان ۔۔۔" فرزانہ نے فوراً جواب دیا۔ "سفارت خانے میں کام کرتی ہے۔ دوسری یونیورسٹی میں اپنے سے بڑے نکموں کو پڑھاتی ہے۔ صغراں آپا اپنے اسکول ماسٹر بیٹے کا رشتہ لے آئیں ۔۔۔ باہر سے ڈھونڈا رشتے والی کے ذریعے تو استانی صاحبہ کا شاگرد نکل آیا۔ یہ کیا انکار کرتی۔ اگلا سر پر پیر رکھ کے بھاگا۔ "استاد تو والدین کے رتبے کا ہوتا ہے جی۔" تو بھیا! ٹھیک ہے ناں جو کنارے لگ رہے ہیں۔ انہیں تو جانے دو کہ نہیں۔
اس اخبار والی کا رشتہ آیا پڑا ہے۔ نہ زبان مل رہی ہے نہ ذات اور رنگ۔ اب کرنے کو تو کر دوں تو کل کو تم یونہی بیٹھ جانا میری گوشمالی کے لیے ایسے کیوں نہ کیا ۔۔۔ ویسے کیوں کر لیا ۔۔۔ ہاں نہیں تو۔"
تائی جی اندر سے خود الجھی ہوئی تھیں' پاپا کے جملے نے جیسے راستہ دیا بولتی چلی گئیں۔
"اور تمہارا کیا خیال ہے ۔۔۔" تائی جی کو دھیان آیا۔ "میں لڑکیوں کے واسطے لڑکے بٹھا کر رکھتی تو تم جیسے حقوق کے علمبردار ڈنڈا برساتے کہ کتنی خود غرض ہوں' بیٹیوں کے لیے بیٹے روک رکھے ہیں۔ ارے دنیا کی وہ مثال ہے' آٹے گوندھتی اور ہلتی کیوں ۔۔۔ مگر بھیا تم سے یہ امید نہ تھی۔ مگر ہاں بھئی ہمارا تماشا لگا ہے۔ خود بھی دیکھو اور جمن چوہڑے کو بھی دکھاؤ ۔۔۔"
تائی جی دوپٹہ منہ پر رکھ کے رونے لگیں۔ پاپا کے ہاتھ پیر پھول گئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر تائی جی کے صوفے پر چلے گئے۔ ان کے پیروں کو انگلیوں سے چھوا۔
"میرا قطعاً" آپ کی دل آزاری کا ارادہ نہیں تھا۔ سوال چبھا تو کر لیا۔ میں آپ کا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں۔" وہ خاموش بیٹھے بھائی کے آگے ہاتھ باندھ گئے۔
"میرا مطلب ۔۔۔ مجھے اپنی بھتیجیاں جان سے بڑھ کر پیاری ہیں۔ جو بھی کہا یا سوچا' ان کی محبت ہی ہیں۔ پلیز بھابھی جان!" پاپا بس رو دینے والے تھے۔ دل میں جیسے مرضی خیالات ہوں مگر سب اس وقت احسان صاحب کو ملامت بھری نگاہوں سے اور تائی جی فرزانہ' شاندانہ اور روشانہ کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔
"ارے میاں! جانے دو ۔۔۔ اب ہر کوئی تمہاری طرح منصوبہ بندی تو کر نہیں سکتا۔ ہمیں بھی خبر ہوتی تو ایسا کچھ کر لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" تائی نے پاپا کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے چمک کر کہا۔
"میں نے۔" پاپا نے اچنبھے سے اپنی شہادت کی انگلی اپنے سینے کے سامنے کی ۔۔۔ "بھابھی جان میں نے کیا کیا ۔۔۔ مطلب۔" پاپا گڑبڑا گئے۔
"ہونہہ۔" تائی جی نے جواب نہ دیتے ہوئے منہ موڑ لیا۔ پاپا نے ساتھ بیٹھی رخسانہ کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو وہاں بھی طنز بھری مسکراہٹ تھی۔ پاپا نے حاضرین محفل کو حیرت بھری سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب ان کی منصوبہ بندی سے واقف ہیں اور تائی کے اس جملے سے خوب حظ اٹھایا گیا ہے۔ عجیب سا احساس ۔۔۔ وہ بے چین ہو گئے۔
"کیا کہنا سننا ۔۔۔ ہم بھی لے آتے کوئی دسویں بارہویں کا لڑکا گھر ۔۔۔ اپنی مرضی سے پڑھاتے لکھاتے

۔۔۔ جیسے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ڈھال لیتے ۔۔۔ اب جیسے تم اپنی مرضی و پسند کا داماد بنا رہے ہو۔ اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اپنے ماحول کے اندر ۔۔۔ آج انویسٹ کرو کل سود سمیت ملے گا ۔۔۔ سانچہ تمہارے پاس ہے جیسے مرضی بنا لو۔ اپنی پسند کے رنگ ڈالو۔ اپنی سوچیں' اپنے نظریات نہ خاندان ڈھونڈنا پڑے گا نہ زبان اور ذات برادری ۔۔۔ شکل و صورت کا بھی بھلا۔ خوب چاند سورج کی جوڑی ہو گی۔ راستہ تم نے دے دیا۔ اب بگشتیہ دونوں دوڑیں گے۔"
تائی جی نے حیران و پریشان علشبہ کو دیکھا۔ پاپا بیٹھے سے کھڑے ہو گئے اور پھر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔
علشبہ کو چہار جانب گھومتا نظر آنے لگا۔ جو سمجھ میں آ رہا تھا وہی کہا گیا تھا یا کچھ اور ۔۔۔
"میں ۔۔۔ میں نے۔" پاپا کی ہکلاتی گلوگیر آواز نکلی۔ "میں نے ایسا کبھی سوچا تک نہیں ۔۔۔ میں۔"
"ارے تم نہیں تو تمہاری بیٹی سوچ لے گی۔" یہ پھپھو کی آواز تھی۔ تین جوان بیٹیوں کی والدہ ماجدہ۔ ان کا انداز ٹھٹھا اڑاتا ہوا تھا۔ آنکھیں نچاتی وہ اپنے فیصلے پر مطمئن تھیں۔
پاپا نے نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ان نگاہوں میں کیا نہیں تھا۔ زخمی نظریں' التجا' رحم کی بھیک۔
"بس آپا ۔۔۔ آپ!" پاپا کی آواز تھرا گئی۔ نجانے کیا کہنا چاہتے تھے۔ علشبہ یکدم کمرے سے باہر نکلی۔ واپس لوٹی تو ہاتھ میں بیگ تھے جن میں سامان ٹھونسا گیا تھا۔ کپڑے نظر آ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ مرتعش تھے اور آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ۔
"چلیے پاپا!" وہ بولی تو آواز مستحکم تھی۔ احسان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ عرق ندامت نے سارے جسم کو نم کر دیا تھا۔
"ارے کدھر ۔۔۔ یہ بیگ کیوں اٹھا لائیں ارے بہ" فرزانہ نے بیگ پکڑنا چاہا اور باقی سب نے از حد حیرت کا مظاہرہ کیا۔ جب ہم کسی عزت دار کا لباس دھجی دھجی کرتے ہیں' اسے برہنہ دیکھتے ہیں تو یقیناً" بھول جاتے ہیں کہ ننگے ہوں تو سب ایک سے ہوتے ہیں۔
علشبہ نے ہاتھ بڑھایا مگر تایا جی نے پہلے احسان صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ انہوں نے بڑے بھائی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ بہت احترام سے الگ کر لیا۔ ایک کندھے پر بیگ' پیچھے زمین پر گھسیٹتے آگے چلتی علشبہ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ تھا اور وہ یوں چلتے تھے' جیسے پیروں سے گیلی روئی کے بورے بندھے ہوں۔ نظریں مجرم کی طرح جھکی تھیں اور شانے بھی۔
انہیں اگلے دن صبح کی ٹرین پکڑنی تھیں' پر دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے' ساری رات اسٹیشن پر لکڑی کی بینچ پر بیٹھے رہے۔

☼ ☼ ☼

"وہ میری زندگی کی سب سے خراب رات تھی۔ لمبی کالی بدبودار' بدشکل رات۔ میں روتی رہی اور پاپا چپ رہے' بدنامی کی ایسی صورت تو مجھے معلوم ہی نہیں تھی۔ پاپا نے مجھے اپنی کزن کا قصہ اس رات سنایا۔ وہ بہت آزردہ تھے۔ کبھی بھڑک جاتے' کبھی ٹھنڈے ہو جاتے۔
"میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔ تمہاری ماں کا پھیلایا گند میرے منہ پر آ کر گرا ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں کبھی ڈر جاتی' کبھی انہیں سمجھاتی اور کبھی رو پڑتی ۔۔۔
"کان کھول کر سن لو علشبہ!" پاپا نے کسی ڈریکولا کی طرح مجھے گھورا۔ آنکھیں نکال کر دانت کچکچا کے "اگر تم نے کبھی مون کے بارے میں ۔۔۔"
"نن ۔۔۔ نن نہیں پاپا ۔۔۔ کک' کبھی نہیں' میرے منہ سے بمشکل نکلا" میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔"
میں نے اپنے دل پر پیر رکھ دیا اور آگے بڑھ آئی' میرے پائے ثبات میں لغزش نہ آئے' میں نے ہر لمحہ خدا سے یہی ایک دعا مانگی ہے۔"

عروہ بری طرح چونک گئی یہ آخری جملہ ـــ علشبہ کہنیوں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"یعنی آپ بھی مون بھائی کو ـــ آپ بھی انہیں پسند کرتی ہیں؟؟"

"اسے ناپسند کیسے کیا جا سکتا ہے۔" علشبہ نے الٹا پوچھ لیا۔

"تو ـــ تو آپی اتنی معمولی سی بات پر آپ۔" عروہ کی آواز پھٹ گئی۔

"یہ معمولی بات ہے؟ پاپا نے تائی جی سے کہا تھا۔ اس سے اچھا تھا آپ غلاظت بھرا جوتا مجھے مار دیتیں۔ کڑکا پانی حلق میں اتر تا تو نگلنا مشکل نہ لگتا۔ جتنی غلیظ اور گندی بات آپ نے میرے خون میں انجیکٹ کر دی ہے۔"

"یہ چھوڑیں آپ یہ بتائیں، آپ کو کب سے مون بھائی پسند ہیں۔"

"ہمیشہ سے جب سے انہیں دیکھا ـــ" علشبہ کے چہرے پر الوہی مسکراہٹ آرکی۔

"مون نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا اور ہاسٹل چلے گئے۔" پاپا نے یہ کیا کہ رشتے داروں سے کٹ گئے اور مجھ سے کہا۔ اپنی ماں سے کچھ مت کہنا اور اپنا عہد یاد رکھنا۔ مون اب کم آتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ رخسانہ باجی تین چار سال پہلے کراچی آئی تھیں۔ پاپا کو فون کیا کہ ملنے آنا چاہتی ہیں پاپا نے صاف منع کر دیا میرے گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تو اتنے سال ضائع کس کے لیے کیے ـــ جب پاپا برادری سے باہر جانے کو معیوب نہیں سمجھتے تو آپ کر لیتیں شادی۔ ایک سے بڑھ کر ایک رشتے آئے اس سکندر سلیمان سے تو بہتر تھے ہزار درجے ـــ" عروہ کو اپنا مسئلہ یاد آیا۔

"یقیناً" بہتر تھے ـــ مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جو پاپا کو کسی بھی حوالے سے لیٹ ڈاؤن کر سکے، سو سکندر سلیمان بہت بہتر ہے۔ پاپا کے مان و مرتبے کے سامنے۔" علشبہ بات ختم کر کے نیم دراز ہو گئی۔

"آپ دنیا کے لیے اپنی زندگی خراب کر لیں گی چچ چچ۔" اس نے از حد تاسف سے پوچھا۔

"اور تم کیا چاہتی ہو لوگوں کے قیافے الزام تراشیاں مجسم ہو کر سامنے آ جائیں؟" علشبہ نے اپنے تئیں بڑا زبردست جواب دیا مگر سامنے عروہ تھی۔ اسے پرسوچ نگاہوں سے دیکھنے لگی پھر مسکرائی۔

مخلوق تو فنکار ہے اس درجہ کہ پل میں
سنگ در کعبہ سے اصنام تراشے
تو کون ہے اور کیا ہے تیرا داغ قبا بھی
دنیا نے تو مریم پہ بھی الزام تراشے

وہ رکوع کی حالت میں جھکی علشبہ کی ٹھوڑی چھو کر پچکار رہی تھی۔ جو سن رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ابھی تو اپنے تئیں اس نے آغاز ہی لیا تھا کہ پاپا نے انگلی اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا حکم دے دیا۔

"پاپا! میری بات تو پوری ہونے دیں۔" وہ ہکلا اٹھی۔

"ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی۔"

"اور کچھ کہنا بھی مت، جاؤ۔ اپنا کام کرو۔"

"پاپا پلیز ایک بار بس میری ـــ دو جملے۔" وہ ملتجی لہجے میں گڑگڑانے لگی۔ "چار زندگیاں خراب ہو جائیں گی۔"

"چار کون سی؟"

"مون بھائی اور جو بھی ان کی زندگی میں آئے گی اور علشبہ آپی اور وہ سکندر پاپا ـــ آپ میری بات۔"

پاپا نے ہتھیلی سیدھی کھڑی کر کے اس کے جملوں کا گلا گھونٹا اور انگلی کے اشارے سے دروازہ دکھایا۔ وہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ گھور رہے تھے۔ عروہ کے لیے کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ الٹے قدموں باہر نکلی۔

پاپا بے حد سنجیدہ تاثرات کے ساتھ سپاٹ آنکھیں لیے اپنے روزمرہ کے کام کرتے دکھائی دیے۔ امی کے چہرے پر تفکر کی لکیریں صحرا کی چٹخی زمین کی طرح پھیل گئیں۔ جب سکندر سلیمان کے گھر والوں نے رشتے میں پڑنے والی آپا سے ان کے عندیہ کے بارے

میں دریافت کیا اور فیصلہ چاہا۔ علشبہ کی کم گوئی، نالے اور آنکھوں کی ویرانی مردنی میں ڈھل گئی۔ وہ بے حد گوری تھی مگر عروہ کو لگا وہ سفید ہو رہی ہے جیسے جسم سے قطرہ قطرہ خون ضائع ہو رہا ہو۔

"آپا پوچھ رہی تھیں۔ ہاں کہلوا دوں پھر ـــ" رات کھانے پر امی نے سرسری انداز میں پاپا سے پوچھا۔

"رسم وغیرہ کے لیے گھر کی شفٹنگ کے بعد۔"

انہوں نے جملہ قصداً" ادھورا چھوڑا اور حاضرین کو دیکھا۔ احسان صاحب کا ہاتھ بدستور کھانے میں مگن رہا۔ علشبہ لقمہ بنا رہی تھی انگلیاں چنگیر میں جڑی رہ گئیں اور چہرہ جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

عروہ نے اپنا فطری ری ایکشن ظاہر کیا۔ اس نے جھٹکے سے کھانے کے برتن آگے اور کرسی پیچھے کھسکائی۔ سب کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور چمچ ٹیبل پر بہت بدتمیزی سے پھینک کر پیر پٹختی دروازے سے نکل گئی۔ امی نے دزدیدہ نگاہوں سے پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ جہاں بے حد سکون اور لاپروائی تھی۔ جیسے کچھ ہی نہیں ہوا۔ احمر کے لیے سب ناسمجھ میں آنے والا تھا۔ وہ حیرانی سے سب کے چہرے تک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ نزلے نے سر میں درد پیدا کر دیا تھا۔ پیروں کو جاگرز کاٹ رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھاتی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ جب موڑ مڑتے ہی پاپا پر نگاہ پڑی۔ عروہ نے بغور دیکھا۔ قدموں میں خود بخود تیزی آ گئی۔ وہ جست بھر کے ان کے روبرو تھی۔ پاپا کے ماتھے پر پسینہ اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر سات آٹھ درجن کینوؤں کا پلاسٹک بیگ احتیاط سے پیچھے شانے سے اتار زمین پر رکھ دیا۔ پھر قریبی بڑے پتھر پر کتابیں اور فائل ٹکا کر خود دوسرے پتھر پر سانس لینے ٹک گئے۔

گھر بھر کا پسندیدہ پھل کینو تھا۔ کالج کے اندر ریڑھی والے نہیں آ سکتے تھے۔ اللہ جانے یہ کینو کہاں سے لیے گئے تھے اور انہیں شانے پر اٹھائے گھر کو جا رہے تھے۔ عروہ نے اپنا بیگ اور فائل کتابوں کے ساتھ جمایا اور آگے بڑھ کے پاپا کے کندھے کو دونوں ہاتھوں سے دبایا، پھر گردن کو نرم انگلیوں سے مسلتے ہوئے سہلایا۔

"یہ اتنے بہت سارے سے کٹے گھوم رہے ہیں، کسی کو بھی کہہ دیتے۔ خود اتنی مشقت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس کا انداز خفگی بھرا تھا۔

"یہاں گیٹ تک تو اصغر چھوڑ گیا تھا۔ اندر لڑکے کب آ سکتے ہیں۔" پاپا نے سانس بحال کرتے ہوئے بتایا۔

"تو گھر فون کر دیتے احمر آ جاتا سائیکل پر ـــ" عروہ ان کے سر پر کھڑی تھی۔ ان کا بازو اوپر اٹھا کر اپنے شانے پر ہاتھ رکھا اور دونوں ہاتھوں سے کلائی سے لے کر بازو کے جوڑ تک ماہر مالشیوں کی طرح تیز تیز دبانے لگی۔

"نس چڑھ گئی ہے شاید۔" اس نے قیاس آرائی کی

"تمہاری ماں احمر کے ساتھ ڈاکٹر تک گئی ہے۔ گھر پر تالا ہے۔"

"او آئی سی۔" عروہ نے ہونٹ سکوڑے۔

"تو ایسا ہے کہ میں سائیکل لے آتی ہوں تو یہ سارا مال ڈھو دوں گی۔"

"چابی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں تو ـــ وہ تو آپ دیں ناں۔" اس نے ہتھیلی آگے بڑھائی۔

"میں اپنی چابی گھر ہی بھول گیا تھا۔" پاپا نے جھینپے ہوئے انداز میں غلطی بیان کی۔

"مائی گاڈ ـــ تو اب کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

پاپا کچھ نہ بولے۔ پانی کی بوتل کے آخری گھونٹ حلق سے اتارے۔ دفعتاً" عروہ کی آنکھیں چمکیں اس نے پرسوچ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا بڑے دنوں بعد وہ روبرو ہوئے تھے۔ تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی۔

"اہم! مجھے تو بہت بھوک لگ رہی ہے۔" اس

نے اعلان کے ساتھ ہی تھیلے کا منہ کھول کر دو کینو نکالے چھلکا اتار کر گھما کے دور نیچے پھینکا' پھر کینو کے چار حصے کیے۔ دو پاپا اور دو اپنے منہ میں ۔۔۔ پھر دوسرا ۔۔۔ پھر تیسرا۔

"کیا سارے ابھی کھا لینے ہیں؟" اسے چوتھے اور پانچویں کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ پاپا نے ٹوکا۔

"کھا تھوڑی رہی ہوں۔ وزن کم کر رہی ہوں گھر تک کیسے لے کر جائیں گے۔ اتنا وزن ہے ان کا۔" اس نے اطمینان سے توجیہہ دی۔

"تم اس طرح وزن کم کرو گی شام ہو جائے گی مگر یہ ختم نہیں ہوں گے۔"

"پاپا! مجھے چیلنج نہ کریں میں انہیں ختم کر کے دکھا سکتی ہوں۔" اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔

"بہرحال!" اس نے منہ میں بھرے بیج پھو کر کے دور اڑائے! "میں جا رہی ہوں' نزہت آنٹی کے گھر بیٹھوں گی۔ ان کے ہاتھ کے دال چاول کھاؤں گی اور نیند آ گئی ۔۔۔ جو کہ لازمی آئے گی تو وہیں سو جاؤں گی ۔۔۔ اور یہ ایک کینو اور ۔۔۔ آپ یہاں بیٹھے رہیے ۔۔۔ کوئی بندہ گزرا تو لفٹ لے لیں ۔۔۔ یا کچھ بھی کر لیں ۔۔۔ بائے۔"

اس نے طوطا چشمی کی حد کرتے ہوئے بیگ کندھے پر ڈالا۔ کتابیں سینے سے لگا لیں اور چلنے کو قدم اٹھائے ۔۔۔ پاپا نے حق دق اس کا منہ دیکھا۔

"ارے تو وہاں جا کر کسی کو بھیجو۔ میں یہاں کب تک بیٹھوں گا۔" کیسی بے مروتی۔

"وہ تو میں بھیجوں گی ہی ۔۔۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"تو یار! مل کے اٹھا لیتے ہیں ناں' ادھر سے تم پکڑو اور ادھر سے میں۔" پاپا نے بڑے دوستانہ انداز میں عجلت سے کھڑے ہو کر کہا۔ عروہ کے قدم رک گئے۔ اس نے فقط گردن گھما کر پہلے پاپا کو پھر تھیلے کو دیکھا۔ وہ واپس پلٹی بیگ اور کتابیں پتھر پر رکھیں پھر سینے پر بازو لپیٹ کر بڑی جتاتی نظروں اور بتلاتی مسکراہٹ سے بغور پاپا کی آنکھوں میں جھانکا۔

"دیٹس دا پوائنٹ ۔۔۔ مل کر اٹھا لینے سے بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ ۔۔۔ یوں۔"

اس نے آنکھ کے اشارے سے پاپا کو آگے بڑھنے اور تھیلا اٹھانے کو کہا۔ نتیجہ حسب خواہش تھا۔ وہ آرام سے گھر تک جا سکتے تھے۔ پر عروہ نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑے اور روڈ پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔

"آپ یہاں بیٹھئے۔" دوبارہ پتھر کی جانب اشارہ کیا۔ پاپا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"یو نو پاپا!" وہ بہت تسلی سے گویا ہوئی۔ "آپ پانی میں پڑی لکڑی کی طرح ہیں۔ بھیگی وزنی اٹھانا چاہو تو اٹھائی نہ جائے۔ جلانا چاہو تو اول تو جلے گی ہی نہیں۔ اس نے آگ ہی نہیں پکڑنی' اور جو بھی جلانے کی مشقت جھیلے گا۔ اس کی آنکھوں سے 'ناک سے پانی نکلنے لگا۔ آنکھیں جلیں گی سانسیں الجھیں گی۔ گیلی لکڑی کی کڑواہٹ حلق اور آنکھوں میں بلیڈ چلنے جیسی ہوتی ہے اور آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے کہ اس لکڑی کو علشبہ آپی جلانا چاہتی ہیں۔" وہ ڈرامائی انداز میں رکی۔ "اپنی زندگی بھسم کرنے کے لیے۔"

پاپا کی آنکھیں حیرت سے جیسے پھٹ پڑیں۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کو سمجھ رہے تھے۔

"آؤ مل کر اٹھاتے ہیں۔" پاپا نے تھیلا دیکھا۔

"اونہوں ۔۔۔!" عروہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی ہتھیلی آگے بڑھائی۔ "بوجھ پاپا!" وہ منتظر نگاہوں سے انہیں اکسا رہی تھی۔

"میں آپ کو منانا چاہتی ہوں پاپا ۔۔۔ قائل کرنا ۔۔۔ لیکن پاپا! میں آپ کو سننا بھی چاہتی ہوں۔ آپ بولیے ۔۔۔ میں سنوں گی۔ آپی کو آپ نے فیصلہ سنایا تھا۔ باقی سب ان کے سامنے ہوا تھا۔ مگر پاپا! آپ مجھے بتایئے آپ نے کیا سنا' آپ نے کیا محسوس کیا' آپ کیا سوچتے ہیں ۔۔۔ آپ کیا سوچتے رہے ہیں۔ اتنے سال ۔۔۔ پلیز پاپا۔"

اس نے ان کا ہاتھ اپنے مٹھیوں میں پکڑ کر چوم لیا۔

"امی کو بھی نہیں بتایا حالانکہ ۔۔۔ میں حیران ہوں انھیں اس سارے قصے کی خبر نہ ہوئی جبکہ۔"

"جب ہم کسی بات کو چھپانے کا سوچ لیں تو وہ چھپ بھی سکتی ہے کوئی اچھنبا نہیں ۔۔۔ ہاں میں نے یہ ضرور کی تھی کہ جس اذیت و ذلت کو میں نے جھیلا وہ میرے کسی اور عزیز تر کے حصے میں نہ آئے۔ بس۔"

پاپا نے شکست خوردہ انداز میں اپنے ایمان کا اظہار کیا۔ عروہ نے دوبارہ بوسہ دیا اور یہ بوسہ چابی جیسا تھا۔ وہ بولنا شروع ہو گئے۔ ایک ایک لفظ ایک ایک منظر ۔۔۔ جزئیات کے ساتھ یادداشت کے پردے پر تو یزاں تھا۔ سردی میں نرم گرم ملائم شال کی طرح لپٹی دھوپ اچانک جیسے ساحلی علاقے میں طوفان سے پہلے والی دھوپ اور تپش میں بدل گئی۔

عروہ کو تن من جھلس جانے کا احساس ہوا۔

"جب پاپا نے بیان کیا تو وہ اپنی سوچوں میں ارادے میں حق بجانب لگے۔ وہ ان کی عینک سے منظر دیکھنے لگی۔ معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھ گیا۔ پاپا جیسے طویل سفر کے بعد اب سانس لینے کو چپ بیٹھے تھے۔ عروہ کو بھی چپ لگ گئی۔

"تو کیا جو ہو رہا ہے' اسے ہونے دیا جائے۔" اس کی نگاہوں میں علشبہ کا بھیگا چہرہ گھوم گیا۔ "اور مون بھائی۔"

"اب تم کہو کیا میرا فیصلہ غلط تھا؟" پاپا نے فیصلے کا اختیار اسے دے دیا۔

"ہیلو ہیلو! کیا باپ بیٹی کا بزنس کا ارادہ ہے تو بھئی جگہ بہت اچھی چنی ہے۔" پروفیسر عتیق الرحمٰن ہوا سے اڑتی ٹائی کو بمشکل سیدھا کرتے چڑھائی چڑھتے آ رہے تھے۔ ان کا سانس انجن کی طرح چھک چھک کرتا تھا۔

"اچھی ہے ناں۔" عروہ بڑے جوش سے مڑی۔

"آپ ہمارے پہلے کسٹمر ہیں کیا لیجیے گا؟" اس نے شاپر سے تین کینو برآمد کیے۔

"پیسے کتنے؟"

"ہوں!" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ "کوئی اچھی سی بات دل کو ٹھک سے لگنے والی۔" عروہ نے ہتھیلی پھیلائی۔

"بہت خوب!" پروفیسر صاحب جھوم گئے۔ "ابھی آج ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ بات تو پرانی ہے مگر بس دل کو لگ گئی۔"

"ایک دانا سے کسی نے پوچھا۔

"ہم ایسا کیا کریں کہ سب کی نظروں میں اچھے بن جائیں؟"

دانا نے جواب دیا۔

"اس دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی بن جائے تب بھی اسے برا کہنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔"

اور دوسرا یہ کہ۔

"دلہن کی تصویر کا بیک گراؤنڈ جتنا مرضی سیاہ ہو دلہن کی چمک' جھل مل ماند نہیں پڑتی۔ سیاہ جتنا گہرا ہو گا۔ تصویر اتنی اجاگر ہو کر سامنے آئے گی۔"

"دیٹس دا پوائنٹ۔" عروہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"سو آپ یہ کہیں گے کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں لہٰذا۔"

"تصویر کے ہمیشہ دو رخ ہی ہوتے ہیں یہ دیکھنے والے پر ڈیپینڈ کرتا ہے وہ اپنی ہتھیلیوں میں کس منظر کو زیادہ جگہ دیتا ہے۔" پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے عروہ کی بات کاٹی۔

"تم اتنے نڈھال کیوں لگ رہے ہو۔ کیا بھابھی نے گھر سے نکال دیا۔" وہ اب احسان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

"نہیں وہ خود گھر سے نکل گئیں۔ تم جانو اور تمہارا گھر میں چلی۔" احسان صاحب نے سرعت سے چہرے ماسک چڑھایا۔

"اوہ یار! بیویاں تیس سال بعد ایسی ہی ہو جاتی ہیں مگر تم لکی ہو۔ ایسی پھلجھڑی جیسی بیٹی ہے تمہاری۔ ہمیں دیکھو' پانچ گدھے گھر میں بندھے ہیں۔ ہائے ڈیڈ اینڈ بائے ڈیڈ کے علاوہ ۔۔۔ اگر کبھی بولیں گے تو ایک ہی لفظ "وائے ڈیڈ۔ کبھی جو پاس پل بھر کو بیٹھے ہوں اور بیٹھنا کیا؟ خود سے چل کر آتے نہیں ہمیں ڈھیٹ بن کر ان کے درمیان پہنچوں تو بھی بھاگ جاتے ہیں۔ میری

توزبان تھک گئی خاموش رہ رہ کر۔"

عروہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ان کے پانچوں بیٹے بے حد پڑھاکو ذہین اور کام سے کام رکھنے والے لڑکے تھے۔

"اور سارے ایک ہی فطرت کے' کوئی جو ذرا الگ ہو۔ اب یہ دیکھو علشبہ سنجیدہ' خاموش طبع' گم صم لڑکی ہے مگر کوئی بات نہیں۔ یہ عروہ ہے ناں اس کا الٹ۔ یار! بیلنس رہنا چاہیے۔ ہمارے پانچوں تو۔"

پاپا کے کان جیسے بند ہو گئے۔ ہاں علشبہ' عروہ سے بہت مختلف تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھیں۔ کیوں ۔۔۔ کیسے "ہمارے گھر آ کر بیٹھو۔ خوب باتیں کریں گے۔"

وہ عروہ سے کہہ رہے تھے "تمہاری آنٹی مٹر پلاؤ بنانے کا کہہ رہی تھیں۔ تمہیں دیکھیں گی تو کباب بھی فرائی کریں گی۔ ایک مزے دار لنچ ۔ واہ۔"

"نو انکل تھینک یو ۔۔۔ آپ بس اتنا کریں' اپنے پانچوں گدھوں میں سے ۔۔۔ اوا!"

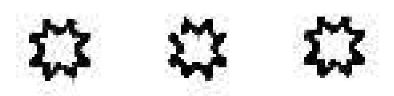
اس نے ہونٹ کا کونا دانتوں میں دبایا ۔۔۔ پروفیسر صاحب کے قہقہے سے جھاڑی پر بیٹھی چڑیاں پھر ہو گئیں۔

"آئی مین! اپنے بیٹوں میں سے کسی کو بھیجیے' تو یہ بورا اٹھالیں۔"

"بالکل' بالکل بلکہ میں فون کرتا ہوں۔" وہ نمبر پش کرنے لگے۔ "بھئی وہ تمہاری آنٹی کہہ رہی ہیں' ابھی تک کوئی نہیں آیا اور دوسرے تمہارے گھر کی چابی ان کے پاس ہے۔"

"ویری گڈ!" عروہ خوش ہو گئی۔

"تو پاپا! آپ یہاں رکیے۔ میں سائیکل لاتی ہوں۔ بس دس منٹ لگیں گے۔"



ایک عجیب سی خاموشی اور پراسراریت نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بظاہر بولتے مگر اپنی اپنی سوچوں میں گم ۔۔۔

"اتنا اچھا رشتہ مل گیا ہے مگر پتا نہیں کیوں دل بجھا بجھا سا ہے۔ اتنی بار آپا فون کر چکی ہیں۔ ان سے ادھر ادھر کی ہزار باتیں کر لیتی ہوں مگر بس ایک لفظ 'ہاں' نہیں نکل پاتا۔" امی الجھن میں تھیں۔

پاپا یوں بیٹھے تھے جیسے مجسمہ۔ علشبہ کے چہرے کی سپیدی بہت نمایاں ہو گئی۔ عروہ نے پہلو بدلا۔ امی بڑبڑاتی کچن میں گھسی تھیں اور علشبہ نے بہت دھیرے سے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تو عروہ کھسک کے پاپا کے نزدیک ہو گئی۔

"ایک بات تو بتائیے کیا آپ نے تائی اماں وغیرہ کو معاف کر دیا؟"

پاپا نے طویل سانس لی۔

"ہاں ۔۔۔ شاید۔"

"اونہہ! میں نہیں مانتی۔ اگر انہیں معاف کر دیا تھا تو سزا آپی کو کیوں دے رہے ہیں؟"

"میں کسی کو سزا نہیں دے رہا ایسا الزام۔" وہ ترنت بولے۔

"کاغذ پر لکھتی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ بس عمل در آمد ہوتا ہے۔ آپ کو پتا ہے پاپا! اگر آپ کی آپی سے اور آپی کی آپ سے محبت کسی ترازو میں تولی جائے تو معلوم ہے۔ آپی جیت جائیں گی۔ وہ آپ کی محبت میں' آپ کی فرماں برداری میں اُن چاہے راستے پر دوڑنے کو تیار ہیں' ایسا راستہ جو خار خار ہے' جہاں کہیں سایہ نہیں۔ خشک ہونٹ اکڑتی زبان ۔۔۔ ساری زندگی کے لیے ایک سزا ۔۔۔ اور اب جو میں بات کہوں گی کوئی سنے تو بہت بری لگے۔ لوگ تھو تھو کریں مگر پاپا حقیقت تو حقیقت ہی ہے اف یو ڈونٹ مائنڈ۔"

اس نے تھوک نگلا اور قصداً پل بھر کو رکی۔ پاپا بہت سکون سے اسے سن رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا مگر عروہ کو لگا وہ اسے سننا چاہتے تھے۔

"دراصل آپ دونوں سی سا پر بیٹھے ہیں۔ ایک اوپر ہو گا تو دوسرا لازماً نیچے ۔۔۔ زندگی کے اگلے پل کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ خبر نہیں میں اپنا جملہ بھی مکمل کر پاؤں گی یا نہیں۔ یہ جو سانس اندر لی ہے' باہر نکالنے کا

موقع ملے گا یا نہیں ۔۔۔ موت برحق ہے ناں پاپا ۔۔۔ آئی ام سوری پاپا جو ۔۔۔ میں کہنے لگی ہوں۔"

وہ اٹکی اور بمشکل ان کی نگاہوں کو سہارا ۔۔۔ پہلے جان بوجھ کر ٹھہر ٹھہر کر تول تول کر بول رہی تھی۔ اب واقعی اٹک گئی۔

"کہو بات جاری رکھو ۔۔۔ جو بھی کہنا ہے۔" پاپا نے چشمہ صاف کر کے دوبارہ ناک پر ٹکایا۔ ان کا انداز ہمت بندھاتا ہوا تھا۔

عروہ نے بہت لمبا سانس کھینچا۔

"آپ کی ریٹائرمنٹ میں اب کچھ ہی عرصہ پڑا ہے۔ ہمارے یہاں ایوریج عمر یہی ہے ساٹھ یا پینسٹھ یا کچھ تھوڑی اور زیادہ ۔۔۔ آپ دس سال سے ان جملوں کو جھیل رہے ہیں۔ اب میں جب سوچتی ہوں تو ہونہہ مو سے شرمندگی غصہ بے بسی بہہ نکلتی ہے۔ پر پاپا!"

وہ خاموش ہو گئی اور اس بار یہ وقفہ بہت طویل تھا۔

"آپی کی مان لیں۔ آپ کو پتا ہے وہ اٹھائیس برس کی ہیں۔ ایوریج عمر کو دیکھیں تو معلوم ہے کتنے سال سزا جھیلیں گی۔ شاید پینتیس سال' چالیس سال یا اس سے بھی زیادہ ۔۔۔ اتنی لمبی سزا؟ آپ دس سال سے کاٹ رہے ہیں کتنا مشکل ہوتا ہے ناں سزا جھیلنا جبکہ آپ مجرم بھی نہ ہوں۔ یونہی الزام میں بھگتتے ہوں ۔۔۔ سکندر سلیمان کا ساتھ دنیا کی نظر میں خوش نصیبی ہو گا مگر خوشی واحد چیز ہے' جو بتائی نہیں جاتی کہ تم خوش ہو' یہ تو دل کے اندر سے بیل کی طرح پھوٹتی ہے اور سارے وجود کو ہرا بھرا کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں' وہ دن بدن بے رنگ ہوتی جا رہی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ دلائل اور بھی تھے مگر پاپا کا سپاٹ چہرہ اس نے ڈھیٹ بن کے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ انجام سے بے پروا ہو کر مگر نتیجہ ۔۔۔ "جاؤ تمہاری ماں اکیلی کچن میں لگی ہے۔ میرے لیے ایک کپ چائے دے جانا۔"

عروہ کی آنکھیں یک بیک بھر آئیں۔ اس نے ناک سکوڑی۔

میں رو رہی ہوں پاپا کو پتا تو چلے ناں۔

وہ چائے بناتے ہوئے بھی ادھیڑ بن میں تھی۔

"ایک ۔۔۔ ایک آخری بات کہہ دوں۔" جب وہ چائے لے کر آئی تو احسان صاحب کے چہرے کی گمبھیرتا سے گھبرا گئی۔ مگر اب نہ کہا تو پھر کب؟

"بھی وہ ۔۔۔ امی آپا سے بات کرنے لگی تھیں فون پر آپ کے موبائل کی چارجنگ ختم تھی تو گھنٹے بعد فون کرنے کا بولا ہے۔ یہی ایک گھنٹہ گزرے گا۔ امی ہاں کہہ دیں گی بات طے ۔۔۔ پاپا! آپی نے حکم عدولی نہیں کی' جو آپ نے کہا مان لیا۔ مان چکی ہیں وہ اپنی محبت میں پوری اتریں۔ پاپا آپ بھی تو اپنی محبت ۔۔۔"

"بس ۔۔۔ بس جاؤ' چلی جاؤ بس۔" پاپا نے بے حد ٹھہرے لہجے میں کپ میز پر رکھ کے دروازہ دکھایا۔ عروہ کی ساری بہادری ہوا ہوئی۔ وہ سرپٹ دوڑی۔



منگنی کی تقریب میں وہ سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہ جواب دے دے تھک گئی۔ چوبیس کلیوں والے گاجر رنگ کے فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ کی بس جھلک ہی دکھائی پڑتی تھی۔ لمبی پنسل ہیل۔ بال کھلے چھوڑے تھے اسے دیکھتے ہی بڑی تراوٹ اور خوشی کا تاثر ابھرتا تھا مگر۔

مگر دور سے نزدیک سے شکل کا خوب حشر بگڑا تھا۔ رو رو کر سوجی آنکھیں' ناک سرخ پکوڑا۔ گلا بیٹھ چکا تھا۔ احمر نے کہا۔

"یوں لگتا ہے جیسے شہد کی مکھیوں نے دھاوا بولا ہو چہرے پر۔" رونے سے ایسی سوجن تھی کہ نقش کچھ کچھ جاپانی اور کچھ تائیوانی لگتے تھے۔ یہی عالم علشبہ کا تھا۔ عروہ نے کھیرے رکھے' آلو کے قتلے ٹھنڈے پانی میں ڈبو ڈبو کر آنکھوں کو سہلایا مگر ۔۔۔ نتیجہ کیسے اچھا ملتا۔ وہ چپ کرتے کرتے پھر رو پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ انگوٹھی پہنتے اور پہناتے وقت بھی ہتھیلی کی پشت پر آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ کہاں تو یہ طے ہوا تھا کہ گھر کی شفٹنگ کے بعد رسم کی جائے گی اور کہاں "آناً فاناً" تین دن کے اندر باقاعدہ فنکشن ارینج کر لیا گیا۔

یہاں تصاویر بنانے کا مقابلہ تھا۔ شامت عروہ کی تھی۔ سب اسے لازمی شامل کرنا چاہتے تھے۔ اب وہ علشبہ کی طرح گھونگھٹ نکال کر تو بیٹھنے سے رہی۔ اس کی تصاویر تو اچھی آہی جانی تھی۔

تیز کاجر رنگ کی لمبی قمیص اور کھلے ٹراؤزر کے ساتھ تیز نیلے کنٹراسٹ کا خوب کام سے بوجھل دوپٹہ بہت لمبے گھونگھٹ کی صورت چہرے پر گرا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں سوٹ کی ہم رنگ چوڑیاں کلائی کو چھپائے ہوئے تھیں۔ یہاں سب سے زیادہ خوب صورتی اس کے ہاتھوں کی تھی جن کی صرف پہلی پوروں کو مہندی سے رنگا گیا تھا اور وہ دہک رہی تھیں۔ اتنا سرخ شوخ امنگوں بھرا رنگ تھا کہ ہاتھ چومنے کو دل کرتا۔

"منگنی پر انہوں نے اتنے نیر بہا دیے آپ کہیں تو بارات ہم بوٹس پر لے آئیں۔" عروہ نے بصد احترام منگیتر صاحب کو کولڈ ڈرنک سرو کی تو موصوف خوش دلی سے بولے۔

"دراصل یہ اس منگنی پر راضی نہیں تھیں۔ آئی مین ہیں۔" عروہ نے دانت کچکچا کر مگر اسی احترام سے کہا۔

"او آئی سی۔ چچ چچ" افسوس کا اظہار۔

"لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ یہ صبر کے گھونٹ پئیں" عروہ نے باقاعدہ بدتمیزی سے ہاتھ پکڑ کے اس میں گلاس تھمایا۔

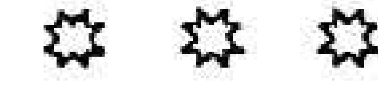
"ویسے سب مہمان تو چلے گئے۔ آپ کب صوفے کی جان چھوڑیں گے؟"

"اتنی مشکل سے تو بیٹھنے کی اجازت ملی ہے اور ہم تو داغ کے ماننے والے ہیں 'حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے۔" منگیتر صاحب کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔ نظروں ہی نظروں میں اسے تول رہے تھے۔

"اب اتنے رش میں کیا کہوں" اپنی عزت اپنے ہاتھ..... مگر وہ تو شاید سنا ہی ہو گا۔ بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے..... شعر سننا اور دیکھنا' لگتا ہے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا صاحب کو..... میں ابھی۔" عروہ کے تو مانو سر پر لگی۔

"عروہ! عروہ! امی اسے پکارتی آئیں۔" اپنے بابا کو بلاؤ۔ وہ کہاں چلے گئے۔ دیکھو کہاں ہیں وہ۔"

"ارے!" عروہ نے بہت مطمئن بیٹھے دولہا کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا اور پاپا کی تلاش میں اندر گئی۔



اس نے اندر جھانکا تو پاپا بہت ڈھیلے سے کرسی کی پشت پر گردن گرائے بیٹھے تھے۔ وہ چند لمحے رک کر دبے قدموں ان کے پیچھے آکر رک گئی۔

"اس وقت ایسے اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟" اس نے دونوں بازو ان کی گردن میں حمائل کر دیے اور گال سے گال جوڑتے ہوئے بہت پیار سے پوچھا۔

"اور مجھے لگتا ہے میرے پاپا رو رہے ہیں۔" اس نے اپنا گال پاپا کی آنکھ سے مس کیا۔

"اور مجھے لگتا ہے میری بیٹی بھی رو رہی ہے۔" پاپا نے چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں کو بغور دیکھا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

"حیرانی کی بات رونا نہیں ہے۔" عروہ شوخی سے گویا ہوئی۔ اس نے اپنی تین انگلیاں پاپا کے چہرے کے سامنے کیں۔ "یہ آنسو ہیں۔ اس نے نمی کی جانب اشارہ کیا بتائیے کون سے میرے ہیں۔" اس کی آواز میں نمی تھی۔

"دونوں میرے۔" پاپا نے انگلیوں کو بوسہ دیا۔ عروہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"چلیں باہر چلتے ہیں' بڑا مزا آئے گا۔"

"پاپا.....!" وہ پکار کر چپ ہو گئی۔

"بولو بھی!"

"آپ' آپ..... ابا نہ بنیں تو کچھ پوچھوں۔"

"میں پہلے کب ابا بنتا ہوں۔" وہ ہار ماننے والے انداز میں بولے۔

"بن جاتے ہیں کبھی کبھی۔" وہ بسوری۔

"عروہ۔ عروہ! ادھر آؤ....." امی اسے پکارتی آئیں۔

"جی امی!" وہ سرعت سے کھڑی ہوئی۔

"ادھر کیا کر رہی ہو۔ وہاں نسیم آپا جانے والی ہیں۔ ایک تھیلا بریانی تو ڈال دو۔ اچھا نہیں لگتا۔ ایسے ہی بھیجتے ہوئے۔ اور آپ بھی آکر خدا حافظ کہیں۔ جلدی سونا عادت ہے مگر ابھی تو مہمان ہیں۔ آئیے' آپ بھی باہر آئیے۔" امی تیز تیز ہدایات دیتی باہر نکلیں۔ عروہ پیچھے پیچھے۔

ہم کسی بھی معاملے کی کوئی سی بھی توجیہہ دے کر سامنے والے کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ' جھوٹی وجہ..... ہم جواب دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں مگر اصل جواز وہ' جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں' جب ہم خود سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ جب ہمیں خود کو بتانا ہوتا ہے خود کو سمجھانا ہوتا ہے۔ دوسروں کو مطمئن کرنا آسان ہوتا ہے مگر اپنی روح کی طمانیت..... ہم اسے قائل کریں تو بات ہے۔

عروہ نے ہر طریقے سے منانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس دلیل تھی' عقل تھی۔ جوش تھا' ہوش تھا۔ وہ رو کر ہنس کر لاڈ سے خفا ہو کر ہر طریقے سے انہیں منا چکی تھی مگر وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔

عروہ ہار کر ان کے قدم پیچھے کر چکی تھی۔ مگر چلتے چلتے وہ ایک جملہ وہ ایک منظر کشی بس بات ختم اس نے کہا۔ "آپ اپنی زندگی جی چکے ہیں۔ آپ اپنی سزا جھیل چکے ہیں۔ اگر مزید امتحان میں پڑتے ہیں' دنیا کا سامنا کرنا پڑے گا تو کتنے سال دو سال' دس سال۔ مگر علشبہ کے سامنے پوری زندگی ہے۔"

بڑی بھیانک تصویر کشی تھی۔ دل کو کچھ ہوا' ڈوب سا گیا مگر کنی کترا گئے۔ وہ باپ کی محبت احترام اور عزت کے معاملے میں اتنی ہٹیلی ہے۔ جان سے چلی جائے گی مگر انہیں جھکتا برداشت نہیں کر سکتی۔ سینہ چوڑا ہو گیا۔ تفاخر سے گردن اکڑ گئی مگر..... وہی ڈھاک کے تین پات.....

"اعتراض کرنے والے تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں اتنے سال تک لڑکا اپنے گھر میں رکھا۔ کیسے ہو سکتا ہے کوئی چکر نہ ہو..... اور تو اور میاں صاحب ہی پوچھ لیں گے۔ مون جیسے بندے کے ہوتے تمہارے گھر والوں کو کسی اور سے رشتہ کیوں کرنا پڑا' مون سے کیوں نہ کیا؟" طعنہ نیزے کی انی کی طرح چبھا مگر سر جھٹک دیا۔

انیسہ نے فون تھما دیا تھا۔ وہ اونچے لہجے میں آپا سے بات کر رہی تھیں۔ عروہ صوفے پر کشن گود میں بھینچے بیٹھی ناخن کتر رہی تھی۔ تب ہی چھناکے سے کچھ گرنے کی آواز آئی علشبہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا۔ وہ لہرا گئی تھی۔ انہوں نے گہری نگاہ سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"سوری! وہ گلاس پھسل گیا۔ ایسے ہی چکر آگیا تھا۔" وہ بدقت مسکرائی اور "سب ٹھیک ہے" کا اشتہار منہ پر چسپاں کر دیا۔

سب ٹھیک نہیں تھا۔ انیسہ کی فون پر بات ادھوری رہ گئی عروہ نے چیک کیا۔ اس کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا۔

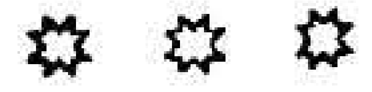
"کچھ نہیں ہوا..... مجھے کچھ نہیں ہوا۔" وہ تسلیاں دینے لگی۔

فون کی بیل بج رہی تھی۔ عروہ پیر پٹختی فون کی سمت بڑھی۔ دوسری طرف آپا تھیں۔ امی نے اشارے سے کہا' بعد میں بات کریں گی۔ وہ فون بند کرنے لگی' تب ہی پاپا نے ہاتھ بڑھا کر فون لے لیا۔

"تم جاؤ میں آپا سے بات کرتا ہوں۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ عروہ کا سانس خشک ہو گیا۔ وہ جم سی گئی۔

"تم جاؤ..... یہاں سے۔"

عروہ کمرے سے نکلی۔ پاپا نے اسی فون پر علشبہ کی منگنی کا دن طے کر لیا تین دن بعد۔



"آپ نے یہ بتا کر اپنی بہن کے لیے گڑھا نہیں کھود لیا کہ وہ اس منگنی پر راضی نہیں تھیں۔"

عروہ آلتی پالتی مارے دولہا دلہن کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ دولہا نے کب سے مچلتا سوال کر دیا۔

"کیا مطلب؟" عروہ ٹھنکی۔ "آپ میری بہن کو

جانتے نہیں۔"

"ہم تو ڈوبے ہیں صنم ہم کو بھی لے ڈوبیں گے۔"

علشبہ نے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھا جس کی شوخی و شرارت عروج پر تھی۔ "اور تم آپی! اب تک یہیں بیٹھو گی چلو کمرے میں چلتے ہیں، چلو اٹھو۔" اس نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

"نہیں اٹھ سکتی۔" علشبہ منمنائی۔

"کیوں بھلا؟" علشبہ چپ۔

"تو آپ اٹھیے پھر۔" وہ دولہا کی طرف مڑی۔

"نہیں اٹھ سکتا۔" وہاں بھی عذر۔

"آخر آپ دونوں کو کیا مسئلہ ہے؟" وہ غصہ ہوئی بلکہ۔ "او آئی سی! آپ دونوں کے ایک ایک ہاتھ غائب ہیں، کہاں ہیں۔"

"ایک دوسرے کے ہاتھ میں۔" دولہا نے اپنا ہاتھ اونچا کیا تو دلہن کا ہاتھ بھی سامنے آگیا۔

"یہ دیدہ دلیری، اتنی ڈھٹائی۔" عروہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔

"ہم ہمت والے لوگ ہیں۔ اب چھوڑیں گے نہیں۔" دولہا نے ہاتھ پیچھے کیے اور اپنی جھولی میں رکھ لیے۔

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب جو ہوا آپ کی ہمت کا نتیجہ ہے؟" عروہ نے کڑے تیوروں سے گھورا۔

دولہا لاجواب ہو گیا۔ عروہ کے چہرے کو بغور دیکھا، پھر اپنی گود میں سرخ مہندی والے ہاتھ کو۔

"ہمت نہ سہی محبت سہی۔" وہ بہت دھیمے سروں میں بولے۔

"کیوں علشبہ؟" دلہن سے تائید چاہی۔

"محبت۔" عروہ نے دانت پیسے۔ "ایک بات میں بتا دوں۔ یہ محبت کا نتیجہ تو ہے مگر آپ دونوں کی محبت نہیں.... ایک تیسری محبت، میری محبت، جو مجھے آپ سے ہے، آپ دونوں سے ہے.... آپ دونوں کی محبت جو میرے جسم میں خون کی جگہ دوڑتی ہے۔ آپ دونوں کی ایک دوسرے سے محبت آپ کے کام نہیں آئی۔ یہ یاد رکھیے گا۔ یہ تیسری محبت ہے جس کی کارگزاری ہے۔ اس تیسری محبت نے جان پر کھیل کے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈال کے.... دکیل راتوں کو جاگ کر نظریہ ضرورت کا کیس ایسے نہیں بناتے ہوں گے جیسے میں نے دلائل تیار کیے۔"

اس کے لہجے میں خوشی اور طمانیت تھی۔

"لیکن اب میں یہ سوچتی ہوں کیا یہ بھی میں بتاؤں گی کہ آپی غیب احمد سے کتنی محبت کرتی ہیں اور غیب احمد آپی سے کتنی۔ کیا یہ کام بھی مجھے کرنا ہو گا۔" وہ شریر ہوئی۔

"نہیں، نہیں۔" مون نے سرعت سے اس کی بات کاٹی۔ "تمہارا کام یہیں تک تھا۔ آگے میں خود۔"

"مون بھائی!" وہ پوری طاقت سے چیخی۔

"آہستہ آہستہ۔" علشبہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"اوں اوں۔" اس نے سر دائیں بائیں پٹخ کر کے خود کو چھڑایا۔ "یہ واحد فلم ہے جس کی ہیروئن نے شروع سے آخیر تک ایک لفظ نہیں کہا اور پھر بھی جیت گئی واہ!"

میرا وکیل جو اتنا اچھا تھا۔" علشبہ نے دوپٹہ ماتھے تک اوپر کر کے پیار سے عروہ کی ٹھوڑی چھوئی۔ عروہ نے ایک پل کو علشبہ کا جگمگاتا چہرہ دیکھا۔

"آپی!" وہ اس سے لپٹ گئی۔

"میں بھی بہت خوش ہوں۔"

"تو کیا میں .... بھی۔" مون بھائی نے جیسے جھجکتے ہوئے اپنا آپ پیش کیا۔

"کوئی نہیں۔" عروہ نے ان کا بڑھا ہاتھ جھٹکا۔ "پاپا سے ڈر نہیں لگ رہا۔ کیسے چپک کر بیٹھے ہیں، چلیے جائیے اب۔"

"جا رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ہم دونوں جا رہے ہیں۔"

"دونوں.... اور پاپا.... ان کی اجازت کے بغیر کبھی کچھ ہوا ہے؟ سارا خاندان اکٹھا ہے۔" اس نے ڈرایا۔

"سارا خاندان ہمیں اکٹھا دیکھنے کے لیے ہی اکٹھا ہوا ہے۔" مون نے بہت مزے سے کہا۔

"ارے!" عروہ کو سن کر بہت مزا آیا۔ وہ ہنسی سارے مہمانوں کے لیے بڑوں کے گھر کے کمرے میں بستر بچھا کر عروہ لوٹی تو تھکاوٹ انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آئی۔ کرسی پر جھول جھول کر چائے پیتے ہوئے سارے دن کو سوچنا بہت دلچسپ تھا مگر وہ دروازے پر ٹھٹک گئی۔ پاپا بھی یہی کر رہے تھے۔

"آپ نے بتایا نہیں کیسے مان گئے۔" دونوں اپنی جگہ خاموش تھے۔ وہ چائے پیتے ہوئے یہ اپنا کپ بناتے ہوئے۔ پاپا بہت گہری سوچ میں تھے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر پکارا۔

"تم نے منایا جو تھا۔"

"اونہوں! اصل بات کہیے پاپا! مجھے تو جھاڑ کر نکال دیا تھا۔"

"تمہارے دلائل دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے ان ضربوں کو برداشت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا.... مگر۔" پروفیسر صاحب کی آواز بھرا گئی۔

"اس کی فرماں برداری، تابع داری اور اس پر بے چارگی، جب وہ کہہ رہی تھی۔ میں ٹھیک ہوں اور اس پر آنسوؤں سے بھری آنکھیں۔ وہ بہت سالوں کی دعاؤں کے بعد ملی تھی۔ ثریا جیسی، صابر شاکر، خاموش، میں نے سب رشتے فراموش کر دیے، صرف باپ بن گیا۔ اس کی آنکھوں کی بے بسی اور ٹوٹتے کانچ سا لہجہ "میں ٹھیک ہوں"۔ ایسا لگا سیسہ پگھل کر سماعتوں میں انڈیل دیا ہو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور وہ اس دن عتیق بھی تو کہہ رہا تھا۔ فرشتے بھی تہمت سے نہیں بچ پائے اور دوسرے میں تو حقیقت سے واقف ہوں ناں بس اتنا کافی ہے۔"

"واہ!" وہ ٹھنکی۔ آپ نے سارا کریڈٹ "تابع داری" کے خانے میں ڈال دیا اور میں.... میرا کیا دھرا!"

"تابع داری کے بارے میں تم ہی نے بتایا تھا ورنہ مجھ سے تو ظلم ہو ہی رہا تھا۔ دراصل بات یہ ہے عروہ احسان۔" پاپا نے شوخی کا مظاہرہ کیا۔ "ابھی تم وہاں کہہ رہی تھیں ناں مون اور علشبہ سے یہ سب تیسری محبت کا کارنامہ ہے جو تمہیں ان سے تھی، جو مجھے تم سب سے ہے۔"

پاپا نے قصہ سمیٹ دیا۔

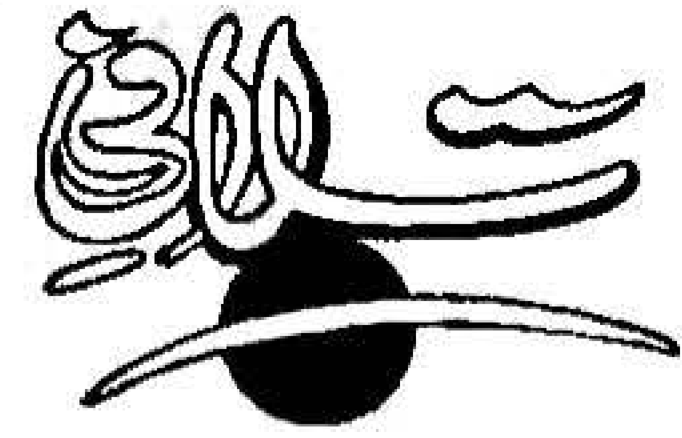
"پاپا! زندہ رہنے کے لیے محبت بہت ضروری ہے ناں؟" بہت دیر کی خاموشی کے بعد عروہ بولی۔

"ہاں بہت ضروری ہے میری تم سے۔ تمہاری ان سے۔ انسان کی انسان سے محبت بہت ضروری ہے۔"

پاپا نے تائید کی عروہ ہولے سے ہنس دی۔ باہر سردی تھی۔ خوشبو تھی اور چاند اپنے جوبن پر۔

☼

سنیعہ ظاہر حسین



کوئی تیسری مرتبہ اس نے نخوت سے ناک سکوڑی۔ اردگرد کا جائزہ لیا پھر گھٹی گھٹی سانس لی۔

"کتنی بدبو ہے بی جان!" واضح الفاظ میں اس نے قدرے نیچی آواز میں تبصرہ کیا۔

"بیٹی! ابھی بجلی آجاتی ہے' پھر میں پنکھا چلادوں گی تو تمہیں اتنی بدبو محسوس نہیں ہوگی۔ ویسے بھی ابھی بتول فاطمہ مرغیوں کو باہر نکال کر ڈربہ صاف کرے گی تو کچھ کمی ہوجائے گی۔ میں تو عادی ہوگئی ہوں۔ تم ابھی تک شاید نہیں ہوسکی ہو۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے خود ہی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔ بھلا یہاں مرغیوں کے ڈربے کی بدبو' جو اس کا دماغ تک سڑا چکی تھی' اس میں ان کا کیا قصور تھا۔

اس کی ماں کا خیال تھا وہ شادی' پسند' محبت جیسے الفاظ محض انہیں تنگ کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے مگر جب ٹھیک دو دن بعد بی جان واپس جارہی تھیں تو۔

"اچھا آمنہ! بہت شکریہ۔ تم نے میرا بڑا خیال رکھا۔"

وہ چادر کو ماتھے تک کھینچ کے برابر کرتے ہوئے اس کی امی سے بولیں۔

"ارے کہاں بی جان! آپ اتنی جلدی جارہی ہیں۔ میں تو ٹھیک سے آپ کی تواضع بھی نہیں کرسکی۔" وہ انکساری سے بولی۔

"نہ بابا۔ تواضع کیسی؟ سات دن' رات' صبح' دوپہر بھوکی تھوڑی رہی ہوں۔ ماشاءاللہ تینوں وقت تم نے اتنے اچھے اچھے کھانے کھلائے ہیں۔ تازہ اور ذائقے دار۔ اب بندہ ساری زندگی اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے در پر تو نہیں پڑا رہ سکتا ناں۔"

انہوں نے ایک سانس میں شکریہ' مہربانی' قدر شناسی اور مجبوری کا اظہار کردیا۔

"چلیں بی جان!" اندر سے آتی صبا نے ان ہی کے انداز میں چادر ماتھے تک کھینچ کے برابر کی' پھر پاؤں خوبصورت ایرانی چپل میں گھسائے اور چھوٹا سا سفری بیگ الٹے ہاتھ میں منتقل کیا اور پھر ڈرتے ڈرتے ماں کو دیکھا۔

"اللہ حافظ۔" بی جان نے امی کو گلے لگایا' سر پر بوسہ دیا' پھر اسے باہر آنے کا اشارہ کرکے جالی دار دروازے سے نکل گئیں۔

"میں جلدی آجاؤں گی امی!" وہ جھجکتے ہوئے ماں کے نزدیک آئی۔ پھر اپنا سیدھا ہاتھ زبردستی ماں کے ہاتھ کے ساتھ ملایا اور ان کے گلے لگ گئی۔

"تو آخر تم جارہی ہو؟" آمنہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"آپ سے پوچھ کے جارہی ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے ماں کو دیکھا۔

"پوچھ کے نہیں' اطلاع دے کر۔" اس نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹی۔

"امی! اب جاتے جاتے بھی آپ۔" ماں کا سرد و سپاٹ انداز اسے رلانے کو کافی تھا مگر سفر پر جانے سے پہلے وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔

"جاؤ' میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔" اس نے ایک نظر صبا کو دیکھا۔ سیاہ کڑھائی والی چادر میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ کچھ اندرونی خوشی اور کچھ قدرتی خوبصورتی تھی' پھر جب وہ اسے پہلے نہیں روک سکی' اپنے شوہر کو نہ منا سکی تو اب کیا کرتی؟

وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔ ایسے میں وہ اسے بھلا کیا سمجھاتی کہ تم اس اپلے تھاپتی' لکڑیاں جلاتی عورت کو نہ نرم کرسکتی ہو اور نہ منا سکتی ہو۔ اس عورت کی فطرت میں ہٹ دھرمی ہے۔ وہ کھڑی کھڑی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔

صبا نے ایک نظر ماں کو دیکھا۔ جانے وہ کیا سوچنے لگی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا ہاتھ چوم کے چھوڑ دیا۔ دو قدم آگے بڑھ کے دوبارہ وہ پلٹی اور ماں کے پاس رک کے ایک بار پھر اس کے گلے سے لگ گئی۔ گال پر پیار کیا اور آنکھوں کی نمی چھپاتی باہر بھاگ گئی۔ پیچھے کھڑی آمنہ پیچھے ہی کہیں بہت دور نکل گئی۔



☼ ☼ ☼

"بی جان! پھو اماں مان جائیں گی ناں۔۔۔؟" اس کا لہجہ آس و نراس سے بھیگا ہوا تھا۔ بی جان کھڑکی کے پاس کھڑی باہر دانہ چگتی مرغیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سوال کو سنا نہیں یا شاید جان بوجھ کر ان سنا کر گئیں۔

"بی جان!" اب کے صبا بھی ان کے ساتھ آ کے کھڑی ہو گئی۔

"صبا بچے۔۔!" انہوں نے آہستگی سے ہونٹ وا کیے۔

بولتے ہوئے وہ یقیناً "سوچ بھی رہی تھیں تب ہی ان کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھی۔ صبا سراپا سماعت تھی۔ وہ ناراض ماں کو چھوڑ کے آئی تھی اور جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی مگر یہاں۔۔۔؟

"یہ جو بتول ہے ناں، یہ اپنی ضد کی بڑی پکی ہے۔ تو کوشش کر لے، آگے اللہ کی مرضی۔"

وہ اسے یہ سب بتا کے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ سو دل میں سوچتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ "اللہ کی مرضی۔" پھر اس کی طرف گھومیں۔ "اور رہ گئی بات تیری ماں کی تو اس کی فکر نہ کر، میں اسے منا لوں گی۔ اسے منانا کون سا مشکل کام ہے۔" انہوں نے سادہ لہجے میں کہا پھر ایک نظر اسے دیکھ کر باہر نکل گئیں۔

صبا نے کھڑکی سے دکھائی دیتی اپنی مستقبل کی "ساس اور حال کی پھپھو" کو دیکھا، پھر طویل سانس لیتے ہوئے سوچا۔ "واقعی امی کو منانا آسان ہے۔"

☼ ☼ ☼

صحن کے عین وسط میں سرخ زرتار جوڑے میں کھڑی لڑکی نے پہلے حیرت، پھر دکھ اور آخر میں مایوسی سے گلا پھاڑ پھاڑ کے روتی ادھیڑ عمر عورت کو دیکھا، جس کے رونے کی اصل وجہ سے وہ تاحال ناواقف تھی۔

"اماں! شادی کرنا گناہ ہے؟"

ابرار نے ماں کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے بے بسی سے پوچھا۔ اماں نے جواب نہ دیا بس روتی رہیں۔

"اماں! آمنہ کو ایک مرتبہ دیکھ تو لو۔ یہ اچھی بہو بن کے دکھائے گی۔"

ابرار نے ایک مرتبہ پھر مایوسی سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اماں کے آنسو نہ رکے۔

"تم ایک نظر دیکھو تو سہی۔ وہ بچاری تھکی ہاری ابھی ابھی آئی ہے۔ آگے سے تم نے یہ سب شروع کر دیا۔"

ابرار خجل خجل سا کبھی ماں کو، تو کبھی اپنی نئی نویلی دلہن کو دیکھتا۔

"اماں۔۔۔!" تھک کے ابرار اٹھا اور اندر چلا گیا۔

بہت سا رو لینے کے بعد اماں اٹھیں، پلو کے کونے سے آنسو صاف کیے پھر اسے سر پر جمایا۔ کنکھیوں سے اسے دیکھا، پھر دائیں جانب غائب ہو گئیں۔

صحن کے وسط میں کھڑی زرتار گٹھڑی نے ایک مرتبہ پھر حیرت، دکھ اور مایوسی سے سر جھکا لیا۔ بہت سے نمکین پانی سے اس کا گریبان اور دوپٹا بھیگنے لگا۔

یہاں کے حالات اور اس کے استقبال کے بارے میں ابرار نے بہت اچھی طرح اسے بتا دیا تھا، پھر بھی وہ ایک ابرار کے بھروسے چلی آئی تھی۔

دراصل ابرار نے بچپن سے عہد کر رکھا تھا کہ وٹے سٹے کی شادی نہیں کرے گا اور چونکہ یہاں کوئٹہ سے تقریباً "ایک سو پچھتر کلومیٹر کے فاصلے پر رہنے بسنے والے تقریباً" سارے خاندان ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے، پھر ہر وقت کا ذکر، آنکھوں دیکھا حال۔ ابھی ابرار کا شعور پختہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے عہد کر لیا کہ وہ وٹے سٹے میں شادی نہیں کرے گا۔ اس بات کا وہ اکثر برملا اظہار بھی کرتا تھا۔ اس کی "بغاوت" کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی، سو ایسے میں اس کی اکلوتی بہن کا شوہر وقتاً "فوقتاً" اسے بہن سے شادی نہ کرنے کی صورت میں اس کی بہن کو طلاق کی دھمکی دیتا رہتا تھا۔

ابرار کی بہن لاکھ اپنے خوبرو، پڑھے لکھے بھائی پر ناز کرے اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ اپنی موٹی اور توے کی رنگت والی نند کو اپنے بھائی کے پہلو میں دلہن

کے روپ میں کھڑا برداشت نہ کرے، مگر یہ بھی ماننے والی بات تھی کہ یہ سب نہ ہونے کی صورت میں اسے اپنے باپ کے گھر جانا پڑتا اور وہ بھی مطلقہ کی حیثیت سے۔۔۔!

سو وہ آتے جاتے ماں کو باور کرانا نہ بھولتی۔

شہر سے فون آنے پر ماں حرف بہ حرف ابرار کے گوش گزار کر دیتی۔ بہن کی خاطر وہ مان بھی جاتا اگر جو اس نے اپنی کلاس فیلو آمنہ کے لیے دل نہ ہارا ہوتا۔

بے شک بہن مطلقہ کی حیثیت سے گھر آ کے بیٹھ جائے۔

وہ مجبور تھا۔ پتا نہیں وہ مجبور تھا یا پھر خود غرض۔

آمنہ کی آمد کے ٹھیک چار دن بعد۔۔۔

دروازے سے بین کرتے، اپنے تین سالہ بیٹے کو گود میں اٹھائے ٹوٹے ہوئے سوٹ کیس اور ختم ہوتی امید کے سہارے وہ آ گئی۔

وہ۔۔۔ جسے سب بتول فاطمہ کہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے یہاں آئے پورا ایک دن ہو چکا تھا۔ دوسرا دن شروع ہوئے بھی کافی وقت ہو چکا مگر پھر بھی وہ دکھائی نہ دیا، نہ اس سے ملاقات ہوئی، سو جھنجلاہٹ بڑی فطری سی بات تھی۔

کمرے کی گھٹن، مرغیوں کی بدبو اور اپنی لایعنی سوچوں سے پیچھا چھڑاتی وہ اکتا کر کمرے سے باہر نکلی کہ پل بھر میں اس کی اکتاہٹ دھواں ہو گئی۔ آنکھوں میں ڈھیروں ستارے، جگنو مچلنے لگے، کیونکہ نظروں کے عین سامنے وہ تھا، جس کی خاطر وہ اپنے گھر سے دور "ایک سو پچھتر" کلومیٹر کے فاصلے پر آ بیٹھی تھی۔

"کیسی ہو۔۔۔؟" بدر نے آنکھوں کے راستے اسے دل میں اتارا، پھر سامنے کھڑے میلے برتن دھوتی ماں کا لحاظ کرکے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"تم سناؤ، کدھر غائب ہو؟ آج دکھائی دے رہے ہو۔"

بدر کی نسبت اس نے اطمینان اور اعتماد سے پوچھا۔

"میں نے کدھر جانا ہے؟ سارے راستے تو یہاں سے شروع ہو کے اب یہیں پر ختم ہوتے ہیں۔"

بدر نے خوبصورت مسکراہٹ لبوں پہ سجا کے نظر بھر کے اسے دیکھا، پھر دیوار سے ٹیک لگا کر سکون سے کھڑا ہو گیا۔

صبا نے ایک نظر کھرا صاف کرتی اپنی پھپھو اماں بتول فاطمہ کو دیکھا۔ وہ تمام برتن دھو لینے کے فوراً بعد کھرا صاف کرتیں، پھر اسی کھرے پر بیٹھ کے اپنی گلابی پھٹی ایڑیاں رگڑتیں اور ہاتھوں کو سادے پانی سے صاف کرنے کے بعد اٹھتیں مگر آج کھرا صاف کرتے ہی وہ اٹھیں، برتنوں کی ٹوکری اٹھائی اور ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلی گئیں۔

صبا نے دکھ اور مایوسی سے انہیں جاتے دیکھا۔ اس کا دل چاہا، وہ ہاتھ بڑھا کے پھپھو اماں سے ٹوکری لے پھر انہیں اپنائیت سے اپنے ساتھ بٹھائے۔ مگر نہ جانے کیا تھا۔ ان کے بیچ ان دیکھی اجنبیت کی دیوار حائل تھی وہ کیسے کوشش کرتی؟ کہ دوسری جانب پھپھو اماں کی سرد مہری اور لاتعلقی اول روز کی طرح جوں کی توں تھی۔ جس دن وہ آئی تھی پھپھو اماں نے سلام کے جواب میں سر پر سرسری سا ہاتھ پھیرنے کے بعد بس اتنا پوچھا۔

"سفر آرام سے تو کٹا ناں۔ خوش رہو۔"

اور وہ جو بہت جوش سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھی تھی، اتنا سرد انداز دیکھ کے مایوس ہو گئی۔

"کہاں کھو گئی ہیں محترمہ!" اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بدر نے پوچھا۔

"بدر! پھو اماں میرے یہاں آنے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ تو ضرورت کے علاوہ مجھ سے بات تک نہیں کرتیں۔ وہ مان جائیں گی؟ میں بہت پرامید ہو کے آئی ہوں۔" اس نے ایک سانس میں ساری شکایت اس تک پہنچائی۔

"بات تو وہ مجھ سے بھی ضرورتاً ہی کرتی ہیں۔" اس نے سوچا۔

"یار! اتنے عرصے تنہا رہنے سے ان کی عادت ہو گئی ہے۔ وہ میری موجودگی میں بھی اکثر خاموش ہی رہتی ہیں۔"

"مگر بدر! میں ان کی خاموشی سے وہ مطلب نہیں نکال سکتی جو تم سمجھتے ہو، یعنی تنہائی کی وجہ سے۔ میں یہاں یہ سالوں کی خاموشیاں، لاتعلقی ہی تو ختم کرنے آئی ہوں۔"

وہ بول چکی تو بدر کو دیکھا۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بلا کی شرارت تھی۔ ایک قدم آگے بڑھ کے بدر نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا واقعی تمہارے آنے کی وجہ صرف سالوں کی خاموشیاں اور لاتعلقی ختم کرنا ہی ہے۔ میں تو سمجھا تم....." اس نے جان کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

صبا کے لیے بدر کا انداز بہت پیارا اور کچھ کچھ خوبصورتی لیے ہوئے تھا۔

"ہاں! ظاہر ہے میں اتنی دور اور کیوں آئی ہوں۔ تم ایسے ہی اپنے اندازے مت لگاتے رہا کرو۔" وہ کچھ نروس ہو کے بولی۔

"ٹھیک ہے! تم اتنے سالوں کی لاتعلقی اور خاموشیاں ختم کرنے کی کوشش کرو میں ذرا باہر کا شور شرابا دیکھ آؤں۔"

بدر نے مسکراہٹ دبائی۔ آنکھوں کی شرارت چھپائی اور ناک کی سیدھ میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

صبا نے اسے دور جاتے دیکھا۔ جو دل کے بہت قریب تھا، پھر سوچا "یہ خاموشی ختم ہو گئی تو ہم دونوں....." اس نے مسکراہٹ دبائی۔ آنکھوں کی حیا چھپائی اور پھر اندر کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ابرار واقعی اس کے لیے ڈھال بنا ہوا تھا۔ اس نے شادی کے دوسرے دن سے مرے دل سے گھر کے کام کاج سنبھال لیے تھے۔ ٹھنڈے یخ کمروں کی صفائی، چکنائی سے اٹے برتنوں کی دھلائی، اینٹوں سے بنے کچے صحن کی صفائی، البتہ کھانا پکانا ابھی شروع نہیں کیا تھا۔ دراصل گیس نہ ہونے کی وجہ سے یہاں لکڑیوں کا چولہا جلانے کا رواج تھا۔ آمنہ کو اس چولہے پر پکانے کا تجربہ نہ تھا ابھی۔ سو وہ خود دل ہی دل میں ساس کی شکر گزار تھی، جو اس کے باہر کا کام ختم کرکے آنے تک چولہے میں لکڑیاں جلا کے کھانا پکانے کی ابتدائی تیاری تو کر ہی لیتی تھیں، مگر شادی کے چوتھے دن بتول فاطمہ کی آمد نے تھوڑی تبدیلی کر دی تھی۔ اب وہ چکنائی سے اٹے برتن اور کچے صحن کی صفائی سے بچ گئی تھی۔

بتول فاطمہ بھی عجیب تھی بلکہ شاید نفسیاتی۔ یہ آمنہ کو لگتا تھا۔ طلاق کے بعد ظاہر ہے اسے یہیں آنا تھا مگر آمنہ کی حیرت اس وقت دوگنی ہو گئی، جب اس نے اسے اگلے دن سے ہی گھر کے کام کاج میں جتا دیکھا۔ اسے دیکھ کے لگتا جیسے کسی مطمئن اور سہاگن بیٹی نے چند روز کے لیے ماں کے گھر قیام کے دوران ماں کو آرام پہنچانے کی خاطر یہ سب کام اپنے ذمے لیے ہوں۔

پہلے دن کے علاوہ اسے دوبارہ بتول فاطمہ کی آنکھوں یا انداز سے معمولی سا شائبہ تک نہ ہوا کہ وہ اپنی طلاق یا گھر اجڑنے سے دکھی یا غمگین ہوئی ہے۔

آمنہ اسے دیکھ دیکھ کے ہولتی رہتی مگر اس کے لبوں کی چپ اور اس کی آنکھوں کی ویرانی بتاتی کہ وہ کسی حد تک ٹوٹ کے بکھر چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

"گھر میں کتنی خاموشی ہے۔"

آمنہ نے جالی دار دروازے سے ڈھلتی شام کو دیکھا۔ صحن میں زرد، نارنجی رنگ بکھر کے عجب اداسی بھرا ماحول بنا رہے تھے۔ آمنہ نے سوچا پھر سامنے بیٹھے ابرار کو دیکھا۔

"آپ اسے فون کرکے کیوں نہیں بلا لیتے؟" آمنہ جھنجلا کے بولی۔

"لو، تم بلا لو۔" ابرار نے جیب سے موبائل نکال کر آمنہ کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت دیر سے خود کو ٹی وی میں مگن ظاہر کر رہا تھا۔ ورنہ اکلوتی لاڈلی بیٹی اتنے دنوں سے نظروں سے دور تھی، یاد تو اسے بھی آ رہی تھی۔

"جیسے میرے بلانے پر تو وہ آجائے گی؟" آمنہ نے روٹھے لہجے میں کہا۔

"میرے بلانے پر بھی نہیں آئے گی۔" ابرار نے اطمینان سے موبائل واپس جیب میں ڈالا، پھر ٹی وی دیکھنے لگا۔

"آپ اسے کیوں نہیں سمجھاتے، وہ کیوں وہاں گھر سے اتنی دور اس اپلے تھاپتی لکڑیاں جلاتی عورت کے قدموں میں جا کے بیٹھ گئی ہے۔" آمنہ نے کلستے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

ابرار نے تاسف سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ اس نے بہن کا گھر اجاڑا، وہ چپ رہی۔ اس کا اکلوتا بھائی، جو باپ کی وفات کے بعد اس کا سرپرست بھی تھا، اسے وہاں اکیلا چھوڑ کے اس کے ساتھ یہاں آبسا، اس نے معمولی شکوہ بھی نہ کیا۔ ابرار نے شہر میں بدر کی تعلیم کی وجہ سے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اس کی بہن چاہتی تو اپنے بیٹے کو روک لیتی، پر اس نے ایسا کچھ نہ کیا، پھر بھی..... پھر بھی اس عورت کا شکوہ ختم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپلے تھاپنے اور لکڑیاں جلانے والی عورت ہے حالانکہ اسی لکڑیاں جلانے والی عورت نے اپنا گھر جلا کے راکھ سمیٹی اور بہت خاموشی سے وہیں آبیٹھی، جہاں سے چلی تھی۔

"تم ہر وقت نفرت کے زہر میں بجھے تیر کیوں پھینکتی رہتی ہو؟ آخر ایسا کونسا تمہارا گلہ ہے، جو اتنے سالوں کے بعد بھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا؟ اس لکڑیاں جلانے والی عورت نے تمہارا کچھ چھینا ہے؟ کچھ چرایا ہے؟ کچھ بگاڑا ہے؟" ابرار نے ریموٹ پٹخ کے آمنہ کو گھورا۔ اس کا لہجہ دکھ اور تاسف میں ڈوبا ہوا تھا۔

"ہاں! چھینا ہے میری بیٹی کو۔ وہ مجھے، اپنی ماں کو چھوڑ کے وہاں چلی گئی ہے۔ آپ کی بہن کے پاس....."

آمنہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہوتی، تب بھی وہ ایسے ہی تڑپا ہوتی جبکہ صبا تو اس کی اکلوتی اولاد ہے۔

"میری بہن نے نہ اسے بلایا تھا، نہ خود لینے آئی تھی بلکہ تمہاری لاڈلی خود گئی ہے وہاں اور اگر چلی گئی ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کی سگی پھوپھی کا گھر ہے۔" اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

آمنہ نے حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ ایک عرصے سے وہ ابرار کو اپنے اشاروں پر نچا رہی تھی۔ آج برسوں بعد وہ اس طرح بھڑک کر بولا تھا۔

آمنہ نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا دیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی ایسے ہی گھٹ گھٹ کے گزر جاتی اگر اس کی زندگی میں اس کی بیٹی صبا نہ آتی۔ اتنے عرصے میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی اور وہ یہ کہ بی جان جو اس سے بالکل مخاطب نہ ہوتی تھیں، اب اس سے بات کرنے لگی تھیں۔ شاید پوتی کی محبت تھی۔ اگرچہ شہر کی ایک پڑھی لکھی لڑکی دور گاؤں میں رہنے والی عورت سے کیا باتیں کر سکتی تھی، پر یہ بھی بہت تھا۔

اسے ماں کی خود سے لاتعلقی اور بہن کی زندگی اجاڑنے کا دکھ اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ ماں کو منا کے، معافی مانگ کے تھک گیا تو بہن کی طرف پلٹا۔

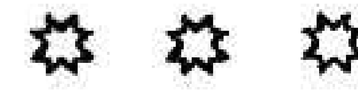
اس کی خواہش تھی کہ اس کی بہن دوبارہ اپنے گھر میں آباد ہو جائے مگر جس دن اس کا سسرالی رشتے دار ایک سادہ کاغذ اس خبر کے ساتھ لایا کہ "اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے اور بیٹے کو کاغذ پہ لکھ کے ہمیشہ کے لیے اس کے حوالے کر دیا ہے۔" ابرار نے دیکھا کہ بتول نے سپاٹ چہرے کے ساتھ وہ کاغذ وصول کیا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں وہ شادی سے قبل رہا کرتی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا، وہ سجدے میں پڑی ہے۔ معلوم نہیں کب تک وہ سجدے میں گری رہی مگر دوسری صبح ابرار نے یہ بھی دیکھا کہ وہ معمول کی طرح گھر کے کاموں میں جتی ہوئی ہے۔ بے تاثر چہرے اور خاموش آنکھوں کے

ساتھ۔ اسے دل میں کچھ چبھن سی محسوس ہوئی تھی۔

پھر ابرار کے شہر منتقل ہوجانے پر بی جان نے جب بتول فاطمہ کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا تو بتول فاطمہ جیسے بےضرر وجود نے صرف اتنا پوچھا تھا۔

"چھوڑ تو نہیں جائیں گی؟" اس کے لہجے میں تنہائی اور اکیلے پن کا کرب تھا۔

بی جان نے آگے بڑھ کے اسے گلے لگالیا۔ بتول فاطمہ نے کچھ آنسو بی جان کے دوپٹے میں جذب کردیے۔

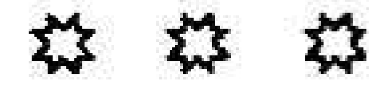


اس نے ساری کچی لکڑیاں توڑ کے لکڑی کے بڑے اور موٹے ٹکڑوں کے ارد گرد رکھیں، پھر ہلکا سا تیل چھڑک کے کاغذ سے آگ لگائی اور توا رکھا۔ پھر بہت سلیقے سے پیڑا بنایا۔ روٹی بیلنے والے لکڑی کے چپٹے اور سیدھے برتن پہ بیلن سے روٹی بیلنے لگی۔ گول روٹی توے پر اچھی طرح سینک کے اتاری اور رومال میں بند کرکے رکھ دی، پھر دوسرا پیڑا بنانے لگی۔

بتول فاطمہ بہت غور سے صبا کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔ اندر آتے بدر نے بھی بہت دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھا اور اچانک اڈ آنے والی خوشی کو اندر دباتے ہوئے سنجیدگی سے دواؤں کا شاپر لا کر بتول فاطمہ کے پاس رکھا۔

پچھلے دو دن سے بتول فاطمہ کو بخار تھا۔ بی جان سارا کام کرلیتیں اگر صبا کرنے دیتی تو۔۔۔ اسے اپنی موجودگی میں دو بیمار عورتوں کو گھر کے کاموں میں کھپتے دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ ابتدا میں تو پھوپھو اماں کی گہری خاموشی اور لاتعلقی سے ڈرتی تھی مگر جب وہ خلوص و اپنائیت سے آگے بڑھی تو بتول فاطمہ نے بھی خوشی خوشی اسے اپنی راجدھانی سونپ دی، بھلے مستقل نہ سہی۔

روٹی لگانے کے بعد اس نے چولہے سے راکھ اِدھر اُدھر کی۔ آگ ہلکی ہلکی سلگ رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کے بی جان سے پتیلی لی جس میں دھلی مرغی، پیاز اور باریک کٹے لہسن تھے۔ ڈھکن لگا کے اسے چولہے پہ رکھا۔ یہ بتول فاطمہ کے لیے بنائی جانے والی یخنی تھی۔



سالوں سے تعلقات میں آئی سرد مہری جوں کی توں تھی۔ اسے نہ ابا کی موت توڑ سکی، نہ ابرار کی آمنہ اور صبا سمیت شہر منتقلی اور نہ ابرار کے آنسو، جو اس نے ایک رات پہلے بتول سے معافی مانگتے ہوئے بہائے تھے۔ اسے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش بھی کی۔ مگر بتول کے ٹکے سے جواب نے اس کا منہ بند کردیا تھا۔

"ایسے میں آپ یہاں کیا کمال کرنے آئی ہیں صبا بی بی۔۔۔؟" ابو کی بتائی ساری تفصیل نئے سرے سے ذہن میں دہراتے ہوئے صبا نے گویا خود سے پوچھا۔

وہ اس وقت کھرے پہ بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اپنے خیالات میں الجھتے اس نے دیکھا ہی نہیں کہ بدر داخلی دروازے سے اندر آتے ہی اسے دیکھ چکا تھا۔

"تم کام کرتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔" بدر نے اس کے سر پہ پہنچ کے کہا تو وہ چونکی۔

اس نے اپنی سیاہ پڑتی ایڑیوں اور کرخت ہوتے ہاتھوں کو دیکھا، پھر سر جھٹک کے دوبارہ سابقہ کام کرنے لگی مگر خاموش رہی۔ ابھی وہ سارے گھر کی جھاڑو لگا کے آئی تھی۔ بتول فاطمہ کا بخار دوا دارو کے باوجود ٹھیک نہیں ہورہا تھا۔

"یار! میرے خیال میں تم اپنی متوقع ساس کو متاثر کرنے کے چکر میں ہو۔"

کھرے سے تھوڑی دور دیوار سے ٹیک لگائے وہ اطمینان سے ہاتھ باندھے بڑی فرصت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ان کا رشتہ بھی بڑا عجیب تھا۔ نہ مکمل اظہار، نہ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں، نہ لمبی لمبی فون کالز اور نہ لمبے لمبے خط۔ بس بہت خاموشی اور سچے دل سے صرف ایک دوسرے کو اپنانے اور ساتھ رہنے کی سچی خواہش تھی اور اس خواہش پر زیادہ عمل اور اس کے پورا ہونے کا یقین تو انہیں ابرار نے دلایا تھا۔

"بات سنو۔۔۔! اگر ایسا ہے تو ایک خوشخبری سناؤں؟" وہ مسلسل اسے چھیڑ رہا تھا مگر صبا نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا بلکہ اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

"یار! چپ کی مار تو نہ مارو۔" وہ دلی گرفتگی سے بولا۔ بہت دیر سے خود کو بے نیاز ظاہر کرتی صبا نے چونک کے اسے دیکھا۔ واقعی وہ اتنے دنوں سے اسے چپ کی مار ہی تو مار رہی تھی۔

"بدر۔۔۔!" اب بولنے کی باری اس کی تھی۔ "میں کیا کروں؟ اُدھر امی نہیں مان رہیں، اِدھر پھواماں نہیں مان رہیں۔ میں۔۔۔" وہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کے رہ گئی۔

"تو تم مان جاؤ ناں۔ تم یہاں آجاؤ مجھ سے شادی کر کے۔"

کھرا صاف کرتی صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس سے کچھ بولا نہ گیا۔

"میں کیا مان جاؤں؟" پھنسی پھنسی آواز میں وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"میں کما کے شہر میں رہائش کا بندوبست کر لوں گا، پھر اماں اور تم کو لے جاؤں گا۔" بدر نے اطمینان سے اپنی پلاننگ بتائی۔ وہ بھی اتنے دنوں کی آنکھ مچولی سے تنگ آگیا تھا۔ نہ اس کی ماں بتول فاطمہ کچھ کہتی سنتی تھی، نہ اس کی ممانی آمنہ نرم پڑی تھی۔ بدر، صبا اور ابرار ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنے ہوئے تھے۔ سو آر پار سہی۔۔۔!

صبا نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی تعلیم و تربیت، شہر میں رہائش بغیر سوچے سمجھے، اتنے دنوں سے اس کا یہاں قیام یہ سب باتیں مل کے بھی اس کے دل میں اس کی ماں کے دل میں گنجائش پیدا نہ کر سکیں۔

"میں دیکھ رہا ہوں یہاں تم اتنی مشکل میں بھی نہیں ہو۔"

بدر نے نظریں چرا کے بمشکل کہا۔ وہ اور کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ صبا نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ سامنے وہ شخص کھڑا تھا، جسے وہ بہت چاہتی تھی اور جس کی خاطر وہ یہاں اپنی پھپھو کو منانے آئی تھی۔

"بدر! ہماری ماؤں کے دلوں پر سالوں پرانے ایک ایسے جھگڑے کی برف جمی ہے، جس کے کرداروں میں سے آدھے تو مر کھپ گئے ہیں۔ میں نے اپنی پوری محبت، خلوص اور سچائی سے پھواماں کو راضی کرنے کے لیے وہ سب کیا، جو شاید عام حالات میں ممکن نہ تھا مگر۔" تھوڑی دیر کو وہ کمزور پڑی۔ اس کی آواز بھی لرزی۔ شاید آنکھوں میں پانی بھی چھلکا۔ مگر جب دوبارہ بولی تو آواز ہموار تھی اور لہجہ سپاٹ تھا۔

بدر نے بدقت اس گلابی پیراہن میں نکھرے گلاب پر سے نظر ہٹائی تو فیصلے کی گھڑی آگئی۔

"ابو مجھے لینے آرہے ہیں۔ میں کل واپس چلی جاؤں گی۔"

"میں تم سے کل بھی محبت کرتا تھا، آج بھی کرتا ہوں۔ تمہارا ساتھ آج بھی میری خوشی ہے اور کل بھی تھا مگر میری ماں۔۔۔" وہ کچھ دیر کو رکا۔ سارے دکھ اور غم صبا نے اس کی آنکھوں میں دیکھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"میری ماں نے یہ سب جانتے بوجھتے مجھے آزاد چھوڑے رکھا۔ ماموں کے گھر ان کی بیٹی سے محبت پر میری ماں نے مجھے نہ روکا۔ ممانی کا احترام کرنے پر میری ماں نے مجھے منع نہ کیا۔ بی جان نے میرا تمہارا رشتہ پکا کرنے سے پہلے اور بعد میں، دونوں دفعہ میری ماں کو بتایا، پوچھا، انہوں نے بغیر اعتراض کیے خاموشی سے مجھے میری خوشی دے دی۔ میں تو ٹھیک طرح سے حیران بھی نہ ہو سکا حالانکہ اماں چاہتیں تو برسوں پرانا بدلہ لے سکتی تھیں۔"

وہ شاید تھک کے چپ ہو گیا تھا۔ حیرت سے کھڑی صبا نے اسے دیکھا اور پشیمانی میں گھر گئی۔

بھلا ماں کی محبت کے آگے اس کی محبت کی کیا اوقات۔۔۔؟

"اب اگر میں تم سے شادی کر کے شہر جا کے رہوں تو شاید اماں بین بھی نہ ڈالیں جیسے بی اماں نے کیا تھا۔۔۔"

وہ اسے دیکھ دیکھ کے رک رک کر کہہ رہا تھا۔ وہ اسے چاہتا تھا، یہ سچ تھا۔ مگر وہ اپنی ماں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ دوسرا سچ تھا۔

"مگر اس سب کے باوجود میں ابرار ماموں نہیں ہوں۔ میں اپنی بوڑھی ماں کو چھوڑ کے اپنے دل کی دنیا آباد نہیں کر سکتا۔ ہماری شادی، شہر جا کے رہنے کی بات، ان دونوں چیزوں پر اگر میری ماں راضی ہو گئی تو تمہاری قسمت اور اگر انہیں یہ پسند نہیں تو تم کسی اور سے شادی کر لینا۔ اور میں یہ سوچ لوں گا کہ تم میرے نصیب میں نہیں تھیں۔"

اپنے اندر کا تمام دکھ اور تکلیف اس نے قطرہ قطرہ صبا کے کانوں میں انڈیلا۔ پھر بہت ضبط سے ایک نظر اس پہ ڈالی۔ صبا نے بدر کو دیکھا۔

"بس اتنی مدت تھی میری محبت کی؟" اس کی آنکھوں میں فریاد تھی۔

"بس اتنی ہی حقیقت تھی ہماری محبت کی۔" بدر کی آنکھوں میں دم توڑتی امید تھی۔

وہ دونوں گم صم کھڑے تھے۔ ان کی تازہ محبت نوحہ پڑھ رہی تھی۔ کھڑکی سے باہر کا سارا منظر اور اپنے کانوں سے ساری بات سنتی بتول فاطمہ نے سوچا۔

"نہ صبا، آمنہ ہے۔
نہ بدر، ابرار ہے۔
نہ میں بین ڈالنے والی بی اماں ہوں۔
پھر اتنے سالوں کی تنہائی نے مجھے کیا دیا۔
اتنے سالوں کی بے رخی نے آمنہ کو کیا دیا اور۔۔۔
سالوں سے منانے کے لیے آتے ابرار کو کیا ملا؟"

اس نے بدر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کے بھائی نے اسے بدر دیا۔ وہ بدر جو یہاں رہتا تو شاید نہ پڑھ لکھ سکتا نہ کمانے کے قابل ہو سکتا نہ مجھے اتنا مان دے سکتا تھا، جو یہ اب دیتا ہے۔

لاکھ طلاق وہ داغ تھا، جس نے اس کی زندگی کے تمام روشن چراغ بجھا دیے مگر اس کے بدلے اس کا بھائی بھی مکمل سکھی نہ تھا۔ برسوں پرانی غلطی کی تلافی کے بدلے اس کے بھائی نے بغیر جتائے بغیر بتائے اس کے بیٹے کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ پھر اس کی اتنے عرصے کی خاموشی نے اسے کتنا معتبر بنا دیا تھا کہ اس کی اکلوتی بھتیجی اپنے ماں باپ کو چھوڑے، یہاں تھی، اس کے پاس۔

اس کا بیٹا بدر اس کے پاس تھا۔ اس کی منشا کے خلاف کچھ بھی نہ کرنے والا۔۔۔!

ابرار اس کا بھائی تھا، اس کا ماں جایا۔ وہ اسے معاف کر چکی تھی۔

صبا اس کا خون تھی، جو صرف اس کی خاطر اس کے بیٹے کی خاطر شہر چھوڑ کے یہاں سخت زندگی گزارنے آئی تھی۔ وہ اسے بھا گئی تھی۔

آمنہ۔۔۔ہاں اس سے اس کا خون کا رشتہ نہ تھا۔ مگر۔۔۔

"آمنہ! میں نے تمہیں بھی معاف کیا۔"

اس نے کھڑکی کی جالی سے پیشانی ٹکاتے ہوئے ہولے سے کہا۔ آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئیں اور دل اطمینان سے۔

اس نے صبا کو دیکھا، وہ اس کا خون تھی۔
اس نے بدر کو دیکھا، وہ اس کی جان تھا۔

اس نے سوچا الگ تو وہ رہ لیں گے مگر خوش نہیں رہیں گے۔ پھر یہاں دوبارہ سے شاید ایسی ہی کوئی کہانی دہرائی جائے۔ ایسے ہی کوئی بتول فاطمہ گھر اجڑ جانے پر روتی آئے۔ ایسے ہی کسی ابرار کو اپنی ماں سے رو، رو کے معافیاں مانگنی پڑیں۔

"نہیں۔۔۔ میں اب ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔"

اس نے دل میں پکا ارادہ کیا، پھر سکون سے آنکھیں موند لیں۔

وہاں شہر کی حدود میں آمنہ فون کان سے لگائے بی جان سے پوچھ رہی تھی۔

"بی جان! بتول فاطمہ مجھے معاف کر دے گی نا۔۔۔! ہے نا بی جان! اگر میں معافی مانگ لوں تو۔۔۔؟"

بی جان چپکے سے مسکرا دیں۔

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی‘ اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لمز میں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے‘ حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا تو وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ جویریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

حذیفہ اپنے دوستوں کے ساتھ پاکستان ٹور پر جاتا ہے تو راستے میں جویریہ سے ملنے کے لیے راہوالی اتر جاتا ہے۔ وہاں ندیم صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے۔ حذیفہ انہیں اسپتال لے کر جاتا ہے۔ وہ جویریہ کے حوالے سے پریشان ہوتے ہیں‘ کیونکہ ادھیڑ عمر اور عیاش مختار وڑائچ‘ جویریہ کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ ندیم صاحب حذیفہ کی رضامندی سے ایمرجنسی میں حذیفہ اور جویریہ کا نکاح پڑھوا دیتے ہیں۔ ندیم صاحب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ حذیفہ اپنے باپ دانش کو آگاہ کرتا ہے۔ وہ راضی ہو جاتے ہیں‘ مگر اچانک انتقال کر جاتے ہیں۔ حذیفہ‘ جویریہ کو راہوالی چھوڑ کر لندن سے دانش کی میت لاتا ہے اور اسمارہ کو شادی کا بتاتا ہے۔ اسمارہ اور رعنا بہت خفا ہوتی ہیں‘ عرشی نیم پاگل ہو جاتی ہے۔

مختار وڑائچ‘ حذیفہ کی غیر موجودگی میں جویریہ پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے۔ وہ عزت بچا کر بتول خالہ کے گھر پناہ لیتی ہے۔ بتول خالہ کا بیٹا منیر‘ جویریہ کو لاہور میں حذیفہ کے گھر لے کر آتا ہے۔

ناولٹ

سونیہ نوید

عہدِ وفا



رعنا اور اسارہ گاڑی میں گھر سے باہر نکل رہی ہوتی ہیں۔ جویریہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ حذیفہ کی بیوی ہے۔ وہ دونوں اس کو سخت سست کہہ کر گھر میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔ جویریہ مایوس ہو کر پلٹ آتی ہے۔

حذیفہ' جویریہ کو تلاش کرتا ہے' لیکن ناکام رہتا ہے۔ رعنا اسے بتاتی ہے کہ جویریہ گھر آئی تھی اور وہ حذیفہ سے جڑے رشتہ کی قیمت لے کر چلی گئی ہے۔ اب واپس نہیں آئے گی۔ اسارہ بہت شدید بیمار پڑ جاتی ہے۔ حذیفہ ان کی خوشی کی خاطر عرشی سے شادی کر لیتا ہے۔

مرنے سے پہلے اسارہ' حذیفہ کو جویریہ کے بارے میں سچ بتا دیتی ہے۔

جویریہ کو پتا چلتا ہے کہ بتول خالہ اور ان کا بیٹا منیر' رعنا سے ملا ہوا ہے اور ان سے پیسہ لیتا ہے تو وہ گھر چھوڑ دیتی ہے اور ایک حادثے کے نتیجہ میں پروفیسر صاحب کے پاس پہنچ جاتی ہے جو ایک فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں۔ وہ ماں بننے والی ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

رعنا کی مصروفیات کا دائرہ ہمیشہ کی طرح وسیع تھا۔ آج کل وہ ایک چیریٹی شو منعقد کروانے کے سلسلے میں مصروف تھیں جس سے ہونے والی آمدنی کو یتیم بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کیا جانا تھا۔

شو کا اہتمام کافی بڑے پیمانے پر کیا جا رہا تھا۔ پبلسٹی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میوزک کی دنیا کے بڑے بڑے ناموں کو اسٹیج پر پرفارم کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ عرشی کو جب پتا چلا کہ اس کا فیورٹ بینڈ بھی اس کانسرٹ میں پرفارم کرنے والا ہے تو وہ جانے کے لیے مچل گئی۔

"میرا خیال ہے' تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا۔" رعنا نے اس سے کہا۔

یوں تو رعنا کو عرشی کو کبھی بھی کہیں لے کر جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا مگر اس بار اس کی حالت کے پیش نظر وہ تھوڑا تذبذب کا شکار تھیں۔

"آپ خوامخواہ کیوں فکر کرتی رہتی ہیں؟ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور پھر آپ بھی تو وہاں ہوں گی نا میرا خیال رکھنے کے لیے۔" عرشی نے لاڈ سے کہا۔

"حذیفہ کو پتا چلے گا تو وہ ناراض ہوگا۔" رعنا ہمیشہ کی طرح عرشی کی ضد کے آگے کمزور پڑنے لگیں تو حذیفہ کا نام لے کر اسے باز رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔

عام طور پر حذیفہ بھی عرشی کو کہیں آنے جانے سے نہیں روکتا تھا مگر جب سے وہ امید سے ہوئی تھی' وہ بھی اسے زیادہ تھکا دینے والے کاموں سے منع کرنے لگا تھا۔

"ناراض تو وہ تب ہوگا جب اسے پتا چلے گا۔ وہ تو اسلام آباد گیا ہوا ہے۔" عرشی نے رعنا کا کمزور سا احتجاج ایک سیکنڈ میں رد کر دیا۔

"مگر عرشی!" رعنا اب بھی متذبذب تھیں۔

"پلیز ممی! پلیز۔" عرشی کی ضد کے آگے رعنا کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میوزیکل ایوننگ کے سارے انتظام کی ذمہ داری رعنا کے ہاتھ میں تھی۔ شو دیکھنے کے لیے خاصی بڑی تعداد میں لوگ آ رہے تھے۔

عرشی کے لیے رعنا نے سامنے والی قطار میں ایک آرام دہ کرسی رکھوا دی تھی جہاں سے وہ اسٹیج پر ہونے والے پروگرام سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکتی تھی۔

رات اچھی خاصی گزر چکی تھی اور ابھی تک کسی ڈھنگ کے سنگر نے پرفارم نہیں کیا تھا۔ ابھی تک مختلف اور چھوٹے موٹے صداکار و گلوکار ہی اسٹیج پر خانہ پری میں مصروف تھے۔ عرشی اب بیٹھے بیٹھے تھکنے لگی تھی۔ رات کے بارہ بجے مشہور بینڈ کی آمد ہوئی تو مجمع میں شور مچ گیا۔

بینڈ کو پسند کرنے والوں میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی جن کا جوش و خروش قابو سے باہر ہو رہا تھا۔

اس شو کو ٹی وی کے کسی مقامی چینل سے بھی ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ جگہ جگہ اسٹیج پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کے لیے اسٹینڈز کے اوپر لائٹیں اور کیمرے نصب کیے گئے تھے۔ اسٹیج کے سامنے زمین پر بے شمار تاروں کے گچھے بکھرے پڑے تھے۔

بینڈ نے اپنے دو مشہور مگر لمبی تان والے گانوں کے بعد بھنگڑا کا آغاز کیا۔

ہجوم کو جوش آیا۔ لوگ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تیز میوزک کی دھن پر کچھ منچلے نوجوان پچھلی سیٹوں سے اٹھ کر اسٹیج کے سامنے آ کر ناچنے لگے۔ بینڈ کے پیش کیے ہر نئے آئٹم پر میوزک پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوتا گیا اور اسٹیج کے سامنے رش گھٹنے کے بجائے بڑھتا گیا۔

عرشی سب سے آگے والی نشست پر بیٹھی تھی مگر ان بے ہنگم طریقے سے اچھلتے کودتے لڑکوں کی وجہ سے اسے اسٹیج ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مسلسل دائیں بائیں ہو کر دیکھنے کی کوشش میں سخت بدمزا ہو رہی تھی۔ تب ہی ان ہلا گلا کرتے لڑکوں میں سے کسی ایک کا پاؤں زمین پر پڑے تاروں میں الجھا اور وہ اپنا توازن کھو کر دوسرے سے جا ٹکرایا اور دوسرا تیسرے سے' یہاں تک کہ جھومتے لڑکوں کا ایک پورا ٹولہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرف کو آ کر گرا' جہاں عرشی بیٹھی ہوئی تھی۔

عرشی کے منہ میں سے نکلنے والی دل دوز چیخ تیز میوزک کے شور میں ہی کہیں دب گئی۔

لڑکے آدھے منٹ کے اندر اٹھ کھڑے ہوئے مگر عرشی کرسی سمیت وہیں زمین پر پڑی رہی۔

آس پاس کی کرسیوں پر بیٹھے لوگوں نے عرشی کے بے سدھ وجود کو ہلا جلا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ رعنا خدا جانے کہاں سے دوڑتی ہوئی آئیں۔

عرشی کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بے ہوش عرشی کو گاڑی میں ڈال کر وہ گولی کی رفتار سے کلینک کی جانب روانہ ہوئیں۔ ڈاکٹر کو انہوں نے راستے میں ہی فون پر مطلع کر دیا۔ ان کے کلینک پہنچنے تک ڈاکٹر بھی وہاں آ چکی تھی۔

کلینک کا عملہ عرشی کو فوراً" آپریشن تھیٹر میں لے گیا اور آپریشن تھیٹر کے باہر شدید خوف و ہراس میں مبتلا رعنا اس کی سلامتی اور زندگی کی دعائیں مانگنے لگیں۔

رات کے جانے کس پہر عرشی نے آنکھوں پر گرے بھاری پپوٹوں کو بمشکل اٹھایا تو کمرے کی سفید چکنی دیوار اور اس پر سے منعکس ہوتی ٹیوب لائٹس کی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح سے چبھی۔ اس نے کچھ بھی دیکھنے کی کوشش ترک کرتے ہوئے آنکھیں واپس موند لیں۔

عرشی کا ذہن پوری طرح سے بیدار نہیں تھا مگر پھر بھی اسے کمرے میں اور لوگوں کی موجودگی کا احساس ان کی دھیمی دھیمی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک آواز رعنا کی اور دوسری یقیناً "ڈاکٹر کی تھی۔ عرشی کو اس وقت جاگنے کی کوشش کرنا بے حد کٹھن کام لگ رہا تھا۔ اس نے بیدار ہونے کی کوشش ترک کرتے ہوئے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

صبح جب عرشی کی آنکھ کھلی تو رعنا ایک چھوٹا سا بچہ اس کے پہلو میں لٹا رہی تھیں۔

وقت کا پتا نہیں تھا لیکن کھڑکی سے اندر آتی دھوپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھا خاصا دن چڑھ چکا ہے۔

"ممی! یہ۔۔۔؟" عرشی نے نہایت کمزور آواز میں حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے جسے تم نے رات میں جنم دیا ہے۔" رعنا نے جواب دیا۔

"لیکن میرا بچہ تو بچ نہیں سکا تھا۔" عرشی کے منہ سے نکلا۔ بچی کے اطراف تکیہ پھنساتی رعنا نے ایک

دم سر اٹھا کر عرشی کو دیکھا۔
"میں نے رات کو آپ کی اور ڈاکٹر کی باتیں سن لی تھیں۔" عرشی نے رعنا کی نظروں سے خائف ہو کر بتایا۔
عرشی کی بات سن کر رعنا کے چہرے پر شکست کے آثار نمودار ہوئے۔ عرشی سے زیادہ اس آنے والے بچے کی منتظر وہ خود تھیں۔ رات کے سانحے کے بعد ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی' یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔
"تو تمہیں پتا لگ چکا ہے۔" رعنا نے تھکے لہجے میں کہا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ فی الحال اس بچی کو اپنے ساتھ لٹالو۔ میں نے ڈاکٹر سے سارے معاملات طے کرلیے ہیں۔ کسی کو کچھ خبر نہیں ہوگی۔"
"مگر یہ ہے کون؟ آپ اسے لائی کہاں سے ہیں؟"
عرشی نے اٹھ کر بیٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ خود کو بستر سے ایک انچ بھی اوپر اٹھا سکتی۔
انہوں نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور کمر کے پیچھے تکیے رکھ کر بیٹھنے میں مدد دی۔
اتنی سی مشقت سے ہی وہ بے دم ہوگئی۔ اس کا سارا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔
"بنتو کے جاننے والوں میں سے کسی کی بچی ہے۔ لاوارث ہی سمجھو۔ ماں پیدا کرتے ہی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ باپ کا پہلے ہی پتا نہیں تھا۔ رشتہ داروں میں سے کوئی بھی اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں تھا' اس لیے تھوڑے سے پیسوں کے عوض بخوشی اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوگئے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط برتی ہے۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ بچی کون اور کہاں لے کر گیا ہے۔ اس لیے بے فکر رہو۔ کبھی کوئی اس کا پوچھنے نہیں آئے گا۔" رعنا نے عرشی کو بچی کی دستیابی کی مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔
"آخ۔ نوکرانی کی رشتہ دار؟" عرشی کو ننھی سی جان سے گھن آئی۔
عرشی نے ساتھ لیٹی بچی سے کھسک کر پرے ہونے کی کوشش کی جیسے بچی چھونے سے غریبی کے جراثیم اسے بھی لگ جائیں گے۔
"اسے لوٹا دیجیے ممی۔ مجھے کوئی بچہ وچہ نہیں چاہیے۔"
"بے وقوفی کی باتیں مت کرو عرشی!" رعنا اس پر بگڑیں۔
"بے وقوفی کی بات تو آپ کررہی ہیں۔" کمزوری کے باوجود عرشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "نجانے کہاں سے اسے اٹھا کر لے آئی ہیں۔ میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیے۔ آپ اسے فوراً واپس لے جائیں۔"
"تم جانتی ہو نا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔" رعنا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"ہاں جانتی ہوں۔ میرا بچہ زندہ نہیں بچ سکا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کسی کا بھی بچہ اپنی گود میں ڈال کر بیٹھ جاؤں۔" عرشی نے وجود میں اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرتے ہوئے بپھر کر کہا۔
رعنا کچھ دیر لب بھینچے عرشی کو دیکھتی رہیں پھر بولیں۔
"مجھے نہیں معلوم کہ رات میرے اور ڈاکٹر کے درمیان ہونے والی گفتگو کا کتنا حصہ تم نے سنا اور کتنا نہیں' لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اس بات چیت کا ایک بہت اہم نقطہ تمہارے گوش گزار ہونے سے رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ تم انتہائی بری حالت میں یہاں لائی گئی تھیں کل رات نہ صرف تم اپنے ہونے والے بچے کو کھو چکی ہو بلکہ تمہارے آئندہ ماں بننے کے امکانات بھی ختم ہو چکے ہیں۔"
رعنا نے بھاری ہوتی آواز کے ساتھ عرشی کو بتایا تو اسے پہلی بار اپنے وجود میں پھیلے خالی پن کا بری طرح احساس ہوا۔
یہ سچ ہے کہ عرشی شادی کے بعد اتنی جلدی بال بچوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن رعنا کے سمجھانے پر وہ اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھی اور

اب جب اس نے ذہنی طور پر خود کو ماں بننے کے لیے طے کرلیا تھا تب یہ سن کر کہ وہ کبھی ماں کے مرتبے پر فائز نہیں ہو پائے گی اسے واقعی دھچکا لگا۔
"میں تمہیں یہ بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔" عرشی کی پیلی پڑتی رنگت کو دیکھ کر رعنا نے اپنا لہجہ نرم کیا۔ "اس وقت تم اس بچی کو اپنا کر حذیفہ کی نظروں میں سرخرو ہو سکتی ہو۔ آج کے بعد تمہیں ایسا کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔"
عرشی چپ رہی۔ اس نے جو کچھ سنا' اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا۔
"دیکھو! جیسا میں کہہ رہی ہوں' ویسا کرو۔ اس بچی کو اپنے برابر لٹالو۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ پہنچنے والا ہے۔ اسے کچھ بھی پتا نہیں چلے گا۔"
عرشی کی خاموشی میں رضامندی کا عنصر پاکر رعنا نے ایک بار پھر بچی کو عرشی کے نزدیک کیا۔
رعنا کے ایسا کرنے پر عرشی نے پہلی بار نظر اٹھا کر ساتھ لیٹی بچی پر ڈالی۔
گلابی کمبل میں لپٹی' روئی کے گالوں جیسی نرم و نازک بچی واقعی دل موہ لینے کی حد تک معصوم اور پیاری تھی۔
پر وہ بھی عرشی تھی۔ اتنی جلدی کیسے پسیج جاتی۔
"ممی! آپ کو لانا ہی تھا تو لڑکا لے کر آتیں۔ جب جھوٹ ہی بولنا ہے تو پھر اس جھوٹ سے پورا فائدہ حاصل کرتے۔" عرشی نے کہا۔
شاید اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ بیٹے کی ماں بن کر وہ حذیفہ کی نظروں میں زیادہ معتبر ہو سکتی ہے۔ ماڈرن زمانے کی پڑھی لکھی عرشی کے ذہن میں اس وقت یہ پرانی مڈل کلاس سوچ نجانے کہاں سے آگئی۔
"بے وقوف لڑکی!" رعنا ایک جلال میں آگئیں۔ "بچے کیا دکانوں پر ملتے ہیں جو جاکر اپنی مرضی کا اٹھا کر لے آتی۔"
"میرا مطلب تھا کسی یتیم خانے سے۔" رعنا کو اس طرح غصے میں آتا دیکھ کر عرشی تھوڑا سا دبک گئی۔
"دنیا کا کون سا ایسا یتیم خانہ ہے جو چند گھنٹے کا نوزائیدہ بچہ راتوں رات تمہارے ہاتھ میں تھما دے گا۔ بچے کو ایڈاپٹ کرنے کے لیے کتنی لمبی قانونی کارروائی کرنی پڑتی ہے' کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں؟"
رعنا ایک بار پھر گرجیں۔
"لو۔ اسے پکڑو اور فیڈ کراؤ۔"
رعنا نے سوئی ہوئی بچی کو' جو اب انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے کی تیاری کررہی تھی' بستر سے اٹھا کر عرشی کی گود میں ڈالا۔ بچی تھوڑی کمزور تھی۔ یہ بھی عرشی کے حق میں اچھا تھا۔ اس کی اپنی ڈیلیوری میں ابھی تھوڑا وقت باقی تھا۔ ایک قبل از وقت پیدا ہونے والے بچے کے طور پر وہ بچی بالکل موزوں تھی۔
عرشی جو اپنے آپ کو ایک لے پالک بچے کو اپنانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کررہی تھی۔ رعنا کی یہ نئی ہدایت سن کر بالکل ہی بدک گئی۔
"واٹ؟ میں اور اسے فیڈ کراؤں۔ نو وے۔" اس نے صاف انکار کردیا۔ دودھ پلانے کا ارادہ تو اس کا خود کے بچے کو بھی نہیں تھا' پھر اس بچی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔
"ممی! آپ کہتی ہیں تو میں اسے رکھ لیتی ہوں' لیکن میں اسے فیڈ ویڈ بالکل نہیں کراؤں گی۔ آپ اس کے لیے اوپر کے دودھ کا بندوبست کیجیے۔" عرشی نے ڈھٹائی سے کہا۔
بچی ابھی تک اس کی گود میں پڑی تھی۔ اچانک عرشی کو اپنے اوپر تیزی کے ساتھ پھیلتے گیلے پن کا احساس ہوا۔
"او مائی گاڈ! اس بچی نے مجھے سارا گندا کردیا۔ اٹھائیے اسے۔" عرشی نے بچی کو خود سے پرے دھکیلا۔
"کم از کم مجھے دینے سے پہلے یہ تو دیکھ لیتیں کہ اس کا ڈائپر ٹھیک سے بندھا ہے یا نہیں۔" عرشی کو سخت غصہ آرہا تھا۔
رعنا نے چپ چاپ بچی کو اٹھا کر بنتو کے حوالے

کردیا' جو اس کے کپڑے تبدیل کرنے لے گئی۔

تھوڑی دیر میں حذیفہ بھی پہنچ گیا۔

"حد ہو گئی خالہ! آپ کو مجھے رات کو ہی اطلاع کردینی چاہیے تھی۔" وہ ناراض ہو رہا تھا۔

"بس بیٹا! سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔" رعنا اس سے نظریں چرائے کہہ رہی تھیں۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو بچی بستر کے ساتھ رکھی کاٹ میں سو رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" وہ پہلے عرشی کے پاس آیا' پھر عرشی سے مثبت جواب پاکر کاٹ کی طرف مڑا۔

بچی پر نظر پڑتے ہی جو چمک حذیفہ کے چہرے پر آئی' اس نے عرشی کو رعنا کے اس تیز رفتار اور دور اندیش قدم کا قائل کردیا۔ رعنا نے حذیفہ اور عرشی کے رشتے میں اس بچی کو لاکر ایسی مضبوط گرہ باندھی تھی کہ ساری دنیا کی جویریائیں بھی آجاتیں تو اسے نہ کھول سکتی تھیں۔

اس بچی نے صرف چند لمحوں میں وہ کردیا جو عرشی اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک نہیں کرپائی تھی۔ اس نے حذیفہ کا دل اپنے قبضے میں کرلیا۔

پہلی بار جویریہ نامی بلا کا خوف عرشی کو مکمل طور پر اپنے دل سے نکلتا محسوس ہوا۔

"اب دیکھتی ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔" عرشی نے بچی کے ماتھے کو پیار سے چومتے حذیفہ کو دیکھ کر مطمئن انداز میں سوچا۔

بچی واقعی بہت پیاری تھی اور دن بدن اور بھی پیاری ہوتی جارہی تھی۔ حذیفہ نے اس کا نام منیہ رکھا۔

منیہ زیادہ تنگ کرنے والی بچی نہیں تھی۔ فیڈ کرا کے کاٹ میں ڈال دو تو گھنٹوں خود ہی پڑی کھیلتی رہتی۔

وہ تیزی کے ساتھ بڑی ہو رہی تھی اور اس کے بڑھنے کے ساتھ اس سے جڑی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

رعنا نے منیہ کو سنبھالنے کے لیے فل ٹائم آیا کا بندوبست کردیا تھا۔ منیہ کو نہلانا' دھلانا' کھلانا' پلانا سب آیا کے فرائض میں شامل تھا۔ عرشی کا کام فقط اسے گود میں بھر کر کلینک سے گھر تک لانا تھا' جو وہ کرچکی تھی اور اب ہر قسم کی فکر و ذمہ داری سے آزاد ہو کر اپنی پرانی روٹین پر واپس لوٹ چکی تھی۔

لیکن حذیفہ کی زندگی میں منیہ کے آنے سے بہت بدلاؤ آگیا تھا۔ منیہ چست بچی تھی۔ جب بیٹھ نہیں سکتی تھی تب بھی ٹانگیں مار کر خود پر سے کمبل اتار دیتی اور چھوٹی سی کاٹ میں گھوم کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی۔ اے سی والے کمرے کے خنک و خوشگوار ماحول میں آیا کاٹ کے برابر بچھے اپنے بستر پر بے سدھ پڑی خراٹے لیتی رہتی۔ حذیفہ ہی راتوں کو بار بار اٹھ کر اسے جاکر کمبل اوڑھا کر آتا۔ اس کے اس دیوانے پن پر عرشی کو ہنسی آتی۔

جیسے جیسے منیہ بڑی ہوتی گئی' حذیفہ کی وارفتگی میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ عرشی کو چڑ ہونے لگی۔ اپنا بچہ ہوتا تو اور بات تھی مگر ایک غیر کے لیے حذیفہ کے دل میں اتنی محبت کا پنپنا عرشی کو بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

منیہ بھی حذیفہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ سارا دن بابا' بابا کی گردان لگائے رکھتی۔ اس نے ہر وہ کام کرنا ہوتا تھا' جو حذیفہ کرتا تھا۔ ہر بات میں وہ حذیفہ کی کاپی کرنے کی کوشش کرتی۔

حذیفہ کو چیز سلائس پسند تھا تو منیہ کو بھی وہی چاہیے ہوتا۔ حذیفہ ناشتے کے ساتھ اورنج جوس پیتا تھا تو منیہ بھلا کچھ اور کیسے لے سکتی تھی۔ حذیفہ کی عادت تھی کہ وہ کولڈ ڈرنک کی بوتل یا گلاس میں سے آخری دو گھونٹ ہمیشہ چھوڑ دیتا تھا تو منیہ بھی ناپ کر دو ہی گھونٹ بچاتی۔ یہاں تک کہ اس نے پہلی بار جب اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں پنسل پکڑی تو حذیفہ کی دیکھا دیکھی سیدھے کے بجائے الٹے ہاتھ میں تھامی۔

رفتہ رفتہ یہ چھوٹی اور معمولی باتیں بھی عرشی کی برداشت سے باہر ہونے لگیں۔

"آپ نے یہ کیسی مصیبت لاکر میرے گلے میں ڈال دی ہے۔ حذیفہ کو منیہ کے سوا کچھ دکھتا ہی نہیں۔ میں تو جیسے ان دونوں کے درمیان ہو کر بھی وہاں نہیں ہوتی۔ اس سے تو بے اولاد ہی بھلے تھے۔"

عرشی نے رعنا کے سامنے دل کی بھڑاس نکالی جو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ساڑھی کی فال درست کررہی تھیں۔ انہیں تھوڑی دیر میں کسی فنکشن میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ وہ اس وقت عرشی کے ساتھ اس ذاتی قسم کے پرابلم پر لمبی چوڑی بحث کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں تھیں۔

"تم خواہ مخواہ ہر بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔ اگر حذیفہ اس بچی سے پیار کرتا ہے تو کرنے دو۔ تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے۔" رعنا نے لاپروائی سے کہا۔

عرشی کو ہمیشہ سے ہی ہر اس شخص کا وجود کھٹکتا تھا' جو تھوڑی دیر کے لیے بھی حذیفہ کی توجہ اس پر سے ہٹا کر اپنی طرف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب اسمارہ سگی خالہ ہونے کے باوجود عرشی کی اس جلن سے مستثنیٰ نہ ہو سکیں تو پھر منیہ تو واقعی غیر تھی۔

"ممی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں۔ وہ لڑکی میری آنکھوں میں چبھتی ہے۔" عرشی نے کہا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہ ہر وقت تمہاری نظروں کے سامنے ہی موجود ہوتی ہے۔" رعنا کو معلوم تھا کہ عرشی کن کن طریقوں سے منیہ کو خود سے دور رکھا کرتی تھی۔

"وہ میری نظروں کے سامنے نہ بھی ہو تو اس کی موجودگی کا احساس تو ہر وقت رہتا ہی ہے۔ میرے بہترین ڈیکور والے گھر میں' جس کی لوگ مثالیں دیتے نہیں تھکتے تھے اب جگہ جگہ منیہ کی کلر پنسلیں' اس کے بلاکس اور پتا نہیں کیا کچھ بکھرا پڑا رہتا ہے۔ اتنی بار آیا سے کہا ہے کہ اسے کھلونے نرسری سے باہر نہ لانے دیا کرے مگر اس عورت پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ ایک نمبر کی کام چور ہے وہ۔ سارے نوکر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تنخواہ لینے وقت حاضر اور کام کے وقت غائب۔" عرشی سخت تپی ہوئی تھی۔

"عرشی بیٹا! چھوٹے بچوں والے گھر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" ہمیشہ کی طرح رعنا نے نرمی سے سمجھا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"مگر مجھے اپنے گھر میں ایسا کچھ نہیں چاہیے۔" عرشی چلائی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رعنا کی اسے پرسکون کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

"ایک تو میں اسے حذیفہ کے سامنے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اسی نے منیہ کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" عرشی کے برعکس رعنا بالکل مطمئن تھیں۔

"اگر وہ حذیفہ کی کمزوری بن چکی ہے تو یہی وہ مہرہ ہے جس کے بل پر تم ساری زندگی حذیفہ کے گھر پر راج کرسکتی ہو۔ حذیفہ جیسے جذباتی مرد کے لیے اولاد کتنی بڑی زنجیر ہوتی ہے' اس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے۔"

رعنا نے عرشی کو سمجھایا تو وہ خاموش ہو گئی۔ حذیفہ کی جذباتیت سے وہ خود بھی واقف تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے پر اس لڑکی کو برداشت کرنا میرے لیے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ پلیز کچھ کیجیے' کوئی حل ڈھونڈیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔" عرشی نے کہا۔

"ریلیکس عرشی! اگر نہیں برداشت ہوتا تو اسے ہاسٹل بھجوا دو۔ اس میں اتنا ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

رعنا نے اپنا آپ تنقیدی نظروں سے آئینے میں دیکھتے ہوئے ایک بار پھر لاپروائی سے کہا۔

وہ اس معاملے میں زیادہ متفکر نہیں تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ عرشی کو رائی کا پہاڑ بنانے کی عادت ہے۔ ان کے حساب سے منیہ کا مسئلہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ تھا ہی نہیں کہ اس طرح پریشان ہوا جائے۔

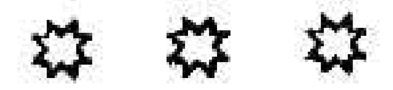
"اچھا سنو! میں ایک فیشن شو میں جارہی ہوں۔ چلوگی میرے ساتھ؟ موڈ بھی ٹھیک ہوجائے گا تمہارا۔"

رعنا نے آخر کار آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے عرشی سے پوچھا۔

"نہیں! آپ جائیے۔ میں اب گھر جاؤں گی۔" عرشی نے جواب دیا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ عرشی کوئی فنکشن چھوڑ دے۔ وہ فیشن کی دلدادہ تھی اور جدید فیشن کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ رکھنا اس کی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔ پر فی الحال وہ کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اس کے ذہن میں رعنا کا ایک ہی فقرہ گھوم رہا تھا۔

"ہنیہ کو ہاسٹل بھجوادو۔"



عرشی کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ حذیفہ اس تجویز پر بالکل راضی نہیں ہوگا۔ اور یہی ہوا۔ وہ بات سنتے ہی بری طرح بھڑک گیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

"اس میں دماغ خراب ہونے والی کیا بات ہے۔" عرشی برامان کر بولی۔

"میں ہنیہ کی بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔ دیکھو نا۔ وہ دن بدن کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی جارہی ہے۔ بورڈنگ میں جاکر وہ تھوڑا ڈسپلن سیکھ لے گی۔" عرشی نے کہا۔

"تم بھی تو ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔ تو کیا تمہیں بھی ڈسپلن کے لیے بورڈنگ بھجوا دینا چاہیے؟" حذیفہ نے ترخ کر کہا۔ عرشی جز بز ہوگئی۔ پھر جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ یہ معاملہ گرمی کھا کر حل ہونے والا نہیں تھا۔

"دیکھو! یہ ہنیا کی بھلائی کا معاملہ ہے۔" عرشی نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے ایک بار پھر کوشش کی۔ "مجھے تو ایک چھوٹی سی بچی کو اپنے گھر اور گھر والوں سے دور کردینے میں اس کا کوئی بھلا نظر نہیں آتا۔ ہنیہ تھوڑی سی شرارتی ضرور ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے سزا کے طور پر بورڈنگ اسکول بھجوا دیا جائے۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بورڈنگ اسکول نہ ہوا جیل ہوگئی، جہاں سزائیں دی جاتی ہیں۔"

"میرے حساب سے وہ جگہ جیل کے ہی برابر ہے جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو ان کے ماں باپ سے دور کرکے رکھا جاتا ہے۔"

حذیفہ قطعی لہجے میں بولا تو عرشی زچ ہوگئی۔ اتنا اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا کہ حذیفہ آرام سے کبھی نہیں مانے گا۔ عرشی نے اپنے اندر ابھرتی جھنجلاہٹ کو چھپا کر حذیفہ کو نرمی سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"دنیا میں کتنے ہی بچے ہاسٹل میں جاکر رہتے ہیں۔ کچھ تو اچھا ہوگا نا ان اسکولوں میں جو لوگ اپنے بچوں کو وہاں بھجواتے ہیں۔" عرشی نے کہا۔

"بھجواتے ہوں گے۔ پر ہنیہ نہیں جائے گی۔"

"لیکن۔۔۔"

"بس۔" اس نے عرشی کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ "میں نے کہہ دیا کہ ہنیہ نہیں جائے گی تو نہیں جائے گی۔ اب ہم اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔"

حذیفہ یہ کہہ کر چلتا بنا اور وہ وہیں کھڑی دانت پیستی رہ گئی۔

حذیفہ اکثر عرشی کی الٹی سیدھی فرمائشوں کو بلا چوں چراں مان کر اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کردیتا تھا کہ وہ اس سے کچھ بھی منوا سکتی ہے، پر اس قسم کے موقعوں پر عرشی کو بڑی شدت سے احساس ہوتا تھا کہ حذیفہ صرف ان باتوں کو مانتا ہے جو اس کی نظر میں ــــــ غیر اہم ہوتی ہیں۔ اتنی غیر اہم کہ وہ ان سے انکار کرکے عرشی کے ساتھ بحث کرنے کی زحمت کرنا بھی گوارا نہیں کرنا چاہتا اور جو باتیں اس کے لیے اہمیت رکھتی تھیں ان پر عرشی سر توڑ کوشش کرلینے کے باوجود اسے ٹس سے مس نہیں کرسکتی تھی۔

پر عرشی بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ بچپن سے اپنی منوانے کی جو عادت پڑ گئی تھی، وہ اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ دو چار دن بعد اس نے پھر بات چھیڑ دی۔ حذیفہ ناشتے کی ٹیبل پر تھا۔

"ہنیہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ ایسا کون سا بورڈنگ اسکول ہے، جو اتنے چھوٹے بچے کو ایڈمیشن دیتا ہے۔" وہ زچ ہوکر بولا۔

جواب میں عرشی نے اسکول کے فارم سامنے ٹیبل پر رکھ دیے۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ ہنیہ کے داخلے کے لیے معقول اسکول تلاش کرنے کے لیے عرشی کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ یہ وہی جانتی تھی اور اب اس کی ساری تفصیلات سے لیس ہوکر حذیفہ کے سامنے یہ مقدمہ پھر سے لے کر آئی تھی۔

"ہنیہ اب اتنی چھوٹی نہیں رہی۔ پورے چھ سال کی ہوچکی ہے وہ۔ یہی عمر ہوتی ہے بچے کی بنیاد کو مضبوط کرنے کی۔" عرشی نے رسان سے کہا۔

"تمہیں اچانک اس کی بنیاد میں کیا کمی نظر آگئی؟ شہر کے بہترین اسکول میں پڑھ رہی ہے وہ۔ پھر بھی اگر تمہیں لگتا ہے کہ اس کی بنیاد کمزور ہے تو تم اسے مضبوط بنانے کے لیے جتنے ٹیوٹر ہائیر کرنا چاہتی ہو کرلو۔ اس میں اگر ڈسپلن کی کمی محسوس ہوتی ہے تو کوئی بھی گورنس، دیسی یا بدیسی لاکر اس کے سر پر بٹھالو مگر جو کچھ کرنا ہے یہیں کرو۔ ہنیہ ہاسٹل ہرگز نہیں جائے گی۔"

حذیفہ اپنا فیصلہ سنا کر ابلا ہوا انڈا کھانے لگا۔ عرشی کی جان جل گئی۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے آخر۔ میں بھی دیکھتی ہوں وہ کیسے نہیں جاتی۔" اس نے دانت پیس کر کہا۔

"میں اپنی بیٹی کو خود سے الگ نہیں کرسکتا۔" حذیفہ نے چمچ میز پر پٹخ دیا۔ اسے غصہ آنے لگا تھا۔

عرشی کے اندر باہر لاوا دہک گیا۔ آگ کے شعلے لپک لپک کر اس کے دل دماغ کو جھلسانے لگے۔

"وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے۔" وہ غصہ سے بے قابو

ہو کر چلائی۔

عرشی کی سب سے بڑی خامی یہی تھی۔ اسے خود پر، اپنے جذبات پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔

ہاتھ سے نکلے وقت اور زبان سے ادا ہوئے الفاظ دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی واپس موڑا جا سکتا تو عرشی یہ کر گزرتی، پر اس وقت اس کے پاس رکتی سانسوں کے ساتھ وہاں کھڑے ہو کر حذیفہ کے رد عمل کا انتظار کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں۔" حذیفہ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا۔ شاک کے مارے عرشی اپنی جگہ پر کھڑی کی کھڑی ہی رہ گئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ ایک ڈاکٹر اور دو نرسوں کا منہ بند کر دینے سے اتنی بڑی بات چھپی رہ سکتی ہے؟" حذیفہ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

"تم۔۔۔ کب سے جانتے ہو۔" عرشی نے سوکھے حلق سے بمشکل آواز نکالی۔

"جب سے تم جانتی ہو۔" وہ بے تاثر لہجے میں بولا۔ "جس کلینک میں تمہاری ڈیلیوری ہوئی، وہاں ایک ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ جو اپنے ایک کیس کے سلسلے میں اس رات وہیں موجود تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ مجھے فون پر بتا چکا تھا کہ بچے کو بچایا نہیں جا سکا اور ماں۔۔۔"

"میں اس لیے چپ رہا کہ چلو تمہارے اس جھوٹ سے اگر تمہاری سونی گود بھرنے کے ساتھ کسی لاوارث کو گھر مل رہا ہے تو کیا برا ہے مگر عرشی! تم نے اس ننھی سی روح کو اپنی جھولی میں لیا ضرور پر کبھی اسے اپنا نہ سکیں۔ جب تم نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا تو اسے کم از کم سنبھالتیں تو سہی۔ اگر اس بچی کو چھت کے ساتھ تھوڑا سا پیار بھی دے دیتیں تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ خاص طور پر جب تمہیں معلوم ہے کہ تم خود کبھی ماں نہیں بن سکو گی، لیکن مجھے تم سے یا تقدیر سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے ہنیہ ہی کافی ہے۔" وہ میز سے اٹھ کر عرشی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

عرشی کا قد ہیل کے بغیر حذیفہ کے کندھے تک پہنچ رہا تھا اور آج اس کی نظریں حذیفہ کی شرٹ کے کالر سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو عرشی!" حذیفہ نے وارننگ دینے والے انداز میں سامنے کھڑی عرشی سے کہا۔ "آج کے بعد یہ کہنے کی غلطی دوبارہ کبھی مت کرنا کہ ہنیہ میری بیٹی نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

عرشی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنا پرس سامنے والی میز پر پھینکا اور اپنے پیر سفید اور نیلے نگوں سے مزین ہیل کی جوتی سے باہر نکالے۔ یہ سینڈل ان ہیلز میں سے تھی جنہیں فیشن کی خاطر بس تھوڑی دیر کے لیے پہنا جاتا ہے جبکہ عرشی انہیں پہن کر کافی دیر بازار میں گھومتی رہی تھی اور اب اپنے پیروں پر پڑنے والے لال نشانوں کو دیکھ رہی تھی جو پتلی پتلی پٹیوں کی وجہ سے وہاں عارضی طور پر نمودار ہو چکے تھے۔ جھکی ہوئی عرشی کے خوبصورتی سے تراشے بال آگے ہو کر چہرے کے ارد گرد سے گزرتے ہوئے اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔

عرشی کے بالوں کا قدرتی رنگ گہرا براؤن تھا، جسے عموماً سیاہ ہی سمجھا جاتا ہے اور وہ بھی کچھ ایسا برا رنگ نہیں تھا، پر عرشی کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت جلد یکسانیت سے اکتا جاتی تھی۔ اب چاہے وہ یکسانیت زندگی میں ہو یا پھر فیشن میں۔ اچانک عقب سے آتی چھناکے کی آواز نے اسے ہڑبڑا کر سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یقیناً کچھ ٹوٹا تھا۔

ہال کے دروازے سے ہی عرشی کو ایک نظر میں ہی سب دکھائی دے گیا۔

ایک کونے میں زمین پر بکھرے کرسٹل کے گلدان کے ٹکڑے سمیٹتی رشیدہ اور اس کے پاس ربڑ کا بڑا سا بال ہاتھ میں لیے مجرم بنی کھڑی ہنیہ۔

عرشی کا خون کھول گیا۔ وہ یہ گلدان اپنے یورپ کے دوران اٹلی سے خرید کر لائی تھی۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کتنے کا آیا تھا یہ الگ بات تھی اسے طیش دلانے کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کے ٹوٹنے میں ننھی سی ہنیہ کا ہاتھ ہے۔

"یہ تمہارے کھیلنے کی جگہ ہے کیا؟" عرشی نے آگے بڑھ کر ہنیہ کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔

"ہزار بار کہا ہے کہ نرسری کے اندر رہ کر کھیلا کرو۔" عرشی نے چلا کر کہا۔

ہاتھ نچا نچا کر چنگھاڑتی ہوئی عرشی اس وقت اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود انتہائی بھیانک لگ رہی تھی۔

ہنیہ چپ چاپ بال ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ اتنی سی عمر میں ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ جہاں وہ حذیفہ کی آنکھ کا تارا ہے، وہیں عرشی کا موڈ اس پر نظر پڑتے ہی خراب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ خود کو اپنے بیڈ روم سے ملحق نرسری تک محدود رکھنے کی عادی بنا چکی تھی۔ گھر کے اس کمرے کو خاص حذیفہ کی ہدایت کے مطابق اور اس کی نگرانی میں تب نرسری میں تبدیل کیا گیا تھا، جب ہنیہ نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا شروع ہی کیا تھا۔ بے بی پنک کلر کی دیواروں والی اس نرسری میں اسٹفڈ ٹوائے اور گڑیوں سے لے کر بے شمار چھوٹے بڑے گیمز ہنیہ کے کھیلنے کے لیے موجود تھے۔

مگر یہ کمرا چاہے کتنا ہی کشادہ کیوں نہ ہو۔ آخر تھا تو چار دیواری اور چھت والا ایک کمرا ہی، ہنیہ جیسی ذہین اور چلبلی بچی کے لیے سارا دن اس کمرے میں بند ہو کر گزارا کرنا بہت مشکل تھا، اسی لیے اس نے رشیدہ سے باہر لان میں جا کر کھیلنے کی فرمائش کی تھی۔

یہ سمجھ کر کہ عرشی اس وقت گھر پر موجود نہیں ہے۔ رشیدہ نے بھی اس کی بات مان لی۔ ہنیہ نے باہر جانے کے لیے ہال میں سے گزرتے وقت ہاتھ میں پکڑی بال کو ہوا میں اچھال کر کیچ کرنا چاہا تو بال واپس ہاتھ میں آنے کے بجائے سائیڈ والی میز پر رکھے گلدان سے ٹکرا کر اسے زمین بوس کر گئی۔

"ممی! سوری۔ میں نے نہیں توڑا۔ غلطی سے ٹوٹ گیا ہے۔" ہنیہ نے عرشی سے کہا۔

"غلطی کی بچی! ہر روز کوئی نیا نقصان کر کے کہتی ہے کہ غلطی سے ہو گیا ہے۔" عرشی نے ہنیہ کو بازو سے دبوچ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

"ممی! میں روز نقصان نہیں کرتی اور آپ سے بھی تو پرسوں پلیٹ ٹوٹی تھی۔" ہنیہ نے بھی پلٹ کر جواب دیا۔ عرشی آگ بگولہ ہو گئی۔ عرشی کی ہنیہ سے چڑنے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے اتنے سخت رویے کے باوجود ہنیہ اس کے رعب میں نہیں تھی۔ وہ عرشی کی گرم مزاجی کی وجہ سے اس کے سامنے آنے سے گریز ضرور کرتی تھی مگر اس سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اس کی پروا نہ کرنے والی فطرت و عادات عرشی جیسی خود پسند اور رعونت بھری عورت کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔

"بکواس کرتی ہے، بجائے معافی مانگنے کے بکواس کرتی ہے میرے سامنے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے بری طرح اسے پیٹ ڈالا۔

"پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔!" ہنیہ تکلیف سے بلبلائی۔ مصیبت میں اسے ایک ہی نام یاد آتا تھا۔

"چیخو اور زور سے چلاؤ۔ کوئی نہیں آئے گا تمہیں بچانے۔"

عرشی نے ہنیہ کو بالوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکے دیے تو ہنیہ کی فلک شگاف چیخیں سارے گھر میں گونجنے لگیں۔

"چپ کر منحوس!" عرشی نے پے در پے کئی تھپڑ اسے لگائے۔ چھ سال کی معصوم بچی عرشی کی جنونی گرفت میں بے بس تھی۔ وہ دونوں بازوؤں میں چہرہ چھپا کر خود کو عرشی کے حملوں سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مغلظات کا ایک طوفان تھا، جو عرشی کے منہ سے جاری تھا جس کو سن کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک مہذب طبقے کی پڑھی لکھی عورت ہے۔

ایک کونے میں کرچیاں سمیٹنا بھول کر ہکا بکا بیٹھی

رشیدہ کو بھی عرشی کا یہ روپ دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"چھوڑیں جی! بے بی سے غلطی ہوگئی۔ معاف کردیں اسے۔"

رشیدہ نے آگے بڑھ کر ہنیہ کو عرشی کی گرفت سے آزاد کروانے کی کمزور سی کوشش کی۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے۔" غصے کی حالت میں عرشی رعنا کے قابو میں نہیں آیا کرتی تھی۔ رشیدہ تو پھر معمولی نوکرانی تھی۔ رشیدہ خاموشی سے پیچھے ہٹ گئی کیونکہ وہ غریب تھی اور اپنی لگی بندھی روزی روٹی پر لات مارنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

اب ہنیہ تھی اور عرشی کا قہر۔ چھڑانے والا کوئی نہ تھا۔ کم از کم عرشی کا یہی خیال تھا اور اس وقت تک رہا جب تک ہنیہ کے رخسار کی طرف بڑھتے ہاتھ کو اچانک کسی نے کلائی سے جکڑ نہ لیا۔

"بس کردو یہ تماشا۔"

عرشی کو اپنے برابر حذیفہ کی غصے سے بھری آواز سنائی دی۔ عرشی کی طرح وہ بھی خلاف معمول جلدی گھر آگیا تھا اور عرشی کی طرح ہی ہال میں داخل ہوتے ہی سامنے کے منظر نے اس کا خون کھولا دیا تھا۔

"کیوں بس کروں۔ دیکھا نہیں اس نے کیا کیا ہے۔" عرشی نے ایک جھٹکے سے اپنی کلائی حذیفہ کی گرفت سے چھڑائی اور اس کی ٹانگوں کے پیچھے چھپی ہنیہ کو ایک بار پھر پکڑنا چاہا۔

"بس!" حذیفہ کی گرجتی آواز نے عرشی کو اپنی جگہ پر ساکت کردیا۔ رشیدہ بھی معاملہ بگڑتا دیکھ کر کب کی وہاں سے رفوچکر ہوچکی تھی۔

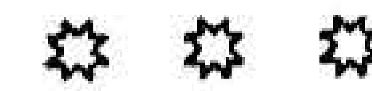
"تم ایک جنگلی اور وحشی عورت ہو۔ تم سے کسی اچھائی کی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔" حذیفہ میں کمال کی قوت برداشت تھی۔ اتنے سالوں میں کئی ایسے مواقع آئے جہاں کوئی بھی انسان خود پر کنٹرول کھو سکتا تھا مگر حذیفہ نے ہمیشہ خود پر قابو رکھا مگر اس وقت وہ جس طرح طیش میں آیا تھا تم سے دیکھ کر عرشی کو لگا کہ اگر اس نے اپنا ہاتھ فوراً نہ روک لیا تو آج حذیفہ کا ہاتھ بھی اس پر ضرور اٹھ جائے گا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار اسے حذیفہ کے غصے سے خوف محسوس ہوا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

کتنی دیر حذیفہ ہنیہ کے سسکتے وجود کو سینے سے لگا کر لان میں پھرتا رہا جیسے اپنی محبت سے اس نفرت کے اثر کو زائل کرنا چاہ رہا ہو۔ جو تھوڑی دیر قبل تھپڑوں کی صورت میں ہنیہ کے جسم پر وارد ہوئی تھی۔ حذیفہ کو معلوم تھا کہ جو کچھ ہوا اس کا ٹوٹے ہوئے ڈیکوریشن پیس سے کوئی تعلق نہیں۔ عرشی محض اپنی فرسٹریشن ہنیہ پر نکال رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی مرضی پوری نہ ہونے پر طوفان کھڑا کردینے والی۔ حذیفہ پر تو اس کا بس نہیں چلتا تھا البتہ ہنیا کو دق کرنے کا کوئی بہانہ وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اور یہ سب حذیفہ سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ہنیہ حذیفہ کی گود میں ہی روتے روتے سوگئی تھی۔ حذیفہ اسے لے کر اندر چلا آیا۔

عرشی کہیں نظر نہیں آرہی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ اس کے اس جنگلی پن کے مظاہرے کے بعد حذیفہ اس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہنیہ کو اس کے بستر پر احتیاط سے لٹا کر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور سوئی ہوئی ہنیہ کو دیکھنے لگا۔ رونے کی وجہ سے اس کی پلکیں بھیگ کر ایک دوسرے سے چپکی ہوئی تھیں۔ گالوں پر ابھی تک عرشی کی بے رحم انگلیوں کے نشان ثبت تھے۔

حذیفہ کتنی دیر ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا، پھر جھک کر سوئی ہوئی ہنیہ کے ماتھے پر بوسہ دے کر باہر نکل گیا۔



حذیفہ ساری رات اپنے کمرے میں نہیں آیا۔ عرشی جب صبح اٹھی تو بستر خالی پڑا تھا اور چادر بے شکن تھی۔ عرشی دونوں ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سمیٹتی بستر سے اترنے لگی تو اسے سائیڈ ٹیبل پر پڑا کاغذ نظر آیا۔

عرشی نے نیند سے بھری آنکھوں کو کھول کر دیکھا تو یہ بورڈنگ اسکول کا ایڈمیشن فارم تھا، جو پچھلے کئی دن سے کبھی یہاں تو کبھی وہاں پڑا رُل رہا تھا۔

جس چیز نے عرشی کی آنکھیں پوری طرح سے کھول دیں وہ فارم کا نچلا اور آخری حصہ تھا، جو کل تک خالی تھا۔ آج وہاں حذیفہ کے دستخط ہوچکے تھے۔

عرشی کو نہیں معلوم کہ حذیفہ نے کیا سوچ کر فارم پر دستخط کیے تھے۔

رات کو ہنیہ کو اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ کتنی دیر باہر لاؤنج میں ٹہلتا رہا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ عرشی اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے بے رحمی کی کسی بھی حد کو پار کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔ جب سے ہنیہ کی اصلیت کو حذیفہ سے چھپا کر رکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی تب سے عرشی کا رہا سہا لحاظ بھی جاتا رہا۔ کبھی کبھی حذیفہ کو لگتا تھا کہ یہ وہ عرشی ہے ہی نہیں، جسے وہ شادی سے پہلے جانتا تھا۔

یا پھر شاید وہ اسے کبھی جانتا ہی نہیں تھا۔ حذیفہ نے باہر دیکھتے ہوئے تھک کر سوچا، جہاں رات کی تاریکی صبح کی نیلگوں سفیدی میں تبدیل ہورہی تھی۔

باہر لان میں مالی کے لگائے پودوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ دنوں میں ان ننھی اور نازک کلیوں نے خوش رنگ اور خوش نما پھولوں کا روپ دھار لینا تھا مگر کونپل سے پھولوں تک کے سفر میں انہیں ماہر ہاتھوں کی محنت کی ضرورت تھی، جو محبت اور توجہ کے ساتھ ان کی آبیاری کرتے۔

بچے بھی ان ننھی کلیوں کے جیسے نرم و نازک ہوتے ہیں جنہیں کھلنے کے لیے اتنی ہی توجہ، محنت اور محبت کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن جس گھر میں محبت کی جگہ نفرت بٹنے لگے وہ گھر رہنے کے قابل نہیں رہتا۔

حذیفہ کو آج بھی وہ لڑکی نہیں بھولی تھی جس کی شخصیت اس کے ماں کے بدصورت رویے نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔ جس نے اس کی خود اعتمادی چھین لی تھی۔ رشتوں پر سے اعتبار ختم کردیا تھا۔

ہنیہ کا ہاسٹل چلے جانا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔

سورج کی افق پر پھیلتی لالی اس کے طلوع ہونے کا اعلان کررہی تھی، جس وقت حذیفہ نے فارم پر دستخط کرکے سوئی ہوئی عرشی کے پاس رکھا۔

اس کے بعد عرشی نے ہفتوں کا کام دنوں میں نپٹایا۔ زندگی میں پہلی بار عرشی نے ہنیہ کے کسی کام میں جی جان سے حصہ لیا اور وہ تھا ہنیہ کے جانے کی تیاری۔

وہ جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اس نے جاتے وقت اتنا واویلا مچایا کہ عرشی کے کان پھٹنے کو آگئے۔ حذیفہ وہاں نہیں تھا۔ وہ صبح سویرے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ وہ ہنیہ کو جاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ وہ اندر بیٹھ کر بھی چلاتی رہی۔ حذیفہ کو آوازیں دیتی رہی۔

گاڑی گئی تو اس کے ساتھ ہنیہ کا کھڑا کیا ہنگامہ بھی رخصت ہوا۔ عرشی نے سکون کا سانس لیا۔

اپنے گھر پر اب اس کا مکمل راج تھا۔ اس راج کا ایک ایک پل وہ پوری طرح سے انجوائے کرنے کے موڈ میں تھی۔

حذیفہ سارا دن گھر سے غائب رہا۔ رات کو آیا تو آتش دان کے سامنے رکھی اپنی مخصوص کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

ابھی سردیوں کا موسم نہیں تھا اس لیے آتش دان ٹھنڈا پڑا تھا۔ پھر بھی حذیفہ اس میں رکھی سوکھی لکڑیوں کے نیچے بجھی ہوئی پرانی راکھ پر نظریں جمائے روشنی اور حرارت کا پتا دیتی کسی چنگاری کے اچانک بھڑک اٹھنے کا جیسے انتظار کررہا تھا۔ عرشی اپنا کافی سے بھرا مگ لے کر اس کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

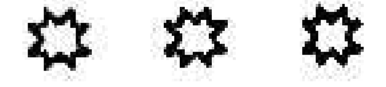
"کتنا عرصہ ہوگیا تھا ہم دونوں کو اس طرح سکون سے ایک ساتھ بیٹھے ہوئے۔ اچھا لگ رہا ہے نا؟"

عرشی نے مسکرا کر حذیفہ سے تائید چاہی۔

عرشی واقعی اتنی بے حس تھی یا پھر انتہائی بے وقوف جو اس وقت حذیفہ سے ایسی بات کررہی تھی۔

جواب میں حذیفہ نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا

کہ عرشی کے ہاتھ سے کافی چھلک کر اس کے کپڑوں کو داغ دار کر گئی۔



اگر عرشی کا خیال تھا کہ ہنبہ کے جانے کے بعد اسے حذیفہ کی پوری توجہ حاصل ہو جائے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ حذیفہ کے ساتھ جو تھوڑا بہت وقت اسے پہلے مل جایا کرتا تھا' وہ اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ اب وہ صبح گھر سے نکلتا تو رات گئے ہی گھر لوٹتا تھا۔

اگر کبھی اتفاق سے وہ گھر پر موجود بھی ہوتا تو کوئی نہ کوئی کتاب لے کر آتش دان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا یا پھر ٹی وی پر کوئی اسپورٹس' کرنٹ افیرز یا پھر نیوز کا کوئی چینل لگا کر دیکھتا رہتا۔ اس نے بہت سالوں کے بعد دوبارہ ٹینس کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک زمانے میں کلب لیول پر ٹورنامنٹس میں بھی حصہ لیتا اور اکثر جیت بھی جاتا تھا۔ تب عرشی بہت شوق سے اس کے میچ دیکھنے جایا کرتی تھی اور تماشائیوں کی صف میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح اس کے لیے تالیاں بجایا کرتی تھی۔

"تمہیں کم از کم نیشنل لیول پر ضرور کھیلنا چاہیے۔ بہت اچھا کھیلتے ہو؟" عرشی اسے اکساتی۔

"اس کے لیے محنت کی ضرورت ہے۔" وہ لاپروائی سے کہتا۔

"تمہیں محنت کی کیا ضرورت ہے۔ تم میں نیچرل ٹیلنٹ ہے۔" عرشی اس سے کہتی۔ "اور اگر ضرورت ہے ـــ تو کر لو نا تھوڑی سی محنت۔ تمہیں کیا اچھا نہیں لگے گا۔ اگر اس کھیل میں تمہارا نام ہو جائے گا۔"

"میں نام کے لیے تو نہیں کھیلتا۔ میں اس لیے کھیلتا ہوں کیونکہ مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ اگر میں صرف جیتنے کے لیے کھیلوں تو شاید اسے اتنا انجوائے نہ کر سکوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" عرشی منہ بنا کر کہتی۔ "جیتنے کا ہی تو مزا ہے۔ دنیا میں جیت سے زیادہ کچھ اہم نہیں ہوتا۔" عرشی سر اٹھا کر رعونت سے کہتی۔

"نہیں عرشی! جیت سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے اچھا' فیئر اور جان دار کھیل پیش کرنا۔ جس کھیل میں یہ نہ ہو' وہ کھیل نہیں جوا ہوتا ہے اور اس کی ہار جیت بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔" حذیفہ عرشی کو سمجھایا کرتا تھا۔

عرصہ ہوا عرشی نے حذیفہ کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا اور حذیفہ اب انجوائے منٹ کے لیے بھی نہیں کھیلتا تھا۔ اب نہ جانے کون سی ذہنی تھکاوٹ تھی اسے' جس سے جان چھڑانے کے لیے وہ خود کو جسمانی طور پر چُور چُور کرنے لگ پڑا تھا۔ عرشی کو حذیفہ کی ان خود ساختہ مصروفیات اور لاتعلق رویے سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ وہ خود گھر میں کم ٹکتی تھی۔ اس نے رعنا کے ساتھ ان کی سرگرمیوں میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی جو ان ہی کی طرح اپر کلاس خواتین نے مشغلے کے طور پر اپنائی ہوئی تھیں۔ بعض اوقات عرشی کو گھر لوٹنے میں حذیفہ سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی تھی۔

عرشی کو اس ساری روٹین میں اگر کوئی بات ناقابل برداشت لگتی تو وہ یہ تھی کہ حذیفہ جو بنا کسی جذبے یا احساس کے ایک روبوٹ کی طرح اپنے شب و روز بسر کر رہا ہوتا تھا' ہنبہ کے چھٹیوں میں گھر آنے پر یکدم پھر سے زندہ ہو جاتا۔ عرشی سے اس کا چھٹیوں میں گھر آنا بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ ایک معصوم لڑکی سے نہ جانے کیسا بیر ـــ تھا کہ وہ اسے کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ محبت کے کسی بھی جذبے یا احساس سے عاری ممتا کے جذبے سے بھی محروم تھی۔ حذیفہ پر مکمل کنٹرول کی خواہش نے اسے پاگل کر دیا تھا۔

"ممی! خدا کا واسطہ ہے' اس عذاب سے میری جان چھڑائیے۔" عرشی ایک بار پھر ـــ رعنا کے سر پر سوار ہو گئی۔

"کس عذاب کی بات کر رہی ہو تم؟" رعنا جو رنگ برنگی دوائیاں ہتھیلی پہ رکھ کر انہیں نگلنے کی تیاری کر رہی تھیں' اس کی بات پر حیران ہو کر پوچھنے لگیں۔

"ہنبہ کی بات کر رہی ہوں میں۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کون سے عذاب میری زندگی میں نظر آ رہے ہیں۔" عرشی نے تنگ کر کہا۔

"عرشی پلیز! پھر سے یہ قصہ مت شروع کرنا۔" رعنا نے بے زاری سے کہہ کر گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کے ساتھ اپنے اندر اتاریں۔

پچھلے کئی دنوں سے ان کی طبیعت بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ ہمت جیسے جواب دیتی جا رہی تھی۔ حالانکہ انہوں نے ہمیشہ چست اور بھاگ دوڑ سے بھرپور زندگی گزاری تھی۔ ڈاکٹر کوئی خاص بیماری تشخیص نہیں کر سکے' پھر بھی آرام کا مشورہ دیا۔

"آپ نے اپنی لائف کو بیسیوں کاموں میں الجھا رکھا ہے میڈم! یہ اس کا نتیجہ ہے۔" یہ ان کے فیملی فزیشن کی رائے تھی۔

"لیکن میں تو ہمیشہ سے اسی طرح کام کرنے کی عادی ہوں۔" رعنا نے کہا تھا۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ کچھ عمر کے بھی تقاضے ہوتے ہیں۔ ایک وقت کے بعد جسم اور دماغ اتنی ٹف روٹین برداشت کرنے کے عادی نہیں رہتے۔ آپ پلیز خود کو تھوڑا آرام دیں۔ ریلیکس کریں۔ کاموں کا کیا ہے وہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے مشورہ دیا تھا۔

مگر عرشی کے ہوتے ہوئے رعنا کو سکون بھلا کہاں مل سکتا تھا۔ ابھی بھی عرشی کے بگڑے موڈ کو دیکھ کر اور اس کے نتیجے میں کم از کم آدھے گھنٹے تک جاری رہنے والی متوقع چخ چخ کا سوچ کر ہی رعنا کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگا۔

"میں اس قصے کو اس وقت تک چھیڑنا بند نہیں کروں گی جب تک آپ اپنی اس پیدا کی ہوئی مصیبت کا کوئی پکا حل تلاش کر کے نہیں دیتیں۔" عرشی نے کہا۔

"میری پیدا کی ہوئی مصیبت؟ میں نے کیا کیا ہے؟" رعنا نے اچنبھے سے کہا۔

"سارا کیا دھرا آپ ہی کا تو ہے۔ آپ ہی نے یہ ہنبہ نام کی بلا لا کر میرے گلے میں ڈالی تھی۔" عرشی برہمی سے بولی۔ "اسے میری زندگی میں آپ لے کر آئی تھیں' اب اسے میری زندگی سے خارج کرنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی پر عائد ہوتی ہے۔"

"بھجوا تو دیا اسے ہاسٹل۔ ہو تو گئی وہ تمہاری زندگی سے خارج۔ اب اور کیا چاہتی ہو تم؟" رعنا نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ سارا ڈرامہ ان کی توقع سے زیادہ ان کے اعصاب سے طاقت نچوڑ رہا تھا۔

"خاک خارج ہوئی ہے وہ۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد پھر گھر میں موجود ہوتی ہے۔"

"چند دنوں کے لیے ہی تو آتی ہے وہ۔ آنے دو۔ کون سا اب وہ مستقل تم لوگوں کے ساتھ رہتی ہے۔" رعنا نے سمجھایا۔

"آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ یہی چند دن میری زندگی کے بدترین دن ہوتے ہیں۔"

عرشی اپنی نیل پالش سے سجی مخروطی انگلیوں کو بے دردی سے موڑ رہی تھی جو اس کے اندرونی اضطراب کی نشانی تھی۔

"حذیفہ کے پاس میرے ساتھ بتانے کے لیے ایک پل بھی نہیں ہوتا اس کے آنے پر اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے مکمل طور پر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ آگ لگتی ہے میرے دل میں یہ دیکھ کر۔" عرشی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کمرے کے وسط میں چکر کاٹ رہی تھی۔

رعنا بستر پر اپنا سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"بیٹا! حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھو۔ ہر چیز مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن مجھے ہر چیز اپنی مرضی کے مطابق چاہیے اور ہنبہ کا وجود اسے کبھی پرفیکٹ نہیں ہونے دے گا۔ پلیز ممی کچھ تو کیجیے۔"

"جو کچھ میرے بس میں تھا' میں کر چکی ہوں۔ اب اور کیا کروں۔" رعنا بے بسی سے کہنے لگیں۔

"ٹھیک ہے۔ کچھ مت کیجیے آپ۔" عرشی اور بھی طیش میں آ گئی۔

"پتا نہیں کیوں میں اپنی پرابلم لے کر آپ کے پاس آ جاتی ہوں۔ آپ نے کبھی میرے لیے کچھ نہیں کیا۔" عرشی نے سارے لحاظ طاق پر رکھتے ہوئے

انتہائی بدتمیزی کے ساتھ کہا۔

رعنا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"کیا کہا تم نے؟ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا؟" رعنا ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھ کر عرشی کے مقابل آکھڑی ہوئیں۔

"میں نے ہمیشہ جو کچھ بھی کیا صرف اور صرف تمہارے لیے کیا۔ مجھے حذیفہ چاہیے' میں حذیفہ کے بغیر مرجاؤں گی۔ کون تڑپ تڑپ کر کہا کرتا تھا یہ۔" رعنا نے کڑے تیوروں کے ساتھ عرشی کو اس کے برسوں پرانی کیفیت یاد دلائی۔

"اس وقت میں نے... ہاں عرشی! میں نے حذیفہ کو لاکر تمہارے ہاتھ میں تھمایا۔ صرف میری وجہ سے وہ آج اس لڑکی کے ساتھ ہونے کے بجائے تمہارے ساتھ ہے۔ صرف میری وجہ سے۔"

رعنا نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ جتنا تاؤ انہیں آج عرشی کی بات سن کر آیا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ رعنا نے عرشی کے چہرے کے آگے اپنا ہاتھ سوالیہ انداز میں لہرایا۔

"یہ سوچو تم نے اتنے عرصے میں کیا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پچھلے سات سال سے وہ تمہارا شوہر ہے۔ سات سال کم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے۔ تم سے تو آج تک یہ بھی نہیں ہوسکا۔"

"ممی!" عرشی تلملا کر رہ گئی۔

"چپ کرو اور خبردار! جو اب میرے پاس کوئی شکایت لے کر آئیں قصور سراسر تمہارا اپنا ہی ہے۔" رعنا نے عرشی کو آئینہ دکھایا۔

"ممی! میں یہ سب سننے کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔" عرشی غصے سے کانپ رہی تھی۔ سچ اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"نہیں سننا چاہتیں تو چلی جاؤ یہاں سے۔ بس بہت کرلی تمہاری مدد اور صلہ بھی دیکھ لیا۔ اب میری توبہ جو میں تمہارے کسی معاملے میں دخل اندازی کروں۔ جاؤ عرشی! اپنے مسئلوں کا حل خود تلاش کرنے کی عادت ڈالو۔" رعنا نے رکھائی سے کہا۔ کچھ دیر عرشی بے یقینی کی کیفیت میں رعنا کی شکل دیکھتی رہی جو اپنے دل کی بھڑاس نکال کر واپس پلنگ کے اوپر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ مجھ سے اتنی ہی تنگ آچکی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں اور آئندہ یہاں نہیں آؤں گی۔" عرشی کا خیال تھا کہ اس جذباتی بلیک میلنگ کے نتیجے میں رعنا اسے روکیں گی' پر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

رعنا اپنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھی رہیں۔

عرشی جھنجلا کر مڑی اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ واپسی پر عرشی کا موڈ سخت آف تھا۔ وہ نہایت ریش انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔

"میری ہی مت ماری گئی تھی جو حذیفہ جیسے پتھر کے ساتھ سر پھوڑا۔" عرشی نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے سوچا۔

اسے یاد آیا کہ یونیورسٹی کے زمانے میں کتنے لڑکے اس کی ایک نظر کرم کے انتظار میں اس کے اردگرد منڈلایا کرتے تھے۔ عرشی نے ان میں سے کسی کو بھی توجہ کے قابل نہ سمجھا کیونکہ تب اس کے حواسوں پر حذیفہ سوار تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انتخاب کرلیا ہوتا تو زندگی اتنی پیچیدگیوں میں نہ الجھی ہوتی۔

لیکن وہ ان میں سے کس کا انتخاب کیسے کرسکتی تھی؟ وہ کتنے ہی بہترین کیوں نہ ہوں' ان میں سے کوئی بھی حذیفہ نہیں تھا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص حذیفہ نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ منفرد تھا۔ سب سے الگ۔ اور صرف عرشی کا تھا۔

کیا فرق پڑتا تھا کہ حذیفہ عرشی کو ہر بات میں اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیا کرتا تھا۔ اپنی تمام کج ادائیوں کے باوجود اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا تھا۔

اسٹیئرنگ پر عرشی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایکسیلیٹر پر سے پاؤں کا زور بھی خود بخود کم ہوگیا۔ گھر

میں داخل ہونے تک گاڑی کی رفتار اور عرشی کا موڈ دونوں چیزیں نارمل حدود کے اندر آچلی تھیں۔

ماربل کے ٹائیلوں سے سجے چمکدار پورچ کی حدیں جہاں ختم ہوتی تھیں وہیں سے گھر کے سامنے بنے ہرے بھرے لان کی شروعات ہوتی تھی۔

اس وقت لان کے عین درمیان گھاس کے اوپر ایک بڑے سائز کا ان فلیٹ ایبل بچھا ہوا تھا جس کے اندر گھر کے دو ملازم پائپ کی مدد سے پانی بھر رہے تھے۔

"یہ کیا کررہے ہو تم لوگ؟" گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے عرشی نے پانی بھرتے ایک ملازم سے استفسار کیا۔

"صاحب نے اسے بھرنے کو کہا تھا۔ چھوٹی بی بی کو پول میں نہانا ہے۔" ملازم نے عرشی کو بتایا۔

"کون چھوٹی بی بی؟" عرشی نے الجھ کر پوچھا۔ پھر اسے ایک دم احساس ہوا کہ وہ ہنیہ کی بات کررہا ہے۔ رعنا کے گھر سے اپنے گھر آنے کے دوران عرشی یہ بھول گئی تھی کہ ہنیہ کی گرمیوں کی چھٹیاں کل سے شروع ہوچکی ہیں اب وہ اگلے دو ہفتے اسی گھر میں عرشی کے سر پر ناچتے ہوئے گزارے گی۔

عرشی نے اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے رکھی کرسی پر گرتے ہوئے رعنا کے ہی انداز میں سر کو تھام لیا۔

عرشی جس کرسی پر بیٹھی تھی' اس کے برابر والی کھڑکی نے آدھی سے زیادہ دیوار کو گھیرا ہوا تھا اور اس کھڑکی میں سے لان کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ کیونکہ یہ حصہ عرشی کے بیڈ روم سے دکھتا تھا اس لیے اس کی آرائش و زیبائش پر لاکھوں روپے خرچ کیے گئے تھے۔

لال پتھروں کی بنی روش' اس کے درمیان سبزے کا مخملیں فرش اور اس پر سجے نایاب اور قیمتی پودے جو جانے کہاں کہاں سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ شہر کے بہترین لینڈ اسکیپ آرٹسٹ کے تخیل کو بھاری قیمت دے کر اس حسین منظر میں ڈھالا گیا تھا۔

پر اس وقت یہ دلکش و دلنشین نظارہ عرشی کے تنے اعصاب کو پرسکون کرنے میں کامیاب نہیں ہورہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ رنگ و خوشبو سے بھرا یہ خوبصورت منظر عرشی کے لیے نہ صرف اپنی کشش کھوچکا تھا بلکہ کچھ عرصے سے اس کی نظروں میں چبھنے لگا تھا۔ اس چبھن کا آغاز اس دن بلکہ اس رات سے ہوا تھا جس رات ان کی لیڈیز کلب کی سیکریٹری مسز رابعہ زمان نے اپنے گھر پر پول سائیڈ پارٹی ارینج کی تھی۔ پارٹی کا مقصد گیٹ ٹوگیدر سے زیادہ اپنے نئے سوئمنگ پول کی نمائش کرنا تھا۔ رات کے وقت پول کے اطراف لگی ڈھیروں لائٹوں کے پانی کی سطح پر جھلملاتے عکس نے نہایت فسوں خیز ماحول پیدا کیا ہوا تھا۔ عرشی سمیت وہاں موجود کئی خواتین کے دل میں اس سے بھی کچھ بہتر کر دکھانے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

"صرف پانچ منٹ کی ڈرائیو پر کمیونٹی کلب کا سوئمنگ پول ہے پھر گھر کے اندر سوئمنگ پول بنوانے کی کیا ضرورت ہے۔" حذیفہ نے عرشی کی تجویز کو سنتے ہی رد کردیا تھا۔

"مگر اس میں حرج ہی کیا ہے۔" عرشی کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ جب وہ لوگ افورڈ بھی کرسکتے ہیں اور ان کے پاس وافر جگہ بھی موجود ہے تب بھی حذیفہ پول بنوانے میں حجت کیوں کررہا ہے۔

"حرج ہے عرشی! چھوٹے بچوں والے گھر میں سوئمنگ پول بنوانا مناسب نہیں ہوتا۔" حذیفہ نے اپنا اعتراض بیان کیا تو عرشی کا منہ کھلا رہ گیا۔

"کیا؟" اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"دیکھو عرشی! ہنیہ ابھی چھوٹی ہے۔ اسے ٹھیک سے تیرنا بھی نہیں آتا لیکن شوق اتنا ہے کہ جب میں اسے کلب لے کر جاتا ہوں تو فوراً پانی میں چھلانگ لگانے کے لیے دوڑتی ہے گھر میں پول ہوگا تو یہاں بھی یہی کرے گی۔ کلب میں تو جتنی دیر پانی میں رہتی ہے۔ میں اس کی نگرانی کرتا ہوں گھر میں چوبیس گھنٹے میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔" حذیفہ نے کہا۔

"تم خواہ مخواہ فکر کررہے ہو' دور رشیدہ ہر وقت اس

کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔"

"جب ہم ماں باپ ہو کر ہر وقت ہنیہ پر نظر نہیں رکھ سکتے تو نوکروں سے یہ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ غفلت نہیں برتیں گے۔"

حذیفہ راضی نہ ہوا۔ ہنیہ کے معاملے میں وہ مڈل کلاس ماؤں سے بھی زیادہ وہمی تھا۔

"مگر مجھے ہر حال میں سوئمنگ پول بنوانا ہے۔" عرشی نے پیر پٹخ کر کہا۔

"کچھ سال بعد دیکھیں گے۔ تب تک ہنیہ بھی سمجھ دار ہو چکی ہوگی۔" حذیفہ نے اسے ٹال کر وقتی طور پر جان چھڑائی۔ آج اپنے سرسبز و شاداب لان کے بیچ ہنیہ کے لیے مصنوعی سوئمنگ پول میں پانی بھرتا دیکھ کر عرشی کو اپنا نہ بن سکنے والا سوئمنگ پول پھر سے یاد آگیا۔

"ہنیہ کے لیے پول لگوانے کی فرمائش فوراً" پوری کردی۔ میرا پول تعمیر کرواتے وقت تکلیف ہو رہی تھی۔" عرشی نے دانت پیس کر سوچا۔ حالانکہ تھوڑی دیر کے لیے سیٹ کیے گئے دو فٹ گہرے بچکانہ سوئمنگ پول میں اور 'ایک دس پندرہ فٹ کی گہرائی والے سوئمنگ پول میں کتنا فرق ہوتا ہے' یہ عرشی کو بھی معلوم تھا۔ مگر وہ اکثر ایسے ہی بے جوڑ اور بے تکے موازنے کر کے اپنا پارہ ہائی کرلیا کرتی تھی۔

حذیفہ ابھی تک آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ یہ پول سیٹ کرنے کی ہدایت اس نے یقیناً" فون پر دی ہوگی۔ عرشی کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک وہ خود بھی گھر پہنچ جائے گا۔ جب ہنیہ گھر پر ہوتی تو کوئی میٹنگ' حذیفہ کے قدم دفتر میں زیادہ دیر تک نہیں روک پاتی۔ عرشی کا اندازہ درست تھا۔ تھوڑی دیر میں حذیفہ کی گاڑی بھی پورچ میں آکر کھڑی ہوگئی۔

احتجاج کے طور پر عرشی اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی اور جب باہر آئی تب تک رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ حذیفہ گھر پر نہیں تھا۔ وہ ہنیہ کو برگر کھلانے لے جاچکا تھا۔

شروع میں حذیفہ عرشی کو بھی اپنے اور ہنیہ کے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر عرشی نے کبھی ان کے ساتھ شامل ہونا پسند نہ کیا تھا۔ اب تو عرصے سے حذیفہ نے اسے ساتھ چلنے کی دعوت دینا بھی چھوڑ دی تھی۔

ناراضی کے اظہار کے طور پر عرشی رات کو بھی ان دونوں کے واپس آنے سے پہلے ہی سو گئی۔

حذیفہ' ہنیہ کو لے کر کب لوٹا۔ کمرے کے اندر کب آیا' آیا بھی یا وہیں ہنیہ کے کمرے میں صوفہ کم بیڈ کھول کر اس پر سو گیا۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر یہ دیکھنے تک کی بھی زحمت نہیں کی۔



ابھی موسم سرما کا پوری طرح آغاز نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی لندن میں اچھی خاصی ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو چکی تھیں۔ یہاں کا موسم عجیب تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں بھی جس روز سورج جلوہ افروز نہ ہوا اس دن بھی اچھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ سوئٹروں' اوور کوٹ اور اکثر چھتریوں کے بنا گھر سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لندن کا شہر بھی اپنے موسم کی طرح عجیب تھا۔ گیلا' میلا' سلیٹی رنگ کا' سوائے سینٹرل لندن کے جہاں ٹورسٹ لوگوں کی بھرمار ہوتی تھی' سارے شہر کا ماحول اداسی اور یاسیت سے بھرپور تھا۔ پر حیرت کی بات یہ تھی کہ دھوپ نکل آنے پر یہی شہر اپنی کینچلی بدل لیتا تھا۔ اداسی کا چولا اتار کر ایک دم سے چمکنے لگتا۔ بدرنگ عمارتیں خوبصورت لگتیں۔ اندھیری گلیاں روشن ہو جاتیں۔ فقط ایک سورج کے نکلنے یا چھپ جانے سے کسی اور جگہ میں اتنی تیزی کے ساتھ اس قدر حیرت انگیز تبدیلی نہیں آتی تھی جتنی کہ لندن شہر میں۔

موسم گرما رخصت ہو رہا تھا۔ سڑک کے کنارے چلتے کئی لوگ تیز ہواؤں سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے کوٹ کے کالر اوپر کیے تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔

ان ہی سبک خرام لوگوں کے درمیان ایک لڑکی بھی چل رہی تھی جس کی رفتار باقی سب کی نسبت کم تھی۔

وہ آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے سڑک کے کونے پر بنی کافی شاپ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اس نے کاؤنٹر سے کافی لی اور ایک کونے میں رکھی بہت ساری بوتلوں میں سے اپنی پسند کا چاکلیٹ پاؤڈر کافی کے اوپر چھڑکا اور پھر شیشے کی دیوار کے ساتھ رکھی میز کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گئی۔ جہاں سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ گرم گرم کافی کے گھونٹ پیتے ہوئے وہ باہر سے گزرنے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

اسے خبر نہیں تھی کہ باہر سے گزرنے والے کئی لوگ بھی کافی شاپ کے اندر بیٹھی اداس آنکھوں والی اس لڑکی کی طرف اکثر متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔

وہ لڑکی جو ہمیشہ شیشے کی دیوار کے سامنے رکھی کرسی پر اکیلی بیٹھا کرتی تھی۔

کافی ختم کر کے لڑکی نے ٹیبل پر رکھا اپنا بیگ اٹھایا اور اسے کندھے پر ڈال کر شاپ سے باہر نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی ٹھنڈی ہوا اس کے گرم ہوئے رخساروں سے ٹکرائی۔ کبھی یہ ٹھنڈ کا موسم اسے بے حد پسند ہوا کرتا تھا۔ تب اسے نہیں پتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس کی زندگی پر ہی برف جم جائے گی۔

ٹھنڈے جذبات' ٹھنڈے احساسات' ہر چیز منجمد' حرارت کے بغیر۔

لڑکی نے بھی اوروں کی طرح کوٹ کے کالر ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے اوپر کیے اور آگے چل پڑی۔ اس کا رخ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف تھا جہاں سے اسے اپنے گھر کی سمت جانے والی ٹرین پکڑنی تھی۔

ٹرین اس کے مطلوبہ اسٹیشن پر پہنچی تو لڑکی برقی سیڑھیوں سے چڑھتی ہوئی زیر زمین اسٹیشن سے نکل کر ایک بار پھر کھلی فضا میں آگئی۔

اب کی بار وہ پہلے کی نسبت تیز قدموں سے ایک سمت میں چلنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ایسے رہائشی علاقے میں داخل ہوگئی جہاں بہت سارے ایک جیسے گھر قطار میں بنے ہوئے تھے۔

ایک گلی میں الٹے ہاتھ کے تیسرے نمبر والے گھر کے سامنے ٹھہر کر اس نے بیگ سے چابی نکال کر دروازے میں لگائی اور گھر کے اندر داخل ہوگئی۔

گھر کے اندر کچن کی سمت سے کھٹر پٹر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"کون؟" دروازہ کھلنے کی آواز سن کر کسی نے کچن میں سے ہی صدا لگائی۔

"میں ہوں۔۔۔ جویریہ" لڑکی نے اپنا کوٹ دروازے کے ساتھ لگے کوٹ ریک پر ٹانگتے ہوئے جواب دیا۔

"سر! آپ روز یہ سوال کیوں پوچھتے ہیں جبکہ آپ کو پتا ہے کہ میرے علاوہ اور کسی کے پاس گھر کی چابی نہیں ہے اور میرے علاوہ کوئی دروازہ کھول کر اندر نہیں آسکتا؟" جویریہ نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے پروفیسر صاحب سے کہا۔

"عادت پڑ گئی ہے۔ اب اس عمر میں پرانی عادتیں آسانی سے جان نہیں چھوڑتیں۔" پروفیسر صاحب اس کی طرف پلٹتے ہوئے مسکرا کر بولے۔

وہ کچن سلیب کے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے بنائے سینڈوچز کے کنارے چھری سے کاٹ رہے تھے۔ سلیب کے نیچے فٹ ہوئی کپڑے دھونے کی مشین کے گول شیشے میں سے جھاگ بھرے پانی میں ڈوبے کپڑے گول گول چکر کھاتے نظر آرہے تھے۔

جویریہ کچن کے وسط میں رکھی ٹیبل کے گرد پڑی کرسیوں میں سے ایک گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئی۔

یہ ایک مناسب سائز کا کچن تھا۔ انگلینڈ کے متوسط طبقے کے ہر دوسرے گھر میں پائے جانے والے کچن جیسا' سادہ مگر ضرورت کی ہر چیز سے لیس۔

کچن کے وسط میں رکھی جس ٹیبل کے پاس جویریہ بیٹھی تھی اس پر رکھی جیم جیلی کی بوتلیں اور دو تین قسم کے پڑے ہوئے سیریلز کے ڈبے یہ بتاتے تھے کہ صبح کا ناشتا عموماً" یہیں بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔

اپنے سر پر پہنی اونی ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے

جویریہ کی نظر سیریل کے پیکٹ کے پیچھے سے جھانکتی سگریٹ کی ڈبیہ پر چلی گئی۔

پروفیسر صاحب بھی سینڈوچز سے بھری پلیٹ لے کر جویریہ کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔

”آج کتنے سگریٹ پیے آپ نے؟“ جویریہ نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا۔

”ایک بھی نہیں۔“ پروفیسر صاحب جلدی سے بولے پھر جویریہ کے ابرو چڑھا کر دیکھنے پر کھسیا کر کہنے لگے۔

”اچھا بابا! ایک پیا تھا۔ اب دن میں ایک سگریٹ کی اجازت تو تم نے بھی دے رکھی ہے۔“

”آپ ایک بار ہمت کر کے مکمل طور پر چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ جویریہ نے کہا۔

”کہا نا۔ اس عمر میں پرانی عادتیں اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتیں۔ خاص طور پر اگر وہ بری عادتیں ہوں۔“ وہ مسکرائے۔ ”اچھا چھوڑو یہ بحث۔ یہ بتاؤ لنچ کیا تھا تم نے؟“

”آج مصروفیت زیادہ تھی۔ وقت ہی نہیں ملا۔“ جویریہ نے جواب دیا۔

”اچھا چلو یہ کھاؤ۔ تمہاری پسند کے سینڈوچ بنائے ہیں۔“ پروفیسر صاحب نے پلیٹ جویریہ کے آگے کھسکائی۔

وہ جویریہ کے آنے سے پہلے کچھ نہ کچھ بنا کر رکھتے تھے۔ بہانہ یہ ہوتا تھا کہ انہیں اس وقت بھوک محسوس ہوتی ہے حالانکہ وہ خود یہ سب بس چکھنے کے برابر ہی کھاتے تھے۔

”آپ پلیز روز ایسا مت کیا کریں۔“ جویریہ ان کے خلوص کے آگے شرمندہ ہو جاتی۔

”تم بھی پلیز روز دوپہر کا کھانا مت چھوڑا کرو۔“ پروفیسر صاحب نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا پھر تحکم بھرے انداز میں کہنے لگے۔

”اچھا اب باتیں کرنا بند کرو اور کھاؤ یہ۔“

جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر پلیٹ میں رکھا ایک تکون اٹھایا اور ہولے ہولے کترنے لگی۔

سینڈوچ واقعی مزیدار تھے۔ جویریہ کو پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے پہلا کب ختم کر کے دوسرا بھی اٹھا لیا۔

”کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ اپنے دوسرے سینڈوچ کے اختتام پر جویریہ نے نوٹ کیا کہ پروفیسر صاحب نے خود ایک بھی سینڈوچ نہیں لیا تھا۔

”ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بس ذرا تھکاوٹ سی ہو گئی ہے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولے تو جویریہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

ستر کی دہائی کے اختتام پر ہونے کے باوجود پروفیسر صاحب ابھی تک انتہائی چاق و چوبند تھے۔ لیکن بہرحال ان کی عمر ایسی نہیں تھی جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔

”آپ کو آرام کرنا چاہیے۔“ جویریہ نے احتیاط کے ساتھ کہا۔ پروفیسر صاحب اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

”آرام کر کے ہی تھک گیا ہوں۔ اب تھوڑی بھاگ دوڑ کرنا چاہتا ہوں۔“

”لگتا ہے ہانز کی کوئی نئی ای میل آئی ہے۔“ جویریہ سمجھ گئی۔ ”اس نے پھر اپنا کوئی نیا کارنامہ سنا کر آپ کو انسپائر کر دیا ہوگا۔“

ہانز اب نائجیریا میں تھا اور اپنے روایتی جوش و خروش کے ساتھ معاشرے سے برائی کے خاتمے کی کوششوں میں مگن تھا۔ اپنی ان کاوشوں کے نتائج وہ اکثر بذریعہ ای میل یا فون پروفیسر صاحب کو بھی بتاتا رہتا تھا۔

”ہانز کی میلز تو آتی ہی رہتی ہیں۔ ہانز سے میرا بھلا کیا مقابلہ۔ وہ بلا تھکان کام کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ہمت، حوصلہ اور طاقت ہے اور میں۔“ پروفیسر صاحب نے گہرا سانس لیا۔ ”میری زندگی میں آئے وقفے میری عمر کا تقاضا ہیں۔ ہر تھوڑے عرصے کے بعد اگر رک کر سانس نہیں لوں گا تو اگلا قدم نہیں اٹھا پاؤں گا۔ انسان کو اپنی حدود کا پتا ہونا چاہیے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“ جویریہ نے کھوجتی نگاہوں سے

انہیں دیکھا۔ پروفیسر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

”تمہیں وہ لاہور والا وومن سینٹر یاد ہے جہاں تم نے یہاں آنے سے قبل کچھ وقت گزارا تھا؟“

پروفیسر صاحب کی بات سن کر جویریہ کے جسم میں غیر ارادی طور پر ایک دم تناؤ آیا، پر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

”جب میں وہاں کام کیا کرتا تھا تو میں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ اس جگہ کو محض ایک پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے یہاں کچھ ایسے ہنر سکھانے کا بھی بندوبست کیا جائے جو غریب عورتوں کی زندگیوں میں بہتری لا سکیں۔ اب چاہے وہ بہتری ان عورتوں کے واپس اپنے خاندانوں میں لوٹ جانے کے بعد اضافی آمدنی کی صورت میں ہو یا پھر ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے میں معاون ہو۔ سینٹر کی سرپرست مسز ملک بھی اس معاملے میں میری ہم خیال تھیں لیکن اس وقت ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ اس تجویز پر عمل کیا جا سکے۔“ پروفیسر صاحب نے جویریہ کو بتایا۔

”اور اب وسائل موجود ہیں؟“ جویریہ کچھ کچھ سمجھنے لگی۔

”ہاں! کچھ کا بندوبست ہو چکا ہے۔ مزید کی بھی امید ہے۔ سینٹر کو بھی توسیع دی گئی ہے۔ اب وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں وہاں واپس آ کر اس کام کو اپنی نگرانی میں پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔“ پروفیسر نے کہا۔

”پھر آپ کو ضرور جانا چاہیے۔“ جویریہ نے خلوص کے ساتھ کہا۔

”تم چلو گی میرے ساتھ؟“ انہوں نے خالی پلیٹیں اکٹھی کرتی جویریہ سے اچانک پوچھا۔

”میں؟“ جویریہ نے حیرت سے پروفیسر صاحب کو دیکھا۔ ”میں وہاں کیا کروں گی؟“

”تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔ آخر تمہیں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا تجربہ ہے۔“ پروفیسر صاحب بولے۔

”نہیں! میں اب واپس نہیں جاؤں گی۔“ پلیٹیں ہاتھ میں لیے ہوئے سر جھکا کر کھڑی جویریہ نے آہستہ سے انکار کیا۔

”جیسے تمہاری مرضی۔“ پروفیسر صاحب نے اصرار نہیں کیا۔ جویریہ نے استعمال شدہ پلیٹیں سنک کے اندر رکھیں۔

”ہاں یاد آیا، تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی جاثم کا فون آیا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ تم گھر پہنچی ہو یا نہیں تمہارے سیل فون پر بھی کال کرتا رہا مگر تم نے اٹھایا ہی نہیں۔“ پروفیسر صاحب نے جویریہ کو اس کے ایک کولیگ کے فون کے بارے میں بتایا۔

”میرے فون کی بیٹری ختم ہو چکی ہے اس لیے اس کا فون میرے نمبر پر نہیں مل رہا ہوگا۔ کوئی بات نہیں۔ ابھی اسے کال کر کے تسلی دے دیتی ہوں کہ میں بخیر و عافیت گھر پہنچ چکی ہوں۔ انتہائی وہمی انسان ہے یہ جاثم بھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر فکر مند ہو جاتا ہے۔“

جویریہ نے چھوٹی پلیٹوں پر صابن لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ہر کسی کے لیے فکر مند نہیں ہوتا ہے وہ۔“ پروفیسر صاحب بولے۔ جویریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پروفیسر صاحب کی طرف پشت کیے برتن دھوتی رہی۔

”جاثم اچھا لڑکا ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر صاحب نے بظاہر عام سے لہجے میں جویریہ سے کہا۔

”ہاں بہت اچھا ہے وہ۔ ہمارے پورے پراجیکٹ کو اسی نے سنبھال رکھا ہے۔“

جویریہ نے پروفیسر صاحب کی طرف مڑتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا۔ جویریہ جان بوجھ کر ان کی بات کا دوسرا مطلب نکال رہی تھی۔ پچھلے سات سالوں کے دوران وہ جویریہ کی عادات سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ پروفیسر صاحب مزید کچھ کہتے، کپڑے دھونے کی مشین نے زور سے گھنٹی بجا کر کپڑے دھل جانے کا اعلان کیا۔

"آپ رہنے دیجیے۔ میں باہر ڈال آتی ہوں۔"

جویریہ نے پروفیسر صاحب کو اٹھنے سے منع کرتے ہوئے مشین کی گول شیشے کی کھڑکی کھول کر دھلے کپڑوں کا ڈھیر پلاسٹک کی ٹوکری میں نکالا اور جلدی سے نئے موضوع گفتگو کو چھوڑ کر باہر نکل آئی جہاں گھر کے پچھواڑے میں چھوٹی سی جگہ تھی۔

باہر دھوپ چھاؤں کی آنکھ مچولی جاری تھی۔ کونے میں ایک قدیم درخت اگا تھا جس میں موسم کے ساتھ کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے۔ لگا کرتے تھے۔ اس درخت کی مہین ٹہنیاں چلنے والی ہوا کے ساتھ ہلکے ہلکے لہرا رہی تھیں۔ درخت سے کچھ فاصلے پر ہی کپڑے لٹکانے والے تار بندھے ہوئے تھے جویریہ نے ٹوکری میں سے ایک شرٹ نکال کر جھاڑ کر تار پر ڈالی۔

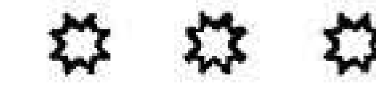
سات سال گزر جانے کے باوجود وہ ماضی کی ایک بھی یاد کو ذہن سے مٹانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی اور پروفیسر صاحب اس سے پوچھ رہے تھے کہ اسے وومین سینٹر میں گزارا وقت یاد ہے؟

بظاہر یہ جویریہ اُس جویریہ سے بہت مختلف تھی جسے پروفیسر صاحب بکھری ہوئی' ٹوٹی ہوئی حالت میں سات سال پہلے یہاں لے کر آئے تھے۔ تب کسے پتا تھا کہ لمز کے پروگرام کے تحت ایڈمیشن حاصل کرنے والی ڈری سہمی اعتماد سے عاری کی قسمت میں ایک دن انگلستان کی ایک اچھی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونا لکھا ہے۔

کہاں بزنس اسٹڈیز اور کہاں سوشل ورک کی ڈگری۔ انسان کہاں سے سفر شروع کرتا ہے' کہاں جانے کا سوچتا ہے اور کہاں جا پہنچتا ہے۔ یہ اسے وقت سے پہلے خود بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اس ڈری سہمی جویریہ سے اس پُر اعتماد جویریہ تک کا سفر کتنا کٹھن تھا' یہ صرف جویریہ ہی جانتی تھی۔

لیکن یہ سارا فرق صرف ظاہری حد تک تھا۔ پروفیسر صاحب کو معلوم تھا کہ اندر سے جویریہ اب بھی اتنی ہی معصوم' حساس اور بھولی بھالی ہے جتنی پہلے ہوا کرتی تھی اور انہیں سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اپنے کام میں مگن کھاتی پیتی' ہنستی بولتی بظاہر ہر طرح سے ایک نارمل زندگی گزارتی جویریہ نے اپنے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر لیے تھے اور اب انہیں کسی کے لیے بھی دوبارہ کھولنے پر تیار نہیں تھی۔

جویریہ سے کہیں بہتر تو اس کی پشت پر اگا ٹنڈ منڈ شاخوں والا درخت ہی تھا جو اپنے پرانے کمزور پتے جھاڑ کر آنے والے خوشگوار دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔



جویریہ جب ساڑھے سات بجے صبا کے گھر پہنچی تو گھر میں کسی قسم کی دعوت کے کوئی آثار نظر آرہے تھے حالانکہ صبا نے اصرار کرکے جویریہ کو ویک اینڈ پر اپنے گھر کھانے پر بلایا تھا۔

"آج ڈنر ہے بھی یا تم نے مجھے بلانے کے لیے بہانہ گھڑا تھا؟" جویریہ کو صبا کا اوٹ پٹانگ سا حلیہ دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔

"ہاں' ہاں ہے کیوں نہیں۔" صبا سیڑھیوں پر سے چھلانگ مار کر اترتے ہوئے بولی۔ "تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔ تب تک جاثم بھی پہنچ جائے گا۔"

"جاثم بھی آرہا ہے؟" اوور کوٹ کے بٹن کھولتی جویریہ کے ہاتھ رک گئے۔ "اور کس کس کو بلایا ہے تم نے؟"

"کسی کو بھی نہیں۔ بس تم اور جاثم ہی ہو۔ تم اندر چل کر بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔ کھانا باہر جا کر کھائیں گے۔" صبا یہ کہتے ہوئے دھپ دھپ کرکے سیڑھیاں چڑھتی اوپر بھاگ گئی۔ جاثم کے گھر سے یہاں تک کا راستہ کم سے کم بھی ڈیڑھ گھنٹے کا ضرور تھا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ جویریہ کو نہیں معلوم تھا کہ جاثم کی صبا سے اتنی دوستی ہے کہ وہ صرف ایک ڈنر کے لیے یہاں تک کی لمبی ڈرائیو کرکے اپنا ویک اینڈ خراب کرنے کو تیار ہو جائے گا۔

بہرحال اگر صبا نے بلایا تھا اور جاثم آرہا تھا تو جویریہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتی تھی۔

جویریہ اندر سٹنگ روم میں آکر صبا کی امی کے پاس بیٹھ گئی اور ان کے ساتھ ٹی وی پر چلنے والا گیم شو دیکھنے لگی۔

صبا کے والدین کا تعلق میرپور سے تھا اور وہ کئی سال پہلے بہتر مستقبل کی تلاش میں انگلستان آئے تھے۔ صبا اس نسل سے تعلق رکھتی تھی' جسے "برٹش بورن" کہا جاتا تھا جو اپنے پاکستان' انڈیا یا بنگلہ دیش میں پیدا ہونے والے ماں باپ کے برعکس یہیں انگلستان میں پیدا ہو کر پرورش پاتی تھی۔ جن کے والدین نے ساری عمر چھوٹے موٹے کام کرکے انہیں اچھی تعلیم دلوا کر اس قابل بنا دیا ہوتا تھا کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ گوروں کے اس دیس میں ان کے شانہ بشانہ چل سکیں اور بہترین ملازمتوں کے لیے ان کے ساتھ برابری کی سطح پر مقابلہ کر سکیں۔

صبا شوخ اور زندہ دل لڑکی تھی جبکہ جویریہ نسبتاً خاموش اور سنجیدہ مزاج رکھتی تھی۔ دونوں کے مزاج میں اتنا فرق ہونے کے باوجود دونوں کی دوستی اب تک قائم تھی اور اسے قائم رکھنے میں جویریہ سے زیادہ صبا کا ہی ہاتھ تھا۔ جویریہ کی نظریں ٹی وی اسکرین سے بھٹک کر سٹنگ روم سے ملحق ڈائننگ روم کی طرف چلی گئیں' جہاں صبا کا بھائی عبیداللہ لکڑی کی میز پر کتابیں پھیلائے اپنا ہوم ورک کر رہا تھا۔

عبیداللہ صبا کا سگا بھائی نہیں تھا۔ وہ ایک افغان لڑکا تھا جس کا تعلق قندھار کے علاقے سے تھا اور جس کے خاندان سمیت پورے گاؤں کو جنگ کی تباہ کاریوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا تھا۔ صرف پندرہ سالہ عبیداللہ ہی کسی طرح اپنی جان پر کھیلتا ہوا انگلستان پہنچ گیا۔ گو کہ عبیداللہ اس ملک میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے لاتعداد افراد میں سے ایک تھا مگر اسے ایک چیز میں دوسروں پر فوقیت حاصل تھی اور وہ یہ کہ وہ فقط پندرہ سال کا تھا اور ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتا تھا جسے بین الاقوامی سطح پر غیر محفوظ قرار دیا جا چکا تھا۔ اکثر معاملات میں ظالمانہ حد تک بے حسی کی چادر اوڑھ لینے والی یہاں کی حکومت کے چند اصول ایسے بھی تھے جو قابل تحسین تھے اور ان میں سے ایک اصول یہ تھا کہ کسی لاوارث بچے کو' چاہے وہ غیر قانونی طور پر ہی ملک میں کیوں نہ داخل ہوا ہو' کسی ایسے علاقے میں واپس نہیں بھیجا جائے گا' جہاں اس کی جان کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہ دی جا سکے۔ چنانچہ سن بلوغت کو پہنچ جانے تک عبیداللہ کو نہ صرف یہاں رہنے کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے جڑے دیگر اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری بھی حکومت برطانیہ نے اپنے سر لے لی۔

صبا کے والدین عبیداللہ کے رضاعی والدین تھے۔ عبیداللہ پچھلے دو سال سے ان لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا اور اب تک ان کے خاندان کا اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔ وہ ایک خاموش طبع' اپنے کام سے کام رکھنے والا ذہین لڑکا تھا جو پسماندہ علاقے سے آنے کے باوجود بہت تیزی کے ساتھ خود کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر رہا تھا۔ اگلے سال عبیداللہ کی اٹھارویں سالگرہ آنے والی تھی۔ قانونی طور پر بالغ ہو جانے کے بعد حکومت اسے یہاں رہنے کی اجازت دے گی یا پھر اسے اس کے ملک واپس بھیج دیا جائے گا' یہ بات فی الحال صبا کے گھر والے بھی نہیں جانتے تھے۔

ٹی وی پر چلنے والا گیم شو اپنے آخری مراحل میں تھا تب صبا تیار ہو کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

"یقیناً" جاثم ہوگا۔" صبا نے گردن کے گرد مفلر لپیٹتے ہوئے اندازہ لگایا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دروازے پر جاثم پھولوں کا بوکے اور چاکلیٹ کا ڈبہ ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہیلو! کیسی ہو؟" اس نے اندر آتے ہوئے جویریہ اور صبا دونوں کو بیک وقت مخاطب کیا۔

جاثم درمیانے قد کا خوش شکل عراقی نوجوان تھا جو صبا اور جویریہ کے ہی دفتر میں ہوتا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ صبا اور جویریہ جاثم کی ماتحتی میں کام کرتی

تھیں لیکن یہ جاثم کے خوش اخلاق اور دوستانہ رویے کا کمال تھا جس نے اس کے ساتھی ورکرز کے ساتھ اس کے تعلقات نہایت خوشگوار رکھے ہوئے تھے۔

جویریہ کا خیال تھا کہ جاثم پھول اور چاکلیٹ صبا کے لیے ڈنر پر بلانے کے شکریے کے طور پر لایا ہے مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جاثم نے دونوں چیزیں صبا کو پکڑانے کے بجائے جویریہ کی طرف بڑھائیں۔

"ہیپی برتھ ڈے جویریہ!" جویریہ نے سٹپٹا کر ساتھ کھڑی صبا کی طرف دیکھا، جس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"سرپرائز۔" صبا چہکی۔

"یہ سب کیا ہے؟" جویریہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہ تمہاری برتھ ڈے پارٹی ہے۔ اصولاً" تو یہ دعوت تمہیں ہم لوگوں کو دینی چاہیے تھی لیکن تم نے نہیں دی اس لیے ہم دے رہے ہیں۔" صبا نے کہا۔

جویریہ نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی تھی۔ جب چھوٹی تھی تب بھی نہیں۔ ان کے گھر میں سالگرہ وغیرہ منانے کا رواج ہی نہیں تھا۔ پر اب پروفیسر صاحب، صبا اور جاثم جیسے مخلص ساتھی اسے یہ دن بھولنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کسی نہ کسی اشارے سے یہ باور کرا دیتے کہ سال کے تین سو پینسٹھ عام سے گزرنے والے دنوں میں یہ ایک دن کم از کم جویریہ کے لیے بہت خاص ہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کہوں۔" جویریہ نے کہا۔

"اچھے بچوں کی طرح شکریہ کہو اور چلو ہمارے ساتھ۔ ہم گرین اسٹریٹ جا کر کھانا کھائیں گے۔"

صبا نے گھر کے پاس ایک جگہ کا نام لیا جو پاکستانی کھانوں کے لیے مشہور تھی۔ باہر ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف کے ننھے ننھے سفید گولے ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے گر رہے تھے۔

گرین اسٹریٹ صبا کے گھر کے پاس ہی تھی۔ جاثم کی گاڑی میں سوار ہو کر ان لوگوں کو وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

"چلو جاثم! آج جویریہ کی سالگرہ کے بہانے تم بھی ہمارے ملک کے ذائقوں سے آشنا ہو جاؤ گے۔ اس جگہ پر کم و بیش ہر قسم کا پاکستانی کھانا مل جاتا ہے۔" صبا نے جاثم کو بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں پہلے بھی یہاں کھانا کھانے آچکا ہوں۔"

"ریئلی؟" صبا نے حیرت سے کہا۔ "مجھے نہیں پتا تھا کہ تمہیں پاکستانی چیزیں پسند ہیں۔"

"پاکستانی چیزوں میں ناپسند کرنے والی کون سی بات ہے۔" جاثم نے سنجیدگی سے کہا تو جویریہ پورے انہماک کے ساتھ گاڑی کی کھڑکی سے باہر تیزی کے ساتھ گزرنے والے سائن بورڈ پڑھنے لگی۔ پتا نہیں اسے ہر بات کیوں ذو معنی لگنے لگی۔ کھانا اچھے خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ جویریہ نے بل دینے کی کوشش کی مگر جاثم اور صبا دونوں نے انکار کر دیا۔

"یہ دعوت ہم دونوں نے دی ہے اس لیے بل بھی ہم ہی دیں گے۔ تم کسی اور دن ہم دونوں کی دعوت کر کے حساب برابر کر لینا۔" صبا نے کہا۔

ان لوگوں کے کھانا کھانے کے دوران برف باری میں کافی تیزی آچکی تھی۔

جویریہ کا خیال تھا کہ صبا کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد جاثم اسے اسٹیشن تک لفٹ دے گا مگر وہ گاڑی اس سے بھی آگے نکال کر لے گیا۔ "یہ کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہیں گھر چھوڑنے۔" جاثم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"وہیں اسٹیشن پر اتار دیتے۔ میں خود چلی جاتی۔" جویریہ نے گاڑی کی سیٹ پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ تمہارا گھر میرے راستے میں ہی پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"ایسا بھی کوئی راستے میں نہیں ہے۔ اچھا خاصا آؤٹ آف وے جانا پڑے گا تمہیں۔" جویریہ ناراضی سے بولی۔ جویریہ کی رہائش گرین وچ میں تھی۔ لندن

کے مشہور زمانہ میری ٹائم میوزیم کے پاس جہاں بنی ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر زمین میں سے زیرو میریڈین نامی ایک سیدھی لکیر گزاری گئی ہوئی تھی۔ پوری دنیا کو جغرافیائی لحاظ سے خط استوا پر بانٹنے والی تین سو ساٹھ فرضی لکیروں میں یہ پہلی لکیر تھی اور وہیں پر نصب ایک گھڑی کے وقت کو GMT یعنی گرین وچ مین ٹائم کہا جاتا تھا جس سے ساری دنیا اپنے اپنے وقت کا حساب لگاتی تھی۔

"مجھے آؤٹ آف وے نہیں پڑے گا۔ اور اگر راستہ لمبا ہو گا بھی تو میرا ہو گا، تمہیں اس سے کیا۔ تم تو گھر پہنچ جاؤ گی۔" جاثم جویریہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ وہ چپ ہو گئی۔

جاثم سے بحث کرنا لاحاصل تھا۔ جویریہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں برف باری کی وجہ سے ٹریفک آہستہ چل رہی تھی مگر سڑک پر گرنے والی برف کی تہہ ابھی اتنی نہیں ہوئی تھی کہ آمد و رفت بند ہو جاتی جیسا کہ عموماً" شدید برف باری کے دوران ہو جایا کرتی تھی۔ زیر زمین راستوں پر برف باری عموماً" اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ جویریہ تو کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ ہی جاتی مگر جاثم کا واپسی کا راستہ خاصا لمبا تھا اور برف باری تیز ہونے کی صورت میں اس کے راستے میں پھنس جانے کے امکانات کافی زیادہ تھے۔ جویریہ نے آسمان سے گرتے سفید گولوں کی طرف فکر مندی سے دیکھا۔

"تم کل شام کو فارغ ہو؟" سڑک پر چلنے والی گاڑیوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرتے ہوئے جاثم نے جویریہ سے اچانک پوچھا۔

"کیوں کیا کوئی اور سرپرائز ہے؟"

"ہے تو۔ پر تمہارے لیے نہیں۔" جاثم ونڈ اسکرین پر سے نظر ہٹا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "دراصل مجھے تمہیں کل اپنے گھر لے کر جانا ہے۔"

جاثم کی بات پر جویریہ ایک دم سے محتاط ہو گئی مگر وہ اپنی دھن میں بولے گیا۔

"کل میرے پیرنٹس کی شادی کی چالیسویں سالگرہ ہے۔ ایڈن برگ سے میرا بڑا بھائی اور سالسبری سے بہن بھی پہنچ رہی ہے۔ ان دونوں نے پہلے فرضی مصروفیات کا بہانہ بنا کر آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس لیے میرے پیرنٹس کو ان کے آنے کے بارے میں نہیں پتا۔ ہم سب بہن بھائیوں نے مل کر انہیں یہ سرپرائز دینے کا پلان بنایا ہے۔"

جاثم جویریہ کو بتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کا سا اشتیاق تھا اور مسکراہٹ میں شوخی تھی۔ اس لمحے جویریہ کو وہ چھوٹا سا بچہ لگا جو اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر پلان کی ہوئی اپنی شرارت کے بارے میں سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" جویریہ بھی مسکرانے لگی۔ "اور کون کون ہو گا تمہارے پیرنٹس کی اینی ورسری پر؟"

"باہر سے تو کوئی نہیں۔ بس اپنے گھر والے ہی ہوں گے۔" جاثم نے بتایا تو جویریہ سوچ میں پڑ گئی۔

"پھر شاید میرا آنا مناسب نہیں ہو گا۔" جویریہ نے جھجکتے ہوئے عذر پیش کیا۔

"کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میرے گھر والے تمہیں اپنے خاندان کا حصہ ہی سمجھتے ہیں۔" جاثم نے برہمی سے کہا۔

جاثم کے گھر والے اسے اپنے خاندان کا حصہ کیوں سمجھنے لگے تھے، یہ جویریہ کو معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ وہاں جانے سے کترا رہی تھی۔

"نہیں جاثم! میں نہیں آپاؤں گی۔" جویریہ نے انکار کیا۔

"جویریہ! ماما نے مجھے خاص طور پر تمہیں لے کر آنے کو کہا ہے۔ تم نہیں آؤ گی تو انہیں بہت مایوسی ہو گی۔" جاثم نرمی سے بولا۔

جویریہ کو جاثم کی امی اچھی لگتی تھیں لیکن ان کی آنکھوں میں جویریہ کو دیکھ کر امید کے جو رنگ ابھرا کرتے تھے وہ جویریہ کو متردد کر دیتے تھے۔ وہ ان کے گھر جا کر ان کی ایسی توقعات کو بڑھاوا نہیں دینا چاہتی تھی جن پر وہ پوری نہ اتر سکتی ہو۔ مگر دوسری طرف وہ

اس نرم خو اور محبت کرنے والی عورت کی خواہش کو رد کر کے اس کا دل توڑنے پر بھی خود کو راضی نہیں کر پا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں جاؤں گی۔" جویریہ نے بے چارگی سے کہا۔ "مگر مجھے اتنی دور سے لینے کے لیے مت آنا۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"اچھا بابا! جیسے تمہاری مرضی۔" وہ جویریہ کے گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے گہرا سانس لے کر بولا۔

"کل شام سات بجے۔ دیر مت کرنا۔" اس نے جانے سے پہلے جویریہ کو پھر یاد دہانی کرائی اور پھر اپنی گاڑی سمیت برف کی گرتی چادر میں گم ہو گیا۔

جاثم کا خاندان عراق پر نوے کی دہائی میں امریکی فوج کے ابتدائی حملوں کے دوران نقل مکانی کر کے یہاں آیا تھا۔ جویریہ ایک دو بار پہلے بھی جاثم کے گھر والوں سے مل چکی تھی۔ وہ سلجھے ہوئے مہذب لوگ تھے۔ جاثم کے والد پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے۔ بغداد میں ان کا نام تھا، ساکھ تھی جو جنگ کے دوران ان کے آبائی گھر کی طرح ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ ساتھ ہی ان کے بچوں کا وہ تابناک اور روشن مستقبل جسے محفوظ بنانے کے لیے انہوں نے عمر بھر محنت کی تھی اسی ملبے سے اٹھنے والی گرد و غبار میں کہیں گم ہوتا نظر آیا۔ تب حالات سے مایوس ہو کر وہ اپنے خاندان سمیت یہاں آ گئے اور ایک نئے ملک میں اپنی اور اپنے بچوں کی نئی زندگی کی شروعات کی۔

جاثم کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے طب کا ہی پیشہ اپنایا۔ ان میں سے ایک بھائی لندن میں اور ایک بھائی ایڈن برگ کے ایک بڑے اسپتال میں سرجری کے شعبے سے منسلک تھا۔ جاثم کی بڑی بہن بھی ایک آرتھوپیڈک سرجن سے بیاہی ہوئی تھی اور سالسبری کے گرد و نواح میں رہائش پذیر تھی۔

ڈاکٹروں سے بھرے اس خاندان میں اکیلا — جاثم ہی تھا جو سوشل ورک کی طرف آنکلا تھا۔ اب تک اس کی زندگی صرف اپنے کام کے گرد ہی گھومتی رہی تھی۔ گھر والوں کے احساس دلانے کے باوجود اسے اپنے شب و روز میں کسی قسم کی تبدیلی لانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کی جویریہ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

جویریہ سے مل کر جاثم کو پہلی بار احساس ہوا کہ اگر اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں کسی کا ساتھ مل جائے تو کچھ ایسا برا بھی نہیں۔ زندگی مصروف سہی لیکن اس مصروفیت میں اگر تھوڑی سی خوشبو، تھوڑے سے رنگ بھی شامل ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

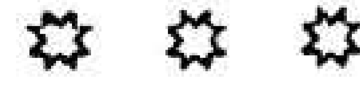
وہ جوان تھا، خوش شکل تھا، خود کفیل اور خود مختار بھی تھا۔ ایسے نوجوان مغرب میں اب ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں رشتہ جوڑنے پر سب راضی تھے مگر رشتوں کو قانونی شکل دینے کا حوصلہ کسی کسی میں ہی رہ گیا تھا۔

جویریہ جاثم کے ساتھ پچھلے دو سال سے کام کر رہی تھی اور ان دو سالوں کے دوران وہ جان چکی تھی کہ جاثم ایک شائستہ اور نفیس انسان ہے۔ جویریہ اسے ایک کولیگ کی حیثیت سے پسند بھی کرتی تھی اور اس کے کام کرنے کے طریقے کار سے متاثر بھی تھی۔ مگر یہ پسندیدگی صرف کام کی حد تک تھی۔ اس سے زیادہ نہیں۔ جاثم کی دلچسپی صرف جویریہ کے کام تک محدود نہیں تھی، یہ بات سب ہی سمجھ چکے تھے۔ یہاں تک کہ جویریہ خود بھی۔

جاثم ویک اینڈ پر ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کر کے صبا کے لیے نہیں، جویریہ کی خاطر آیا تھا۔ وہ اس کے لیے اس سے زیادہ بھی کر سکتا تھا، یہ بات جویریہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے جویریہ جاثم کے ساتھ کام کے علاوہ زیادہ وقت گزارنے سے گھبراتی تھی۔

مسئلہ جاثم کے ساتھ نہیں تھا۔ مسئلہ جویریہ کے ساتھ تھا، جو جاثم کی طرف سے ملنے والے واضح اشاروں کے باوجود اب تک اسے کوئی مثبت جواب نہیں دے پائی تھی۔

جویریہ کا دل ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہو چکا تھا اور یہ بات وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں جاثم کو جتا بھی چکی تھی۔ جاثم کوئی ٹین ایجر نہیں تھا جو قسمیں کھا کر یا رات بھر عشقیہ ایس ایم ایس کر کے جویریہ کو اپنی محبت کا یقین دلاتا۔ بتیس سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ سمجھ چکا تھا کہ ایسے فیصلے زور یا دباؤ ڈال کر نہیں کرائے جا سکتے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نوخیز محبت کے زخموں کو بھرنے میں سب سے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ اسے امید تھی کہ جویریہ ایک نہ ایک دن ماضی کے تکلیف دہ شکنجے سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو جائے گی اور تب وہ اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو گا۔



جویریہ کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس کا ذہن ابھی تک جاثم کے گھر میں ہونے والی دعوت میں الجھا ہوا تھا۔

اس کی توقع کے خلاف جاثم کے گھر اس کا اچھا وقت گزرا تھا۔ جاثم کی امی نے جن کے چہرے پر جھریوں کے ساتھ شفقت اور اپنائیت کی بھی جھلک تھی، اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔

کھانے کے بعد انہوں نے جویریہ کو پرانی البم میں سے جاثم اور اپنے دوسرے بچوں کی تصاویر دکھائیں۔ جاثم کی ماما اور اس کے خوش مزاج و زندہ دل ڈیڈ کے درمیان صوفے پر بیٹھ کر ان پرانی یادگاروں کو دیکھتے ہوئے اسے بالکل بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ ان کے گھرانے کا حصہ نہیں ہے۔

چند پرانی تصویریں تھیں جنہیں جویریہ بیٹھ کر دیکھ رہی تھی اور ایک تازہ تصویر تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے بن رہی تھی۔ جاثم کے ماں باپ، بہن بھائی اور ان کے چاروں طرف دوڑتے بھاگتے، کھیلتے کودتے بچے۔ ایک مکمل اور خوش باش خاندان کی تصویر۔

ایسے ہی کسی خاندان کا حصہ بننے کی جویریہ نے ہمیشہ خواہش کی تھی۔ ایسی ہی محبتوں اور چاہتوں کا حصہ دار بننے کی خواہش جو آج تک کبھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔

کبھی کبھی تو جویریہ کو عبداللہ جیسے حرماں نصیب پر بھی رشک آتا جس سے قدرت نے اس کا سب کچھ چھین لینے کے بعد اسے پھر سے ایک محبت کرنے والا خاندان عطا کر دیا تھا۔

جاثم کے گھرانے کی پرانی تصویروں میں جویریہ شامل نہیں تھی۔ مگر اب تخلیق ہونے والی تصویر کا حصہ وہ بن سکتی تھی۔

یہ اپنائیت اور لگاوٹ سے بھرا خاندان اسے اپنی آغوش میں سمیٹنے کو تیار تھا۔ پھر کیوں وہ اب تک ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ اتنا تو اس کا بھی حق بنتا تھا کہ وہ تھوڑی سی خوشیاں اپنی جھولی میں ڈال لے۔ تھوڑی سی چاہتوں پر اپنا بھی حق جما سکے۔

جویریہ کتنی دیر خالی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔ آخر اس نے جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے سائیڈ پر رکھا فون اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

"آپ کے پراجیکٹ میں میرے لیے ابھی بھی گنجائش ہے؟" جویریہ نے آہستہ آواز میں استفسار کیا۔

"گنجائش کا کیا مطلب؟ تمہاری جگہ کوئی اور لے سکتا ہے کیا؟" دوسری طرف سے پروفیسر صاحب بولے۔

"ٹھیک ہے سر! تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" جویریہ نے کہا۔ "میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہو؟" پروفیسر صاحب ایک دم بولے تو جویریہ بھونچکی رہ گئی۔

"یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ جہاں مخالف کا زور بڑھا یا حالات ناموافق ہوئے وہاں سے فرار اختیار کر لی۔ پر مجھے کیا۔ میرا تو فائدہ ہی ہو رہا ہے نا۔" نہیں نجانے کیوں ہنسی آ گئی تھی۔

"بے چارہ جاثم، ہاہاہا۔۔۔" وہ پھر ہنستے ہی چلے گئے۔

جوریہ نے بھنا کر فون بند کردیا۔

☆ ☆ ☆

”یہ چکن ٹرائی کر کے دیکھو۔ یہاں کی کڑاہی کافی مشہور ہے۔“ حذیفہ نے ایک ڈش محب کے آگے سرکاتے ہوئے اس سے کہا۔

”اس کی باری جب آئے گی تو اس کو بھی ٹرائی کرلوں گا۔ تم نے اتنا کچھ منگوالیا ہے کہ چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر جائے گا۔“ محب نے جواب دیا۔ ماضی کے دبلے پتلے محب اور آج کے محب میں خاصا فرق آچکا تھا۔ اس کا جسم پہلے کی نسبت کافی بھاری ہوگیا تھا اور آنکھوں پر سنہری فریم کے چشموں نے جگہ بنالی تھی۔

”ویسے اب تم سچ مچ کے ڈاکٹر لگنے لگے ہو۔“ حذیفہ نے محب کو چھیڑا۔

”اور تمہیں ذرا سا بھی فرق نہیں پڑا۔ اب تک ویسے کے ویسے ہو۔“ محب رشک سے بولا۔

”نہیں خیر۔ فرق تو پڑا ہے۔“ حذیفہ نے کہا۔

تبدیلی تو حذیفہ میں بھی آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ محب کی تبدیلی نظر آتی تھی جبکہ حذیفہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

”بھابھی کیسی ہیں؟“ محب نے پلیٹ میں پالک پنیر ڈالتے ہوئے حذیفہ سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“

”اور بیٹی؟ وہ کتنی بڑی ہوگئی ہے؟“

”ننھیہ سات سال کی ہوگئی ہے۔“ حذیفہ نے مسکرا کر بتایا۔ ”اور تمہارے بچے؟“

”ایک ابھی پانچ سال کا ہوا ہے‘ دوسرا ساڑھے تین سال کا ہے۔ ست بد معاش ہیں دونوں‘ ہر وقت منہ بگاڑ کر انگریزی بولتے رہتے ہیں۔“ محب نے منہ بنا کر حذیفہ کو بتایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

”قصور ان کا نہیں‘ تمہارا ہے۔ تم ہی انہیں وہاں لے کر گئے تھے۔“ حذیفہ نے کہا۔ محب اپنی فیملی کے ساتھ کافی عرصہ پہلے کینیڈا شفٹ ہوگیا تھا اب کئی سال کے بعد اس کا پاکستان چکر لگا تھا۔

”ہاں یار! پر اب میں سوچتا ہوں کہ میرا باہر جانے کا فیصلہ صحیح تھا بھی یا نہیں۔ بعض دفعہ ہم اپنا فیوچر بنانے کے چکر میں کچھ ایسی چیزوں کی قربانی دے دیتے ہیں جن کی اہمیت سے ہم اس وقت واقف نہیں ہوتے۔“

”تو واپس لوٹ آؤ۔“ حذیفہ نے مشورہ دیا۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“ محب نے موضوع بدلا۔ ”تم بتاؤ تمہاری اس دوست کا کیا حال ہے؟“ محب کے ذہن میں اچانک کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہوئی۔

”کون سی دوست؟“

”وہی جس کا کیس تم مجھ سے ایک بار ڈسکس کرنے آئے تھے۔ کیا نام تھا اس کا۔۔۔ ہاں۔۔۔ جوریہ۔ کہاں ہوتی ہے وہ آج کل؟“

”تمہیں وہ اب تک یاد ہے؟“ حذیفہ نے حیرت سے کہا۔

”بھولے تو تم بھی نہیں ہو۔“ محب حذیفہ کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”معلوم نہیں۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ اب تو کئی سال ہوچکے ہیں۔“ حذیفہ نے بتایا۔

”کبھی کہیں سرراہ ملاقات‘ کوئی اتفاقیہ مڈبھیڑ؟“ محب کو تجسس ہو رہا تھا۔ حذیفہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”دو تین سال پہلے لندن انڈر گراؤنڈ میں ٹرین پر چڑھتی ایک لڑکی پر اس کا گمان ہوا تھا۔ پر وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ وہ بھلا وہاں کہاں؟“ حذیفہ محب کے سر کے پیچھے دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھتا ہوا خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔ اب وہ محب کو کیا بتاتا کہ کئی بار جس کو وہ اپنی تلاش کا انت سمجھا‘ وہ پاس جانے پر معمولی شباہت کے علاوہ کچھ نہ نکلی۔

اسماء کے بستر مرگ پر کیے گئے اعتراف کے بعد سے اسے جوریہ کو ڈھونڈنے کی بے چینی لگ گئی تھی۔ رعنا کے بولے اس جھوٹ کا پول بھی اسی لمحے کھل گیا تھا جس کا سہارا لے کر انہوں نے حذیفہ کو عرشی سے شادی کے لیے رضا مند کیا تھا۔ پر حذیفہ نے یہ بات کبھی رعنا کو جتائی نہیں تھی اگر وہ اپنی ماں کو معاف کرسکتا تھا تو رعنا کو بھی کرسکتا تھا۔ دونوں ماؤں نے اپنی

دانستہ میں اپنی اپنی اولاد کا مستقبل محفوظ کرنے کی سعی کی تھی۔

محب نے حذیفہ کی طرف دیکھا جس کی توجہ کھانے سے ہٹ چکی تھی۔ وہ دیوار پر لگی تصویر میں اپنی ہمجولیوں کی جھرمٹ میں پائیں باغ کی شہ نشین پر استراحت فرمائی مغلیہ شہزادی کے نقوش میں جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ پینٹنگ کے دونوں طرف دیوار میں بنے طاقچوں میں سجی ہوئی لمبی گردن والی صراحیاں اور سفید براق چاندنی سے ڈھکے اور سنہری کم خواب کے گاؤ تکیوں سے سجے پستہ قد تخت جن پر کھانا چنا گیا تھا۔

محب کو اچانک ہی سارا ماحول انتہائی دیدہ زیب اور دلفریب لگنے لگا تھا۔

”تم نے ہاتھ کیوں روک لیا۔ یہ لو نا۔“ حذیفہ کا دھیان پھر سے محب کی طرف ہوا۔ اس نے اپنے فرائض میزبانی ادا کرتے ہوئے ایک ڈش محب کے آگے کی اور بیرے کو تازہ اور گرم نان لے کر آنے کا اشارہ کیا۔

کھانے پینے کا سلسلہ بظاہر وہیں سے واپس جڑ گیا جہاں پر تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا‘ پھر بھی محب اپنے دل سے اس پشیمانی کے احساس کو پوری طرح نہ نکال سکا کہ اس نے نادانستگی میں ایسا قصہ چھیڑ دیا تھا جو شاید اسے نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

عرشی نے انگلی کی مدد سے اپنے سن گلاسز کو واپس آنکھوں کے سامنے کیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

برگد کے بڑے سے پیڑ کے سائے میں دھوپ کی تیز شعاعوں سے خود کو بچا کر کھڑی عرشی کے سامنے خالی میدان کے پار ایک زیر تعمیر عمارت تھی جس کے اندر ہر دو تین فٹ کے فاصلے پر فرش سے لے کر چھت تک گڑے کیے لمبے لمبے بانس اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ اس عمارت کی پہلی چھت ڈلے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

عرشی کو زیر تعمیر عمارتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اس گرمی کے موسم میں طویل چٹیل میدان پار کر کے اسے جا کر دیکھنے کا حوصلہ تھا۔ لیکن یہ عمارت یہاں پر ہونے والے ترقیاتی کاموں میں کا حصہ تھی اور جس کا ہر ایک کو معائنہ کرانا یہاں کے نگران محمود اختر صاحب کا خاص شوق تھا۔

عرشی نے دھول‘ مٹی اور بجری کے ڈھیر کے درمیان سے گزرتے محمود صاحب کی پشت کو دیکھا جو سرپرستی آگ سے بے نیاز‘ ساتھ چلتے حذیفہ کو اس عمارت کے تعمیر ہوجانے کے بعد اسے استعمال میں لائے جانے کی تفصیلات سے آگاہ کر رہے تھے۔

حذیفہ عموماً عرشی کے ساتھ کم ہی کہیں آیا جایا کرتا تھا مگر آج عرشی بصد اصرار اسے اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ وہ اسے دکھانا چاہتی تھی کہ اس کی مصروفیات اتنی فالتو اور بے کار بھی نہیں ہیں۔ جتنا وہ تصور کرتا ہے۔

اور اس جگہ کے بارے میں عرشی کو ہمیشہ اچھی ہی رپورٹ ملتی آئی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ جگہ عرشی کی نہیں بلکہ رعنا کی محنت کا نتیجہ تھی۔ رعنا اپنے اس پراجیکٹ کی تکمیل تک زندہ نہ رہ سکیں ورنہ اس ادارے کی کارکردگی یقیناً ان کا سر فخر سے بلند کردیتی۔

رعنا اس پُراسرار بیماری سے صحت یاب ہو ہی نہیں پائی تھیں‘ جس کا سراغ ان کے ڈاکٹر ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

رعنا کے ساتھ فلاحی کاموں میں عرشی نے ان کی زندگی میں ہی حصہ لینا شروع کردیا تھا مگر ان کی وفات کے بعد ان کاموں سے منسلک تمام ذمہ داریاں جیسے عرشی کو ورثے میں مل گئیں۔

رعنا کے انتقال کے بعد حذیفہ نے عرشی کے ساتھ برتاؤ میں خاصی تبدیلی آئی تھی۔ زیادتی وہ پہلے بھی نہیں کرتا تھا‘ اب اس کا رویہ مزید نرم ہوگیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ماں باپ کے گزر جانے کے بعد جس طرح وہ خود اکیلے پن کا شکار ہوگیا تھا عرشی بھی اسی کیفیت سے گزرے۔

حذیفہ یہاں آکر عرشی کی توقع کے مطابق متاثر ہوا یا نہیں لیکن وہ دلچسپی ضرور لے رہا تھا۔ یہ اندازہ عرشی کو دور سے ہی اسے پورے انہماک کے ساتھ بگلے جیسے سفید بالوں والے اختر محمود کی باتیں سنتا دیکھ کر ہو رہا تھا۔

عرشی کو اختر محمود جیسے لوگوں کی قوت برداشت پر حیرت ہوتی تھی جن پر کام دھن میں نہ سردی اثر کرتی تھی نہ ہی گرمی' جو کئی سال باہر ٹھنڈے علاقوں میں گزارنے کے باوجود بھی اس عمر میں اس دھوپ کے نیچے یوں آرام سے پھر رہے تھے جیسے کوئی خوشگوار موسم میں باغ کی چہل قدمی کو نکلتا ہے۔

عرشی نے دور کھڑے حذیفہ اور اختر محمود پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اپنے پیچھے بنے سنگل اسٹوری آفس سے متصل کمرے کا رخ کیا جس کی ایک دیوار میں سے آدھے سے زیادہ باہر نکلی چوکور ڈبہ نما مشین کے اندر سے نکلتی گڑگڑاہٹ عرشی کو یہ تسلی دینے کے لیے کافی تھی کہ کم از کم اس کمرے کا درجہ حرارت اس کی مرضی کے مطابق ضرور ہو گا۔

اس نے اپنے برابر کھڑی بنتو کو گیٹ کے پاس درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑی کی ہوئی گاڑی میں سے منرل واٹر کی بوتل لانے کا کہہ کر اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔

باہر کی تیز دھوپ سے ایک دم اندر آنے پر عرشی کو کچھ دیر کمرے میں اندھیرے ہیولوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

تھوڑی دیر میں جب عرشی کی آنکھیں صاف دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ کمرا اس سینٹر کا کمپیوٹر روم تھا۔ دیوار کے ساتھ ترتیب سے رکھی ڈھیر ساری میز کرسیاں اور ہر میز پر رکھا ہوا ایک عدد کمپیوٹر۔

یہ کمپیوٹر روم باہر سے آنے والی ٹیم کے اصرار پر بنایا گیا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہاں سکھائے جانے والے علوم کو جدید وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ غریب گھرانوں سے آئی ایسی باصلاحیت لڑکیاں جن میں کچھ نیا سیکھنے کی قابلیت موجود ہو انہیں اس کی بھی تربیت حاصل کرنے کا موقع ضرور دیا جانا چاہیے تاکہ وہ بھی تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

خود عرشی کی نظر میں یہ چونچلے ان عورتوں کی اوقات سے بڑھ کر تھے جو یہاں پر آیا کرتی تھیں۔ غریبوں کی حیثیت اور ان کے معاشرے میں مقام سے متعلق عرشی کی بڑی مخصوص اور محدود سی سوچ تھی۔

عرشی کے علاوہ اس وقت اس لمبوترے کمرے کے اندر ایک اور لڑکی بھی موجود تھی جس نے عرشی کے اندر داخل ہوتے وقت اسے سر کے خفیف اشارے سے خوش آمدید کہا تھا اور جسے آنکھوں کے سامنے چھائے اندھیرے اور دماغ پر چڑھی گرمی کے زیر اثر عرشی دیکھ نہیں پائی تھی۔

پر اب گرمی اور اندھیرا دونوں چھٹ چکے تھے۔

عرشی نے اب دلچسپی کے ساتھ اس سادہ سے پرنٹڈ لان کے سوٹ میں ملبوس اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سارے کمپیوٹروں کو باری باری آن کر کے انہیں چیک کر رہی تھی۔

اس نے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنا رکھا تھا جس میں سے کچھ لٹیں نکل کر اس کے چہرے پر آرہی تھیں۔

عرشی نے آج سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً "یہ بھی باہر سے آنے والی ٹیم کا ہی حصہ تھی کیونکہ اس کے انداز میں جو بے نیازی اور خود اعتمادی تھی' وہ اکثر یہاں کام کرنے والی چھوٹی موٹی سوشل ورکرز میں نہیں پائی جاتی تھی۔

عرشی کو اس لڑکی میں عجیب سے کشش محسوس ہوئی۔ انتہائی شفاف اجلا چہرہ جس سے کرنیں سی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سیاہ آنکھوں میں گہری چپ اور خاموشی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ تب ہی کمرے کا بیرونی دروازہ کھلا اور حذیفہ اور اختر محمود ایک

دوسرے کی معیت میں کمرے کے اندر داخل ہوئے۔

"یہ ہمارے سینٹر کا ایک اور نیا اضافہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہم عورتوں کو یہ سب سکھا کر انہیں اپنے ماحول اور اپنے لوگوں سے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ہم نے یہ ترغیب کبھی نہیں دی۔ ہمارا مقصد خود کفالت ہے 'خود مختاری نہیں۔" اختر محمود حذیفہ کو بتاتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ حذیفہ کو ابھی اس عمارت کا معائنہ کرا کے لا رہے تھے جس کے مختلف حصوں میں مکمل ہو جانے کے بعد سلائی 'کڑھائی اور بنائی کی مشینیں سیٹ کی جالی تھیں اور اب اس سے اگلا اور بہتر قدم کمپیوٹر کی تربیت تھا۔ اختر محمود صاحب کا تبصرہ اب تک جاری تھا۔

"یہ جگہ ہم نے انتہائی کم وقت میں سیٹ کی ہے اور یہ سب جویریہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم اتنے کم وقت میں بھی اس ٹارگٹ کو پورا کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔"

"جویریہ؟" اختر محمود اور حذیفہ کی طرف بڑھتی ہوئی عرشی ایک لمحے کو ٹھٹکی۔

ایک عام سا نام ہی تو تھا جو کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ مگر یہ وہ نام تھا جو اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی عرشی کو دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک لگتا تھا۔

عرشی نے تیزی کے ساتھ پلٹ کر کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا جو شاید اٹھ کر نئے آنے والوں کا استقبال کرنا چاہتی تھی۔

مگر اپنی جگہ سے اٹھ نہیں پائی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی عرشی فوراً" سمجھ گئی کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا صرف نام ہی نہیں بلکہ اس کا پورا وجود ہی عرشی کے لیے خطرہ ہے۔

عرشی نے لڑکی پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے دہشت زدہ ہو کر حذیفہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ اتنا ہی سفید پڑ چکا تھا جتنا کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کا تھا۔

ایسا لگا جیسے زمین کی گردش تھوڑی دیر کے لیے رک سی گئی ہو جیسے وقت اپنی جگہ ٹھہر گیا ہو۔

اور اس جمے ہوئے لمحے میں صرف جویریہ اور حذیفہ ہی نہیں وہ بھی شامل ہو چکی تھی۔

اس سارے ماحول میں صرف اختر محمود ہی وہ ایک واحد شخص تھے جنہیں ابھی تک ان قیامت خیز لمحوں کی خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ اس جوش و خروش سے حذیفہ کو سینٹر کی تفصیلات سے آگاہ کیے جا رہے تھے۔ فرق صرف یہ ہوا تھا کہ حذیفہ کو اب ان کی کوئی بات سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اختر محمود کے علاوہ اب کسی کو بھی کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا یہاں تک کہ عرشی کو بھی نہیں جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی بت بنے حذیفہ کی طرف دیکھتی تو کبھی پتھرکی بنی جویریہ کو۔

عرشی کا بس چلتا تو وہ جویریہ اور حذیفہ کے درمیان ایسی دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی جو انہیں آر پار دیکھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی۔

پر اب ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

"جویریہ!" حذیفہ کی سانسوں کے ساتھ نکلنے والے نام نے اختر محمود کی چلتی زبان کو روک دیا۔

پہلی بار انہیں کچھ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوا۔ انہوں نے الجھ کر اپنے برابر کھڑے حذیفہ کی طرف دیکھا' جواب وہاں نہیں تھا۔

وہ جویریہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں جویریہ۔! اتنے سال کہاں تھیں تم؟"

وہ عرشی اور اختر محمود' دونوں میں سے کسی کی بھی موجودگی کی پروا نہ کرتے ہوئے جویریہ کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے بازپرس کر رہا تھا اور جویریہ وہیں وومن سینٹر میں کپڑے اور روئی سے بنائی جانے والی بے جان لچکیلی گڑیا کی طرح اس کے ہاتھوں کے زور سے آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو اور جس کے ٹوٹ جانے کا ڈر اسے آنکھیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہا ہو۔

شاید یہ سب کچھ ایک خواب ہی تھا۔ جویریہ نے بند آنکھوں کے ساتھ سوچا اور اگر یہ واقعی خواب تھا تو اس خواب کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے وہ تمام عمر اپنی آنکھیں موندنے کو تیار تھی۔

"جویریہ! آنکھیں کھولو۔ دیکھو میری طرف۔" حذیفہ نے اس سے کہا۔ یہ خواب کیسے ہو سکتا تھا۔ جویریہ کے کان حذیفہ کی آواز سن رہے تھے، جب حذیفہ کے ہاتھوں کی گرمی اسے اپنے بازوؤں کے اندر حیات بن کر اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن اگر یہ آواز، یہ وجود حقیقت نہ ہوا تو اب کی بار وہ برداشت نہیں کر پائے گی۔

جویریہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کا دھندلایا ہوا ذہن تاریکی سے روشنی میں یوں واپس آیا، جیسے کوئی غوطہ خور گہرے پانی کو پیچھے چھوڑتا ہوا سطح اور زندگی کی طرف واپس لوٹتا ہے۔

کمپیوٹر روم اور اس میں موجود لوگ ایک بار پھر منظر میں واپس آ گئے۔

دروازے کے پاس کھڑی خوف زدہ چہرے والی عورت، اس کے برابر پریشان ہوتے پروفیسر صاحب اور ان دونوں سے دور اور جویریہ کے بالکل پاس ابھی تک اس کے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑے کھڑا حذیفہ۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں مجھے چھوڑ کر؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں تلاش کیا۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟"

حذیفہ دنیا بھر کی تھکان اپنے لہجے میں سموئے اس سے ایسے سوال پوچھ رہا تھا جن کا کوئی تسلی بخش جواب جویریہ کے پاس نہیں تھا۔

"میں نے تمہیں نہیں چھوڑا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکے ہو۔"

ساری وضاحتیں، سارے جواب ایک دم سے بہت بے معنی اور فالتو لگنے لگے تھے۔

اپنی زندگی کے آٹھ قیمتی سال اس نے ایک جھوٹ کی نذر کر دیے۔ وہ اب بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ زیادہ قصور کس کا تھا۔

اس کا، جس نے جھوٹ بولا یا پھر اس کا جس نے بلا سوچے سمجھے اس جھوٹ کا یقین کر لیا۔

"تم سے یہ سب کس نے کہا۔" حذیفہ نے چونک کر پوچھا۔ "اور اگر کہا بھی تھا تو تم نے اتنی آسانی سے کیسے مان لیا۔ کم از کم ایک بار مجھے پکار کر تو دیکھتیں۔"

"پکارا تھا۔ میرے دل نے کئی بار تمہیں پکارا تھا۔ تخلیق کے کرب سے گزرتے ہوئے بھی میں نے بار بار تمہارا ہی نام لیا تھا۔ پر میری آواز تم تک پہنچ ہی نہیں پائی۔" وہ حذیفہ کو روتے ہوئے بتا رہی تھی۔

وہ آنسو جو پچھلے آٹھ سال سے چھپا کر رکھے ہوئے تھے، آنکھوں کو جل تھل کرنے لگے۔

"تخلیق کا کرب؟" عرشی کے ذہن میں یہ فقرا ہتھوڑے کی طرح لگ کر اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" حذیفہ نے جویریہ کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا خود کا رنگ اچانک ہی بے حد پیلا پڑ گیا تھا۔

"یہ تم کس کی باتوں میں آ رہے ہو حذیفہ! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تمہیں ایک بار پھر سے پھنسانے کے لیے مکروفریب کا جال بن رہی ہے۔"

عرشی کا خوف اب ٹھیک ٹھاک دہشت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جو کچھ اس کے سامنے ہو رہا تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا، اسے ہونے کی وہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"جویریہ! خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔ سچ کیا ہے۔" حذیفہ نے عرشی کی مداخلت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے جویریہ کو ایک بار پھر سے جھنجھوڑا۔

"جھوٹ بول رہی ہے یہ۔ بکواس کر رہی ہے۔ یہ کسی تخلیق کے کرب سے نہیں گزری۔ تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے ایک نئی کہانی گھڑ رہی ہے۔"

عرشی ہذیانی انداز میں چلائی۔ اسے اپنی پوری زندگی ریت کی مانند لگنے لگی تھی، جسے وہ جتنا زیادہ زور لگا کر مٹھی میں بھینچے رکھنے کی کوشش کرتی وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ اس کی انگلیوں کے بیچ سے پھسلتی جا رہی تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ یقین نہیں آتا تو اس سے پوچھو۔ یہ بھی اس وقت وہیں تھی، جب میں نے تمہارے بچے کو جنم دیا تھا۔"

جویریہ نے عرشی کی سمت اشارہ کر کے کہا تو وہ حیرت کے مارے اپنی جگہ پر اچھل پڑی۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جویریہ کا سچ مچ دماغ چل گیا ہے۔ اس نے تو آج سے پہلے جویریہ کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

عرشی اس بات کو جویریہ کے پاگل پن کی سند کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ضرور کچھ کہتی اگر اس کے عین پیچھے کوئی چیز شخص کی زوردار آواز کے ساتھ زمین پر نہ گر پڑتی۔

اس آواز پر عرشی نے تیزی کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا یہ منرل واٹر کی بوتل تھی جس کا ڈھکن استعمال کے بعد ٹھیک سے بند نہیں کیا گیا تھا اور اب زمین پر گری ہوئی اس بوتل میں پانی بہہ کر کمپیوٹر روم کے فرش کو سیراب کر رہا تھا۔

لیکن جس کے ہاتھوں سے یہ بوتل گری تھی اس نے اسے اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ بنتو تھی، جو جو عرشی کے پیچھے ادھ کھلے دروازے کے بیچ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"بسنت بی بی۔" پروفیسر اختر کو بھی مسز ملک کی یہ ملازمہ خاص یاد آ گئی جو جویریہ کے حمل کے دوران سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔

"پوچھو اس عورت سے۔ کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔" جویریہ نے روتے ہوئے حذیفہ سے کہا۔

حذیفہ کی نظریں بنتو پر جم گئیں۔

"بولو۔ سچ کیا ہے؟"

حذیفہ کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ بنتو سر سے پیر تک خوف سے لرز گئی۔

بنتو رعنا کی پرانی ملازمہ تھی اور ان ذمہ داروں میں سے ایک تھی جو رعنا کی وفات کے بعد عرشی کو ورثے میں ملے تھے۔

بنتو کو اس وقت اگر ذرا سی بھی امید ہوتی کہ وہ آج اس سوال کا جواب دیے بنا یہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ اسی ادھ کھلے دروازے سے پلٹ کر واپس بھاگ جاتی مگر اس بات کو سمجھنے کی عقل اس جاہل اور ان پڑھ عورت میں بھی تھی کہ اب وہ کہیں بھی بھاگ کر چلی جائے، سچائی اگلے بنا بچ نہیں سکتی۔

"وہ۔ وہ جی۔ زچگی ہوئی ضرور تھی پر بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔" بنتو نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ میرا بچہ زندہ اس دنیا میں آیا تھا۔" اب کی بار جویریہ نے حذیفہ کو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی۔" بنتو گھبرا کر بولی۔ "بچہ مردہ تھا۔ ہم لوگوں نے اسے خود دفنایا تھا۔ آپ پروفیسر صاحب سے پوچھ لیں۔"

بنتو نے ایک کونے میں کھڑے پروفیسر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ایک نومولود دفنایا ضرور گیا تھا۔ اتنا تو پروفیسر صاحب کو بھی یاد تھا مگر جس جویریہ کو وہ جانتے تھے، وہ اتنی بڑی بات بلاوجہ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر جو کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے اس وقت ہو رہا تھا، اسے دیکھنے کے بعد انہیں بالکل یقین نہیں رہا تھا کہ جو کچھ انہوں نے برسوں پہلے دیکھا۔ وہ واقعی سچ تھا یا پھر فقط ان کی نظر کا دھوکا۔ ایک ایسا دھوکا جو جان بوجھ کر دیا گیا ہو۔

"نہیں۔ وہ زندہ تھا۔ میں نے خود اپنے بچے کے رونے کی آواز سنی تھی۔" جویریہ نے کہا۔

"اس کو غلطی لگی ہے جی۔ یہ تو بے ہوش تھی اس وقت۔" پروفیسر صاحب کی طرف سے کوئی تائیدی بیان نہ پا کر بنتو سخت سٹپٹائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"مجھے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ ایک ماں اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے اس کے رونے کی آواز سنی تھی لیکن کسی نے میری بات نہیں مانی۔ سب مجھ سے یہی کہتے رہے کہ

اس کی سانسیں اس کے پیدا ہونے سے پہلے بند ہو چکی تھیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟"

جویریہ نے حذیفہ کے سینے پر سر رکھ کر زارو قطار روتے ہوئے اس سے وہ سوال کیا، جس نے پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اسے ایک پل بھی چین نہیں لینے دیا تھا۔

پچھلے آٹھ سالوں کے دوران اس کے تحت الشعور میں گونجنے والی ایک مہین سی آواز کی بازگشت نے نجانے کتنی اندھیری راتوں میں اسے جھٹکے سے بیدار کیا تھا۔

دن کے اجالوں میں بھی نجانے کتنی بار اس کے راہ چلتے قدم کسی بچے کے رونے کی آواز پر بری طرح لڑکھڑائے تھے۔

اور سب بضد تھے کہ اسے غلط فہمی ہوئی تھی؟

حذیفہ کچھ دیر روتی بلکتی جویریہ کے سامنے ساکت کھڑا رہا پھر آہستہ سے اسے خود سے الگ کر کے پیچھے کی طرف مڑا۔

اس کی نظروں میں جو کچھ تھا، اسے دیکھ کر عرشی خوف زدہ ہو کر اس کے رستے سے ہٹ گئی۔

لیکن حذیفہ کو اس وقت عرشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

"اگر بچہ زندہ پیدا ہوا تھا تو پھر یقیناً" تم نے ہی اسے بعد میں مارا ہو گا۔ بولو کیسے مارا تھا؟ گلا گھونٹا تھا یا پھر زہر دیا تھا؟" حذیفہ نے بنتو کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"مم... میں نے کچھ نہیں کیا تھا جی۔" بنتو نے سر سے پیر تک کانپتے ہوئے کہا۔ حذیفہ کی آنکھوں میں اس قدر اشتعال تھا کہ بنتو کی سٹی گم ہو رہی تھی۔

"بولو ذلیل عورت! کیا کیا تھا تم نے میری اولاد کے ساتھ؟" حذیفہ ایک دم دھاڑ کر بولا تو بنتو چیخ مار کر اس کے پیروں میں گر گئی۔

"میں نے اس کو نہیں مارا... میں نے تو... میں نے اس کو چھوٹی بی بی کی گود میں لا کر ڈال دیا تھا۔"

کسی ہنستے بستے شہر پر بم گرنے کے بعد جو موت کا سناٹا چہار سو پھیلتا ہو گا ویسا ہی سکوت بنتو کے ان الفاظ کے بعد سارے کمرے پر طاری ہوا۔

"معاف کر دیں صاحب! معاف کر دیں۔ ہم تو حکم کے غلام ہیں جی۔ جو ملکانی جی نے بولا میں نے وہی کیا... معافی..." بنتو حذیفہ کے پیروں سے لپٹی گھگیائے جا رہی تھی، پر اب حذیفہ کو کچھ بھی سننے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اس انکشاف کے بعد سب ہی دم بخود کھڑے تھے۔ خاص طور پر عرشی۔

عرشی کو لگا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے کسی نے زمین کھینچ لی ہو۔

"ہنیہ" حذیفہ کی ہی بیٹی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" عرشی نے چکراتے سر کے ساتھ سوچا۔

لیکن اگر گزرے ماہ و سال پر وہ ایمان داری کے ساتھ نظر ڈالتی تو ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں لگ رہا تھا۔

ہنیا کو پارک میں کھلاتے وقت یا بازار میں لے کر گھومتے ہوئے جب اکثر لوگ عرشی کے بجائے حذیفہ سے آ کر کہتے تھے کہ آپ کی بیٹی بالکل آپ پر ہے تو عرشی کو عجیب نہیں لگتا تھا۔ ہنیہ ہر وقت تو حذیفہ کی گود میں یا اس کے کندھوں پر چڑھی رہتی تھی۔ ظاہر ہے جو ہر وقت اسے ساتھ لیے پھرے گا لوگ اسی سے یہ بات کہیں گے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جو مماثلت راہ چلتے اجنبیوں کو بھی دکھائی دے جاتی تھی، وہ عرشی کو کیوں نہ نظر آ سکی۔

شاید اس لیے کہ وہ اسے دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی آنکھوں پر بندھی خود غرضی کی پٹی نے اس پر کبھی حقیقت کا ادراک ہونے ہی نہیں دیا۔

ہنیہ کے ہر رنگ، ہر روپ میں اس کا باپ جھلکتا تھا۔ اس کی ہر عادت حذیفہ کا عکس تھی۔

ہنیہ کی جن باتوں کو عرشی حذیفہ کی نقل سمجھا کرتی تھی۔ وہ اس بچی کا اصل تھیں، جو اسے اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھیں۔

کتنی انہونی بات تھی کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود عرشی ہنیہ کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کر سکی جبکہ حذیفہ نے اسے اسی لمحے اپنا لیا تھا، جب پہلی بار گود میں اٹھا کر ماتھے پر بوسہ دیا تھا۔

شاید یہ خون کی مہک تھی جس نے باپ بیٹی کو ایک کر دیا اور عرشی اتنے سال ان کے ساتھ رہنے کے باوجود کبھی ان کا حصہ نہ بن سکی۔

"تم۔" حذیفہ پیروں میں گری پڑی بنتو کو نظر انداز کر کے عرشی کی طرف مڑا۔ "تم اتنی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہو، یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" حذیفہ عرشی کو دیکھتے ہوئے تنفر سے بولا تو وہ دنگ رہ گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" عرشی نے شدید حیرت کے عالم میں حذیفہ سے پوچھا۔ جواب میں حذیفہ عرشی کو بازو سے گھسیٹ کر جویریہ کے سامنے لے آیا۔

"دیکھو اس کی طرف۔ اور کیا کیا کچھ چھینو گی تم اس لڑکی سے۔ اس کی زندگی کی خوشیاں لے کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہوئی جو تم نے اس کی اولاد بھی ہتھیا لی۔ ایک ماں کی گود کو ویران کرتے ہوئے تمہارے دل کو کچھ نہیں ہوا؟"

حذیفہ آنکھوں میں نفرت لیے عرشی سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ سب میں نے نہیں کیا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔ ممی نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ ہنیہ کو کہاں سے لے کر آئی تھیں۔"

"تم مجھ سے یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ تمہاری "ممی" تمہاری مرضی کے خلاف بھی کوئی کام کر سکتی تھیں۔"

حذیفہ کے لہجے میں اس کی نگاہوں سے بھی زیادہ تنفر تھا۔

"بس کرو عرشی! اور کتنے جھوٹ بولو گی مجھ سے۔ اور کتنے دھوکے دو گی۔"

حذیفہ کے انداز میں عرشی کے لیے ذرا بھی رعایت نہیں تھی۔ رعنا نے ہمیشہ پیسے کے بل پر سب کچھ خریدا تھا یہاں تک کہ انسانوں کو بھی۔ کلینک کی ڈاکٹر سے لے کر وومن سینٹر کی ہیلتھ ورکر تک اور اس کے علاوہ بھی جانے کتنے لوگ جن کے بارے میں عرشی کو واقعی خبر نہیں تھی۔

لیکن ایک بات کا عرشی کو اچھی طرح سے پتا تھا اور وہ یہ کہ رعنا نے جو کچھ بھی کیا، صرف اس کی خاطر کیا۔ شاید رعنا بذات خود اتنی سنگدل نہ تھیں جتنی عرشی کی محبت میں بے بس ہو کر مجبور ہو گئی تھیں۔

رعنا نے حذیفہ کی ہی بیٹی کو عرشی کی گود میں ڈال کر ہمیشہ کی طرح بہت خطرناک داؤ کھیلا تھا مگر اس کھیل میں رعنا اکیلی نہ تھیں۔ کچھ ہاتھ اس میں تقدیر کا بھی تھا ورنہ عرشی کی گود اسی رات سونی نہ ہوتی جس رات قدرت نے جویریہ کی گود بھری تھی۔

اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ اگر عرشی کو ایک جیتے جاگتے بچے کی ضرورت نہ ہوتی تو کیا تب بھی رعنا کو بچہ تبدیل کرنے کا خیال آتا؟

اگر نہیں تو پھر ہنیہ کا کیا بنتا؟

کیا اسے اس کی ماں کے پاس رہنے دیا جاتا یا پھر رعنا اسے حذیفہ پر حق جتانے کا ذریعہ سمجھ کر جویریہ سے علیحدہ کر دیتیں؟

یہ سارے وہ سوال تھے جن کے جواب رعنا اپنے ساتھ قبر میں لے گئیں۔

رعنا تو اپنے اعمال قبر میں لے کر چلی گئیں اور ان کا نتیجہ بھگتنے کے لیے عرشی کو اکیلا چھوڑ گئیں۔

بنتو اب تک فرش پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی اور پروفیسر صاحب چپ چاپ ایک کونے میں کھڑے ہو کر وہاں دیکھ رہے تھے، جہاں حذیفہ نے اپنے بازو کے حلقے میں روتی ہوئی جویریہ کو سمیٹ رکھا تھا۔

آخر پروفیسر صاحب تھک کر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ان کی کیفیت اس وقت ایک ایسے میر کارواں کی سی تھی، جو اپنی سنگت میں سفر کرنے والے لوگوں کو بخیر و عافیت منزل تک پہنچا دینے کے بعد آسودگی بھری تھکان کا شکار ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ پھر یاد آیا کہ وہ آج کا سگریٹ پی چکے

ہیں۔ کوشہ پورا ہو چکا تھا۔ ان کے سگریٹ کا بھی اور اس لڑکی کی آزمائش کا بھی جو برسوں سے نارسائی کی آگ میں جل رہی تھی۔

انہوں نے ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے ڈبیہ واپس جیب میں ڈال لی۔

"حذیفہ پلیز۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔" عرشی نے حذیفہ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ رو نکھی ہو رہی تھی۔ اس کا سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہا تھا اور وہ کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

حذیفہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو عرشی کی گرفت سے آزاد کرالیا۔ وہ حذیفہ جسے عرشی کی خوشبو میں بسی شہد رنگت ریشمی زلفیں مائل نہ کر سکیں اب جویریہ کے الجھے سلجھے بالوں پر ٹھوڑی رکھ کر آنکھیں موندے سکون سے کھڑا تھا۔

اس لمحے عرشی کو حذیفہ کے چہرے پر الفت و محبت کے وہ تمام رنگ دکھائی دے رہے تھے جو اس کا اتنے برسوں کا ساتھ بھی کبھی لانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔

عرشی کو ایک دم احساس ہوا کہ اتنے سال تک اپنی جس فتح کے نشے میں وہ چور رہی وہ کس قدر کھوکھلی تھی۔ اس نے حذیفہ کو کبھی جیتا ہی نہیں تھا فقط اس کا خول اپنایا تھا۔ اصل حذیفہ تو کہیں جویریہ کے پاس ہی رہ گیا تھا۔

وہ تو عرشی کا کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔

کسی کو زبردستی بھی حاصل کیا جا سکتا ہے بھلا؟ اس سارے قصے میں سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ حذیفہ کو آج یہاں آنے کے لیے عرشی نے ہی مجبور کیا تھا۔

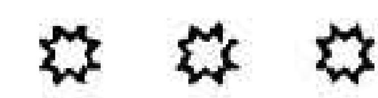
وہ نہ آتا تو کیا ہوتا؟

یہ ایک بے ضرر سا معمول کا وزٹ ہوتا جس کے ختم ہونے کے بعد عرشی اپنی زندگی کے روز مرہ معمولات کی طرف واپس لوٹ جاتی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ آٹھ سال کی جو مہلت قدرت کی طرف سے عرشی کو ملی تھی اس کی معیاد پوری ہو چکی تھی۔

حذیفہ کو ہر حال میں آج ساتھ آنا ہی تھا اور جویریہ کو بھی یہیں پر موجود ہونا تھا۔ کیونکہ قسمت میں ایسا ہی لکھا تھا۔

عرشی اب اس فیصلے کی بازگشت کو سن رہی تھی جو اتنے سالوں کے بعد لوٹ کر حساب برابر کرنے آئی تھی اور عرشی کو ڈر تھا کہ اگر حساب انصاف کے ساتھ کیا گیا تو اس کے ہاتھ خسارے کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

آٹھ سال میں پہلی بار عرشی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو بہنے لگے تھے۔



پھر اس نے مجھ سے کچھ نہیں لیا۔ نہ بنگلہ نہ گاڑی بس فقط اپنی ذات کو میری زندگی سے نکال کر لے گیا۔

دوسرے لفظوں میں مجھے تہی داماں کر گیا۔

ہاں یہ میں ہوں۔ عرشین حذیفہ۔

میں جانتی ہوں کہ اس کے نام کو بھی اپنے ساتھ جوڑے رکھنے کا حق اب مجھے نہیں رہا ہے۔ حذیفہ کے جانے کے کچھ ہی عرصے کے بعد مجھے اس کی طرف سے طلاق کے کاغذات موصول ہو گئے تھے۔

مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔

جاتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے جتنا غصہ اور جتنی نفرت تھی اس کو دیکھ لینے کے بعد میرا کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا رہنا حماقت ہوتی۔

میرے ہر جھوٹ، ہر غلط بیانی کو اتنے سال خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والا میری زندگی کے اس سب سے بڑے سچ کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوا کہ اس کی بیٹی کو اپنی ماں سے جدا کرنے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

دل میں اگر کسک اٹھتی ہے تو اس بات کی کہ جویریہ کے ساتھ جڑے جس رشتے کو دوری کے آٹھ طویل سال بھی ختم نہ کر سکے، میرے ساتھ اسی تعلق کو توڑنے میں حذیفہ نے آٹھ ماہ بھی نہ لگائے۔

ممی کہا کرتی تھیں کہ سات سال کم نہیں ہوتے کسی مرد کے دل میں اپنی جگہ بنانے کو۔ اور اگر میں واقعی کوشش کرتی تو شاید میں بھی حذیفہ کے دل میں اپنا مقام بنا سکتی تھی پھر شاید وہ مجھ سے اتنی بے دردی کے ساتھ ناتا توڑنے سے پہلے ایک بار رک کر سوچتا ضرور۔ اگر وہ مجھ سے اس قدر بدظن نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ اب بھی اپنی زندگی میں میرے لیے تھوڑی سی گنجائش نکال لیتا۔

اسے رشتوں کا مان رکھنا آتا تھا۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

وہ جتنا عرصہ میرے ساتھ رہا، میں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اب وہ نہیں ہے تو احساس ہوا کہ میں اس کے بنا کچھ بھی نہیں۔

جب وہ تھا تو مجھے اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ نہیں ہے تو میں سرشام گھر لوٹ آتی ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھی اس کی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر اس کے ہونے کے احساس کو اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے ایک ہی جھٹکے میں جویریہ اور میری زندگیوں کو ادل بدل کر ڈالا ہو۔ کل تک جو میرے پاس تھا، وہ سب اس کا ہو چکا ہے اور جو کچھ میں نے اس سے چھینا تھا، وہی میرا مقدر ٹھہرا۔

نارسائی کے اس کرب سے مجھے بھی آشنائی ہو گئی جس کا عذاب وہ لڑکی اتنے سال تک سہتی رہی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ جویریہ کی سزا تو آٹھ سال کے بعد اختتام پذیر ہو گئی، لیکن کیا میری اس قید تنہائی کا کبھی کوئی انت ہو گا؟

کچھ دن پہلے مجھے ان دونوں کے ہاں جڑواں بیٹوں کے پیدا ہونے کی خبر ملی تھی۔ میں خوش ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں وہ بھی خوش ہو گا۔ اسے بچے اچھے لگتے ہیں۔

ہنیہ کو بھی ان دونوں نے بورڈنگ اسکول کے بجائے ریگولر اسکول میں داخل کروا دیا ہے تاکہ وہ بھی عام بچوں کی طرح زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ماں باپ کے ساتھ گزار سکے۔ اسکول کے خشک ماحول کی جگہ اب اسے ماں باپ کا پیار ملے گا جو اس کا حق اور ضرورت ہے۔

باپ کی توجہ اور پیار تو ہنیہ کو شروع دن سے ہی حاصل تھی، البتہ ہنیہ کے دل کی سلیٹ کا ماں والا حصہ تو کورا ہی تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جویریہ بہت پیار سے اس پر اپنا نام کندہ کرے گی۔

میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا، کسی سے ملنے کی خواہش نہیں ہوتی۔ پھر بھی میں جاتی ہوں۔ کام بھی کرتی ہوں۔ ممی کی این جی او کی ساری ذمہ داری اب میرے کندھوں پر ہے۔

سب لوگ کہتے ہیں کہ مسز رعنا کی بیٹی ان ہی کی طرح خدا ترس اور بے غرض ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے والی۔

مگر سب غلط کہتے ہیں۔

میں بے غرض نہیں ہوں۔

دکھی انسانیت کی خدمت میں بھی میری اپنی غرض شامل ہے۔

حذیفہ نے ایک بار کہا تھا کہ عرشی! تم دوسروں کا بھلا کرو گی تو خدا تمہارا بھلا کرے گا۔

مجھے خدا سے کس بھلے کی امید ہے، یہ مجھے خود بھی نہیں معلوم، پھر بھی میں اس آس پر لوگوں کا بھلا کیے جا رہی ہوں کہ کبھی تو خداوند کریم کو میری حالت پر رحم آئے گا۔

کبھی تو میرے دل کی بے چینی اور کسک ختم ہو گی۔

کبھی تو وہ مجھے بخش کر میرے گناہوں کا بوجھ میرے ضمیر سے ہٹائے گا۔

کبھی تو۔

ایلیا یقین

بے عنوان

"جنگل میں آگ لگ جائے تو کیا کرتے ہیں؟" سمیر نے کشن بازو کے نیچے رکھ کر بازو کو موڑ کر سر کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے دیکھا اب وہ اپنے گھنگریالے بالوں والا سر ہاتھ پر ٹکا چکا تھا۔

"آگے کے درخت کاٹ کر ادھر سے ہٹا دیتے ہیں تاکہ آگ نہ پھیلے۔" میں نے جواب دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی جس پر یقیناً "میرا سائیکاٹرسٹ شوہر خود بھی سیدھے ہو کر لیٹ گیا ہوگا۔

سمیر کو رات کو جاگ کر فطرت کے اصولوں اور نظریوں پر گفتگو کرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ ہر بات کو ہر مسئلے کو گفتگو سے حل کر لیتا ہے بلکہ وہ اتنا معتدل مزاج ہے اور اتنی اچھی گفتگو کرتا ہے کہ معاملات بگڑتے ہی نہیں۔ جب میں نئی نویلی دلہن تھی تب میں پورے ذوق و شوق سے اس گفتگو میں حصہ لیا کرتی تھی لیکن اب جبکہ میرے تین بچے ہیں میرے پاس اس کے لیے فرصت نہیں یا پھر نیند غالب آجاتی ہے۔ شاید عظمیٰ سچ کہتی ہے کہ میرا معیار بھی گر چکا ہے۔ کیونکہ ایک باشعور شخص کے ساتھ نظریات پر گفتگو کرنا اور چیز ہے اور پڑوس اور میکے میں سسرال کی برائیاں کرنا اور پڑوسیوں کو لڑوانا اور بات ہے۔

صبح سمیر بازو پر سر رکھے کروٹ کے بل ویسے ہی سو رہا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہی پچھلے دن والی روٹین شروع ہوگئی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد دوپہر میں بچوں کو کھانا کھلا کر ٹیوشن بھیجا۔ صحن سے اندر آ ہی رہی تھی کہ ساتھ والی ثمینہ نے آواز لگائی۔ وہ اپنی سیڑھیوں پر چڑھ کر دیوار کے اس حصے پر چڑھ جاتی تھی جہاں دو چار گملے تھے اور درمیان میں کچھ خالی جگہ تھی پھر وہاں سے ہمارے ہاں جھانکا کرتی تھی۔ شروع میں تو میں خاصی جز بز ہوئی لیکن مروتاً "خاموش رہی پھر وقت کے ساتھ ساتھ عادی ہوگئی۔

"کل مسز کمال شہلا کا رشتہ مانگنے گئی تھیں۔" اس نے خبر دی۔

"پھر؟" میں نے دلچسپی چھپاتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا سبین نے مسز کمال کو گھر سے نکال دیا بہت شور مچا تم نے نہیں سنا؟"

"نہیں میں تو سو گئی تھی۔" وہ جانتی تھی کہ میں جلدی سونے کی عادی ہوں۔

"اچھا۔" پھر وہ کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔ "تم سبین کو سمجھاؤ تو سہی اچھا رشتہ ہے غور تو کرنا چاہیے۔ انکار کرنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔"

اب وہ میری اور سبین کی اچھی سلام دعا کا فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی۔

سبین باجی پچھلی گلی میں رہتی تھیں اور ادھیڑ عمر خاتون تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں شہلا اور نائلہ۔ ان کے شوہر فاروق صاحب کو دو برس پہلے اچانک دل کا دورہ پڑا تو سمیر نے ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ بس اسی وجہ سے وہ ہمیشہ ہم سے احسان مندی سے ملتی تھیں ورنہ محلے میں ان کے تعلقات محدود تھے اور ہاں! میرے تینوں بچے شہلا ہی سے ٹیوشن پڑھتے تھے۔ میں نے اچھا کہہ دیا اور وہ مجھ سے رخصت لے کر مسز کمال کے گھر چلی گئی جو سامنے تھا۔ مسز کمال کا بیٹا تین برس پہلے دبئی گیا تو ان کے ہاں خوش حالی آگئی اس کی ضد تھی کہ شادی شہلا سے ہی ہو۔



☼ ☼ ☼

رات کو عجیب اتفاق ہوا۔ سمیر آیا تو دروازے پر پیچھے پیچھے ہی مسز کمال بھی داخل ہوئیں۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہا تو وہ برآمدے میں ہی بیٹھ گئیں۔ برآمدے کے اکلوتے تخت پر جس کے علاوہ برآمدے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ اسی پر نظر ڈال کر گویا ہوئیں۔

"آپ نے سبین سے بات کی کہ میرے رشتے پر غور کرے؟" میں نے نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔

"وہ تو میرا بیٹا سر ہو گیا ہے ورنہ میں کیوں اس سے رشتہ جوڑوں۔ اسے تو کوئی تمیز ہی نہیں نہ کھانے کو ہوتا ہوگا گھر میں۔ ہم تو گاڑی میں رشتہ لینے گئے تھے۔ ان کے پاس تو سائیکل پر بھی شاید ہی کوئی رشتہ لے کر آئے۔" پھر آخر میں بولیں۔ "آپ انہیں مت سمجھائیں۔ لیکن انسان کو اپنی حالت دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ کہہ دیجیے گا آپ ان کو۔" وہ چائے لاتی فائزہ کو نظر انداز کر کے لوٹ گئیں۔

سمیر یہ ساری صورت حال دیکھ کر مسکرانے لگا اور سالن پر چاول ڈالتے ہوئے بولا۔

"تم اس بات پر ایسے ہی مٹی ڈال دو جیسے میں لوکی گوشت پر چاول ڈال رہا ہوں پھر اسے مکس بھی کر دو۔"

میں خاموشی سے بچوں کے سونے کا انتظار کرتی رہی پھر فارغ ہو کر کمرے میں گئی۔ میں سمیر سے یہ الجھن سلجھوانا چاہتی تھی۔

"کیا ہو جاتا اگر سبین باجی بے عزتی کر کے مسز کمال کو گھر سے نہ نکالتیں تو۔" میں بولی۔

"مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔" پینڈو نے متوجہ ہو کر کہا۔ وہ سچ مچ پینڈو ہے۔ کیسے؟ یہ تو میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال میں نے اس کو ساری بات بتا دی جو مجھے ثمینہ نے بتائی تھی۔

"ارے! میں تو رات بارہ بجے تک جاگ رہا تھا میں نے تو کوئی شور نہیں سنا اور ہمیں کیا پتا کہ دونوں میں کیا بات ہوئی ہے۔ مسز کمال نے جا کر کیا کہا اور شور تو بالکل بھی نہیں سنا میں نے۔" وہ قطعیت سے بولا۔

سمیر بھی کسی بات پر تلخ نہیں ہوتا تھا۔ وہ میری اکلوتی پھوپھو کا بیٹا ہے جن کی شادی گاؤں میں ہوئی تھی اور ابو اور پھوپھو ایک دوسرے کے اکلوتے بہن بھائی ہیں تو انہوں نے مزید ایک رشتہ تشکیل دینے کے لیے سمیر اور میرا انتخاب کیا۔ اب ہماری ہفتہ وار چھٹی امی کے گھر اور لمبی چھٹیاں پھوپھو کے ہاں گزرتی ہیں۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ سمیر مزاجاً" بالکل پینڈو ہے ــــــ وہ پلیٹ میں سالن ڈال کر اوپر سے چاول ڈالتا ہے۔ اس کے کپڑے استری نہ ہوں تو خفا نہیں ہوتا، لیکن میں اسے سال کے تین سو پینسٹھ دن پراٹھا پکا کر دوں تب بھی اس کی ممنونیت میں کمی نہیں آتی اور وہ روزانہ اتنی ممنون نظروں سے میرا شکریہ ادا کرتا ہے جیسے یہ پہلا پراٹھا ہو، شاید اس لیے کہ میں پینڈو آدمی کی شہری بیوی ہوں۔ اسے اپنے پینڈو ہونے پر فخر ہے اور مجھے پینڈو کی بیوی ہونے پر۔

بچوں کے امتحان ختم ہوئے تو ایک ہفتے کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں بچوں کے ساتھ سسرال چلی آئی۔ بھرے پرے سسرال میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔ دو جیٹھ، تین نندیں، پھر پھوپھا کے رشتے دار الگ۔ اتنے بڑے خاندان میں ہفتہ دن کی طرح گزر جاتا لیکن سمیر کے لیے یہ وقت خاصا طویل ہو جاتا تھا کیونکہ میں سسرال جاؤں تو وہ اپنے سسرال میں ٹھہر جاتا ہے یعنی میری امی کے گھر۔

ایک ہفتہ گزار کر سمیر کے ساتھ ہم واپس آ گئے۔ چھوٹے سے صحن میں دیواروں کے ساتھ کیاریاں اور گھر کے دروازے سے برآمدے کی جالی کے دروازے تک راستے کو چھوڑ کر دونوں اطراف میں گھاس لگی ہوئی تھی۔ گھر کا یہ حلیہ دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ اب گھر اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ لان بچتا" لیکن اب کیا کیا جائے کہ سمیر آخر پینڈو ہے۔ میں نے موڈ آف کر کے لڑنا چاہا تو یہ بھی ممکن نہ ہوا کیونکہ اب آخر چھم چھم ایک ہاتھ سے تو کھیلا نہیں جا سکتا۔

میں نے گھر کی اس درگت کا سبب جاننا چاہا تو وہ سر میں تیل بہاتے ہوئے بولا کہ شہر میں رہ کر وہ بڑی اداسی محسوس کرتا ہے، اس لیے چھوٹا سا کھیت تو ہونا چاہیے۔ یعنی اب میں پینڈو کے لیے سبزیاں گھر میں اگاؤں تاکہ اسے گاؤں جیسا محسوس ہو۔

پہلے پہل تو میں جھنجلائی لیکن پھر تازہ دھنیا کاٹ کر سالن میں ڈالنا مجھے خود اچھا لگنے لگا اور توری، بینگن، کریلے اور ٹنڈے خود اگا کر پکانے میں بھی بہت مزا آیا۔ آہستہ آہستہ "کھیتی باڑی" میری روٹین کا حصہ بن گئی اور میں "شہری پینڈو" بن کر سبزیاں محلے والوں کو تحفتاً بھیجنے لگی۔

پھر ایک روز سمیر نے مجھے کہا۔ "یار رانیہ! تم بچوں کو گھر میں ہی پڑھا لیا کرو۔ بچے اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ ان کے پڑھے لکھے ماں باپ انہیں وقت نہیں دیتے۔" یہاں وہ ماہر نفسیات کی زبان بول رہا تھا۔

"انہیں شک ہوتا ہو گا کہ ہم نے محنت کر کے نہیں پڑھا ورنہ خود ہی پڑھا دیتے ان کو۔" یہ جذباتی بلیک میلنگ تھی۔ "دیکھو! سائنس، معاشرتی علوم، کمپیوٹر اور سندھی تم پڑھا لینا اور اسلامیات، اردو، ریاضی اور انگریزی میں دیکھ لیا کروں گا۔"

مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔

فائزہ آٹھویں جماعت میں تھی، ربیعہ چھٹی میں اور احمد تیسری میں۔

شروع شروع میں مجھے اس نئے تجربے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں تھوڑا وقت لگا۔ دھیرے دھیرے میرے بچے مجھ سے قریب ہو گئے۔ البتہ اب ثمینہ نے دیوار سے لٹک کر ہمارے گھر جھانکنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب میں سارا دن ہی مصروف ہوتی اور مجھے وقت ہی نہ ملتا۔

اور جب کبھی تینوں کا ہوم ورک کم ہوتا تو میں انہیں عظمیٰ اور کبریٰ کے گھر لے جاتی۔ آؤٹنگ بھی ہو جاتی اور بچے بھی خوش ہو جاتے۔ پہلے ٹیوشن کی وجہ سے صرف اتوار کا دن ہی فارغ ہوتا تھا۔ اب تو میں بہت عرصے بعد شبینہ کے گھر بھی ہو آئی تھی، جو اسکول کے زمانے سے میری گہری دوست تھی۔ اب مجھے کسی طرح بھی محلے کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ اچانک ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ثمینہ نے میرے کھیت میں صبح صبح آ کر بتایا کہ شہلا کے لیے کوئی رشتہ آیا تھا۔ ان لوگوں نے انکوائری کے لیے ثمینہ سے بات کی تھی اس لیے کہ وہ لوگ اس کے کسی رشتہ دار کے خاندانی دوست تھے۔ تب ثمینہ نے انہیں مسز کمال والا واقعہ گوش گزار کر دیا۔ جس پر رشتہ نہ ہو سکا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ مجھ سے بھی کچھ خفا تھی کہ میں نے اتنی مصروفیات پال لی ہیں کہ میرے پاس اس کی بات سننے کا اب وقت ہی نہیں بچتا۔ میں نے اسے ملامت کرنا چاہا کہ اس نے شہلا کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"جبین اتنی بداخلاق ہے اور ویسے بھی میں مسز کمال سے تعلقات خراب نہیں کر سکتی کیونکہ وہ مجھے ترکیبیں بتاتی ہیں۔"

میں اس کی بے حسی کا اندازہ کر کے خاموش ہو گئی۔ وہ اِدھر اُدھر کی چند باتیں کر کے لوٹ گئی لیکن میرا ذہن شہلا کے معاملے میں ہی اٹکا رہا۔

رات کو ہم بچوں کو شب بخیر کہنے کے بعد اپنی خواب گاہ میں آئے تو میں سمیر سے آج کے واقعے پر تبادلہ خیال کرنے لگی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق پوری توجہ سے مجھے سنتا رہا۔ پوری بات سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی بے چینی پھیل گئی۔

"یہ شہری عورتوں کا مسئلہ ہے اور کچھ عورتوں کی نفسیات۔ شہر میں گھر میں رہنے والی عورتیں یکسانیت اور فراغت سے بہت عاجز آ جاتی ہیں رانیہ! وہ سارا دن گھر میں رہتی ہیں ـ نہ آؤٹنگ ہوتی ہے نہ کوئی تفریح۔ بڑے شہروں میں تو رشتے دار اور ملنے جلنے والے اتنی دور رہتے ہیں کہ ان کے گھر جانا مشکل ہوتا ہے اور انسان تو سماجی حیوان ہے، پھر وہ محلے میں ہی اپنی سہیلیاں بنا لیتی ہیں اور محلے میں یہی کچھ ہوتا ہے ـ اب دیہات میں عورتیں کھیتوں میں جاتی ہیں۔ رشتے دار قریب قریب ہوتے ہیں تو بہت زیادہ سازشیں نہیں ہو پاتیں۔ سلائی کڑھائی میں اور مختلف کاموں میں مشغول رہتی ہیں تو اس طرح کا حبس زدہ ماحول نہیں ہوتا، ان کی زندگی اور روٹین میں حرکت ہوتی ہے۔ شہری عورتیں جو گھروں میں رہتی ہیں ان کی زندگی بہت بور ہوتی ہے۔ وہ اوب جاتی ہیں۔ ان کی تفریح اسی طرح کی باتیں بن جاتی ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

"جبین باجی تین بار میرے پاس آ چکی ہیں۔ وہ بھی اوب چکی ہیں لیکن تنہائی پسند ہیں۔ اب مسز کمال کا بیٹا ہزار جان سے شہلا پر عاشق ہے، اس کا کردار جیسا بھی ہو لیکن مسز کمال ہر وقت اپنی امارت جتاتی رہتی ہیں تو جبین باجی کیسے اپنی بیٹی کی شادی ادھر کر دیں؟ اور خوامخواہ انہوں نے اس لڑکی کا تاثر بھی خراب کر دیا ہے۔ یہ بات محلے میں اتنی مشہور ہے کہ اب کوئی بھی رشتہ آئے تو یہ مفت کی بدنامی ان کے سر لگ گئی۔ کوئی لڑکی بدنام ہو جائے تو سوچو اس کے گھر والے کیسے ناکردہ گناہ کے مجرم بن جاتے ہیں؟" اس نے حسب عادت بڑی تفصیل سے مجھے سمجھایا۔

"تمہیں پتا ہے، جنگل میں آگ لگ جائے تو اسے آگے کے درخت کاٹ کر قابو کر سکتے ہیں۔ لیکن عورتوں کی زبان پر کوئی ایسی بات آ جائے تو اس کا کیا کریں؟" میں نے نفی میں سر ہلایا اس نے کہا۔

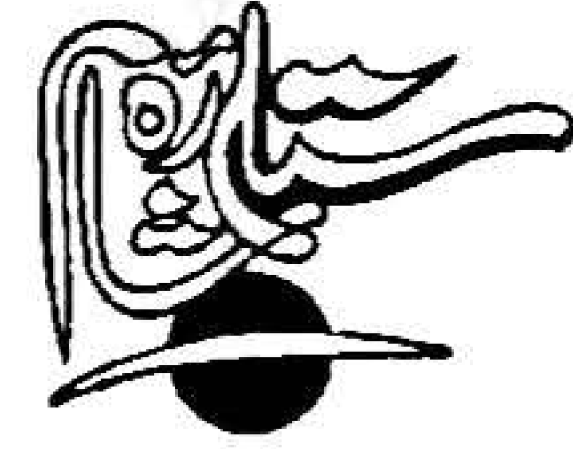
"مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ دنوں میں تم بھی ثمینہ کے ساتھ ان چکروں میں پڑ جاؤ گی۔ تم نہ بھی چاہتیں تو وہ تمہیں گھیر گھار کر ان ہی کاموں میں لگا دیتی۔ پھر شاید تم بھی انتقامی کارروائی کرتیں اور عمر بھر کے لیے ان چکروں میں پڑ جاتیں۔ اس لیے میں نے چاہا کہ تمہیں باغبانی کی طرف اور بچوں کی طرف لے آؤں تاکہ تم اس دلدل سے بچ جاؤ۔"

وہ اب بھی اسی انداز میں لیٹا تھا، تکیے پر کہنی ٹکا کر ہتھیلی پر سر رکھے۔

مجھے اس کی چالاکی پر بڑا پیار آیا اور میں اس سے واقعی متفق ہوں۔

کہیے! آپ کا کیا خیال ہے؟

آمنہ ریاض



دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ہادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ہادی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

نبیہہ العباس طبیعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ



پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ' تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرو تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ' تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس' ثروت دانیال کی اولاد ہے' جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بد مزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال' ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد' زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً" ہادی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ہادی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ہادی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ہادی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ہادی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں' لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ' ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ہادی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے۔ ہادی' ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ' ہادی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر' نمرو اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرو ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد' بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے' لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد' جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت' دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن' ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ' ہادی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس' ہادی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ہادی کے باپ' رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ' ہادی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ہادی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ہادی آرٹس نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ہادی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ہادی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہادی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

۲۲
بائیسویں قسط

"ڈیئر عروش! مجھ سے دوستی کرنے کے لیے تمہیں سروش کے نام کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بھی تمہیں پسند کرتی ہوں اور دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ تم جو نہیں کہتیں' تمہاری آنکھیں کہہ دیتی ہیں اور تمہاری آنکھیں صرف محبت کی زبان بولتی ہیں۔ میں تمہاری محبت اور دوستی کی قدر کرتی ہوں اور اس محبت میں ڈوب جانا چاہتی ہوں۔ پلیز! اس خط کا جواب جلدی دینا۔

صرف اور صرف تمہاری.... جنت۔

شبیہہ العباس کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی پھر ناپسندیدگی اور جھنجلاہٹ دکھائی دینے لگی۔ بھڑکنے کے لیے تو یوں بھی اسے کم ہی باتوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب تو پھر بھی متن الجھانے والا تھا۔ اس پر سے غضب یہ ہوا کہ تنوی بھی اسی وقت اپنی نوٹ بک کی تلاش میں آگئی۔

"وہ شبیہہ بھائی! میری نوٹ بک آپ کے روم میں رہ گئی تھی شاید۔" تنوی نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

شبیہہ نے پلٹ کر کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

"شاید نہیں' یقیناً"۔" ساتھ ہی نوٹ بک اس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" کھلا ہوا صفحہ اس کے سامنے تھا۔ تنوی نے ذرا سی حیرت کے ساتھ نوٹ بک پکڑ لی' پھر سپٹا گئی۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔"

"تم لڑکیوں کو دوستیاں کرنے سے فرصت نہیں ہے۔" شبیہہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

"وہ۔۔۔ یہ میری فرینڈ نے مذاق میں لکھ دیا تھا۔" تنوی نے سراسیمہ ہو کر وضاحت پیش کی یا محض کوشش ہی کی

تھی۔
"یعنی ایک اور واہیات فرینڈ تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے؟" شبیہہ نے زہر خند لہجے میں کہا تھا۔ تنوی کا جھکا ہوا سر اتنا جھک گیا کہ ٹھوڑی ہنسلی کی ہڈی سے ٹکرانے لگی۔
"میری بات کان کھول کر سن لو! فوراً" سے بیشتر اپنی دوستیاں محدود کر لو۔ میں نے تمہیں کالج میں ایڈمیشن سے پہلے بھی سمجھا دیا تھا کہ کسی اوٹ پٹانگ سرگرمی کی خبر نہ ملے مجھے۔ اور پھر بھی تم ایسی چیپ لڑکیوں سے دوستیاں گانٹھتی پھر رہی ہو۔"
"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔" آنسو پہلے نکلے لفظ لبوں سے بعد میں ادا ہوئے تھے۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں میری فرینڈ نے مذاق میں لکھ دیا تھا۔"
شبیہہ مزید چڑ گیا۔
"اسی لیے میں تم سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ آنسوؤں کے بغیر تو تمہیں بات کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ اونہہ جاہل!"
تنوی کی ہچکیاں ہی بندھ گئیں۔
"گیٹ لاسٹ۔ جسٹ گیٹ لاسٹ۔" شبیہہ نے چنگھاڑ کر کہا۔ "اور اگلی بار مجھے اپنی شکل تب دکھانا جب ان آنسوؤں سے چھٹکارا حاصل کر لو۔"
تنوی سرپٹ باہر بھاگی۔ شبیہہ بے وجہ غصے سے کھولتا رہا۔

☼ ☼ ☼

ہادی اپنی ہی جھونک میں تھی۔ تنوی غم زدہ اور حواس باختہ۔
راہداری کے کنارے بری طرح ٹکرا گئیں۔
"ارے بھئی! دھیان سے۔" ہادی نے ہی کچھ حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی گرنے سے بچایا تھا۔
"چوری کی ہے یا محض تفریح کے لیے بھاگ رہی ہو؟" حسب عادت ہادی نے سنجیدگی کے ساتھ انتہائی غیر سنجیدہ سوال جڑا۔ تنوی کے پہلے ہی حواس درست نہیں تھے، آن کی آن اور بھی ہونق نظر آنے لگی۔
ہادی نے بغور اسے دیکھا پھر تعجب سے بولی۔
"ارے! تم تو رو بھی رہی ہو۔" استفسار تھا یا محض بات برائے بات تنوی سمجھی نہیں۔ یوں بھی تازہ تازہ جھاڑ کھا کر نکلی تھی۔ سمجھ بوجھ نے تقریباً "تقریباً" ساتھ چھوڑ ہی رکھا تھا۔
"کچھ تو بولو تنوی! ہوا کیا ہے آخر تمہیں؟"
لیکن تنوی نے جواب دینے کے بجائے آنسو پونچھتے ہوئے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تو پھر کیا جسٹ فار داسیک آف فن رو رہی ہو؟" ہادی نے زور دے کر پوچھا۔ لیکن تنوی مستقل نفی میں سر ہلاتے تیزی سے تقریباً "بھاگتے ہوئے آگے نکل گئی۔
"عجیب لڑکی ہے۔" ہادی نے کندھے اچکا کر سوچا اور آگے کی طرف چل دی۔ یوں ہی چلتے پھرتے، گھومتے گھامتے حویلی کے آرکیٹکچر پر غور کرتے ہوئے اسی طرف آ گئی جس طرف پچھلی بار حویلی کی بھول بھلیوں میں کھو کر پہنچ گئی تھی۔
وہی برآمدے کی سیڑھیاں، سامنے احاطہ، کنواں، درخت اور تین اطراف میں بنے کمرے۔

عجیب سا اسرار چھپا تھا اس حصے میں، جو بیک وقت اسے اپنی طرف کھینچتا بھی تھا اور دور رہنے پر مجبور بھی کر رہا تھا۔ معاً "اسے وہی لڑکی دکھائی دی۔ ہادی اسے دیکھ کر غیر ارادی طور پر محتاط ہو گئی۔
"لگتا ہے، آپ آج پھر راستہ بھول گئی ہیں۔" وہ لڑکی ہادی کے پاس چلی آئی۔ "آئیں بی بی! آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔"
ہادی نے محسوس کیا، وہ پچھلی بار سے کہیں زیادہ پُراعتماد دکھائی دیتی تھی۔
"ایک بار رستہ بھولنے کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ ہر بار۔ ایسا ہی ہو۔" ہادی نے بظاہر ہنس کر لیکن معنی خیزی سے کہا۔ "اور میرا خیال ہے اس بار تو میں بالکل صحیح جگہ پر پہنچی ہوں خیر۔ نام کیا ہے تمہارا؟"
"تسنیم۔"
"ہوں۔ اچھا نام ہے۔" ہادی نے سرسری سی نظریں اس پر ڈال کر بند دروازوں کو دیکھا۔
"ان بند دروازوں کے پیچھے کیا ہے تسنیم! جو تم ان کی اتنی حفاظت کرتی ہو؟" گو کہ اس کا انداز سرسری تھا۔
"راز ہیں بی بی!"
"ہیں۔ کیا مطلب؟"
تسنیم ہنس دی۔
"ہر حویلی کے کچھ راز ہوتے ہیں بی بی! جن سے حویلی والے واقف ہوتے ہیں یا حویلی کے ملازم۔ باہر والوں کو ان رازوں سے آشنائی کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان بند دروازوں کے پیچھے بھی راز چھپے ہیں۔ اس لیے میرا مشورہ مانیں ان دروازوں سے دور ہی رہیں۔"
"ان ہی رازوں سے پردہ اٹھانے تو میں یہاں آئی ہوں اور میرا دل کہتا ہے تسنیم! ان بند دروازوں کو کھولنے میں تم ہی میری مدد کرو گی۔" ہادی نے گہری پُرسوچ نظریں تسنیم کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔
"آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں بی بی! میں آپ کے کمرے میں پہنچا دیتی ہوں۔"
"نہیں! فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اب میں اکثر تمہیں زحمت دوں گی۔ سمجھیں؟ نہیں نا؟۔ اچھی بات ہے، کچھ معاملات میں کچھ لوگوں کی سمجھ کم ہو، تب ہی بہتر رہتا ہے۔ اچھا! میں چلتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر تسنیم کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے رستے چل دی۔
تسنیم الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ یہ لڑکی رجب علی کی بیٹی ہے، یہ خبر گھومتے پھرتے اس تک بھی پہنچ ہی گئی تھی اور دل ہی دل میں اس نے بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی کیونکہ ہادی کا ہاتھ اسے عقل کی طرف سے تھوڑا تنگ لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہاں سے ہٹ کر جس وقت ہادی، حرم کے کمرے میں پہنچی تنوی اس کے کندھے پر سر رکھے زار و زار رو رہی تھی۔ حرم اسے پیار سے سہلا رہی تھی جبکہ نمل غصے سے یہاں وہاں ٹہل رہی تھی۔
"چلو۔ ابھی بڑے ابا سے بات کرتے ہیں۔ آخر شبیہہ بھائی کو کس نے اتنا اختیار دیا ہے کہ۔۔۔"
"ارے ہادی! آؤ نا۔ دروازے میں کیوں کھڑی ہو؟"
ساتھ ہی ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں نمل کو اشارہ بھی کیا کہ خاموش رہے، لیکن نمل، حرم جیسی صلح جو اور معاملہ فہم تھی اور نہ ہی تنوی جیسی ڈرپوک کہ کسی کے ڈر سے خاموش ہو جائے۔ ہادی پر ایک اڑتی پڑتی نظر ڈال کر اس وقت بھی اس نے اپنا بیان جاری رکھا تھا۔

"تنوی سمیت ہم سب پر رعب جماتے رہیں۔ یہ ساری بی جان کی دی ہوئی ڈھیل ہے اور سچی بات ہے تنوی! تمہاری بزدلی کا بھی بڑا ہاتھ ہے کہ شبیہہ بھائی اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں۔ جس وقت وہ تمہیں ڈانٹ رہے تھے دو چار کھری کھری سنائی ہوتیں تو مجال تھیں تھی کہ دوبارہ تمہیں کچھ کہتے۔"

"تمہارا ابھی دماغ ہی خراب ہے نمل!" حرم نے اس کی نان اسٹاپ چلتی زبان سے چڑ کر کہا۔

"تمہیں نہیں پتا کہ تنوی اور شبیہہ کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اگر وہ تنوی پر حق جتاتا ہے تو صرف اسی رشتے کی وجہ سے۔ تنوی کیسے اسے کچھ کہہ سکتی ہے؟"

"رشتے کی نوعیت مختلف ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان جان کو ہی آجائے۔" نمل مشکل ہی سے قائل ہوتی تھی۔ "اور پھر حق جتانے اور محض رعب جھاڑنے میں بہت فرق ہوتا ہے حرم آپا! منگیتر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ لڑکا لڑکی کو دوسرے انسانوں سے کاٹ کر ہی رکھ دینا چاہے۔"

"اچھا! اب اس بات کو ختم کرو۔" حرم نے کن انکھیوں سے ہادی کو دیکھتے ہوئے بحث سمیٹنا چاہی۔

"میں اس بحث کو ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے اتنا غصہ آرہا ہے اس لڑکی پر۔ حد ہوتی ہے بزدلی کی ہر بار کسی نہ کسی بات پر آنسو بہا کر چپ ہو بیٹھتی ہے۔ یہ نہیں کہ اسی وقت دو باتیں سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلے۔ اور اس پر سے بی جان سینئر ہٹلر یہ نہیں کہ اپنے جانشین ہٹلر جونیئر کو بھی ساتھ ہی لے جاتیں، بٹھا گئیں ہمارے سروں پر رعب جمانے کے لیے۔ کیا ہمارے ماں باپ موجود نہیں جو ہر ہدایت ہمیں شبیہہ بھائی کی طرف سے جاری کی جاتی ہے؟" نمل بہت ہی غصے میں تھی۔

"بس کرو نمل! خدارا بس کرو۔" حرم کو بری طرح تاؤ آیا۔

"ایک تو بے چاری تنوی ویسے ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اس پر سے تمہاری بک بک ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔"

"میری چڑ چڑ اس لیے ختم نہیں ہو رہی کہ شبیہہ بھائی کے سامنے آپ نے مجھے بولنے ہی نہیں دیا۔ لے کے ہاتھ دبا دیا میرا۔"

"بھائی ہے وہ ہمارا۔ اگر کسی بات پر کچھ کہہ بھی دیا تو کون سی قیامت آگئی؟ بھول بھی جاؤ۔" حرم چاہتی تھی جلد از جلد یہ موضوع ہی سمٹ جائے تاکہ ہادی کے سامنے بات کھلے ہی نہیں۔

"خوامخواہ بھول جاؤں۔ چلو تنوی پر پابندیاں لگائیں بات کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے۔ کچھ لوگ بیوی اور منگیتر کے معاملے میں پونیسو ہوتے ہیں لیکن ہمیں کیوں منع کیا کہ ہادی سے بات چیت ہی نہ کریں؟" حرم نے سر ہی پیٹ لیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہادی کے تاثرات ہی بدل چکے تھے۔

"ہیں..... مجھ سے بات کرنے سے منع کیا ہے۔ لیکن کیوں؟" وہ جواب تک ان کی ساری گفتگو سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"صرف بات کرنے سے منع نہیں کیا تم سے "دور" رہنے کے آرڈرز جاری کیے ہیں۔" نمل نے جل کر کہا۔

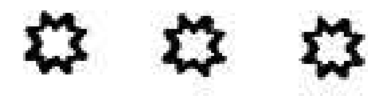
"واقعی؟" ہادی نے دلچسپ قہقہہ لگایا۔ یوں جیسے بڑی اچھی بات ہوئی ہو۔

تینوں نے بیک وقت اس کو دیکھا۔ اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات تھی آخر؟ لیکن ہادی نے ان تینوں کے تاثرات پر زیادہ توجہ نہیں دی وہ مزے سے پیر جھلاتے ہوئے دل ہی دل میں بہت کچھ سوچنے میں مصروف ہوگئی۔

"تو ثابت ہوا شبیہہ العباس بھٹی! کہ تم مجھ سے خائف ہو تب ہی تو اپنی کزنز کو مجھ سے دور رہنے کی تاکید کرتے پھر رہے ہو۔ اب آئے گا مزا۔ تمہارا نام تو شبیہہ العباس کے بجائے "کڑو بھٹی" ہونا چاہیے تھا۔ اب دیکھنا۔ میں نے بھی تمہاری بساط تم پر ہی نہ الٹ دی تو میرا نام ہادی احسان نہیں۔" وہ مزے سے ارادے باندھ

رہی تھی۔

"اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ تم تو حد ہی کرتی ہو نمل! اور تنوی اٹھ کر فوراً "منہ دھوؤ"" حرم بڑی آپا کا رول نبھاتے ہوئے بولی۔



اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ شبیہہ العباس لڑکیوں کو اس سے فاصلہ رکھنے کی تاکید کر چکا ہے، ہادی آرام سے بیٹھی ان کے ساتھ گپیں لڑاتی رہی۔ پھر جب ممی کو فون کرنے کے خیال سے وہاں سے باہر نکلی تو حرم اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"ہادی!" وہ تقریباً" آدھی راہداری عبور کر چکی تھی، جب اس نے اپنے عقب میں حرم کی آواز سنی۔ ہادی نے گردن موڑ کر دیکھا۔ حرم تیز تیز چلتی اس کی طرف آرہی تھی لیکن ہادی یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گئی کہ حرم کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

"رکو ہادی! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" حرم نے قریب پہنچتے ہوئے کہا، مبادا وہ پھر سے چل پڑے۔

"حرم!... یہ..... ؟" اس کا الجھا ہوا سا استفسار اور نگاہوں کا رخ پیروں کی طرف تھا۔

"کیا؟" حرم نے قدرے تعجب سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بے مطلب ہنس دی۔

"اچھا یہ... اوہ! میں سمجھی پتا نہیں کیا ہوا۔ یہ تو میرے پیر میں بچپن سے لنگ ہے اب تو اس کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ اگر میں لنگڑا کر نہ چلوں تو عجیب لگے گا۔ دراصل تم نے پہلی بار دیکھا ہے تو عجیب لگ رہا ہے۔"

اتنی وضاحت کے باوجود ہادی کچھ بول نہیں سکی۔

"علاج نہیں کروایا؟"

"شاید بچپن میں کروایا ہو۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔" حرم نے لاپروائی سے کہا۔

"مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے حرم! آئی ایم سوری۔" ہادی نے ہمدردی سے کہا۔

"تم کیوں دکھی ہو رہی ہو۔" حرم نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"اس حویلی میں رہی نہیں ہونا! اس لیے تمہیں کچھ بھی نہیں پتا۔ بی جان کی ساری اولادوں کو اللہ نے کسی نہ کسی آزمائش میں ضرور ڈالا ہے۔ خود ہمارے بڑے دونوں تایا ذہنی طور پر معذور ہیں۔ پھر بڑے ابا ہیں۔ انہیں اور ان کی اولاد کو کسی بیماری کی آزمائش تو نہیں ملی البتہ ان کو فیملی کا سکون نصیب نہیں ہو سکا۔ پھر ہمارے ابا ہیں تو ان کی اولاد میں سے مجھے بیماری ملی ہے۔ اف ہادی! تم کیا کیا سنو گی۔ بڑی لمبی داستان ہے۔ تم چھوڑو اس بات کو۔ میں تو تم سے صرف اتنا کہنے آئی تھی کہ پلیز! نمل کی باتوں کو سیریس مت لینا۔ شبیہہ نے تو ذرا سی بات کہی تھی اس نے بات کا بتنگڑ ہی بنا دیا۔ شبیہہ دل کا برا نہیں ہے۔ پتا نہیں کس جھونک میں کہہ گیا ہوگا۔ تم پلیز اس کی باتوں کو دل پر مت لینا۔" حرم بے چاری اپنی ذمہ داری نبھا رہی تھی۔

"ارے نہیں! (میں کسی کی باتوں کو دل پر نہیں لیتی۔ لیکن بدلہ ضرور لیتی ہوں اور شبیہہ العباس سے بھی بدلہ ضرور لوں گی۔)" وہ مسکرا مسکرا کر دل ہی دل میں ارادے باندھ رہی تھی، جبکہ حرم کہہ رہی تھی۔

"شبیہہ العباس ہمیشہ سے بی جان کے قریب رہا ہے۔ بی جان اس کی باتوں کو بہت اہمیت دیتی ہیں تو اسی وجہ سے ہمیں بھی اس کی ہر صحیح غلط بات کو ماننا پڑتا ہے۔ اب تو خیر عادت ہی ہوگئی ہے لیکن نمل ابھی چھوٹی ہے اسی لیے ہر بات پر اعتراض کرنا شروع کر دیتی ہے۔"

"اور تنوی؟" ہادی نے پوچھا۔ "آئی مین! تنوی اتنا کیوں رو رہی تھی؟ کیا اس کے نزدیک شبیہہ العباس کی بات

اہم نہیں ہے؟"

"اس کے لیے تو سب سے اہم ہے۔" حرم نے ہنس کر کہا۔

"شبیہہ بی جان کا لاڈلا ہے اور تنوی بی جان کی چھوٹی بیٹی کی نشانی۔ اسی لیے دونوں ہی بی جان کو عزیز ہیں۔ اسی بنا پر بی جان نے تنوی کے پیدا ہوتے ہی اسے شبیہہ سے منسوب کر دیا تھا۔ اب میں اور نمل تو شبیہہ کی کسی بات سے پھر بھی انکار کر سکتے ہیں، لیکن تنوی ہرگز نہیں۔"

"اچھا!" ہادی کو تعجب ہوا۔

"کیا منسوب ہونے کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ لڑکی اپنے سارے اختیارات چھوڑ دے؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"ارے نہیں!" حرم ذرا سٹپٹا گئی۔

"دراصل تنوی کچھ خود بھی بزدل ہے۔ اسے اپنا حق لینا آتا ہی نہیں ہے اور کچھ شبیہہ بھی بے جا روک ٹوک کر کے زیادتی کر جاتا ہے، پھر تنوی کو پالا بھی میری امی نے ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل میری امی کے جیسی ہے یعنی فطرتاً" اور عادتاً"۔۔۔ ہم بہن بھائیوں میں سے تو سچی بات ہے، جلال کے علاوہ کسی نے بھی امی کی عادات نہیں لیں۔ ہاں! تنوی ہو بہو ان کی کاپی ہے۔ ویسی ہی صلح جو کسی حد تک بزدل۔ شبیہہ کی ہر کھوٹی کھری من من کر تنوی نے بھی اسے سر چڑھا لیا ہے، ورنہ سچی بات ہے، شبیہہ دل کا برا ہرگز نہیں ہے۔"

ہادی نے اس بات پر تبصرہ کرنا کچھ ضروری نہ سمجھا۔

"اور تنوی کے پیرنٹس؟ اس کی ممی کو تو میں نے اب تک نہیں دیکھا۔"

"یہ بھی بڑی افسوس ناک بات ہے کہ تنوی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں تنوی کے والد نے زریں پھپھو کو طلاق دے دی تھی اور تنوی شاید بمشکل ڈیڑھ سال کی ہوگی، جب پھپھو کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔"

"اوہ۔۔۔" ہادی فقط یہ ہی کہہ سکی۔ یہ بڑی افسوس ناک خبر تھی۔ ممی کے اصرار کے باوجود وہ بنیادی طور پر زریں کی تلاش میں ہی حویلی آئی تھی اور اب ان کے انتقال کی خبر نے اسے ازحد دکھی اور مایوس کر دیا تھا۔ معاً" اسے تسنیم دکھائی دی وہ لان سے گزر کر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جا رہی تھی۔

یکایک ہادی کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔

"حرم! تم نے کہا، ہمارے دو تایا ذہنی طور پر معذور ہیں، لیکن میں نے تو ابھی تک انہیں بھی نہیں دیکھا۔"

"نجیب تایا کی تو خیر چھوٹی عمر میں وفات ہو گئی تھی جبکہ زبیر تایا جی حیات ہیں، مگر حویلی کے اندر ان کا اتنا آنا جانا نہیں۔ اب تو خیر! کچھ بیماری اور کچھ بڑھتی عمر کی وجہ سے ضعیف بھی ہو گئے ہیں۔ خود سے چل پھر بھی نہیں سکتے۔ تم نے ابھی بی جان کو نہیں دیکھا۔ زندگی میں اتنے مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود انہوں نے خود کو بہت فٹ رکھا ہے۔ اگر کسی کو بتایا جائے کہ زبیر تایا جی ان کے بیٹے ہیں تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

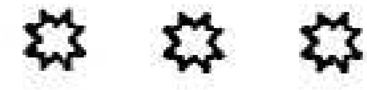
حرم اسے جو تفصیلات بتا رہی تھی ان سے ہادی کو چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کی پرسوچ نگاہیں تو تسنیم کے تعاقب میں تھیں۔

"تو اگر حویلی کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے تو زبیر تایا جی کہاں رہتے ہیں؟" اس نے اگلا سوال اٹھایا۔

"حویلی کے پچھلے حصے میں بی جان نے کچھ کمرے بنوا رکھے ہیں ان ہی میں سے ایک کمرے میں تایا جی رہتے ہیں۔ ملازمین ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے ہیں۔"

"ہوں۔" ہادی نے محض اتنا ہی کہا تھا۔ گو کہ ذہن میں سوال سر اٹھا رہے تھے کہ باقی کمروں کو کس مقصد کے

لیے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس سوال کا جواب اسے خود ڈھونڈنا تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی محرم اسے خاطر خواہ جواب نہیں دے سکے گی۔



شام سے ذرا بعد کا وقت تھا جب ملازمہ مستقیم بھٹی کا بلاوا لیے چلی آئی۔

ہادی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ موسم کی مناسبت سے ہلکے نیلے رنگ کی لانگ شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ متوقع اعتراضات سے بچنے کے لیے گلے میں اسٹول بھی ڈال لیا تھا اب کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے ملازمہ سے اپنے لیے کافی بھجوانے کے لیے کہا اور اسی کی ہمراہی میں مستقیم بھٹی کی اسٹڈی میں آ گئی۔

"السلام علیکم!"

مستقیم بھٹی چشمہ لگائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے جب ہادی نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! آؤ ہادی! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" مستقیم بھٹی نے کتاب بند کرتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیسا گزر رہا ہے وقت؟ کوئی دقت تو پیش نہیں آ رہی؟"

"ارے! دقت کیسی۔ یہاں سب اپنے ہی تو ہیں۔۔۔ اور سچ بات ہے کہ مجھے یہاں اچھا بھی بہت لگ رہا ہے۔ آفٹر آل میرے بابا کی یادیں جڑی ہوئی ہیں اس حویلی سے اور آپ سب لوگوں سے۔" ہادی نے ہنس کر کہا اور صاف محسوس کیا کہ اس آخری بات پر مستقیم بھٹی کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات دکھائی دیے ہیں۔

"لیکن میرا خیال ہے، کچھ لوگوں کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا۔"

اس نے معصومیت سے پتا چلایا۔ "آئی مین۔۔۔ دیکھیے! میں سمجھ نہیں پا رہی کہ مجھے آپ سے یہ کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ابھی حویلی میں رہنا چاہتی ہوں اور سب لوگوں کے ساتھ اچھا ٹائم گزارنا چاہتی ہوں مگر۔۔۔" وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے الجھ رہی ہو بات کا سرا اسے نہ مل رہا ہو۔

"تم کو جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔" مستقیم بھٹی نے دلچسپی اور سنجیدگی سے کہا۔ "کسی سے ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ڈر یا گھبراہٹ والی تو کوئی بات نہیں ہے تایا جان! لیکن مجھے عجیب سا لگا، جب لڑکیوں نے بتایا کہ شبیہہ العباس نے انہیں مجھ سے بات چیت کرنے سے منع کیا ہے۔ اور یہ بہت انسلٹنگ لگا مجھے۔"

"کیا؟ شبیہہ العباس نے ایسا کہا ہے؟" مستقیم بھٹی نے اچنبھے سے پوچھا۔

"جی ہاں! بالکل۔۔۔ اور میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس نے ایسی بات کس بیس (بنیاد) پر کی ہے۔ میری اس سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔"

اس نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ اب یہ ہادی کی خوش قسمتی تھی یا شبیہہ کی بد قسمتی کہ وہ اسی وقت کسی کام سے اسٹڈی میں چلا آیا اور ہادی کو وہاں موجود پا کر اپنی ناپسندیدگی کے تاثرات چھپا نہیں سکا۔

"آپ شاید مصروف ہیں۔ میں پھر آ جاؤں گا۔"

"رکو شبیہہ!" مستقیم بھٹی کی آواز پر اس کے پلٹتے قدم تھم گئے۔

"جی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مستقیم بھٹی کی طرف دیکھا۔

"تم نے حرم، تنوی اور نمل کو ہادی سے بات چیت کرنے سے منع کیا ہے؟" ان کا لہجہ سخت تھا۔ شبیہہ اتنی

واضح جواب طلبی کی توقع نہیں کر رہا تھا لمحہ بھر کو گڑبڑایا تھا لیکن اگلے ہی پل اس کا اکل کھرا پن عود کر آیا۔

"جی۔"

"وجہ جان سکتا ہوں؟" مستقیم بھٹی کا لہجہ سخت تھا۔

ماویٰ کو دل ہی دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔

"میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے وابستہ کوئی بھی انسان اس سے بات کرے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ان تینوں کا جو رشتہ تم سے ہے وہی ماویٰ سے بھی ہے پھر تمہیں کس نے اتنا حق دیا ہے کہ انہیں ماویٰ سے بات کرنے سے روکو؟" مستقیم بھٹی نے بھڑک کر کہا۔

"لیکن ابا۔۔۔" شبیہہ نے کہنا چاہا۔

"بس۔" مستقیم بھٹی نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"تم جا سکتے ہو۔ مجھے تم سے فی الحال کوئی بات نہیں کرنا۔۔۔ اور ہاں! اگلی بار بھول کر بھی کسی کو ہدایات جاری کرنے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ خصوصاً ماویٰ کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔"

شبیہہ کا چہرہ توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر ماویٰ کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اطمینان سے دائیں ٹانگ بائیں پر رکھے فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

شبیہہ تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

"ماویٰ!" مستقیم بھٹی کی آواز نے اسے چونکایا۔

"جی۔" وہ قدرے گڑبڑا کر متوجہ ہوئی کہ شبیہہ کی درگت بنتے دیکھ کر بری طرح مسکرا رہی تھی۔

"شبیہہ کی طرف سے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ یہ ذرا سرپھرا ہے لیکن تمہیں دوبارہ اس کی طرف سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔"

"پلیز تایا جان! اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" اس نے ہوشیاری سے کہا اور دل ہی دل میں خود سے بے حد متاثر ہوئی کیونکہ وہ ہرگز نہ جانتی تھی کہ وہ اتنی باصلاحیت ہے۔ بھئی! ایک تیر سے دو شکار کرنا کوئی معمولی بات تو نہیں ہے نا۔

اگر مستقیم بھٹی سامنے نہ ہوتے تو یقیناً وہ اپنا کندھا تھپک چکی ہوتی۔ وہ مزے سے مستقیم بھٹی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ تب ہی تسنیم ماویٰ کے لیے کافی لے کر آئی۔

"چوہدری صاحب! آپ سے بات کرنی تھی۔" وہ مودب ہو کر بول رہی تھی۔

ماویٰ نے پرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پہلا گھونٹ لیا۔ "لاحول ولا قوۃ" اس قدر بدمزا کافی۔"

"تسنیم! یہ کافی تم نے بنائی ہے؟" بدمزا کافی کے گھونٹ کے باوجود اسے خیال آیا تو پوچھ لیا۔

"جی بی بی!"

"بہت اچھی کافی بنائی ہے تم نے۔" اس نے مرے دل سے ملکین جوش کے ساتھ کہا۔ "سنو۔۔۔ اب سے ہر بار میرے لیے کافی تم ہی بنانا۔"

"ہاں بھئی۔۔۔ بی بی کو تمہارے ہاتھ کی کافی پسند ہے تو تم ہی بی بی کے لیے کافی بنانا۔ خیال رہے ماویٰ بی بی کو کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔"

مستقیم بھٹی نے فوراً اس کی مشکل آسان کر دی۔ ماوی اطمینان سے کافی کے کڑوے کسیلے گھونٹ بھرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

انیجا بے حد پریشان تھی۔ ولید کی طرف سے اس کی فکرمندی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ یہ ساری الجھنیں کس سے ڈسکس کرے۔ ممی بیمار تھیں اور پھر دور بھی جبکہ ڈیڈی کو تو لگتا تھا کسی معاملے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ وہ صبح جلدی آفس جاتے اور رات گئے ان کی واپسی ہوتی تھی۔ ماویٰ اور ثمینہ آنٹی بھی بہت دن ہوئے انیکسی چھوڑ کر جا چکے تھے ورنہ وہ ضرور ماویٰ سے ڈسکس کرتی۔

اس روز بھی وہ ولید کے لیے فکرمند ہو کر نماز کے بعد رونے لگی۔ اچھی خاصی پرسکون زندگی کی جھیل میں اتنے سارے پتھر ایک ساتھ۔ تلاطم تھا کہ تھمتا ہی نہ تھا۔ پتھروں کے تہ میں بیٹھنے کا انتظار کرتا تھا لیکن یہاں تو ایک کے بعد ایک پتھر تھا کہ آئے چلا جا رہا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی کہ ڈور بیل نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت چار بجے تھے۔ ڈیڈی یا ولید کی آمد بھی غیر متوقع تھی اور کسی مہمان کے آنے کا تو چانس ہی نہ تھا۔ بڑے شہروں میں تو اب اچانک آ کر سرپرائز دینے کا رواج بھی نہیں رہا۔

وہ سوچتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلی اور عادتاً بالائی منزل کی ریلنگ سے نیچے لاؤنج میں جھانکا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس وقت سچ مچ ایک سرپرائز اس کا منتظر ہو گا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے شبیہہ؟"

مستقیم بھٹی بنا دستک دیے جارحانہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ شبیہہ اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف تھا اس نے گردن موڑ کر لاتعلق سی نگاہ ان پر ڈالی۔

"اس دو ٹکے کی لڑکی کے سامنے میری انسلٹ کر کے آپ کی تسلی نہیں ہوئی جو آپ پھر مجھ سے سوال جواب کرنے آ گئے ہیں؟" اس کا لہجہ گو کم سرد مہر لیکن تمیز سے عاری تھا۔

مستقیم بھٹی کا چہرہ اشتعال سے سرخ ہو گیا۔

"دو ٹکے کی لڑکی؟ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ ماویٰ کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کرو۔ عورت کی عزت کرنا سیکھو شبیہہ! ورنہ ساری زندگی نقصان اٹھاؤ گے۔" ان کا لب و لہجہ ان کے غصے کا غماز تھا۔

"آپ بھول رہے ہیں، آپ نے مجھے عورت کی عزت کرنا کبھی نہیں سکھایا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں جیسے جوتا ان کے منہ پر دے مارا تھا۔

"ایک وقت پر میں اپنی سگی ماں کے لیے آپ کے منہ سے اس سے کہیں زیادہ برے لفظ سنتا رہا ہوں جیسے لفظ میں اس لڑکی کے لیے بول رہا ہوں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ جب آپ کو ایک عورت کے لیے کچھ بولتے ہوئے برا نہیں لگا تو دوسری عورت کے لیے سنتا کیوں برا لگ رہا ہے؟"

"یہ تم نہیں۔۔۔ تمہارے منہ میں اماں کی زبان بول رہی ہے۔" مستقیم بھٹی نے تنفر سے کہا۔ "مجھے ساری عمر پچھتاوا رہے گا کہ میں نے تمہاری تربیت کا ذمہ انہیں سونپ دیا۔ انہوں نے تمہیں بھی اپنے جیسا خودسر اور ضدی بنا دیا۔"

"آپ کو پچھتانا بھی چاہیے لیکن افسوس اس پچھتاوے کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ کس نے کہا تھا مجھے بی جان کی گود میں ڈالیں؟ انہیں میری تربیت کرنے دیں؟ میری ماں کو کیوں نہیں رہنے دیا آپ نے میری زندگی میں؟ اچھا ہوتا، برا ہوتا کم سے کم میری تربیت تو ان کے ہاتھوں ہوتی۔ آپ نے آپ کی سابقہ بیوی نے اپنے جھگڑے میں میری پروا نہیں کی۔ ایسے میں بی جان نے مجھے سنبھالا۔ اب میں انہیں کیسے برا کہہ سکتا ہوں۔۔۔ جبکہ مجھے اپنی

پوری زندگی میں نہ کبھی ماں کی محبت کا احساس ہوا اور نہ کبھی باپ کی موجودگی کا۔“

مستقیم بھٹی بے حد غصے میں آئے تھے ‘لیکن اس وقت اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا شبیہہ۔ اس کی بظاہر اس متوازن پرکشش شخصیت کے پیچھے جو ٹوٹ پھوٹ مچی رہتی تھی ‘اس میں سراسر قصور ان ہی کی کوتاہیوں کا تھا‘ پھر آخر وہ کیوں بار بار ہر بات کا الزام اماں کے سر ڈال کر بری الذمہ ہو جانا چاہتے تھے۔

شبیہہ کہہ رہا تھا۔

”بی جان کی شخصیت کی خامیوں سے آپ تو واقف تھے ‘پھر آپ نے کیوں مجھے انہیں سونپ دیا؟ کیوں نہیں مجھے اپنے جیسا بنالیا؟ افسوس تو یہ ہے کہ نہ میں مکمل طور پر بی جان کے قالب میں ڈھل سکا۔ نہ آپ جیسا بنا اور۔۔۔ اور نہ اپنی ماں جیسا۔۔۔ میری تو کوئی انفرادی شخصیت بھی نہیں ہے ابا! اور آپ مجھ سے خدا معلوم کیا کیا توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔۔۔ مجھے آپ کی بھتیجی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے ‘لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہمیں کوئی نہ کوئی نقصان ضرور پہنچائے گی۔ بی جان نے زندگی میں بھلے ہی بہت سے غلط فیصلے کیے ہوں ‘لیکن ان کے کیے ہوئے درست فیصلوں کو بھی آپ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ اس لڑکی کو حویلی میں ٹھہرانے جیسا فیصلہ بی جان سے پوچھے بغیر آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا۔ اب اس معاملے پر میں آپ سے مزید کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔“

مستقیم بھٹی جب اس کے کمرے سے نکلے تو ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور الفاظ گم ہو چکے تھے۔ ہم ہمیشہ بڑے آرام سے دوسروں کو کٹہرے میں کھڑا کر کے احتساب کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ خود کٹہرے میں کھڑے ہو کر احتساب دینا بھی پڑ سکتا ہے۔



انبہا ‘فیضان کو اس طرح دیکھ رہی تھی جس طرح کوئی خواب کا منظر اس کے سامنے ہو۔ بن مانگی دعا مجسم ہو کر اس کے سامنے آگئی تھی۔

”آ۔ آپ کب آئے؟“ بے یقینی اور دبی دبی سی خوشی اس کے لہجے اور آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

فیضان خوبصورتی سے مسکرا دیے اور اس کے معصوم چہرے کو آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے بولے۔

”اب تو کافی سال گزر چکے۔“

”جی۔“ انبہا نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا ‘پھر کھسیانی ہو کر ہنس دی۔

”آپ پلیز! بیٹھیں۔ کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں اور تم؟“

اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ دل چاہتا تھا ان کے چہرے سے نظریں ہی نہ ہٹائے۔ اس نے تو سوچا تھا شاید یہ قصہ ختم ہو چکا ‘لیکن فیضان کو موجود پا کر دل و دماغ کو ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی جو بیان سے باہر تھی۔

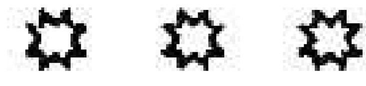
”میں انیکسی کی طرف گیا تھا ‘لیکن وہ لاکڈ ہے۔ شاید ثمینہ آپا اور ماوی کہیں گئی ہوئی ہیں۔ اسی لیے میں ادھر آگیا۔ اگر تمہارے پاس ڈپلیکیٹ کی ہے تو۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ شاید۔ آپ نے اچھا کیا ادھر آگئے۔ میں انیکسی کھلوا دیتی ہوں۔ شازیہ۔۔۔“ پھر ساتھ ہی کچھ خیال آنے پر بولی۔

”آپ کھانا کھائیں گے؟“

”نہیں! کھانا تو میں فلائٹ میں کھا چکا ہوں۔ ابھی تو سوؤں گا ‘پھر اس کے بعد چائے۔ اس وقت تک تو شاید ثمینہ آپا اور ماوی بھی آچکی ہوں اور دانیال بھائی بھی۔“ فیضان نے کہا۔

”او ہاں۔“ انبہا نے کچھ خیال آنے پر بہت سی باتیں ٹال دیں اور شازیہ کو بلا کر انیکسی سے متعلق ہدایات دینے لگی۔



ماوی کو حویلی میں رہتے تقریباً“ تین ہفتے گزر چکے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان تین ہفتوں میں اس نے بہت انجوائے کیا تھا گو کہ شہوز اور شزا کے ساتھ بھی اس نے بہت یادگار وقت گزارا تھا لیکن یہاں کی بات ہی اور تھی حرم ‘تنوی اور نمل کے ساتھ ساتھ دونوں بھابھیوں سے بھی اس کی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ سب کے ساتھ مل کر حرم کی شادی کی تیاریوں میں بھرپور حصہ لے رہی تھی اور ان سب کے زرق برق کپڑے اسے بہت متاثر کرتے تھے۔

عالیہ نرم طبیعت کی مہربان خاتون تھیں۔ وہ بالکل ماؤں کی سی شفقت کے ساتھ اس کا خیال رکھتیں ‘لیکن اتنی اچھائی کے باوجود ان کے اندر بے وقوفی کی حد تک سادگی موجود تھی جو کہ بیچ بیچ جلال اور تنوی میں دکھائی دیتی تھی۔

تنوی نے اپنی نانی یعنی جنت بیگم کا صرف نام اور خوبصورتی لی تھی فطرتاً“ وہ اس عورت کے بالکل برعکس تھی۔

حویلی میں ٹڈی دل کی طرح ملازمین بھرے ہوئے تھے اور اتنے ملازمین کی کھیپ میں سے وہ کسی نہ کسی طرح تسنیم کا اعتماد حاصل کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ شاید اس میں کچھ ہاتھ تسنیم کا اپنا بھی تھا۔ وہ پراسراری لڑکی تھی۔ مالکان کے ڈر سے غالباً“ کھل کر بات نہ کرتی تھی ‘البتہ ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کر جاتی تھی کہ ماوی اور محتاط ہو جاتی۔

شبیہہ العباس نے اس کے بعد دوبارہ اس کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی ‘البتہ ماوی وقتاً“ فوقتاً“ اس پر طنزیہ فاتحانہ نگاہیں ڈال لیتی تھی جس سے وہ سلگ کر رہ جاتا مگر مصلحتاً“ خاموش رہتا۔ چند روز بعد وہ واپس لاہور چلا گیا ان تین ہفتوں کے دوران وہ صرف ایک مرتبہ ایک دن کے لیے آیا تھا۔

ماوی شروع میں ہر چھوٹی چھوٹی تفصیل ثمینہ کو بتاتی رہی تھی ‘مگر پھر اس نے یہ سلسلہ محدود کر دیا۔ جب تک جنت بیگم نہ آجاتیں ‘اس کے پاس بتانے کے لیے ایسی کوئی تفصیل نہ تھی جسے سن کر ثمینہ خوش ہوتیں۔

ماوی یہاں جنت بیگم سے ملنے آئی تھی اور اس عورت کے متعلق اتنا کچھ جان لینے کے باوجود وہ کسی قسم کی گھبراہٹ یا ڈر کا شکار نہ تھی ‘البتہ جلال کا سامنا کرنے کے خیال سے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی تھی اور وہ شرمندگی کا شکار ہو جاتی تھی۔

ایک عام سے دن وہ جب صبح بیدار ہوئی اور ساتھ ہی اپنی بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ آج اسے بیدار ہونے میں تھوڑی تاخیر ہو گئی تھی۔ تیز چمکیلی دھوپ کی کرنیں بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے جو کمرہ دیا گیا وہ حویلی کی دوسری منزل پر تھا اور یہاں سے حویلی کے مرکزی پھاٹک کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ معاً“ اسے ڈرائیووے پر کچھ گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ ایک گاڑی کے پاس شبیہہ العباس کھڑا کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔

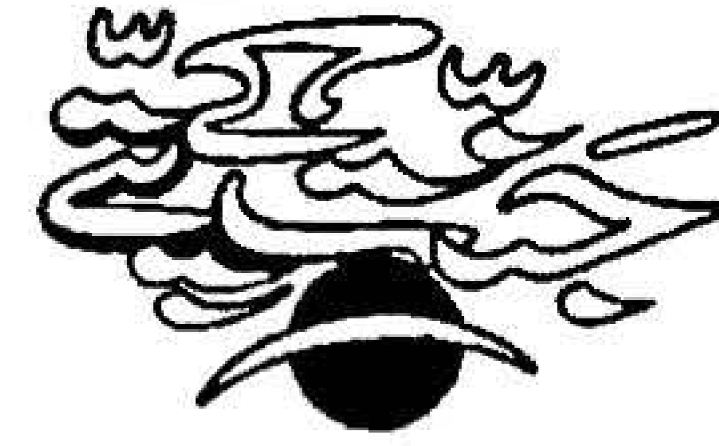
ماوی کی چھٹی حس یکدم بیدار ہوئی۔ وہ چونک کر سیدھی ہوئی اور اس نے بغور اس عورت کو دیکھا جس کے نقوش تو اتنی دور سے بہت واضح نہیں ہو رہے تھے ‘مگر اس کا مجموعی تاثر خوبصورتی کا تھا اور اس کی شخصیت سے شاہانہ پن اور رعونت جھلکتی تھی۔

”ہو نہ ہو۔۔۔ یہی جنت بیگم ہے۔“ ماوی نے زیر لب کہا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مکمل ناول

نمرہ احمد



سلیمان صاحب کے دو بچے ہیں' حیا اور روحیل۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا ہے۔ حیا سلیمان کو یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے منتخب کیا۔ اب وہ پانچ ماہ کے لیے ترکی جارہی ہے۔ حیا سلیمان کا ایک برس کی عمر میں سبین پھپھو کے آٹھ سالہ بیٹے جہان سکندر سے نکاح ہوچکا ہے۔ سبین پھپھو ترکی میں رہتی ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار فون پر رابطہ کرلیتی ہیں۔ بائیس سال پہلے ہونے والے نکاح کو سب جیسے بھول چکے ہیں مگر حیا کے لیے وہ رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تایا فرقان کے بیٹے داور کی مہندی کے فنکشن میں حیا اور ارم (تایا فرقان کی بیٹی) کے ڈانس کی ویڈیو کوئی انٹرنیٹ پر چلا دیتا ہے۔ حیا بدنامی کے خوف سے سائبر کرائم سیل سے رابطہ کرتی ہے۔ وہاں میجر احمد سے میٹنگ ہوتی ہے۔ وہ حیا کے بارے میں ہر بات جانتا ہے۔ حیا کے شکایت کرنے پر وہ ویڈیو ہٹا دیتا ہے۔

تایا فرقان اپنی بیٹی ارم کو سر پر دوپٹہ اوڑھنے کی سختی سے تاکید کرتے ہیں' جبکہ سلیمان صاحب قدرے آزاد خیال ہیں۔ سلیمان صاحب حیا کے نکاح کو بھول کر اس کی شادی اپنے دوست کے بیٹے ولید لغاری سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ولیمہ والے دن حیا سے بے ہودگی کرتا ہے تو ایک خواجہ سرا ڈولی اس کی عزت بچاتا ہے۔ یہ خواجہ سرا حیا کو اکثر اہم مواقع پر ملتا رہتا ہے۔

حیا کے ساتھ اس کی کالج فیلو خدیجہ عرف ڈی جے ترکی جارہی ہے۔ وہ دونوں بہت جدوجہد کرکے پاسپورٹ اور ویزا بنواتی ہیں۔ دونوں کی دوستی ہوجاتی ہے۔



ایکسچینج کا فارم بھرنے کے بعد حیا اور خدیجہ ترکی کے لیے روانہ ہوتی ہیں اسلام آباد جاتے ہوئے فلائٹ میں انہیں عثمان شبیر ملتے ہیں۔ ابوظہبی ایئرپورٹ پر ایک حبشی فون بوتھ پر ان کی مدد کرتا ہے۔ چغتائی اور احمت انہیں ترکی میں ریسیو کرتے ہیں۔ پھر ترک لڑکی ہالے ہاسٹل تک ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ ترک روایت کے مطابق خدیجہ اور حیا کی مسز عبداللہ اپنے گھر دعوت کرتی ہیں جو حیا کو پاشا کے متعلق بتاتی ہیں مگر ہالے اس بیان کی تردید کردیتی ہے۔ ہالے، حیا کو جہان کے گھر لے جاتی ہے۔ جہان سکندر سرد مزاجی سے حیا سے ملتا ہے جبکہ سبین پھپھو محبت سے ملتی ہیں۔ جہان کے گھر میں حیا کو پھر سفید پھول ملتے ہیں، جس پہ جہان خفا ہوتا ہے۔

حیا نک سک سے تیار ہو کر اپنے ہاسٹل سے باہر نکلتی ہے تو جہان مل جاتا ہے۔ وہ گزشتہ دن کے برعکس کافی خوش اخلاقی سے ملتا ہے اور اسے کھانا کھلاتا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ بھی پاشا کے وجود سے انکار کرتا ہے۔

ہاسٹل میں خدیجہ اور حیا کو رات کا کھانا خود پکانا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی میں ان کی ملاقات انجم نامی انڈین خاتون سے ہوتی ہے ان کے شوہر جاوید پروفیسر ہیں۔ حیا اپنی پھپھو کے گھر ان سے ملنے جاتی ہے تو کسی کام سے اسٹور میں جانا پڑتا ہے۔ وہاں ایک شخص آکر حیا کی گردن دبوچ لیتا ہے۔

۳
تیسری قسط

"چھوڑیں۔" دھاڑ سے دروازہ کھلا اور کوئی غصے سے چلاتا اندر آیا۔ اس کی گردن کے گرد جکڑے ہاتھ کو کھینچ کر الگ کیا اور ادھ کھلا ڈھکن پورا کھول کر دوہری ہو کر اوندھی جھکی حیا کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

"کیا کر رہے تھے آپ؟ وہ آپ کی بیٹی کی طرح ہے، ایک بات میری دھیان سے سنیں۔ آئندہ اگر آپ نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہو گا۔"

انگشت اٹھا کر سختی سے وہ انہیں تنبیہہ کر رہا تھا۔ جہان کو دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر خاموشی سے اسے سنتے گئے۔

"اور تم!" وہ حیا کی طرف پلٹا۔ ایک غصیلی نگاہ اس پہ ڈالی، اور کہنی سے پکڑ کر کھینچتا باہر لایا۔ "اوپر کیوں آئی تھیں؟ کس نے کہا تھا ادھر آؤ؟"

سیڑھیوں کے دہانے پہ لا کر اس نے حیا کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چہرہ دہشت سے اس کا رنگ لباس کی مانند زرد پڑ چکا تھا۔ گردن پہ انگلیوں کے سرخ نشان پڑے تھے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"وہ پھپھو نے..."

"پھپھو کا بیٹا مر گیا تھا جو انہوں نے تمہیں بھیجا؟ منع بھی کیا تھا، مگر یہاں کوئی سنے تو۔" وہ غصے میں بولتا اسے کہنی سے پکڑے نیچے سیڑھیاں تیزی سے اترنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آرہی تھی۔

پھپھو پریشان سی آخری سیڑھی کے پاس کھڑی تھیں۔

"میں بکواس کر کے گیا تھا نا، مگر میری سنتا کون ہے اس گھر میں؟ دو دن کے لیے نہ ہوں تو سارا نظام الٹ جاتا ہے۔ پورے گھر کو پاگل کر دیا ہے انہوں نے۔"

وہ آگے بڑھا اور سینٹر ٹیبل پہ رکھی میز سے پانی کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

وہ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی۔ جہان کو اتنے شدید غصے میں اس نے پہلی دفعہ دیکھا اور اتنی شستہ اردو بولتے ہوئے بھی۔

"میں... میں انہیں دیکھتی ہوں۔" پھپھو پریشانی سے کہتے ہوئے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

وہ گھونٹ پہ گھونٹ چڑھاتا گیا۔ بوتل خالی کر کے میز پہ رکھی اور اس کی طرف دیکھا۔

"باہر آؤ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ ڈری، سہمی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آئی۔

وہ بیرونی دروازے کے آگے بنے اسٹیپس پہ بیٹھا تھا۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ آبیٹھی۔ زرد فراک پھسل کر اس کے ننگے پاؤں کو ڈھانپ گیا۔ باہر سردی تھی، مگر اسے نہیں لگ رہی تھی۔

"جو بھی ہوا، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

نیلی جینز کے اوپر پہنے بھورے سوئیٹر کو عادتاً کہنیوں سے ذرا آگے تک موڑے، وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ غصہ اب کہیں نہیں تھا وہ ہمیشہ والا دھیما اور سنجیدہ جہان بن گیا تھا۔

"ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔ کئی دفعہ انہوں نے ممی کو بھی مارنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے کچھ نہیں کہتے۔ ڈرتے نہیں ہیں، شاید نفرت کرتے ہیں۔"

سامنے سبزہ تھا۔ اس سے آگے سفید لکڑی کی باڑ اور باڑ سے ہی بنا گیٹ، باڑ کے تختوں کی درزوں سے باہر گلی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ نم ہوا گھاس پر سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے چہرہ جہان کی جانب موڑے بیٹھی تھی۔ فراک کا فرش کو چھوتا دامن ہوا کی لہروں سے پھڑپھڑاتا ہوا اوپر اٹھ جاتا تو پاجامے کی تنگ چوڑیوں میں مقید اس کے ٹخنے اور پاؤں جھلکتے۔

"میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں پاکستان جاؤں۔ اپنے رشتہ داروں کے درمیان رہوں، اپنا آبائی گھر دیکھوں، مگر ہم پاکستان نہیں جاتے اور تم اس روز ممی کو طعنہ دے رہی تھیں کہ ہم پاکستان نہیں آتے۔"

"نن... نہیں۔" وہ گڑبڑا گئی، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"حیا! ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جاسکتے۔"

"مگر کیوں؟" وہ سنانے میں رہ گئی۔ وہ چند لمحے چپ رہا، پھر آہستہ سے کہنے لگا۔

"میرے دادا اپنے کاروبار کے سلسلے میں استنبول آیا کرتے تھے۔ اس گھر کی زمین انہوں نے ہی خریدی تھی بعد میں ابا نے ادھر گھر بنوایا۔ تب وہ پاکستان آرمی کی طرف سے یہاں پوسٹڈ تھے۔ میں استنبول میں ہی پیدا ہوا تھا اور ابا کی دوبارہ اسلام آباد پوسٹنگ ہونے کے بعد بھی میں اور ممی ادھر دادا کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے دادا بہت اچھے، بہت عظیم انسان تھے۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ دین، دنیا، عزت، بہادری اور وقار سے جینے اور شان سے مرنے کا سبق انہوں نے ہی مجھے دیا تھا۔ میں آٹھ سال کا تھا، جب دادا فوت ہوئے تو میں اور ممی کچھ عرصے کے لیے پاکستان آگئے اور تب ہی وہ واقعہ ہوا، جس نے ہماری زندگی بدل دی۔"

حیا کا سانس رک گیا۔ تب ہی تو ان کا نکاح ہوا تھا، تو کیا وہ باخبر تھا...؟

"جن دنوں میں اور ممی پاکستان میں تھے، بلکہ تمہارے گھر میں تھے، ابا آناً فاناً ترکی فرار ہو گئے۔ فرار اس لیے کہ انہوں نے ایک حساس مقام کے بلیو پرنٹس ان کو بیچ دیے تھے جو ہمیشہ خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ثبوت انہوں نے کوئی نہیں چھوڑا، مگر تفتیش شروع ہوئی تو بہت کچھ کھلنے لگا۔ ابا نے ترکی سے ہی اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ پیچھے عدالت میں مقدمہ چلا اور وہ غدار ٹھہرائے گئے۔ ان کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی۔ ان کو سزائے موت سنا دی گئی اور انہوں نے ترکی میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ کچھ تعلقات کام آئے اور کچھ رشوتیں، ابا کو ترک حکومت کبھی ڈی پورٹ نہ کر سکی، نہ ہی انٹرپول نے کوئی قدم اٹھایا۔ قصہ مختصر، ابا جس دن پاکستان کی سرزمین پہ قدم رکھیں گے، وہ گرفتار ہو جائیں گے اور ان کو پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ بات تمہارے والدین کو پتا ہے،

مگر بدنامی کے ڈر سے کسی کوتاہی نہیں جاتی۔"

وہ کسی بھی جذبے سے عاری نگاہوں سے سامنے باڑ کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔ حیا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"میں ایک غدار کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ ایک ملک دشمن ہے۔ اس ذلت کے باوجود ہم ابا کے ساتھ رہنے پہ مجبور ہیں۔ احساس جرم ہے یا قدرت کی سزا' وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ذہن کھوتے جا رہے ہیں۔ سزائے موت کا خوف ان کے لیے ناسور بنتا جا رہا ہے جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا' اس پہ ان کو معاف کر دینا۔ وہ میرے باپ ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ حقیقت بہت جگہ پر میرا سر جھکا دیتی ہے' میں ان سے محبت کرنے پر مجبور ہوں۔"

حیا نے گہری سانس لی۔ اس کے کسی قصے میں اس کا قصہ نہیں تھا' کسی داستان میں اس کی داستان نہ تھی۔

"میں کام سے باہر جا رہا ہوں' آج کھانا کھا کر جانا۔"

وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شاید وہ صرف ابھی تنہائی چاہتا تھا۔

حیا گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پہ چلتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔



"حیا۔۔۔ خدیجہ!"

ٹالی نے انہیں اس وقت پکارا' جب وہ دونوں ڈی جے کے بینک پہ بیٹھی' ڈی جے کی شاپنگ پہ تبصرہ کر رہی تھیں۔ وہ تیرہ فروری کی دوپہر تھی۔ انہیں ترکی آئے آٹھواں روز تھا اور ڈی جے جو ویلنٹائن ڈے کی رونق دیکھنے آج تاقسم گئی تھی مایوس سی واپس آئی تھی۔ پاکستان کے برعکس ترک ہر کام چھوڑ کر سرخ رنگ میں نہا نہیں جاتے تھے' بلکہ سوائے سرخ پھولوں کی فروخت کے استنبول میں ویلنٹائن ڈے کے کوئی آثار نہ تھے۔ جب ڈی جے خوب مایوس ہو چکی تو

اس نے یہ کہہ کر اپنے خیالات میں ترمیم کر لی کہ "بھاڑ میں گیا سینٹ ویلنٹائن' ہمیں اس تہوار سے کیا لینا دینا۔"

ان کی اس گفتگو میں مخل ہونے والی اسرائیلی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی۔

"ہاں؟" وہ دونوں رک کر نیچے دیکھنے لگیں' جہاں ٹالی ان کے بینک سے نیچے لٹکتی سیڑھی کے ساتھ کھڑی تھی۔

"وہ لڑکے تمہارا پوچھ رہے تھے۔"

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ٹالی کو۔

"کون سے لڑکے؟"

"وہ فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس جو ساتھ والے ڈورم میں رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ وہ پاکستانی لڑکیاں کیسی ہیں اور یہ کہ ان کو کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں ہے' اور یہ بھی کہ تم دونوں آج شام کی چائے کامن روم میں ان کے ساتھ پیو۔ وہ تمہارا انتظار کریں گے' اوکے بائے۔" ایک اسرائیلی مسکراہٹ ان کی طرف اچھالتی' ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گئی۔

"یہ فلسطینیوں کو ہمارا خیال کیسے آگیا؟"

"اس ٹالی کے درخت سے دل بھر گیا ہوگا شاید۔"

ڈی جے نے قیاس آرائی کی۔

"حکومت! وہ ہمیں صرف اپنی مسلمان بہنیں سمجھ کر بلا رہے ہوں گے۔"

"اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں۔ یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔" ڈی جے بدک اٹھی تھی۔

"چلو پھر تیار ہو جائیں تاکہ وقت پہ پہنچ سکیں۔"

حیا لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی۔

"صرف ہمیں ہی بلایا ہے یا یہ عرب اسرائیل دوستی کی زندہ مثال بھی موجود ہوگی؟" ڈی جے کا اشارہ ٹالی کی طرف تھا۔

"پتا نہیں۔" حیا نے شانے اچکا دیے۔ وہ الماری

سے کپڑے نکالنے لگی۔ ہر موقع کی مناسبت سے مکمل ڈریسنگ کرنا اس کا جنون تھا۔ کپڑوں پہ ایک سلوٹ تک نہ ہو اور میک اپ کی ایک لکیر بھی اوپر نیچے نہ ہو' وہ ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ البتہ لڑکوں کی دعوت پہ جانے کی اجازت پاکستان میں ابا یا تایا فرقان کبھی نہ دیتے' مگر وہ ادھر کون سا دیکھ رہے تھے۔ یہ ترکی تھا اور یہاں سب چلتا تھا۔

وہ تین لڑکے تھے۔ معتصم المرتضیٰ' حسین اور مومن' ان کے دو فلسطینی دوست محمد قادر اور نجیب اللہ جاتی دعوت کے شروع میں موجود رہے' پھر اٹھ کر چلے گئے' مگر ان تینوں میزبانوں نے احسن طریقے سے میزبانی نبھائی۔

وہ تینوں اسمارٹ اور گڈ لکنگ سے لڑکے ایک جیسے لگتے تھے۔ معتصم ان میں ذرا لمبا تھا۔ (اس کا نام معتصم المرتضیٰ تھا' مگر یہ ڈی جے نے بعد میں نوٹ کیا کہ وہ فیس بک پہ اپنا نام معتصم اینڈ مرتضیٰ لکھتا تھا۔ وجہ انہیں کبھی سمجھ نہ آئی۔) حسین اور معتصم ان دونوں کو بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بھائی چارے سے مومن متفق نہ تھا۔ وہ فلرٹی' نظر باز سا لڑکا کچھ بھی تھا' مگر مومن نہ تھا۔ البتہ وہ دونوں اس کو اپنی موجودگی میں سیدھا کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اتنے ملنسار اور مہذب لڑکے تھے کہ حیا کو اپنے سارے کزنز ان کے سامنے بے کار لگے۔ البتہ جہان کی بات اور تھی۔ اس نے فوراً اپنی رائے میں ترمیم کی۔

"اگلے ہفتے حسین کا برتھ ڈے ہے۔" حسین موبائل پہ فون سننے باہر گیا تو مومن نے بتایا۔

"پھر تو ہمیں اسے ٹریٹ دینی چاہیے۔" ڈی جے سوچ کر بولی۔

"اور گفٹ بھی۔" حیا کو خیال آیا۔

"ہم دونوں اس کے لیے ایک گھڑی خریدنے کا سوچ رہے ہیں جو ہم نے جواہر میں دیکھی ہے۔ 130 لیراز کی ہے۔" معتصم نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر کپ میز پہ رکھا۔

"یعنی کہ پاکستانی روپوں میں۔۔۔" حیا نے سوچتے ہوئے پرس میں ہاتھ ڈالا تاکہ موبائل کے کیلکولیٹر سے حساب کرسکے۔

"سات ہزار ایک سو پچاس پاکستانی روپے۔" معتصم جھک کر پیسٹریز کی پلیٹ سے ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولا۔ حیا کا پرس کو کھنگالتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے حیرت و بے یقینی سے معتصم کو دیکھا۔

"تم نے اتنی جلدی حساب کیسے کیا؟"

"میں میتھس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔" وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

"اور معتصم کا ایک ہی خواب ہے کہ وہ میتھس میں نوبل پرائز لے۔" مومن، حیا کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد معتصم سے آنکھ بچا کر حیا کے سراپے کا جائزہ لے لیتا تھا۔ حیا قدرے رخ موڑ کر معتصم کی طرف متوجہ ہوئی۔

"تو میتھس کے اسٹوڈنٹ! جلدی سے بتاؤ کہ اس مہنگی گھڑی کو خریدنے کے لیے اگر ہم چاروں پیسے تقسیم کریں تو ہر ایک کے حصے میں کتنے۔۔۔"

"32 لیرا اور پچاس کرش۔"

"اوکے!" حیا نے گہری سانس لی اور پرس کھولا۔

ان کو پیسے انہوں نے زبردستی تھمائے۔ مومن کو تو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر معتصم ان سے رقم لینے پہ متذبذب تھا، مگر یہ ایک ان کہی بات تھی کہ بغیر اسکالر شپ کے استنبول جیسے مہنگے شہر میں وہ سب اتنا ہی افورڈ کرسکتے تھے۔

وہ تینوں جواہر کے لیے نکل رہے تھے۔ معتصم نے بتایا کہ وہ ابھی حسین سے نظر بچا کر گھڑی خرید لائیں گے۔ ان کو بھی ساتھ چلنے کی پیشکش کی اور ڈی جے ہاں کرنے ہی والی تھی کہ حیا نے اس کا پاؤں اپنے جوتے سے زور سے کچلتے بظاہر مسکراتے ہوئے انکار کردیا۔

"نہیں! آپ لوگ جائیں، ہم آج ہی ہو کر آئے ہیں۔"

وہ تینوں چلے گئے تو ڈی جے نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"تم نے انکار کیوں کیا؟"

"پاگل عورت! تم پاکستان سے آئی ہو یا نیویارک سے؟ ان کی دعوت قبول کرلی، یہ ہی بہت ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ سیر سپاٹوں پہ بھی نکل جائیں، دماغ ٹھیک ہے؟"

"مگر وہ تو ہمارے بھائیوں کی طرح ہیں۔"

"پیچھے ہمارے اصلی والے بھائیوں کو پتا چلا تو کل ہی پاکستان واپس بلوالیں گے۔ اس لیے اپنی اوقات میں واپس آؤ اور رات کے کھانے کی تیاری کرو۔" وہ موبائل کے ساتھ ننھی ہینڈز فری کانوں میں لگاتے ہوئے بولی۔

"زہر ملا کردوں گی تمہیں۔" ڈی جے بھناتی ہوئی پیر پٹخ کر اٹھی۔

"اور اگر تم چاولوں پہ آملیٹ ڈال کر لائیں تو میں ساری ڈش تمہارے اوپر الٹ دوں گی۔"

وہ وہیں صوفے پہ لمبی بیٹھی، اب موبائل کے بٹن دبا رہی تھی۔ دھیما میوزک اس کے کانوں میں بجنے لگا۔ ڈی جے غصے میں بہت کچھ کہتی گئی، مگر اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ہولے ہولے پاؤں جھلانے لگی۔

ڈی جے پیر پٹخ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات ویلنٹائن کی رات تھی۔ ڈی جے کامن روم میں منعقدہ اس آل گرلز پارٹی میں جا چکی تھی، جو لڑکیوں نے مل کر دی تھی، جبکہ حیا آئینے کے سامنے کھڑی اپنا کاجل درست کررہی تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی، لیکن جب تک وہ اپنی آنکھوں کے کٹورے کاجل سے بھر نہ لیتی، اسے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ابھی وہ کاجل کی سلائی کی نوک آنکھ کے کنارے سے رگڑ ہی رہی تھی کہ دروازہ بجا۔

دھیمی سی دستک اور پھر خاموشی۔

اس نے کاجل کی سلائی نیچے کی اور پلٹ کر دیکھا۔ یہ انداز ڈی جے کا تو نہیں تھا۔ وہ یوں ہی کاجل پکڑے آگے بڑھی اور ناب گھما کر دروازہ کھولا۔

باہر بالکونی میں روشنی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، بالکونی تاریک ہوگئی۔ غالباً سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب بجھ گیا تھا۔ کیا کوئی آکر واپس پلٹ گیا تھا؟

"کون؟" اس نے گردن آگے کرکے راہداری میں دونوں سمت دیکھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ بالکونی ویران تھی۔ وہاں سردی تھی اور اندر کمرا گرم تھا۔

وہ چند ثانیے کھڑی رہی، پھر دھیرے سے شانے اچکا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ۔۔۔

"اوہ نہیں!" اس کے لبوں سے ایک اکتائی ہوئی کراہ نکلی۔

چوکھٹ پہ اس کے قدموں کے ساتھ سفید گلابوں کا بکے اور ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ وہ جھکی، دونوں چیزیں اٹھائیں اور جارحانہ انداز میں لفافے کا منہ پھاڑا۔ اندر رکھا چوکور سفید کاغذ نکالا اور چہرے کے سامنے کیا۔

"ہیپی ویلنٹائن ڈے۔۔۔ فرام یور ویلنٹائن۔"

اس نے لب بھینچ کر تنفر سے وہ تحریر پڑھی اور پھر بے حد غصے سے کاغذ موڑ کر گلدستے سمیت پوری قوت سے راہداری میں دے مارا۔

"آؤچ!" وہ واپس مڑنے ہی لگتی تھی، جب کسی کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

گلدستہ اور کاغذ سیدھے ہاتھ والے کمرے سے نکلتے معتصم کو جالگے تھے اور اس سے ٹکرا کر اب اس کے قدموں میں پڑے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

"آئی ایم سوری معتصم!" وہ شدید بے زاری سے بمشکل ضبط کرکے بولی۔ معتصم کو وضاحت دینے کا سوچ کر ہی اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

"یہ میں نے تمہیں نہیں دیے بلکہ کسی فضول انسان نے مجھے بھیجے ہیں۔ تم برا مت ماننا اور ان کو ڈسٹ بن میں ڈال دینا۔" وہ ایک ہاتھ دروازے پر رکھے، دوسرے میں کاجل پکڑے ذرا رکھائی سے بولی۔

معتصم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے اس کی شکنیں درست کرکے چہرے کے سامنے کیا۔ حیا کو کوفت ہونے لگی۔

"میں کہہ رہی ہوں نا، سوری۔" اس نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں پھر معتصم کو پکارا۔ وہ جو بھنویں سکیڑے کاغذ کو دیکھ رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں، اٹس اوکے۔ مگر یہ۔۔۔ تمہیں کوئی سانجی میں تنگ کررہا ہے؟" وہ تحریر پہ نگاہیں دوڑاتے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ یہ بہت پہلے سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ لمبی کہانی ہے، جانے دو۔ اس کو کوڑے میں پھینک دینا۔ گڈ نائٹ۔"

وہ مزید مروت کا مظاہرہ کیے بغیر دروازے کا کواڑ بند کرنے ہی لگی تھی جب وہ ہولے سے بولا۔

"یہ گیلا کیوں ہے؟ تم روئی ہو؟"

کچھ تھا اس کی آواز میں کہ دروازہ بند کرتی حیا ٹھٹک کر رکی، پھر پٹ نیم وا کیا اور باہر بالکونی میں قدم رکھا۔

"میں کیوں روؤں گی؟" وہ کاغذ کو دیکھ کر بولی۔

معتصم کاغذ کے نچلے دائیں طرف کے کنارے پر انگلی پھیر رہا تھا۔

"پھر یہ گیلا کیوں ہے؟ شاید پھولوں پہ پانی تھا؟"

حیا نے میکانکی انداز میں نفی میں گردن ہلائی۔

"نہیں، یہ تو موٹے لفافے میں مہر بند تھا۔"

معتصم نے وہ نم حصہ ناک کے قریب لے جاکر آنکھیں موندے سانس اندر کو کھینچی۔

"سٹرس؟ لیموں؟ لائم؟" وہ متذبذب سا حیا کو دیکھنے لگا۔

"کیا کہہ رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"کسی نے اس کے نچلے کنارے پہ لیموں کا رس لگایا ہے۔" پھر اس نے ذرا چونک کر حیا کو دیکھا۔

"تمہارے پاس ماچس ہے؟"

وہ جواب دیے بنا الٹے قدموں پیچھے آئی اور دروازہ پورا کھول کر ایک طرف ہوگئی۔ معتصم قدرے جھجکا، پھر کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا۔

حیا نے اپنی اور ڈی جے کی میز کی کرسیاں کھینچ کر آمنے سامنے رکھیں اور پھر ثالی کی میز پر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

"کیا تم بھی بچپن میں لیموں کے رس اور آگ والا کھیل کھیلتے تھے؟" وہ اب میز کی دراز کھول کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

معتصم دھیرے سے ہنسا۔

"بہت کھیل کھیلے ہیں اور ان میں سے اکثر آگ والے ہوتے تھے۔ فلسطین میں بہت آگ ہے، شاید تم نہ سمجھ سکو۔"

"چلو آج ان ترکوں کے کھیل اسرائیلی آگ سے کھیلتے ہیں۔" وہ دراز سے ایک سگریٹ لائٹر نکال کر اس کے سامنے کرسی پہ آبیٹھی اور لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

معتصم نے لائٹر کا پہیہ انگوٹھے سے دبا کر گھمایا تو آگ کا نیلا زرد سا شعلہ جل اٹھا۔

"احتیاط سے۔" وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

معتصم نے جواب نہیں دیا۔ وہ خط کے نم حصے کو، جو اب تک سوکھ چکا تھا۔ شعلے کے قریب لایا۔ ذرا سی تپش ملی اور الفاظ ابھرنے لگے۔ بڑے بڑے کر کے لکھے انگریزی کے تین حروف۔ "اے آر پی"

وہ حروف عین "فرام یور ویلنشائن" کے نیچے لکھے تھے۔

وہ دونوں چند لمحے کاغذ کے ٹکڑے پہ ابھرے بھورے حروف کو تکتے رہے، پھر ایک ساتھ گردن اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

"آرپ۔ ارپ؟ کیسا لفظ ہے یہ؟" حیا نے ممکنہ ادائیگی کے دونوں طریقوں سے حروف کو ملا کر پڑھا۔

"شاید کوئی نام!"

"کیا آرپ کوئی ترک نام ہے؟"

"معلوم نہیں۔" معتصم نے شانے اچکا دیے۔

حیا سوچتی نگاہوں سے کاغذ کو تکتی رہی۔

"کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے ایک نظر معتصم کو دیکھا، پھر نرم سا مسکرائی۔

"تم کر چکے ہو۔"

وہ ہولے سے مسکرا کر کھڑا ہوا اور کاغذ میز پہ رکھا۔

"وہ جو بھی ہے، شاید تمہیں اپنا نام بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے، یہ تم بہتر سمجھ سکتی ہو گی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"ہوں۔ تھینک یو معتصم!"

معتصم نے ذرا سی سر کو جنبش دی اور باہر نکل گیا۔ دروازے کا کیچر سست روی سے واپس چوکھٹ تک جانے لگا۔

حیا چند لمحے میز پہ رکھے کنارے سے بھورے ہوئے کاغذ کو دیکھے گئی، پھر بے اختیار کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے ہاتھ میں پکڑی کاجل کی سلائی کو سیدھا کیا اور بائیں ہتھیلی کی پشت پہ وہ تین حروف اتارے۔

"اے آر پی"

دروازہ چوکھٹ کے ساتھ لگنے ہی والا تھا۔ ذرا سی دور سے باہر راہداری میں گرا گلدستہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دو پل مزید گزرے اور زوردار "ٹھاہ" کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔

وہ اپنی ہتھیلی کی پشت پہ سیاہ رنگ میں لکھے وہ تین الفاظ دیکھ رہی تھی۔

"اے آر پی۔"

☆ ☆ ☆

اس نے اوپر سے کیبنٹ کا دروازہ کھولا۔ چند ڈبے الٹ پلٹ کیے۔ نچلے خانے میں سرخ مرچوں کا ڈبا نہیں تھا۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر ذرا سی اونچی ہوئی اور اوپر والے خانے میں جھانکا۔ وہاں سامنے ایک پلاسٹک کے بے رنگ ڈبے میں سرخ پاؤڈر رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ڈبا نکالا اور کاؤنٹر کی طرف آئی۔ وہاں ڈی جے کھڑی، سلیب پہ کٹنگ بورڈ کے اوپر پیاز رکھے کھٹا کھٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"بریانی کی مقدار زیادہ ہے، چار چمچ سرخ مرچ کے ڈال دیتی ہوں، شاید ذرا سا ذائقہ آجائے۔ ٹھیک؟" وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ٹوکری سے چھوٹا چمچ ڈھونڈنے لگی۔

"ہاں ٹھیک!" ڈی جے نے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے رندھی آواز میں کہا اور آستین سے آنکھیں رگڑیں۔

حیا اب ڈبے سے چمچ بھر بھر کر دھوئیں اڑاتے پتیلے میں ڈال رہی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اس کی پیچھے گردن پہ جھول رہا تھا۔ سادہ شلوار قمیص پہ وہ ڈھیلا ڈھالا سا سبز سوئٹر پہنے ہوئے تھی جس کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ دوپٹا ایک طرف دروازے پہ لٹکا تھا اور چند لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے کے اطراف میں لٹک رہی تھیں۔ گوشت میں چمچہ ہلاتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔

وہ دونوں اس وقت انجم باجی کے کچن میں موجود تھیں۔ صبح انجم باجی ڈی جے کو ڈائننگ ہال میں ملیں تو شام اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی، جو کہ ڈی جے نے یہ کہہ کر قبول کر لی کہ وہ اور حیا مل کر بریانی بنائیں گی۔ اب سر شام ہی وہ دونوں ہالے کو لیے انجم باجی کے اپارٹمنٹ آگئی تھیں۔

ایک بیڈ روم، لاؤنج اور کچن پہ مشتمل وہ چھوٹا مگر بے حد نفیس اور سلیقے سے سجا اپارٹمنٹ تھا۔ ہالے کو انہوں نے لاؤنج میں انجم باجی کے ساتھ بیٹھا رہنے دیا اور خود کچن میں آکر کام میں مصروف ہو گئیں۔

"یہ پینٹنگ جوید جی لائے تھے انڈیا سے۔" اندر لاؤنج میں انجم باجی کی ہالے کو مطلع کرتی آواز آ رہی تھی۔

"ڈی جے! یہ جوید جی کیا ہے؟" اس نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

"ان کا مطلب ہے، جاوید جی۔ ان کے ہزبینڈ!" ڈی جے نے سرگوشی کی تو وہ مسکراہٹ دباتی پلٹ کر ابلتے چاولوں کو دیکھنے لگی۔

جس وقت انجم باجی اور ہالے کچن میں داخل ہوئیں، حیا پتیلے کا ڈھکن اخبار لگا کر احتیاط سے بند کر رہی تھی۔ آہٹ پہ پلٹی اور مسکرائی۔

"بس دم دے رہی ہوں۔"

"بہت خراب ہو تم دونوں، مجھے اٹھنے ہی نہیں دیا۔"

"بس اب آپ کو کھانے کے وقت ہی اٹھانا تھا۔ وہ جوید۔ جاوید بھائی آگئے؟" وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ڈی جے کے پاس آئی۔

ڈی جے کا سلاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ اب کہیں جا کر وہ ٹماٹروں پہ پہنچی تھی۔

"بس آنے والے ہیں۔ لاؤ! یہ سلاد تو مجھے بنانے دو۔"

"نہیں! میں کر لوں گی۔ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔" ڈی جے نے بڑی بے فکری سے کہا تو حیا نے اسے جتاتی نظروں سے گھورا۔

"آپ نے اس تھوڑے میں بھی صبح کر دینی ہے، لاؤ مجھے دو اور پلیٹیں لگاؤ۔" اس نے ٹماٹر اور چھری ڈی جے کے ہاتھ سے لے لی۔

ہالے از خود نہایت پھرتی سے سارا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی تھی۔ وہ میلے برتن اب سنک میں جمع کر رہی تھی۔

ڈی جے کیبنٹ سے پلیٹیں نکالنے لگی اور انجم باجی رائتہ بنانے لگیں۔

حیا نے ٹماٹر کو کٹنگ بورڈ پہ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر رکھا اور چھری رکھ کر دبائی۔ دو سرخ ٹکڑے الگ ہو گئے اور ذرا سا سرخ رس اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پہ بہہ گیا، جہاں کاجل سے لکھے تین مٹے مٹے سے حروف تھے۔

اے۔ آر۔ پی

وہ دو تین روز سے اسی "اے آر پی" کے متعلق سوچے جا رہی تھی، اب بھی کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھائی۔

"انجم باجی!"

وہی کو کاٹتے سے پھینٹتیں انجم باجی نے ہاتھ روک

کر اسے دیکھا۔

"آپ نے کسی "اے آر پی" کے متعلق سنا ہے؟"

"اے آر پی؟" انجم باجی نے حیرت بھری الجھن سے دوہرایا۔

"جی اے آر پی۔ اے آر پی۔" اس نے وضاحت کے لیے ہجے کرکے بتایا۔

"اوہ ناٹ اگین حیا!" ہالے جو سنک کے آگے کھڑی تھی' قدرے اکتا کر پلٹی۔ اس کے ہاتھ میں جھاگ بھرا اسفنج تھا جسے وہ پلیٹ پہ مل رہی تھی۔ "تم پھر وہی موضوع لے کر بیٹھ گئی ہو؟" اس کے انداز میں خفگی بھرا احتجاج تھا۔

"مگر ہالے۔" اب کے وہ الجھی تھی۔ یہ موضوع تو اس نے ابھی تک ہالے کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا تھا' پھر۔۔۔؟

"میں نے کہا تھا نا' یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔"

"مگر میں نے پوچھا ہی کیا ہے؟"

"اے آر پی۔ عبدالرحمان پاشا اور کون؟ میں نے بتایا تھا نا کہ یہ گھریلو عورتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ استنبول ہے' یہاں قانون کا راج ہے' مافیا کا نہیں۔ اب اس کے بعد میں اس موضوع پہ کچھ نہیں سنوں گی۔"

ہالے اب پلٹ کر جھاگ سے بھری پلیٹ کو پانی سے کھنگال رہی تھی اور وہ۔۔۔ وہ حیرتوں کے سمندر میں گھری کھڑی تھی۔

اے آر پی۔۔۔ عبدالرحمان پاشا۔۔۔ اوہ۔۔۔ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

"اوکے اوکے!" وہ بظاہر سر جھکائے ٹماٹر کاٹنے لگی مگر اس کے ذہن میں بہت سے خیال گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ہالے اور جہان دونوں ایک جیسے تھے اور اپنے استنبول کے دفاع کے علاوہ وہ کبھی کچھ نہیں کہیں گے' اسے یقین تھا' مگر کسی کے پاس تو کچھ کہنے کے لیے ہو گا اور اسے اس "کسی" کو ڈھونڈنا تھا۔

وہ میز لگا رہی تھی' جب جاوید بھائی آ گئے۔

وہ بھی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور سبانجی میں پڑھاتے بھی تھے۔ بے حد ملنسار' سادہ اور خوش اخلاق سے دیسی مرد تھے۔ پرانے پاکستانی ڈراموں کے شوقین اور پرستار۔ ٹی وی کے ساتھ ریک میں ان کہی' تنہائیاں' دھوپ کنارے' آنگن ٹیڑھا' الف نون سمیت بہت سے کلاسک ڈراموں کی ڈی وی ڈیز قطار میں سجی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لیے طرز تخاطب بہت دلچسپ تھا۔ "جوید جی" اور "انجو جی" اسے بہت ہنسی آئی۔ باقی تینوں کچن میں تھیں' جب حیا پانی رکھنے میز پہ آئی تو جاوید بھائی کو تنہا بیٹھے پایا۔ وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"جوید۔۔۔ جاوید بھائی!" وہ گڑبڑا کر تصحیح کرتی ان کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھی اور محتاط نگاہوں سے کچن کے دروازے کو دیکھا۔ "ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔"

"جی جی۔ پوچھیے۔" وہ فوراً کتاب رکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"استنبول میں ایک انڈین مسلم رہتا ہے عبدالرحمان پاشا نام کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟" وہ محتاط سی کرسی کے کنارے ٹکی بولتے ہوئے بار بار کچن کے دروازے کو بھی دیکھ لیتی۔

کون پاشا؟ وہ بیوک ادا والا؟"

اور حیا کو لگا' اسے اس کے جواب ملنے والے ہیں۔

"جی جی وہی۔ وہ خاصا مشہور ہے۔"

ہاں! سنا تو میں نے بھی ہے۔ بیوک ادا میں اس کا کافی ہولڈ ہے۔ وہ مال امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہے۔"

"کیا وہ مافیا کا بندہ ہے؟ اسلحہ اسمگل کرتا ہے؟"

"ایک پروفیسر کو مافیا کے بارے میں کیا معلوم ہو گا حیا جی؟" وہ کھسیاہٹ سے مسکرائے۔

"یعنی کہ وہ واقعی مافیا کا بندہ ہے' اور آپ کو معلوم بھی ہے' مگر آپ اعتراف نہیں کرنا چاہ رہے۔ شاید ایک اور داؤد ابراہیم؟" اس نے اندھیرے میں تیر چلایا اور وہ عین نشانے پہ بیٹھا۔

"داؤد ابراہیم۔۔۔ شاید!" انہوں نے سادگی سے ہتھیار ڈال دیے۔

دفعتاً" کچن سے انجم باجی کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو کرسی کے کنارے پہ ٹکی تھی' گھبرا اٹھی اور کچن کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا؟"

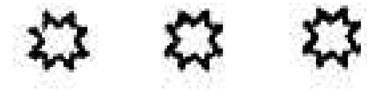
انجم باجی سرخ بھبھوکا چہرہ اور آنکھوں میں پانی لیے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی چمچہ تھا۔

"مرچیں۔۔۔ اتنی مرچیں حیا!"

"نن نہیں۔۔۔ یہ ترکی کی مرچیں پھیکی ہوتی ہیں تو میں نے صرف چار چمچے۔۔۔"

"چار چمچے؟" ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ ترکی کی نہیں' خالص ممبئی کی مرچیں ہیں' میں سارے مسالے وہیں سے لائی ہوں۔"

"اوہ نہیں!" اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا' جبکہ ڈی جے ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔



سردی کا زور پہلے سے ذرا ٹوٹا تھا۔ اس صبح بھی سنہری سی دھوپ تقسیم اسکوائر پہ بکھری تھی۔ مجسمہ آزادی کے گرد ہر سو سونے کے ذرات چمک رہے تھے۔ وہ دونوں سست روی سے سڑک کے کنارے چل رہی تھیں' جب ڈی جے نے پوچھا۔

"حیا۔۔۔ یہ تقسیم' نام کتنے مزے کا ہے اس کا مطلب کیا ہو بھلا؟"

"میں شہر کی میئر ہوں' جو مجھے پتا ہو گا؟"

"نہیں' وہ میری گائیڈ بک میں لکھا تھا کہ تقسیم عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی شاید بانٹنے کے ہیں' کیونکہ یہاں سے نہریں نکل کے سارے شہر میں بٹ جاتی تھیں۔ تمہیں عربی آتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"عربی میں تو تقسیم نام کا کوئی لفظ نہیں ہے' اور عربی میں بانٹنے کو تقسیم کہتے ہیں۔" وہ ایک دم رکی اور بے اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔ "وہ تقسیم یعنی تقسیم۔ اگر گوروں کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے پڑھو تو تقسیم "تقسیم" بن جاتا ہے۔"

"تقسیم۔۔۔ لوائے۔" وہ دونوں اس بات پہ خوب ہنستی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ وہ شاپنگ کے ارادے سے آج استقلال اسٹریٹ کی طرف آئی تھیں۔

استقلال جدیسی (اسٹریٹ) تقسیم کے قریب سے نکلنے والی ایک لمبی سی گلی تھی۔ وہ گلی دونوں اطراف سے قدیم آرکیٹیکچر والی اونچی عمارتوں سے گھری تھی۔ گلی بے حد لمبی تھی' وہاں انسانوں کا ایک رش ہمیشہ چلتا دکھائی دے رہا ہوتا۔ بہت سے سامنے جا رہے ہوتے اور بہت سے آپ کی طرف آ رہے ہوتے۔ ہر شخص اپنی دھن میں تیز تیز قدم اٹھا رہا ہوتا۔

گلی کے درمیان ایک پٹری بنی تھی' جس پہ ایک تاریخی' سرخ رنگ کا چھوٹا سا ٹرام چلتا تھا۔ وہ پیدل انسان کی رفتار سے دگنی رفتار سے چلتا اور گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچا دیتا۔ اس گلی کو ختم کرنے کے لیے بھی گھنٹہ تو چاہیے تھا۔

وہاں دونوں اطراف دکانوں کے چمکتے شیشے اور اوپر قمقمے لگے تھے۔ بازار' نائٹ کلبز' ریسٹورنٹس' کافی شاپس' ڈیزائنر وئیر' غرض ہر برانڈ کی دکان وہاں موجود تھی۔ چند روز پہلے وہ ادھر آئیں تو صرف ونڈو شاپنگ میں ہی ڈھائی گھنٹے گزر گئے' اور تب بھی وہ استقلال جدیسی کے درمیان پہنچی تھیں' سو تھک کر واپس ہو لیں۔

"حیا! تم نے دیکھا' استقلال اسٹریٹ جیسے ماڈرن علاقے میں بھی ہر تھوڑی دور بعد پرئیر ہال ضرور ہے۔"

"بڑے نیک ہیں بھئی ترک!" وہ قدرے طنزیہ ہنسی اور پھر متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ استقلال اسٹریٹ آنے کا اصل مقصد جہان سے ملنا تھا' اور وہ صرف اس لیے یہاں آئی تھی کہ بر گر کنگ جائے اور "میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا۔۔۔" کہہ کر اس سے مل لے۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ وہاں ہوا تیز تھی اور حیا کے کھلے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پہ آ رہے تھے۔ وہ بار بار کوٹ کی

جیب سے ہاتھ نکالتی اور انہیں کانوں کے پیچھے اڑستی تب ہی اس نے برگر کنگ کا بورڈ دیکھا تو ڈی جے کو بتائے بنا ریسٹورنٹ کے دروازے تک آئی اور اس سے پہلے کہ وہ دروازہ پہ ہاتھ رکھتی' دروازے اندر سے کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ وہ بے اختیار ایک طرف ہوئی۔ وہ جہان تھا' وہ اسے پہچان گئی تھی مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔

وہ اس کے سامنے سے آتا ساتھ سے نکل کر گزر گیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ڈی جے نے اسے رکتے نہیں دیکھا تھا' وہ اپنی دھن میں دکانوں کو دیکھتی چلتی گئی اور لوگوں کے ریلے میں آگے بہہ گئی۔

حیا یونہی اپنے گھٹنوں تک آتے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ہوا کے رخ پہ کھڑی تھی' تو اس کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے تھے۔

جہان اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد لڑکی بھی تھی۔ کوٹ اسکرٹ میں ملبوس' اپنے سرخ بالوں کو اونچی پونی میں باندھے' وہ لڑکی ناگواری سے ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔

جہان نے اسے نہیں دیکھا' اسے یقین تھا۔ وہ دوڑ کر ان کے پیچھے گئی۔ وہ دونوں بہت تیز چل رہے تھے۔ ان کی رفتار سے ملنے کی سعی میں وہ ایشیائی لڑکی ہانپنے لگی تھی' بمشکل وہ ان کے عین عقب میں پہنچ پائی۔

لڑکی بلند آواز میں نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ جہان بھی خاصا جھنجلایا ہوا جواباً" بحث کر رہا تھا۔ وہ ترک بول رہے تھے' یا کوئی دوسری زبان' وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید ترک نہیں تھی۔ وہ بہت لمبے لمبے فقرے بول رہے تھے اور جتنی ترک حیا نے اب تک سنی تھی' وہ ایسی نہیں تھی' ترک میں فقرے چھوٹے ہوتے تھے۔ بس فعل استعمال کیا اور اس کے آگے پیچھے سابقے لاحقے لگا لگا کر ایک بڑا سا لفظ بول دیا جو معنی میں کئی فقروں کے برابر ہوتا تھا۔

"جہان۔۔۔ جہان۔۔۔" وہ شور اور رش میں بمشکل اتنی آواز سے اسے پکار پائی کہ وہ سن سکے۔ اس کی تیسری پکار پہ وہ رکا۔ لڑکی بھی ساتھ ہی رکی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

"جہان۔۔۔" اس کے ہونٹ جہان کو دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے سنجیدہ' اکھڑے اکھڑے انداز میں ابرو اٹھائے۔ اس کے چہرے پر اتنی سختی اور ناگواری تھی کہ حیا کے مسکراہٹ میں کھلتے لب بند ہو گئے۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میں۔۔۔ حیا۔۔۔" وہ بے یقینی سے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک گزرا کہ جہان نے اسے نہیں پہچانا۔

"ہاں تو پھر؟" وہ بھنویں سکیڑے بولا۔

وہ لڑکی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی ناپسندیدگی سے حیا کو دیکھ رہی تھی۔

"پھر؟" حیا نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ وہ ششدر سی جہان کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی کام ہے؟" وہ بمشکل ضبط کر کے بولا۔

حیا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

"تو میری شکل کیا دیکھ رہی ہو جاؤ!" وہ شانے جھٹک کر پلٹا۔ لڑکی بھی ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈال کر مڑ گئی۔

استقلال اسٹریٹ پہ لوگوں کا ریلا آگے بڑھتا گیا۔ جہان سکندر اور اس لڑکی کے پیچھے بہت سے لوگ اس سمت جا رہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑی بہت سے سروں کی پشت کے درمیان ان دونوں کو دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔

ان دونوں کے سر اب ہجوم میں گم ہو رہے تھے۔ وہ دو نقطے بنتے جا رہے تھے۔۔۔ مدھم۔۔۔ دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔

"حیا۔۔۔ حیا۔۔۔" ڈی جے کہیں دور اتھل پتھل سی سانسوں کے درمیان چلا رہی تھی' مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی طرح بھیڑ کے درمیان پتھر ہوئی کھڑی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت دور جا چکے تھے۔ ساکت پتلیوں میں اب درد ہونے لگا تھا۔ بالآخر بوجھ سے اس کی پلکیں گریں اور جھک کر اٹھیں تو منظر بھیگ چکا تھا۔ اس نے پھر سے پلکیں جھپکائیں تو بھیگی آنکھوں سے قطرے رخساروں پہ گرنے لگے۔ سامنے کا منظر قدرے واضح ہوا مگر۔۔۔

لمحے بھر کی تاخیر سے اس کا تعاقب ہار گیا تھا۔ وہ دونوں بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ وہ اپنا منظر کھو چکی تھی۔

آنسو ٹپ ٹپ اس کی ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ لڑھکتے گئے۔

"حیا۔۔۔ کدھر تھیں تم؟" ڈی جے نے نڈھال سی آ کر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔ مگر حیا ابھی تک اسی سمت دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے ایک ہاتھ سے اوون کا ڈھکن کھولا دوسرے ہاتھ سے گرم ٹرے باہر نکالی۔

ٹرے پہ بھوری' خستہ گرما گرم جنجر بریڈ تیار ہوئی تھی۔ ادرک کی ہلکی سی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔

وہ دوسرے ہاتھ سے جنجر بریڈ کو چیک کرتی سیدھی ہوئی اور ٹرے لا کر کاؤنٹر پہ رکھی۔ وہ سفید ڈھیلی سی آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ اور کھلے سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا اور الجھی الجھی سی لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر پہنے ایپرن پہ جگہ جگہ چاکلیٹ اور کریم کے دھبے لگے تھے۔

معتصم کاؤنٹر کے ایک طرف کھڑا پیالے میں انڈے کی سفیدی پھینٹ رہا تھا۔ ڈی جے دوسری طرف کھڑی سجاوٹ کے لیے لی گئیں "ننھی جیلی اور بینز کے پیکٹ کھول کھول کر پلیٹ میں انڈیل رہی تھی۔ ہر رنگ کی بینز' کینڈیز اور سرخ جیلی بینز کا ڈھیر لگ چکا تھا۔

آج حسین کی سالگرہ تھی۔ روایتی طریقے سے کیک بنانے کی بجائے حیا اس کے لیے جنجر بریڈ ہاؤس تیار کر رہی تھی۔ ایک فٹ کا جنجر بریڈ سے بنا گھر جو چاکلیٹ' کریم اور رنگ برنگی جیلیز سے سجانا تھا۔ وہ پچھلے چار گھنٹے سے لگی ہوئی تھی' اور اب بالآخر اس کی جنجر بریڈ کے چھ کے چھ ٹکڑے بیک ہو چکے تھے۔ چار دیواروں کے لیے اور دو مخروطی چھت کے لیے۔

"آؤ اب اس کو جوڑتے ہیں۔" اس نے کہا تو معتصم جو آئسنگ بنا چکا تھا' پیالا رکھ کر اس کی طرف آیا۔ ڈی جے اب ایک دیوار اٹھا کر اس میں سے مستطیل دروازہ کاٹ رہی تھی۔

حیا اور معتصم نے احتیاط سے دو دیواریں متصل کھڑی کیں اور ان کے جوائنٹ پہ' بطور گم' مخصوص سیرپ لیپ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے دونوں نے اپنے ہاتھ ہٹائے۔

دیواریں سیدھی کھڑی رہیں۔ سیرپ نے ان کو چپکا دیا تھا۔

"زبردست!" وہ پرجوش سی ہو گئی۔ اس کا گھر بن رہا تھا' یہ خیال ہی اس کی ساری تھکاوٹ ہوا کر لے گیا۔

وہ دونوں اب اگلی دیوار جوڑنے لگے۔ حیا کے ماتھے سے جھولتی لٹ بار بار آنکھوں کے سامنے آتی' وہ بار بار ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹاتی۔ پوروں پہ لگے چاکلیٹ سیرپ کے دھبے اس کے رخسار پہ لگ گئے مگر پروا کسے تھی۔

چار دیواری بن گئی تھی۔ اب انہوں نے وہ مستطیل ٹکڑوں کو اوپر الٹے "وی" کی طرح رکھا اور جوڑ پر سیرپ لگایا۔ کافی دیر بعد انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

چھت برقرار رہی۔ سیرپ سوکھنے لگا تھا۔ چھت مزید مضبوط ہو گئی۔

"حیا! تم گریٹ ہو۔" وہ بھورا سا گھر بنا رنگ یا آرائش کے بھی اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ معتصم بے اختیار ستائش سے بولا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

وہ تینوں اب الا بلا کینڈیز' بینز اور جیلیز سے دیواروں کی سجاوٹ کرنے لگے۔ وہ ہر ڈیکوریشن کے ٹکڑے کے پیچھے ذرا سا سیرپ لگا کر اسے دیوار سے چپکا دیتے۔ بھورے گھر پہ جگہ جگہ سرخ' سبز اور نیلے

بٹن کی مانند آنکھیں ابھرنے لگی تھیں۔ ذرا سی دیر میں گھر سج گیا تھا۔ ڈی جے نے سفید کریم سے کھڑکیوں کی چوکور چوکھٹیں بنائیں اور اندر نیلی کریم کا رنگ بھر دیا۔

"اب استنبول کی برف باری کا مزا اپنے گھر کو بھی چکھائیں۔"

حیا آئسنگ شوگر اور چھلنی لے آئی۔ اس نے سفید سوکھے آٹے کی شکل کی آئسنگ شوگر چھلنی میں ڈالی اور گھر کے اوپر کرکے چھلنی آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ چھلنی کے سوراخوں سے سفید ذرے نیچے گرنے لگے۔ بھورے گھر پہ برف باری ہونے لگی اور ایک ہلکی سی سفید تہہ چاکلیٹ سے ڈھکے گھر پہ بیٹھنے لگی۔ "حیا جنجر بریڈ ہاؤس" تیار تھا۔

اس نے احتیاط سے ٹرے اٹھائی۔ گھر برقرار رہا۔ وہ اس کی ساڑھے چار گھنٹوں کی محنت کا ثمر تھا۔ کسی سالگرہ کی تقریب سے پہلے حیا سلیمان تک سک سے تیار نہ ہو، حیرت انگیز بات تھی، مگر آج اس کی تیاری وہ گھر ہی تھا۔ اسے اپنے رف حلیے، ایپرن اور چہرے پہ لگے دھبوں کی پروا نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ ٹرے میں رکھے جنجر بریڈ ہاؤس پہ تھی۔

وہ ڈی جے اور معتصم کے پیچھے چلتی کامن روم میں داخل ہوئی۔

وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ درمیانی میز پہ کفتس اور حسین کا لایا ہوا کیک رکھا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس آچکے تھے۔ وہ کوئی سرپرائز پارٹی نہ تھی۔ سو حسین بڑی میز کے پیچھے کھڑا ہنستا ہوا تالی کا گفٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا، جسے تالی بار بار پیچھے کر رہی تھی۔

"سرپرائز!" حیا نے پکارا تو سب نے ادھر دیکھا۔ معتصم اور ڈی جے کے پیچھے وہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائی ٹرے میں وہ فیری ٹیل ہاؤس رکھا تھا، اور حیا کو پتا تھا، وہ ہنسل اور گریٹل کے جنجر بریڈ ہاؤس سے زیادہ خوب صورت تھا۔

"واؤ!" بے اختیار بہت سے لبوں سے ستائش نکلی۔

"حیا۔ تم نے میرے لیے اتنا کیا؟" حسین بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا اور سردی اندر آرہی تھی۔

"آؤ حیا! اسے میز پہ لے آؤ۔" معتصم بڑی میز پہ کفتس، کیک اور دوسری ڈشز کے درمیان چیزیں ہٹا کر جگہ بنانے لگا۔

سردی کی لہر دروازے سے اندر گھس رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ٹرے پکڑے، دایاں ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلنا چاہا۔ وہ بدقسمتی کا لمحہ تھا۔

دروازے کے ناب کو اس نے چھوا ہی تھا کہ دروازہ زور سے پورا کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کھلتے دروازے نے اس کا بڑھا ہاتھ پیچھے دھکیلا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی اور تب ہی اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیڑھی ہوئی۔

"اوہ۔ نو!" بہت سی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں اور ان میں سب سے دل خراش اس کی اپنی چیخ تھی۔

الٹی ہوئی ٹرے اس کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہلکی سی ٹھڈ کی آواز کے ساتھ جنجر بریڈ ہاؤس زمین پہ جا گرا۔ ہر دیوار ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ ہنٹیز اور جیلیز اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

فرش پہ بریڈ، چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگی ہنٹیوں کا ایک ملبہ پڑا تھا اور وہ سب سناٹے کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

کتنے ہی پل وہ شاک کے عالم میں اس ملبے کو دیکھے گئی، پھر اس کے پار نظر آتے جوگرز کو دیکھا اور اپنی ششدر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

وہ جہان سکندر تھا، اور اتنی ہی بے یقینی و شاک سے اس ملبے کو دیکھ رہا تھا۔ حیا کے دیکھنے پہ بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"حیا۔ آئی ایم سوری۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سامنے۔ اوہ

گاڈ۔" تاسف، ملال کے مارے وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

وہ جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، ایک دم لب بھینچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر کی جگہ غصے نے لے لی۔ خون کی سرخ لکیریں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ وہ ایک دم جھکی، بریڈ کا ٹوٹا، کریم میں لتھڑا ٹکڑا اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے پوری قوت سے جہان کے منہ پہ دے مارا۔

وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کریم میں لتھڑا ٹکڑا اس کی گردن پہ لگا تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ ٹکڑا اس کی شرٹ پر سے پھسلتا نیچے قدموں میں جا گرا۔

اس نے گردن پہ لگی کریم کو ہاتھ سے چھوا اور پھر انگلیوں کے پوروں کو بے یقینی سے دیکھا۔

"حیا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔"

وہ سرخ آنکھوں سے لب بھینچے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لب اتنی سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں اور کنپٹی پہ نیلی لکیر نظر آرہی تھی۔ وہ بالکل چپ کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

"حیا۔ الس اوکے۔" حسین پریشانی سے آگے بڑھا۔ ڈی جے اور معتصم اس کے ساتھ تھے۔

"حیا! میں نے واقعی نہیں دیکھا تھا کہ تم۔"

"شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ!" وہ اتنی زور سے چلائی کہ آگے بڑھتا حسین وہیں رک گیا۔

"چلے جاؤ تم یہاں سے۔ کہیں بھی چلے جاؤ مگر میری زندگی سے نکل جاؤ۔ تم میرے لیے عذاب اور دکھ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لائے۔ نکل جاؤ اس کمرے سے۔" اس نے اردو میں چلا کر کہا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے اردو کوئی نہیں سمجھتا تھا سوائے ڈی جے کے، مگر وہ تمام متاسف کھڑے طلبا سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"حیا۔!" جہان کی آنکھوں میں دکھ ابھرا۔

"میرا نام بھی مت لو۔" اس نے گردن کے گرد بندھے ایپرن کی ڈوری ہاتھ سے نوچی، ایپرن ایک طرف اتار پھینکا اور بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب اس کے آتے ہی جل اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے چکردار سیڑھیاں اترنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے پہ بہہ رہے تھے۔ آخری سیڑھی پھلانگ کر وہ اتری اور برف سے ڈھکی گھاس پہ تیز تیز چلنے لگی۔

باہر تیز سرد ہوا تھی۔ ہلکا ہلکا سا کہر ہر سو چھایا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے روتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ وہ ایک جنجر بریڈ ہاؤس کے لیے نہیں رو رہی۔

پہاڑی کی ڈھلان اتر کر سامنے سبانجی کی مصنوعی جھیل تھی۔ جھیل اب خاصی پگھل چکی تھی، پھر بھی فاصلے فاصلے پہ بڑے بڑے برف کے ٹکڑے تیرتے نظر آرہے تھے۔

وہ جھیل کے کنارے رک گئی۔ تیز دوڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ تنگ ٹی شرٹ میں سردی لگنے لگی تھی۔ ڈھیلا جوڑا آدھا کھل کر کمر پہ گر گیا تھا۔

وہ گیلی ماندی سی گھاس پہ بیٹھ گئی اور سلیپرز سے پاؤں نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ وہ خود اذیتی کی انتہا تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر نیچے جھکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مصنوعی جھیل کا پانی رات کے اندھیرے میں چاندی کی روشنی سے چمک رہا تھا، گویا چاندی کا ایک بڑا سا ورق سیاہ پانی پہ تیر رہا ہو۔ دور جنگل سے پرندوں کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ کئی لمحے ریت کی طرح پھسل کر جھیل کی چاندی میں گم ہوگئے تو اس نے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اس کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب کاٹتا سنجیدہ سا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"سوری حیا! میں تو معذرت کرنے آیا تھا کہ اس روز کام کی پریشانی میں تم سے مس بی ہیو کر گیا مگر۔"

وہ چپ چاپ بے آواز روتی اسے دیکھے گئی۔

"آئی ایم رئیلی سوری۔۔۔ میں نے تمہارا اتنا نقصان کردیا۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا' مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دروازے کے پار کھڑی ہو۔ میں نے تمہارا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنی دانست میں میں بہت تیز چل رہا تھا اور انجانے میں تمہارا ہاتھ دھکیل دیا۔ تمہاری ساری ریاضت ضائع کردی۔"

شاید وہ صرف جنجر بریڈ ہاؤس کی بات کررہا تھا' یا شاید ان کے تعلق کی۔

"مگر میں مداوا کردوں گا۔"

"مداوا؟" اس کے بہتے آنسو پل بھر کو تھمے۔

"ہاں! میں تمہیں بالکل ایسا جنجر بریڈ ہاؤس بنا کر لادوں گا۔"

اور اس کا دل چاہا' وہ پھوٹ پھوٹ کر پھر سے رو دے۔

"مائی فٹ جہان سکندر!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور گیلے پیر پانی سے نکال کر سلیپرز میں ڈالے۔ "میری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔"

وہ تیزی سے پلٹی تو ڈھیلے جوڑے کا آخری بل بھی کھل گیا اور سارے بال آبشار کی طرح کمر پہ سیدھے گرتے گئے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اوپر ڈھلان پہ چڑھنے لگی۔

جہان لب کاٹتا اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ تکیے سے ٹیک لگائے' پاؤں لمبے کیے' کمبل میں لپٹی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے موبائل تھامے وہ گیم کھیل رہی تھی۔

ساتھ والے بینک پہ الٹی منہ پہ تکیہ رکھے سو رہی تھی' چیری اسٹڈی روم میں تھی۔ خدیجہ نیچے اپنے بینک کی کرسی پہ بیٹھی میز پہ رکھے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

"حسین کا برتھ ڈے جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹنے سے خراب نہیں ہوا' اس کا برتھ ڈے تمہارے اوور ری ایکشن سے خراب ہوا ہے۔ تم نے اپنے کزن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس کا قصور نہیں تھا۔ اس نے تمہیں واقعی نہیں دیکھا تھا۔ اگر تم تھوڑا سا ضبط کرلیتیں اور کھلے دل سے اپنے کزن کو ویلکم کرتیں تو ہم اسی ٹوٹے جنجر بریڈ ہاؤس کو یادگار بنا لیتے۔ اسے ایک دوسرے کے چہروں پہ ملتے' اس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں' ٹوٹ جاتی ہیں' بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس سے ہار مان لی۔"

لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہیں جمائے ڈی جے تیزی سے کچھ ٹائپ کرتی کہہ رہی تھی۔

حیا اسی طرح ببل چباتی موبائل کے بٹن دباتی رہی۔

"تمہارے جانے کے بعد سب اتنے شرمندہ تھے کہ مت پوچھو کس طرح میں نے بمشکل سب کو منا کر حسین سے کیک کٹوایا۔"

دفعتاً حیا کا موبائل بجا تو ڈی جے خاموش ہوگئی۔

حیا نے لب بھینچے اسکرین کو دیکھا۔ وہاں جہان کا موبائل نمبر لکھا آرہا تھا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ کال مسترد نہ کرسکی۔

"کیا ہے؟" اس نے فون کان سے لگا کر بہت آہستہ سے کہا۔

"ابھی تک خفا ہو؟" وہ ایک دم اتنی اپنائیت سے پوچھنے لگا کہ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکنے لگا۔

"خفا ہونے کا اختیار اپنوں کو ہوتا ہے' مجھے یہ اختیار کبھی کسی نے دیا ہی نہیں۔"

"اتنے لمبے مکالمے مت بولو۔ مجھ سے اب سردی میں نہیں کھڑا ہوا جارہا۔ فوراً باہر آؤ۔"

وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"تم کہاں ہو؟" آنسو غائب ہوگئے۔

"تمہارے ڈورم کے باہر بالکونی میں کھڑا ہوں۔"

"میرے اللہ! تم اب تک یہیں ہو۔" وہ فون پھینک کر اٹھی' تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور دوڑ کر دروازہ کھولا۔

وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے' سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"اف جہان!" حیا دروازہ بند کرکے اس تک آئی۔ اس نے ٹی شرٹ کے اوپر ایک کھلا سا سیاہ سوئیٹر پہن لیا تھا اور بالوں کا پھر سے ڈھیلا جوڑا باندھ لیا تھا۔ آنکھیں ہنوز متورم تھیں۔

"کب سے کھڑے ہو ادھر؟" وہ خفگی سے کہتی اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی۔

"جب سے تم نے بتایا تھا کہ تمہاری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔ میں نے سوچا ان کو حل کیے بغیر نہ جاؤں۔ چائے تو تمہیں پلاؤ گی؟"

وہ کچھ ایسے ڈرتے ڈرتے بولا کہ وہ ساری تلخی بھلا کر ہنس دی۔

"آؤ! تمہیں ایپل ٹی پلاتی ہوں۔ تمہارے ترکی کی سوغات ہے ورنہ پاکستان میں تو ہم نے کبھی سیب والی چائے نہیں پی تھی۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ اندرونی سیڑھیاں اترنے لگے۔

"اور ہم یہی پی کر بڑے ہوئے ہیں۔ کتنا فرق ہے ناہم میں۔" وہ شاید یونہی بولا تھا۔ مگر کچن کا دروازہ کھولتی حیا نے مڑکر اسے دیکھا ضرور تھا۔

"ہاں! بہت فرق ہے ہم میں۔" اس نے تسلیم کرلیا تھا۔ اس نے ہار مان لی تھی' اور انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک۔۔۔ اف یہ ڈی جے کے سنہری اقوال بھی نا۔۔۔!

وہ سر جھٹک کر کچن میں داخل ہوئی۔

"ایپل ٹی تو ختم ہے' اب سادہ چائے پیو۔" اس نے کیبنٹ کھول کر چند ڈبے آگے پیچھے کیے اور پھر مایوسی سے بتایا۔

"دودھ نکالو' میں چائے کا پانی چڑھاتا ہوں۔" وہ آگے بڑھا' دیگچی ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالی' اس میں پانی اور پتی ڈال کر چولہے پہ چڑھایا اور چولہا جلادیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ "فوراً" سے کام کردینے والا۔ اس کے ہاتھ بہت سخت اور مضبوط سے لگتے تھے۔ کام کے' محنت اور مشقت کے عادی۔ وہ استنبول کی ورکنگ کلاس کا نمائندہ تھا۔ اب وہ سلیب پہ رکھے برتن جمع کرکے سنک میں ڈال رہا تھا۔

"رہنے دو جہان! میں کرلوں گی۔"

"تم نے کرنے ہوتے تو اب تک کرچکی ہوتیں۔ اب اس سے پہلے کہ پانی سوکھ جائے' دودھ ڈال دو' بلکہ مجھے دو۔" اس نے پلیٹ دھوتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دودھ کا ڈبا اٹھایا اور خود ہی دیگچی میں انڈیل دیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

وہ کھلے نل تلے پلیٹ کھنگال رہا تھا۔ جینز اور جوگرز پہنے' سوئیٹر کی آستینیں کہنیوں تک موڑے' وہ تاقسم اسکوائر کی میٹرو میں موجود اس ایگزیکٹو سے قطعاً مختلف لگ رہا تھا جس سے چند ہفتے قبل حیا ملی تھی۔

"حیا۔۔۔ حیا۔۔۔" ڈی جے حواس باختہ سی چلاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔

"تمہارا فون مرجائے گا بج بج کر۔ اوہ السلام علیکم۔" جہان کو دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی اور رک کر سانس لینے لگی۔ اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔

"وعلیکم السلام!" جہان پلٹ کر اسے جواب دیا۔

"تمہارا فون!" وہ حیا کو موبائل تھما کر واپس مڑ گئی۔

حیا نے موبائل پہ دیکھا۔ پانچ مسڈ کالز۔ ترکی کا کوئی غیر شناسا نمبر۔

اسی وقت اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے اسکرین کو دیکھا۔ وہی ترکی کا نمبر۔ اس نے کال وصول کرلی۔

"ہیلو؟" جب وہ بولی تو اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

"حیا سلیمان؟ بندے کو عبدالرحمان پاشا کہتے ہیں۔ اب تک تو آپ مجھے جان گئی ہوں گی۔" وہ شستہ اردو میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں مبہمی کے

باسیوں کا تیکھا بن تھا اور لہجہ بہت ٹھنڈا۔

حیا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر جہان کو دیکھا۔ وہ بہت غور سے اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

"رانگ نمبر!" اس نے کہہ کر فون رکھنا چاہا مگر وہ آگے بڑھا اور موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"کون؟" وہ فون کان سے لگا کر بولا۔ تو اس کے چہرے پہ بے پناہ سختی تھی۔

"کون؟" اس نے دہرایا۔ شاید دوسری جانب سے کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جہان لب بھینچے چند لمحے انتظار کرتا رہا' پھر اس نے فون کان سے ہٹایا۔

"بند کر دیا ہے۔" اس نے موبائل حیا کی طرف بڑھاتے ہوئے جانچتی' مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "کون تھا؟"

"تمہیں نہیں بتایا تو مجھے کیوں بتاتا۔ شاید رانگ نمبر تھا۔" وہ اب سنبھل چکی تھی۔

"ہوں! تمہیں کوئی تنگ تو نہیں کر رہا؟" پھر جیسے وہ چونکا۔ "وہ پھول۔۔۔"

"پتا نہیں کون ہے۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ "جانے دو۔"

"ہراس منٹ ایک جرم ہے' ہم اس کے لیے پولیس کے پاس جا سکتے ہیں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔ کسی مسئلے کا حل جہاں سکندر کے پاس نہ ہو' یہ ممکن تھا بھلا؟

"جانے دو۔ میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔" گو کہ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا' مگر سر ہلا کر پلٹ گیا اور نل پھر سے کھول دیا۔

حیا نے موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر جیب میں ڈال دیا۔ وہ اس نازک رشتے میں مزید بدگمانی کی متحمل نہ تھی۔

"چولہا کیوں بند کر دیا؟ ابھی پکنے دیتیں' میں زیادہ کڑھی ہوئی چائے پینے کا عادی ہوں۔"

"میں نے نہیں بند کیا' یہ آٹومیٹک ہیں' ہر پندرہ منٹ بعد دس منٹ کے لیے بند ہو جاتے ہیں' مو دس منٹ بعد خود ہی جل اٹھے گا۔"

"یہ اچھا کام ہے!" اس جیسے کوفت ہوئی' پھر آخر برتن کھنگالتے ہوئے وہ بار بار چولہے کو سوچتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب برتن ختم ہو گئے تو ہاتھ دھو کر چولہے کی طرف آیا۔

"برتن دھل گئے ہمارے' اب تمہاری زندگی کے اگلے مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کون سا مسئلہ ہے' وہ بھی بتاؤ۔" وہ چولہے کو پھر سے جلانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میری زندگی کے مسئلے ٹوٹے کیبنٹ یا ٹھنڈے چولہے کی طرح نہیں ہیں' جو تم حل کر لو۔"

"اچھی بھلی زندگی ہے تمہاری' کیا مسئلہ ہے تمہیں' سوائے اس بے کار چولہے کے' کوئی تو حل ہو گا اس کا بھی۔" وہ نچلا لب دبائے جھک کر سوئچ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

"اس کا کوئی حل نہیں ہے۔"

"یہ ناممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو۔ ٹھہرو! میں کچھ کرتا ہوں۔" وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا اور جھک کر نیچے سے چولہے کا جائزہ لینے لگا۔

"جہان! رہنے دو!"

"میری کار سے میرا ٹول بکس لے آؤ۔ ڈیش بورڈ میں پڑا ہو گا۔ تب تک میں اسے دیکھتا ہوں۔" وہ جینز کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس کی طرف بڑھائے' گردن نیچے جھکائے چولہے کے اردگرد جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

وہ جہان ہی کیا' جو کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پھر کسی کی سنے۔ اسے میٹرو میں اپنے جوتے کے تسمے کھولتا جہان یاد آیا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر ہاتھ بڑھا کر چابی پکڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جہان کی چھوٹی سفید سی کار ہاسٹل کی سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس میں سے ٹول بکس نکالتے ہوئے حیا نے بے اختیار سوچا تھا کہ وہ اتنا امیر نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی' یا پھر شاید یورپ میں رہنے والے رشتہ داروں کے بارے میں عمومی

دریہی ہوتا ہے کہ وہ خاصے دولت مند ہوں گے' مگر جہان اور سبین پھپھو اس کے برعکس محنت کش' ورکنگ کلاس کے افراد تھے۔

وہ واپس آئی تو وہ چھری سے ہی شروع ہو چکا تھا اور پائپ' ساکٹ اور پتا نہیں کیا کیا کھولے بیٹھا تھا۔

چند منٹ وہ خاموشی سے سلیب کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ وہ دائیں گھٹنے اور بائیں پنجے کے بل زمین پہ بیٹھا پائپ کے دہانے پہ پیچ کس سے کچھ کھول رہا تھا۔ ٹول بکس اس کے پاؤں کے ساتھ فرش پہ کھلا پڑا تھا۔

چند صبر آزما پل بیتے اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا۔

"یہ چوتھا چولہا جو کونے میں ہے' یہ فکس کر دیا ہے' اب یہ خود سے نہیں بجھے گا۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی عملی مظاہرے کے طور پہ چوتھے چولہے کو جلا دیا اور پھر چائے کی کیتلی اسی پہ رکھ دی۔

"یہ جو تم نے حرکت کی ہے نا جہان سکندر! یہ غیر قانونی ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو۔۔۔؟"

"سبانجی میں اسموکنگ بھی غیر قانونی ہے' مگر اسٹوڈنٹس کرتے ہیں نا؟ ڈرنک بھی غیر قانونی ہے' اسٹوڈنٹس وہ بھی کرتے ہیں اور کمروں میں چھوٹے چولہے اور مائیکرو ویو رکھنا بھی غیر قانونی ہے' وہ بھی رکھتے ہیں نا؟ سو تم بھی کرو!" وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بڑی لاپروائی سے بولا تو وہ ہنس دی۔ اسے اپنا سروے فارم یاد آ گیا تھا۔

"تم سبانجی سے پڑھے ہو جو اتنی معلومات ہیں؟"

"سبانجی سے پڑھا ہوتا تو ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نہ چلا رہا ہوتا۔ ہم تو عام سی سرکاری یونیورسٹیز میں پڑھنے والے مڈل کلاس لوگ ہیں مادام!" وہ جب بھی اپنی کم آمدن یا کام کا ذکر کرتا' اس کے بظاہر مسکراتے لہجے کے پیچھے ایک تلخ اداسی سی ہوتی۔ ایک احساس کمتری یا پھر شاید یہ اس کا وہم تھا۔

"خیر!" حیا گہری سانس لے کر چولہے کی طرف آئی اور چائے کی کیتلی اٹھائی۔ ٹرے میں پیالیاں اس نے پہلے سیٹ کر رکھی تھیں' اب وہ چھلنی رکھ کر چائے انڈیلنے لگی۔

"اس ویک اینڈ پہ ڈنر کریں ساتھ؟"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا' ذرا سی چائے چھلنی کے دہانے سے پھسل کر پیالی پکڑے اس کے ہاتھ پہ گری' مگر وہ بے حد حیرت و بے یقینی سے جہان کو دیکھے گئی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ نہیں کرتے۔ غلطی سے کہہ دیا۔" وہ جیسے شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں! نہیں' میرا مطلب ہے' ٹھیک ہے شیور' مگر کہاں؟" وہ جلدی سے بولی مبادا وہ کچھ غلط نہ سمجھ لے' پھر اپنی جلد بازی پہ بھی خفت ہوئی۔

"استقلال جدیسی میں کہیں بھی۔ تمہیں بس ٹائم پہ اتارتی ہے نا؟" حیا نے اس کی پیالی اٹھا کر اسے دی تو اس نے سر کے ذرا سے اثبات کے ساتھ تھام لی۔

"ہاں۔" وہ اپنی پیالی لے کر اس کے بالمقابل سلیب سے ٹیک لگائے کھڑی ہو گئی اور چائے میں چمچ ہلانے لگی۔

"پھر میں تمہیں تاقسم سے پک کر لوں گا۔ ہفتے کی رات' آٹھ بجے ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا دی۔

جب وہ اسے واپس باہر تک چھوڑنے آئی تو دونوں کو اپنے نیچے پا کر بالکونی کی بتی خود سے جل اٹھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ ہولے سے کہہ اٹھی۔

"آئی ایم سوری' میں آج اوور ری ایکٹ کر گئی تھی۔"

جہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کچن کے سارے برتن دھلوا کر' چولہا ٹھیک کروا کر اور چائے کے دو کپ بنوا کر تم نے بالآخر مان ہی لیا۔ بہت شکریہ۔ اب میں سکون سے سو سکوں گا۔" وہ گویا بہت تشکر اور احسان مندی سے بولا تھا۔

وہ خفت سے ہنس دی۔ "کہا نا سوری۔"

"سوری مجھے بھی کرنی چاہیے' مگر وہ میں ڈنر پہ کروں گا' ادھار رہا۔ ہفتے کی شام آٹھ بجے' شارپ!"

"مجھے یاد رہے گا۔" وہ سیڑھیاں اترنے لگا اور حیا سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ کمرے کی طرف مڑ گئی۔ بالکونی کی بتی بجھ گئی۔ سارے میں تاریکی چھا گئی۔ ڈی جے وہیں کرسی پہ بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔

وہ زیر لب کوئی دھن گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بنک کے زینے چڑھنے لگی۔

"تمہارا کزن بڑا ہینڈسم ہے۔" ڈی جے نے مصروف انداز میں تبصرہ کیا۔

"سو تو ہے۔" اس نے بستر میں لیٹ کر ڈی جے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ وہی پھپھو کا بیٹا ہے نا؟" ڈی جے اسکرین کو دیکھتی لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

"ہوں!"

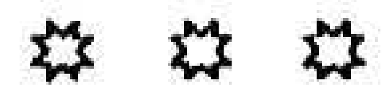
"وہی شادی شدہ؟"

"ہاں۔" اس کے لبوں پہ ایک دبی دبی مسکراہٹ در آئی۔

"اچھا!" ڈی جے مایوسی سے خاموش ہو گئی۔

حیا زیر لب وہی دھن گنگنانے لگی۔

"بکو مت۔ مجھے اسائنمنٹ بنانے دو۔" کچھ دیر بعد ڈی جے جھنجلا کر بولی مگر وہ مسکراتے ہوئے گنگنائے جا رہی تھی۔ وہ خوش تھی بہت خوش۔



دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دھکیلا تو وہ ایک ناگوار مگر آہستہ آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

سامنے لاؤنج میں ابتری پھیلی تھی۔ چھوٹا سا کچن بھی ساتھ ہی تھا جس میں اس کی بیوی کام کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ہاشم قدم قدم چلتا کچن کے دروازے پہ آ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اس کی جانب پشت کیے چولہا جلا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح تھی۔ دراز قد، گھنگھریالے سیاہ بال اور اہل حبشہ کی سی مخصوص موٹی سیاہ آنکھیں۔

"ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟"

وہ چونک کر پلٹی۔ پھر اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور واپس چولہے کی طرف مڑ گئی۔

"سرجری ہو گی، اور اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑا اسے تکتا رہا۔

"پیسوں کا انتظام ہوا؟" وہ کپڑے سے ہاتھ پونچھتی ہاشم تک آئی اور پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔" ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

"تو اب کیا ہو گا؟ ہمیں انہی چند ہفتوں میں ہزاروں لیراز جمع کرنے ہیں۔ تم نے پاشا سے بات کی؟"

"کی تھی۔"

"تو کیا کہتا ہے وہ؟" وہ بے قرار ہوئی۔

"نہیں دے گا۔ جو کام میں کر رہا ہوں، بس اس کی قیمت دے گا۔ اوپر ایک کرش بھی نہیں۔"

"کیوں؟ اتنا تو پیسہ ہے اس کے پاس۔ پورا محل تو کھڑا کر رکھا ہے بیوک اوا میں، پھر ہمیں کیوں نہیں دے گا؟"

"وہ کہتا ہے اس نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا اور پھر مزید کس کھاتے میں دے؟ میں نے ابھی تک اس کی پچھلی رقم نہیں لوٹائی۔"

"ہاں تو وہ حارث کے علاج پہ لگ گئے تھے، کوئی جوا تو نہیں کھیلتے ہم۔" اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کپڑا میز پہ دے مارا۔

"وہ نہیں دے گا میں کیا کروں؟" وہ بے حد مایوس تھا۔

"مجھے نہیں پتا ہاشم! کہیں سے بھی ہو، تم پیسوں کا بندوبست کرو، ورنہ حارث مر جائے گا۔"

ہاشم نے بے چارگی اور کرب سے سر جھکا۔

"ہاشم! کچھ کرو۔ ہمارے پاس دن بہت کم ہیں۔ ہمیں پیسے چاہئیں ہر حال میں۔"

"کرتا ہوں کچھ۔" وہ جس شکستگی کے عالم میں آیا تھا، اسی طرح واپس پلٹ گیا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ تفکر کی لکیروں کا جال بچھا تھا اور چال میں واضح مایوسی تھی۔

وہ مضطرب سی انگلیاں مروڑتی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی، پھر ایک نظر کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی جہاں ان کا بیٹا سو رہا تھا اور سر جھٹک کر واپس سنک کی طرف پلٹ گئی، جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔



ڈی جے نے دروازہ کھولا تو وہ اسے آئینے کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے آئی اور حیا کے سامنے کھڑے ہو کر پوری فرصت سے اور بہت مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں مسکارا برش تھا اور وہ آئینے میں دیکھتی، آنکھیں کھولے احتیاط سے پلکوں سے برش مس کر رہی تھی۔ گہرا کاجل، سیاہ سنہری سا آئی شیڈ اور لبوں پہ چمکتی گلابی لپ اسٹک۔ وہ بہت محنت سے تیار ہو رہی تھی۔ بال یوں سیٹ کر رکھے تھے کہ اوپر سے سیدھے آتے بال کانوں کے نیچے سے مڑ کر گھنگھریالے ہو جاتے تھے۔ بالوں پہ اس نے کچھ لگا رکھا تھا کہ وہ گیلے گیلے سے لگتے تھے اور جو فراک اس نے پہن رکھا تھا، اس کی اوپری پٹی قدیم طرز کے سنہری سکوں سے بھری تھی۔ آستین بہت چھوٹی تھیں اور ان پہ بھی سنہری سکے لٹک رہے تھے۔

نیچے لمبے فراک کی کلیاں سیاہ تھیں۔ ٹخنوں سے ذرا سا جھلکتا پاجامہ بھی سیاہ تھا۔

"کدھر کی تیاریاں ہیں؟" ڈی جے نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

"ڈنر کی!" اس نے لپ گلوس کے چند قطرے لبوں پہ لگائے اور آئینے میں دیکھتے ہوئے ہونٹ آپس میں مس کر کے کھولے۔

"کس کے ساتھ؟"

"جہان کے ساتھ!" بے ساختہ لبوں سے پھسلا، لمحے بھر کو وہ چپ ہو گئی، پھر لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "ویسے وہ شادی شدہ ہے۔"

"اچھا! وہ دو گھنٹے سردی میں بالکونی میں کھڑا رہتا ہے، چولہے کے تاروں میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹھیک کر دیتا ہے، سارا کچن صاف کر کے جاتا ہے، پھر تمہیں ڈنر پہ بلاتا ہے اور تم اس ساری تیاری کے ساتھ جا رہی ہو۔ پھر سوچ لو، وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟"

"بکو مت!" وہ ہنستے ہوئے کرسی پہ بیٹھی اور جھک کر اپنی سیاہ ہائی ہیلز پہننے لگی۔

"نہ بتاؤ، میں بھی پتا لگا کر رہوں گی۔" ڈی جے منہ پہ ہاتھ پھیرتی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

حیا نے گنگناتے ہوئے میز پہ رکھا اپنا چھوٹا سنہری کلچ اٹھایا۔ وہی داور بھائی کی مہندی والا کلچ جو اس نے جہاز میں بھی ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ اسے وہ زیادہ استعمال نہیں کرتی تھی، اب بھی کھولا تو اندر ایک تہہ کیا ہوا وزیٹنگ کارڈ اور اتصلات کا کالنگ کارڈ بھی رکھا تھا جو انہوں نے ابوظہبی میں خریدا تھا۔ اس نے موبائل، پیسے اور سبانجی کا آئی ڈی کارڈ اندر رکھا۔ کلچ چھوٹا تھا، موبائل پورا نہیں آ رہا تھا، تو اس نے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا اور "اچھا میں چلی" کہہ کر ہینگر پہ لٹکا اپنا سفید نرم کوٹ ایک ہاتھ سے کھینچ کر اتارا اور باہر لپکی۔

باریک لمبی ہیل سے پتھریلی سڑک پہ چلتے ہوئے اس نے کوٹ سیدھا کیا اور پہنا، پھر چلتے چلتے سامنے سے بٹن بند کیے۔ گورسل کا اسٹاپ ذرا دور تھا۔ اسے وہاں تک پیدل جانا تھا۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے تیز تیز سڑک پہ چلتی جا رہی تھی۔ شام کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے گیلے گیلے گھنگھریالے بال کمر پہ اڑ رہے تھے۔

جس لمحے وہ گورسل اسٹاپ کے قریب پہنچی، اسے گورسل دور سبانجی کے گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔

ہالے نے کہا تھا، جس دن تمہاری گورسل چھوٹے گی اس دن تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔ اور اس پل بے بسی و دکھ سے اس دور جاتی گورسل کو دیکھ کر اسے واقعی ہالے نور بہت یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے موبائل نکالا اور جہان کو پیغام

لکھا۔
”میری گورسل چھوٹ گئی ہے‘ مجھے پک کرلو‘ میں اسٹاپ پہ کھڑی ہوں۔“
وہ کتنی ہی دیر وہاں سڑک پہ ٹہلتی رہی‘ مگر اس کا جواب نہیں آیا‘ شاید اس غریب کے پاس جواب دینے کا بھی کریڈٹ نہیں تھا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوجاتا ہے۔ ہر متوقع خوشی پر کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات یا واقعہ ہوجاتا۔ شروع سے اب تک وہ عجیب و غریب قسم کے حالات سے دوچار ہوتی رہی ہے۔ وہ خواجہ سرا ڈولی۔۔۔ وہ سفید پھولوں اور چند حرفوں کے خط کا سلسلہ۔۔۔ اور سب سے زیادہ حیران کن بات خدیجہ کے ساتھ شاپنگ مال میں اپنی ماں اور بہن کے ہمراہ وہ نوجوان جس کی کلائی پر کاٹنے کا سرخ گلابی سا نشان تھا۔ جیسے جلا ہو۔۔۔ یا۔۔۔ کوئی برتھ مارک۔۔۔
ایسا نشان تو اس نے پنکی کے ہاتھ پر دیکھا تھا۔۔۔ پھر جب وہ نیٹ پر سے اپنی ویڈیو ہٹانے کے سلسلے میں میجر احمد سے ملی تو۔۔۔
حیا کے ذہن میں یک دم وہ دن کسی کوندے کی طرح لپکا۔ وہ لمحوں میں وہیں پہنچ گئی۔۔۔ اس نے بہت آہستہ سے نگاہ اٹھا کر اس نوجوان کو دیکھا تھا۔
وہ اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ گلابی کپڑے کو ہاتھ میں مسل کر چیک کرتا ہوا وہ مکمل طور پہ اپنی فیملی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ یہاں سے اس کا نیم رخ ہی دیکھ سکتی تھی۔
وہ دراز قد تھا‘ رنگت صاف اور آنکھوں پر فریم لیس گلاسز تھے۔ چہرے پہ متانت اور سنجیدگی تھی۔ جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔
حیا نے دوبارہ اس کے ہاتھ کو دیکھا‘ جس میں اس نے کپڑا پکڑ رکھا تھا۔ اسی پل اس کی بہن نے وہ کپڑا نرمی سے اپنی جانب کھینچا۔ گلابی ریشم اس کی ہتھیلی سے پھسل گیا۔ اب اس کی انگلیاں سامنے تھیں جن کے اوپری پوروں کی قدرتی لکیر پہ بھوری سی لکیر پڑی تھی۔
اسے بے اختیار شیشے میں آئی وہ انگلیاں یاد آئیں۔ بہت احتیاط سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خدیجہ قدرے فاصلے پہ کھڑی ڈمی کا لباس دیکھ رہی تھی۔ آس پاس کوئی اس کا جاننے والا نہ تھا۔ وہ یہاں تماشا کر سکتی تھی۔
”پنکی!“
اس نے دانستہ قریب کھڑے نوجوان کی طرف چہرہ کرکے باآواز بلند پکارا۔ وہ اپنی بہن کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ البتہ اس کی بہن حیا کو اپنی جانب دیکھتا پاکر کچھ بولتے بولتے رکی بھی۔
”پنکی!“ اس نے ذرا زیادہ زور سے پکارا۔
لڑکی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ اس کی والدہ بھی بیٹی کی نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھنے لگی تھیں۔ ان دونوں کے یوں رک کر حیا کو دیکھنے کے باعث اس نوجوان نے گردن موڑ کر دیکھا۔ تو اس کا پورا چہرہ سامنے آیا اور حیا نے دیکھا‘ اس کا آدھے سے ذرا کم چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ جھلسنے کا نشان بہت گہرا نہ تھا‘ بس اتنا کہ آدھا چہرہ صاف گندمی رنگ کا لگتا تو دوسرا حصہ گہرا سانولا۔
”پنکی! ڈولی کہاں ہے؟“ وہ سینے پہ بازو لپیٹے بڑے تیکھے انداز میں بولی اور چونکہ وہ اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی تو وہ ذرا الجھ سا گیا۔
”سوری؟“
”میں نے پوچھا ہے‘ ڈولی کہاں ہے؟“
”کون؟ میں سمجھا نہیں!“ وہ دھیمے مگر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
”اگر آپ کے دماغ پہ چوٹ آنے کی وجہ سے آپ کی یادداشت کھو گئی ہے تو بے فکر رہیے‘ میں آپ کو یاد کرائے دیتی ہوں۔ ڈولی آپ کا وہ خواجہ سرا دوست ہے جس کے ساتھ مل کر آپ اس روز خواجہ سرا بنے سڑک پہ بھیک مانگ رہے تھے۔ پنکی نام بتایا تھا آپ نے اپنا‘ نہیں؟“

اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ آنکھوں میں غصہ در آیا‘ تاہم وہ ذرا برداشت کرکے بولا۔
”میڈم! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے‘ میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں۔“
”مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ آپ کی انگلیوں پہ نشان میری گاڑی کی کھڑکی کے شیشے میں پھنسنے کا باعث ہی آئے تھے۔ مجھے یاد ہے مسٹر!“
”آپ کون ہیں اور پرابلم کیا ہے آپ کو؟“ وہ لڑکی مزید برداشت نہیں کرسکی تھی۔
”میں وہ ہوں جس نے آپ کے ان بھائی صاحب کو خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔“
”وِلس انف!“ اس نوجوان نے غصے سے جھڑکا۔ ”میں شرافت سے آپ کی بکواس سن رہا ہوں اور آپ بے لگام ہوتی جارہی ہیں۔ اس سے آگے اگر آپ نے کوئی فضول گوئی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“
”اتنی ہی شرافت ہے آپ میں تو خواجہ سرا کیوں بنے ہوئے تھے؟“ کسی نے اس کے عقب میں کہا تو وہ چونکی۔ خدیجہ بہت اعتماد سے کہتی اس کے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حیا کو ایک دم ہی جیسے ڈھارس سی ملی۔
”آپ کا دماغ خراب ہے۔ اپنی بہن کو سمجھائیں‘ میرے بھائی سے تعارف کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے انہوں نے۔“ لڑکی بھڑک کر بولی۔
شاپ میں بہت سے لوگ سب کچھ چھوڑ کر ان کو دیکھ رہے تھے۔
”تعارف؟ مائی فٹ!“ جواباً خدیجہ بھی اونچی آواز میں بولی۔ ”آپ کے بھائی کو میں نے بھی خواجہ سرا بنا دیکھا تھا۔ میں ابھی دس اور لوگ لاسکتی ہوں جو اس بات کی گواہی دیں گے۔“
”عجیب خاتون ہیں آپ‘ خوامخواہ تنگ کیے جارہی ہیں۔ یہ تعارف کے بہانے کسی اور کے سامنے جاکر بتلایئے۔“
”سر‘ میڈم!“ شاپ کا منیجر تیزی سے ان کی طرف آیا تھا۔ ”پلیز آپ ادھر تماشا نہ کری ایٹ کریں۔ دوسرے کسٹمرز ڈسٹرب۔۔۔ اوہ میجر صاحب۔“ اب اس نے اس نوجوان کا چہرہ دیکھا تو شناسائی بھری حیرت سے بولا! ”بہت معذرت سر! آپ محترمہ۔“ وہ حیا کی طرف مڑا۔ ”آپ پلیز شور نہ کریں۔ اگر آپ نے خریداری نہیں کرنی تو آپ جاسکتی ہیں۔“ حیا کے تو تلوؤں پہ لگی‘ سر پہ بجھی۔
”آپ ہوتے کون ہیں مجھے شاپ سے نکالنے والے؟“
”احمد بھائی! چلیں ہم ہی چلتے ہیں۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔“ لڑکی نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کپڑا پھینکا اور پلٹی۔ وہ نوجوان ایک تنفر بھری نگاہ اس پہ ڈال کر‘ اپنی ماں کا شانہ تھامے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ احمد بھائی۔۔۔ میجر صاحب۔۔۔ تو کیا وہ۔۔۔“
”توبہ ہے‘ ان آج کل کی لڑکیوں کی۔“ والدہ صاحبہ مسلسل ناپسندیدگی سے بڑبڑاتی نکل گئیں۔
وہ لب بھینچے کھڑی انہیں جاتے دیکھے گئی۔ اسے اس شخص کے میجر احمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔
”حیا! اس سے پہلے کہ یہ منیجر ہمیں دھکے دے کر نکالے‘ ہم بھی کھسک جائیں۔“ ڈی جے نے اس کے قریب سرگوشی کی تو وہ چونکی‘ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔
باہر کھلی فضا میں آکر اس نے بے اختیار کہا تھا۔
”تھینک یو ڈی جے!“ اور یہ وہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے خدیجہ کو اس کے معروف نام سے پکارا تھا۔
ڈی جے بے ساختہ ہنس دی۔
”مجھے پتا تھا آپ جھوٹ نہیں بولتیں۔ آپ نے واقعی وہی دیکھا ہوگا جو کہہ رہی تھیں۔“
”مگر ڈی جے! میں نے واقعی اسے خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔“

"حیا! آپ نے اسے بس خواجہ سرا بنے دیکھا تھا نا؟ تو ہو سکتا ہے وہ صرف ایڈونچر کے لیے ایسا بنا ہو۔"

"پتا نہیں!" اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔ "چلو چلتے ہیں۔" وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

ہارن کی آواز پر وہ اپنے حال میں لوٹ آئی جہاں ایک سیاہ چمکتی ہوئی کار اس کے عین سامنے کھڑی تھی۔

ڈرائیور نے بٹن دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور چہرہ ذرا سا موڑ کر اسے مخاطب کیا۔

"مادام سلیمان؟ تاقسم اسکوائر' جہان سکندر۔" ترک لب و لہجے میں ڈرائیور نے چند الفاظ ادا کیے تو اس نے سر ہلا دیا اور دروازہ کھول کر پچھلی نشست پہ بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً "جہان کا ڈرائیور تھا" گو کہ اس نے مفلر چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور سر پہ ٹوپی بھی لے رکھی تھی۔ حیا بس اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی' پھر بھی اسے گمان گزرا کہ اس نے اس سیاہ فام حبشی کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں' یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے جہان کو "بہت شکریہ۔ میں پہنچ رہی ہوں۔" لکھنے لگی۔

ذرا کی ذرا اس نے نگاہ اٹھا کر بیک ویو مرر میں ایک دو بار دیکھا بھی' مگر ڈرائیور نے اسے کچھ یوں سیٹ کر رکھا تھا کہ وہ صرف اپنا چہرہ ہی دیکھ سکتی تھی۔

تاقسم اسکوائر پہ تاریکی کے پنچھی نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور اسی مناسبت سے ہر سو بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ پورا اسکوائر ان مصنوعی روشنیوں سے چمک رہا تھا۔ مجسمہ آزادی کے اطراف سے مخالف سمتوں میں سڑکیں نکل رہی تھیں' وہاں ہر سو ٹریفک کا رش تھا۔

مجسمہ آزادی کو چاروں اطراف سے گھاس کے ایک گول قطعہ اراضی نے گھیر رکھا تھا' جیسے کسی پھول کی چار پتیاں ہوں اور ہر پتی کے کناروں کی لکیر پہ پتھریلی روش بنی تھی۔ وہاں لوگوں کی خوب چہل پہل تھی۔

ڈرائیور نے اسکوائر کے مقابل ایک عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دی۔

"جہان سکندر!" اس نے انگلی سے اسی دیوار کے ساتھ ساتھ دور اشارہ کیا' جہاں جہان کی سفید کار کھڑی تھی۔ یوں کہ وہ دیوار کے اس کنارے پہ تھی تو یہ سیاہ کار اس کنارے پہ۔

اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل احتیاط سے باہر سڑک پہ رکھی۔ تاقسم اسکوائر کو اس کی ہیلز پسند نہیں تھیں' اسے اندازہ تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہی موجود تھا۔ بونٹ کھول کر وہ جھک کر کچھ تاریں جوڑ رہا تھا۔ سیاہ جیکٹ اور جینز میں ملبوس ہمیشہ کی طرح عام سے حلیے میں۔

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' سج سج چلتی اس تک آئی۔ وہ کچھ گنگناتے ہوئے ایک تار کو دوسری کے ساتھ جوڑ رہا تھا۔ ہیل کی ٹک ٹک پہ رکا اور گردن گھما کر دیکھا۔

"السلام علیکم!" اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔

"وعلیکم السلام! اس تاریک کونے میں کیا کر رہے ہو؟"

"میری کار ہر خاص موقع پہ دغا دے جاتی ہے' اب بھی مسئلہ کر رہی ہے' خیر میں فکس کر لوں گا۔" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"وہ تو تم کر لوگے' مجھے پتا ہے۔ جہان سکندر کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔ "تم بتاؤ' پورے اسکوائر پہ مجھے تلاشتے تمہیں کتنی دیر لگی؟ اور بس پہ ہی آئی ہو؟"

"نہیں' تمہاری بھیجی گئی شوفر ڈرِون کار میں آئی ہوں۔"

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"یہ طنز کرنا کہاں سے سیکھ لیے ہیں تم نے؟ میں اتنا عجب بھی نہیں ہوں کہ تم یوں مذاق اڑاؤ۔" وہ ہنس کر سر جھٹکتا اب بونٹ بند کر رہا تھا۔

حیا نے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا۔ طویل دیوار کے اس سرے پہ وہ سیاہ کار اسی طرح کھڑی تھی۔

"تمہیں میرا میسج نہیں ملا تھا؟" وہ قدرے بے یقینی سے بولی۔

"میسج؟" جہان نے جیب تھپتھپائی۔ "میرا موبائل کہاں لیا؟" اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا اسمارٹ فون نکالا' پھر اس کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔

"نہیں!" اس نے اسکرین حیا کے چہرے کے سامنے کی۔ وہاں ان باکس کھلا تھا اور حیا کا کوئی پیغام نہ تھا۔ حیا نے بے اختیار اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ اس پہ پیغام رکنے کا نشان نظر آ رہا تھا' اس نے جلدی سے بٹن دباتے ہوئے آؤٹ باکس کھولا۔ اس کے دونوں پیغام وہیں پھنسے ہوئے تھے۔ غالباً" بیلنس بالکل ختم تھا۔

"کوئی خاص بات تھی کیا؟" وہ کار کو لاک کر رہا تھا۔

"تم نے مجھے اس پارکنگ ایریا میں ڈنر کرانا ہے یا کسی مہذب جگہ پہ؟" وہ بات بدل گئی۔ کنکھیوں سے اس نے اس لش پش چمکتی سیاہ کار کو دیکھا' جو دور کھڑی تھی۔ اسے کس نے بھیجا' وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

"اگر یہ کار میرا اتنا وقت ضائع نہ کراتی تو میں اب تک کسی ریسٹورنٹ میں جگہ ڈھونڈ بھی چکا ہوتا۔ لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔

استقلال اسٹریٹ نامی وہ طویل گلی تاقسم اسکوائر کے ساتھ سے ہی نکلتی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی' سو استقلال اسٹریٹ روشنیوں میں نہائی' رنگوں اور قمقموں سے سجی' رونق کے عروج پہ تھی۔ وہاں لوگ ہمیشہ کی طرح دونوں اطراف میں تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔ گلی کی دونوں جانب چمکتے شیشوں والی شاپس اور ریسٹورنٹس میں خاصا رش تھا۔

وہ آغاز میں ہی دائیں طرف کی قطار میں بنے ایک ریسٹورنٹ میں چلے آئے۔

زرد روشنیوں سے مزین چھت اور جگمگاتے فانوس نے ریسٹورنٹ کے ماحول کو ایک خواب ناک سا تاثر دے رکھا تھا۔ اس کونے والی خالی میز کے ساتھ رکھے اسٹینڈ پہ حیا نے کوٹ اتار کر لٹکایا اور جہان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ زرد روشنیوں میں اس کے فراک کے سنہری سکے چمکنے لگے تھے۔ اس نے دائیں بازو میں ایک سنہری کڑا پہن رکھا تھا اور اب وہ کہنی میز پہ رکھ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کڑے کو گھما رہی تھی۔ سنہری کلچ اور موبائل اس نے میز پہ ہی رکھ دیا تھا۔

"آرڈر میں کروں یا تم؟"

"دعوت تمہاری طرف سے ہے' سو تم کرو۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ جہان نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور مینیو کارڈ کھول کر انہماک سے پڑھنے لگا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ پڑھتے ہوئے نچلے لب کو دانت سے دبائے ہوئے تھا۔

حیا نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ استقلال جدیسی میں کتنے ہی لوگوں نے مڑ مڑ کر اس قدیم یونانی دیویوں کے سے سنگھار والی لڑکی کو ستائش سے دیکھا تھا' مگر یہ عجیب شخص تھا۔ کوئی تعریف نہیں' کوئی اظہار نہیں' اتنی لاتعلقی و بے خبری وہ بھی اس شخص کی جو ایک نظر میں سارے منظر کا باریک بینی سے جائزہ لے لیا کرتا تھا؟

اسے اپنی ساری تیاری رائیگاں جاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

آرڈر کر چکنے کے بعد وہ میز پہ کہنیاں رکھے' دونوں ہاتھ آپس میں پھنسائے حیا کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا سا مسکرایا۔

"تم نے مجھ سے اس روز پوچھا ہی نہیں کہ میں تمہارے ڈورم بلاک کیوں آیا تھا؟"

وہ مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے ہلکے سے بھورے شیڈ لیے سیاہ بال نوعمر لڑکوں کی طرح

ماتھے پہ سیدھے کٹے ہوئے تھے اور عموماً" وہ ہلکے ہلکے گیلے ہوتے تھے۔ پرکشش آنکھوں میں ایک نرم، دھیما سا تاثر لیے' وہ اب اتنا کم گو اور محتاط نہیں لگتا تھا جتنا پہلے دن لگا تھا۔

"ظاہر ہے' کسی کام سے ہی آئے ہوگے۔ مجھ سے ملنے بالخصوص آؤ' یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔"

"تم سے ملنے بالخصوص ہی آیا تھا اور اس کے لیے ممی کو پاکستان فاطمہ آنٹی کو فون کرکے تمہارے ڈورم کا نمبر پوچھنا پڑا تھا' ورنہ تم نے تو ہمیں ایڈریس تک نہیں دے رکھا۔"

اور یہ بات تو اماں نے اسے کل ہی فون پہ بتادی تھی مگر لمحے بھر کو اس نے سوچا تھا کہ ڈھونڈنے والے تو بنا پتے کے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں' جیسے وہ سفید گلاب اسے ہر جگہ تلاش کرلیتے تھے۔

"تو پھر آپ کیوں آئے تھے مجھ سے ملنے؟"

"بس یونہی۔ مجھے لگا تھا کہ تم اس روز استقلال اسٹریٹ میں مجھ سے خفا ہوگئی تھیں۔"

"اچھا تو آپ نے مجھے اس دن پہچان لیا تھا' ہوسکتا ہے وہ میری شکل کی کوئی لڑکی ہو؟" وہ بہت جلدی بھلا دینے والوں میں سے نہیں تھی' سو بڑی حیرت سے کڑے کو انگلیوں میں گھماتے بولی تھی۔

"ایک بات ابھی کلیئر کرلیتے ہیں حیا!" وہ قدرے آگے کو ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "میں بہت ایکسپریسو نہیں ہوں' میں لمبی لمبی باتیں نہیں کرسکتا۔ میں پریکٹیکل سا آدمی ہوں' ایسا آدمی جس کو فکر معاش ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔ میرے پاس بڑی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے' میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہوں جس کی ملکیت میری اپنی نہیں ہے' میں کئی سالوں سے اس ریسٹورنٹ کی قسطیں ادا کررہا ہوں جو کہ پوری ہی نہیں ہو رہیں۔ یہ چیز مجھے بہت پریشان رکھتی ہے۔ وہ کرد لڑکی جو اس دن میرے ساتھ تھی' وہ میرے ریسٹورنٹ کی عمارت کی اونر ہے اور ہمارے درمیان اس وقت یہی مسئلہ زیر بحث تھا' جب تم وہاں آگئیں۔ حیا! میں اس دن اتنا پریشان تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ میری پراپرٹی ضبط کرنے کی بات کررہی تھی اور اگر میں اس کی رقم ادا نہ کرپایا تو وہ ایسا کر بھی گزرے گی۔ اسی پریشانی میں میں تمہارے ساتھ بھی مس بی ہیو کرگیا۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔ مگر اپنی تمام پریشانیوں میں بھی مجھے اپنے سے جڑے رشتوں کا احساس ہے' اور میں ان کی پروا کرتا ہوں۔"

حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب بھی خفا ہو اسی بات پہ؟" وہ قدرے توقف سے بولا۔

"نہیں' میں نے تو تمہیں تب ہی معاف کردیا تھا جب تم نے کچن کے سارے برتن دھوئے تھے اور چولہا فکس کرکے دیا تھا۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔

"مگر وہ جنجر بریڈ ہاؤس مجھ پہ ادھار ہے۔"

اس سے قبل کہ وہ جواباً کچھ کہتی' ایک ویٹر اس کی طرف آیا تھا۔

"میڈم سلیمان؟"

حیا نے چہرہ اٹھا کر دیکھا اور لمحے بھر کو پتھر کی ہوگئی۔

ویٹر ایک سفید گلابوں کا بوکے میز پہ رکھ رہا تھا۔

"یہ آپ کے لیے۔" ساتھ ہی اس نے ایک دو رویہ تہہ کیا ہوا کاغذ حیا کی طرف بڑھایا۔

"لیجیے مادام!" وہ جو ساکت نگاہوں سے گلدستے کو دیکھ رہی تھی' چونکی اور مضطرب سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔ اس کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ مؤدب سا ویٹر واپس پلٹ گیا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

بے سطر کاغذ کے عین وسط میں انگریزی میں تین سطور لکھی تھیں۔

"میری کار میں سفر کرکے یہاں آنے کا شکریہ' لیکن اصولاً" مجھ سے لفٹ لینے کے بعد آپ کو ڈنر میرے ساتھ کرنا چاہیے تھا' نا کہ اپنے کزن کے ساتھ۔

"فرام یور ویلنٹائن!"

جہان گلاس لبوں سے لگائے گھونٹ گھونٹ پانی پیتا پلکیں سکیڑے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کون بھیجتا ہے تمہیں یہ سفید پھول؟" وہ خاصے سرد لہجے میں بولا تو حیا نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ چند لمحے پیشتر کی گرم جوشی جہان کی آنکھوں سے مفقود تھی۔ اس کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔

"پہ۔۔۔ پتا نہیں۔"

"اور اسے کیسے علم ہوا کہ ہم ریسٹورنٹ میں ہیں؟" اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ کوئی جواب بن ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

"دکھاؤ!" اس نے ہاتھ بڑھایا اور اب حیا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کمزور ہاتھوں سے وہ کاغذ جہان کے ہاتھ پہ رکھا۔

جیسے جیسے وہ تحریر پڑھتا گیا' اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھرتی گئیں۔ رگیں تن گئیں اور لب بھینچ گئے۔

"تم کس کی گاڑی میں تاقسم آئی ہو؟" اس نے نگاہ اٹھا کر حیا کو دیکھا اور وہ ایک نگاہ اسے سمجھا گئی تھی کہ وہ ایک مشرقی مرد تھا۔ تایا فرقان' ابا اور روحیل کی طرح کا مشرقی مرد۔

"وہ۔۔۔ میں سمجھی وہ تمہاری کار اور ڈرائیور ہے۔ میں سمجھی تم نے ڈرائیور بھیجا ہے۔"

"میرا ڈرائیور؟ کب دیکھا تم نے میرے پاس ڈرائیور؟" اس نے تنفر سے کاغذ کو مٹھی میں موڑ دیا۔

"میں سمجھی اور اس نے کہا' تمہارا نام لیا تو۔۔۔"

"اس نے یہ کہا کہ اس کو میں نے بھیجا ہے؟" اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ نہیں۔"

"یعنی کہ نہیں۔ اس نے نہیں بتایا کہ اسے کس نے بھیجا ہے اور تم اس کے ساتھ بیٹھ گئیں؟ حیا! تم یوں کسی کی گاڑی میں بھی بیٹھ سکتی ہو؟"

"میں نے کہا نا میں سمجھی وہ تمہاری کار ہے۔" بے بسی کے مارے اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

"میرے پاس تم نے دوسری کار کب دیکھی؟ تم۔۔۔"

"اگر تمہیں مجھ پہ اتنی بے اعتباری ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ۔" اس نے نیپکن نوچ پھینکا اور کرسی دھکیل کر اٹھی۔ "جو شخص یہ حرکت کرتا ہے' وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتا' نہ اس میں میرا کوئی قصور ہے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی برا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے' یہاں اکیلے بیٹھو' اکیلے کھاؤ اور اکیلے رہو۔"

اس نے کلچ یوں ہاتھ مار کر اٹھایا کہ کرسٹل کا گلدان میز سے لڑھک کر نیچے جا گرا۔ چھناکے کی آواز آئی اور وہ کرچیوں میں بٹ گیا۔

جہان شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مگر وہ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے نہیں رکی۔ وہ تیزی سے میز کے ایک طرف سے نکلی' اسٹینڈ پہ لٹکا کوٹ کالر سے پکڑ کر کھینچا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اگر وہ اس کے پیچھے آنا بھی چاہتا' تو ابھی جو نقصان وہ کرکے گئی تھی' اسے پورا کرکے ہی آتا اور اس کارروائی میں اسے جتنے منٹ لگتے' اتنی دیر میں وہ دور جاچکی ہوتی۔

استقلال اسٹریٹ میں لوگ اسی طرح چل رہے تھے۔ وہ اس رش کے درمیان میں ہی کہیں تھی۔ اس نے کوٹ پہنا نہیں' بازو پہ ڈال دیا اور پھر دونوں بازو سینے پہ لپیٹے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی جارہی تھی۔ آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

وہ اس کے پیچھے نہیں آیا' اور اگر آیا بھی تو وہ اس شور اور رش میں نہ اسے دیکھ پائی نہ ہی اس کی آواز سن پائی۔ بس اسی طرح چلتی رہی۔ استقلال اسٹریٹ کا آخری کنارا مڑ کر وہ تاقسم اسکوائر میں داخل ہوئی اور بالکل سیدھ میں چلتی ہوئی تاقسم پارک کی طرف بڑھ گئی۔

تاریک پارک کے ایک گوشے میں وہ سنگی بنچ ویران پڑا تھا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں اس پہ بیٹھی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

انا' خودداری' عزت نفس' اور اپنی ذات کے وقار کے وہ سارے اسباق جو وہ ہمیشہ خود کو پڑھاتی اور یاد دلاتی رہی تھی' آج بہت ذلت کے ساتھ چکنا چور ہوئے تھے۔ وہ شخص کب اس کو یوں ذلیل نہیں کرتا تھا' یوں بے مول' بے وقعت نہیں کرتا تھا' اسے ایک موقع بھی یاد نہ آیا۔ ہمیشہ' ہر دفعہ وہ یہی کرتا تھا' یا پھر ایسا ہو جاتا تھا۔ آخر کب تک یوں چلے گا؟ بہت گرا لیا اس نے خود کو' بہت جھکا لیا' بہت بے مول کر لیا' اب وہ مزید نہیں جھکے گی۔ اب اسے جھکنا پڑے گا' بس آج یہ طے ہو گیا۔

اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا' پھر ارد گرد پچھلی رات کو دیکھا تو واپسی کا خیال آیا۔ اس نے گود میں رکھا سنہری کلچ کھولا تاکہ موبائل نکال سکے' مگر۔۔۔ اوہ' موبائل تو اس میں پورا ہی نہیں آتا تھا' وہ تو اس نے میز پہ رکھا تھا اور۔۔۔

وہ کوٹ اٹھائے باہر بھاگی۔ اپنا ترکی والا بھدا موبائل وہ اس ریسٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی' اسے ہر حالت میں موبائل واپس اٹھانا تھا' چاہے جہان سے سامنا ہو یا نہ ہو۔ چند منٹ بعد جب وہ ہانپتی ہوئی واپس استقلال اسٹریٹ میں اس ریسٹورنٹ کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کونے والی میز خالی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میز تک گئی اور اِدھر اُدھر چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنا موبائل تلاشا' مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کرسٹل کے ٹوٹے گلدان کی کرچیاں بھی اب فرش سے اٹھالی گئی تھیں۔

"پرابلم' میڈم؟"

وہ آواز پہ پلٹی تو وہی باوردی ویٹر جس کی ناک پہ موٹا سا تل تھا' متفکر سا کھڑا تھا' وہ یوکے اسی نے اسے لا کر دیا تھا۔

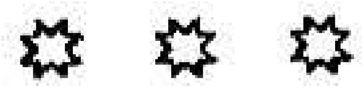
"میرا موبائل تھا اس میز پہ۔" وہ پریشانی سے گھنگریالی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی میز پہ چیزیں پھر سے اِدھر اُدھر کرنے لگی۔

"جی ہاں پڑا تھا' مگر جب آپ گلدان گرا کر گئیں تو آپ کے ساتھ جو صاحب تھے' انہوں نے وہ موبائل رکھ لیا اور مجھے کہا تھا کہ اگر آپ آئیں تو میں بتادوں کہ وہ فون انہی کے پاس ہے۔" ویٹر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا۔

"اوہ اچھا۔" اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ملنے کا ایک اور بہانہ۔ "وہ چلا گیا؟"

"جی! وہ بل پے کر کے فوراً" آپ کے پیچھے باہر دوڑے تھے۔ آپ کو نہیں ملے؟"

"نہیں۔ شکریہ!" وہ پھولوں کے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے باہر نکل آئی۔ استقلال اسٹریٹ پہ قدم رکھتے ہوئے اس نے کوٹ پہن لیا۔ اب اسے کافی دیر تک تاقسم اسکوائر پہ گورسل کے انتظار میں بیٹھنا تھا۔



ڈی جے خاموشی سے موبائل کے بٹن دباتی نمبر ملا رہی تھی۔ بٹنوں کی ٹوں ٹوں نے ڈورم کی خاموشی میں ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ کال کا سبز بٹن دبانے سے پہلے اس نے نظر اٹھا کر اپنے مقابل کرسی پہ بیٹھی حیا کو دیکھا جو پوری سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

"مگر حیا! میں اسے کہوں گی کیا؟"

"یہی کہ حیا کو اپنا موبائل چاہیے اور وہ اسے واپس کرے۔"

"مگر وہ واپس کیسے کرے گا؟"

"یہ اس کا مسئلہ ہے' تم کال ملاؤ۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

ڈی جے نے سر ہلا کر سبز بٹن دبایا' اسپیکر آن کر دیا اور فون اپنے لبوں کے قریب لے آئی۔

دوسری جانب طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں دم سادھے گھنٹیاں سنے گئیں۔

"پتا نہیں' تمہارا موبائل کدھر پڑا ہو' اسی کے نمبر پہ کر لیتے ہیں' شاید اس پہ وہ اٹھائے ہی۔۔۔" تب ہی کال اٹھالی گئی۔

"ہیلو؟" وہ جہان ہی تھا۔ ازلی مصروف انداز۔

"السلام علیکم! میں ڈی۔۔۔ خدیجہ بول رہی ہوں۔"

"دس از جہان۔ خدیجہ! ایسا ہے کہ یہ فون میرے پاس ہے، حیا ریسٹورنٹ میں بھول گئی تھی۔" وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔ پیچھے بہت سے لوگوں کی بولنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ ریسٹورنٹ میں تھا۔

"مجھے پتا ہے' اسی لیے تو کال کی ہے۔"

"اوکے!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "حیا کدھر ہے؟"

"وہ... وہ ذرا مصروف تھی تو میں نے سوچا میں آپ سے بات کرلوں۔" بات کرتے ہوئے ڈی جے نے ایک نظر حیا پہ ڈالی جو دم سادھے کرسی کے کنارے پہ آگے ہو کر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی... کہیے۔"

"بات یہ تھی کہ میں اور حیا کل پرنسز آئی لینڈز (شہزادوں کے جزیرے) پہ جانے کا سوچ رہے تھے' ان فیکٹ ہم پرنسز آئی لینڈز کے سب سے بڑے جزیرے بیوک ادا جائیں گے۔"

حیا نے نا سمجھی سے الجھ کر اسے دیکھا' پھر نفی میں سر ہلا کر روکا' مگر وہ مزے سے کہے جارہی تھی۔

"اوکے تو آپ کو فون چاہیے؟"

"نہیں! فون آپ اپنے پاس رکھیں' عیش کریں' ہمیں بس کمپنی چاہیے۔"

"ڈی جے' ذلیل!" وہ بنا آواز کے لب ہلا کر چلائی اور ڈی جے کی کہنی موڑی' مگر ڈی جے ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"کل؟ کل تو میں ذرا مصروف ہوں۔ آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"

"تو پرسوں صبح چلتے ہیں۔"

"شش... نہیں۔" وہ ہاتھ سے اشارے کرتی اسے باز رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"پرسوں تو مجھے شہر سے باہر جانا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر جمعے کو؟"

"جمعے کو میری ایک بہت اہم میٹنگ ہے اور بیوک ادا میں تو پورا دن لگ جاتا ہے۔"

"پھر تو آپ ہفتے کو بھی مصروف ہوں گے؟" ڈی جے نے مایوسی سے کہا تو دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

"ان فیکٹ ہفتے کو میں واقعی فارغ ہوں۔ ٹھیک ہے' ہفتے کو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔" وہ جیسے بہت با دل نخواستہ تیار ہوا تھا۔

"بس پھر ٹھیک ہے' ہم صبح والی کورسل سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی سات بجے سے پہلے پہلے تک ادھر ہمارا انتظار کیجئے گا۔ وہاں سے ہم پھر اکٹھے فیری میں سوار ہوں گے' ٹھیک؟"

"ٹھیک' میڈم!"

"اور ہاں' تب تک آپ ہمارا فون استعمال کرسکتے ہیں۔"

"میں آپ کا احسان تاعمر یاد رکھوں گا۔" وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

وہ فون بند کر کے واپس آئی تو حیا خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ ڈی جے واپس کرسی پہ بیٹھی اور بڑے لاپروا انداز میں میز سے میگزین اٹھا کر صفحے پلٹنے لگی۔

"کیا ضرورت تھی اسے ساتھ چلنے کا کہنے کی؟ ہم اکیلے بھی تو جاسکتے تھے۔"

"کیونکہ مجھے اس کے شادی شدہ ہونے میں ابھی تک شک ہے۔" وہ اب ایک صفحے پہ رک کر بغور کوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ "ویسے اس کی بیوی کہاں ہوتی ہے؟"

"یہیں' استنبول میں۔" وہ بددلی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

"اس کی کیا اپنی بیوی سے کوئی لڑائی ہے؟ کبھی ذکر نہیں کرتا اس کا۔"

"شاید... میں نے اس موضوع پہ کبھی بات نہیں کی۔ ویسے بھی جہان کا نکاح بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ اب پتا نہیں اس کو خود اپنے نکاح کا علم ہے بھی یا نہیں کیونکہ وہ کبھی ذکر نہیں کرتا' شاید پھپھو نے اس سے چھپا رکھا ہو۔"

"بچوں والی باتیں کرتی ہو تم بھی۔" ڈی جے نے چہرہ اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا۔ "آج کے دور میں ایسا کہاں ممکن ہے کہ کسی کا نکاح ہوا ہو اور اسے علم بھی نہ ہو۔ یقیناً' اسے پتا ہوگا۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ نکاح اس کا جس سے بھی ہو' تم اس کی اتنی کیئر کیوں کرتی ہو؟" ڈی جے پھر مسکراہٹ دبائے رسالے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

"کیونکہ اس کا نکاح مجھ سے ہوا تھا۔" وہ آہستہ سے بولی تو ڈی جے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"یعنی' یعنی اوہ گاڈ... تمہارا اس سے نکاح ہوا تھا تو... تو وہ تمہارا کیا لگا؟"

"سوتیلا ماموں لگا۔" وہ بگڑ کر بولی اور اپنے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

"اوہ مائی گاڈ... تم نے مجھے اتنی بڑی بات نہیں بتائی!" ڈی جے ابھی تک بے یقین تھی۔

"اب بتا تو دی ہے نا۔ اب جاؤ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور میں آج کیمپس نہیں جاؤں گی۔" وہ اوپر اپنے بستر میں پھر سے لیٹ گئی اور کمبل منہ پہ ڈال لیا۔

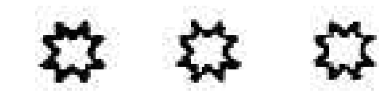
"بہت ذلیل ہو تم حیا! ارے آٹھ بج گئے۔" وہ میگزین پھینک کر اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی' پھر سلائیڈ کھول کر' چہرہ باہر نکالے لبوں کے گرد دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند چلائی۔

"گڈ ماآآآ آرننگ... ڈی جے۔"

"ٹی ی ی ی ی... نے ے ے..." دور نیچے سے کسی لڑکے نے جوابی ہانک لگائی تھی۔

"ذا... لیل۔" وہ جل کر اور زور سے چلائی۔

"چپ کرو' مجھے سونے دو۔" حیا نے تکیہ کھینچ کر اسے دے مارا' مگر وہ اسی کھڑکی کے پاس کھڑی صدائیں لگاتی رہی۔



وہ یونیورسٹی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہی تھی' جب اس کا موبائل بجا۔ وہ وہیں تیسری سیڑھی پہ رکی' فائل اور کتابیں دوسرے ہاتھ میں منتقل کیں اور باری باری کوٹ کی دونوں جیبیں کھنگالیں' پھر اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چنگھاڑتا ہوا موبائل باہر نکالا۔

یہ اس کا پاکستانی سم والا فون تھا۔ دوسرا موبائل جہان کے پاس ہونے کے باعث وہ آج کل اسے ہی استعمال کررہی تھی۔

چمکتی اسکرین پہ ترکی کا کوئی غیر شناسا نمبر لکھا آرہا تھا۔ نمبر کس کا تھا' اسے قطعاً' یاد نہ آیا۔ نمبر یاد رکھنے کے معاملے میں وہ بہت چور تھی۔ اسے اپنے پاکستانی موبائل نمبر تک کے آخری دو ہندسے بھولتے تھے اور ترکی والا تو خیر سرے سے یاد نہ تھا۔

"ہیلو؟" وہ فون کان سے لگائے ہوئے وہیں سیڑھی پہ بیٹھ گئی۔ کندھے سے بیگ اتار کر ایک طرف رکھا اور فائلیں گود میں۔

"جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں"

آواز اجنبی تھی بھی اور نہیں بھی' مگر اس کا لوچ' اتار چڑھاؤ اور انداز... سب شناسا تھا۔ وہ لب بھینچ گئی۔

"عبدالرحمٰن بات کر رہا ہوں اور بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔" گو کہ وہ پڑھا لکھا لگتا تھا مگر انداز سے کہیں نہ کہیں ممبئی کے کسی نچلے طبقے کے شہری کی جھلک آتی تھی۔

"کیا بات کرنی ہے آپ کو؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟"

"ملنا چاہتا ہوں۔ بتائیے' کیا یہ ممکن ہے؟"

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں بے اختیار پسینے میں بھیگ گئیں۔

"میں نہیں مل سکتی۔"

"کیوں؟ جس فون کال میں آپ کی دوست نے آپ کے کزن کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تھی' اس میں غالباً' انہوں نے بیوک ادا کا ذکر کیا تھا۔ پرنسز آئی لینڈز... شہزادوں کے جزیرے... کیا آپ ادھر نہیں آرہیں؟"

تو وہ اس کی کالز ٹیپ کر رہا تھا اور تب ہی اس نے

پاکستان والے موبائل پہ کال کی تھی کیونکہ وہ ترکی والے فون کے جہان کی تحویل میں ہونے کے بارے میں جانتا تھا۔

"میں بیوک ادا نہیں جا رہی۔ آئندہ آپ نہ تو میرا پیچھا کریں گے' نہ ہی میری کالز ٹیپ کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی جان لے لوں گی سمجھے!" اس نے جھلا کر فون کان سے ہٹایا اور سرخ بٹن زور سے دبایا۔ موبائل آف ہو گیا۔ وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب یہ شخص اس کا پیچھا چھوڑے گا۔

☆ ☆ ☆

سمندر کی جھاگ بھری نیلی لہروں پر سے ہوا سرسراتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں فیری کی بالکونی میں کھڑے سامنے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جہان قدرے جھک کر ریلنگ پکڑے کھڑا تھا اور حیا گردن سیدھی اٹھائے لب بھینچے سامنے افق پہ دیکھ رہی تھی۔

ڈی جے ابھی ابھی کیمرا لیے بالکونی کے دوسرے سرے تک گئی تھی' سو ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔

وہ جب سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ فیری میں سوار ہوئے تھے' تب سے آپس میں بات نہیں کر رہے تھے۔ فیری ویسے بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ جگہ ڈھونڈنے میں ہی اتنا وقت صرف ہو گیا۔ فیری کی نچلی منزل جو چاروں طرف سے شیشوں سے بند تھی' پر جڑے تمام صوفے اور کرسیاں بھرے تھے' سو وہ بالائی منزل پہ آ گئے جو اوپن ایئر تھی کھلا سا وسیع احاطہ جہاں ہر طرف صوفے اور کرسیاں تھیں' مگر ایک نشست بھی خالی نہ تھی۔ ان کو بالآخر فیری کے کنارے پہ بنی تنگ سی بالکونی میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ وہ اتنی تنگ تھی کہ سمندر کی جانب رخ کر کے ایک وقت میں ایک بندہ ہی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بالکونی کی گیلری لمبی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار وہاں کھڑی تھی۔

وہ دونوں بالکل دائیں طرف کے کونے میں تھے۔ ہوا بے حد سرد تھی' پھر بھی جہان سیاہ سوئیٹر کی آستین کہنیوں تک موڑے ہوئے تھا۔ مگر اسے بے حد سردی لگ رہی تھی کہ اس نے سیاہ لمبے اسکرٹ کے اوپر صرف سرمئی سوئیٹر ہی پہن رکھا تھا' سو اب سیاہ اسٹول کو سختی سے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بازو سینے پہ باندھ رکھے تھے۔

"گیومی سم سن شائن۔۔۔ گیومی سم رین۔۔۔"

حیا کے بائیں جانب ریلنگ پکڑے انڈین لڑکیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ وہ لڑکیاں بہت سی تھیں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھیں' مگر ان کی قطار بالکونی کے دوسرے سرے تک جاتی تھی۔ وہ کسی اسٹڈی ٹور پہ استنبول آئی ہوئی تھیں اور اب چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند لہک لہک کر وہ گیت گا رہی تھی۔

"تم اس روز بغیر بتائے اٹھ کر چلی گئیں۔ تمہیں پتا ہے میں کتنی دیر استقلال اسٹریٹ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا؟" وہ ریلنگ پہ جھکا سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو نہ ڈھونڈتے۔" حیا نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ہوا سے اس کے بال اڑ اڑ کر جہان کے کندھے کو چھو رہے تھے مگر وہ انہیں سمیٹنے کا تکلف بھی نہیں کر رہی تھی۔

"اتنا غصہ؟" جہان نے گردن موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔

"ایسا بھی کچھ نہیں کہا تھا میں نے۔"

"اگر تمہیں خود شرمندگی نہیں ہے تو میں کیوں دلاؤں؟"

"میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی پوچھتا۔"

"مجھے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

مرغابیوں کا ایک غول پر پھڑپھڑاتا ان کے سامنے سے گزرا تھا۔ جہان سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پکڑی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر فضا میں اچھالا۔ ایک بڑی سی مرغابی نے

فضا میں ہی غوطہ لگا کر اسے اپنی چونچ میں دبا لیا۔

وہ خاموشی سے پانی کی نیلی سطح کو دیکھتی رہی۔ پانی میں گلابی جیلی فش تیر رہی تھیں' ان کے سر پانی کے اندر ہی تھے مگر وہ اتنا شفاف تھا کہ وہ واضح دکھائی دیتی تھیں۔

"کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے حیا! کہ میں پوچھ سکوں کہ وہ شخص کیوں تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

"پوچھو' ضرور پوچھو' مگر اسی سے جا کر پوچھو۔"

"مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟"

"میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔"

آج وہ جہان کے لیے وہی حیا سلیمان بن گئی تھی' جو وہ ہر ایک کے لیے تھی۔ خود کو جس شخص کے سامنے جھکا لیا تھا' اب اسی کے سامنے اٹھانا بھی تھا۔

"جینے دو۔۔۔ کچھ پل تو۔۔۔ جینے دو۔"

وہ لڑکیاں ابھی تک لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ڈی جے بھی کہیں ان کے ساتھ تھی۔

"اچھا آئی ایم سوری۔" وہ رخ موڑ کر اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا اور روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

حیا نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے پگھلنے میں اور وہ پگھلی ہوئی موم کا ڈھیر بن گئی۔ بہت دھیرے سے وہ مسکرا دی۔ خود سے کیے سارے وعدے بھول گئے۔

"او کے!" اس نے روٹی کا ٹکڑا کھینچ کر توڑا اور اڑتی ہوئی مرغابی کی سمت پھینکا۔ اس نے اسے فضا میں ہی پکڑ لیا۔

"تمہارا ترکی بہت خوب صورت ہے جہان! مگر یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔" اب وہ روٹی کے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال رہی تھی۔

"اچھا۔۔۔ کیسے ہیں وہ؟"

"اکھڑ' بدلحاظ' مغرور' بدتمیز' بدتہذیب' بے مروت' الٹے دماغ کے لوگ ہیں یہاں کے۔"

وہ کہتی گئی اور وہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

"اور پاکستان کے لوگ کیسے ہوتے ہیں حیا سلیمان!" خوب ہنس کر وہ بولا تھا۔

"کم از کم ترکوں سے تو بہتر ہوتے ہیں۔" اس نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی دور اچھال دیا۔

جہان ابھی تک ہنس رہا تھا۔

"گیومی سم سن شائن۔

گیومی سم رین۔۔۔

گیومی این اور چانس ٹو گروپ اگین۔۔۔"

لڑکیاں اسی طرح مگن سی گا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں ساتھ ساتھ اس بل کھاتی سڑک پہ نیچے اتر رہے تھے۔ حیا ایک ہاتھ سے اسٹول اور دوسرے سے اڑتے بالوں کو سمیٹ کر پکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ پرانے زمانوں میں واپس چلی گئی ہے۔ ایک قدیم جزیرے پہ۔ جو ساری دنیا سے الگ تھلگ سمندر کے درمیان واقع تھا۔ وہ صدیوں پرانے شہزادوں کے جزیرے تھے اور وہ خود کوئی امر ہوئی شہزادی تھی۔

"شہزادوں کے جزیرے یا پرنسز آئی لینڈز" مرمرا کے سمندر میں قریب قریب واقع نو جزیروں کے گروہ کو کہا جاتا تھا۔ گئے وقتوں میں سلاطین اپنے تخت و تاج کے لیے خطرناک لگتے شہزادوں کو جلاوطن کر کے ان نو جزیروں پہ بھیجا کرتے تھے' جس سے ان کا نام پرنسز آئی لینڈ پڑ گیا۔ "بیوک ادا" ان میں سب سے بڑا جزیرہ تھا۔ بیوک یعنی بڑا اور "ادا" یعنی جزیرہ۔ بیوک ادا دنیا کے ٹریفک' رش اور ہنگامے سے دور ایک پرسکون' چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہاں گاڑیاں' بسیں' اور دوسری آٹوز نہیں ہوتی تھیں۔ سفر کرنے کے لیے قدیم وقتوں کی طرح گھوڑا گاڑیاں اور بگھیاں تھیں یا پھر بائی سائیکل۔

ڈی جے اور جہان اس سے چند قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ قدیم زمانوں کے رومانس میں کھوئی ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے' ان میں اب تک خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ جہان اسے

ریسٹورنٹس کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔
"یہاں بہت زیادہ اقسام کے کباب ملتے ہیں' غالباً ڈیڑھ سو اقسام کے اور ہر ریستوران یا تو سوپ فری دیتا ہے' یا ایل ٹی۔"
وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی قدم اٹھا رہی تھی۔
اس جگہ سڑک دونوں اطراف سے ریسٹورنٹس میں گھری تھی۔ ان کے دروازے کھلے تھے اور سامنے برآمدوں میں شیڈ تلے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔
سیاحوں کا ایک ہجوم ہر سو پھیلا تھا۔
سڑک کے وسط میں ایک جگہ مجمع سا لگا تھا۔ وہ تینوں بھی بے اختیار دیکھنے کے لیے رک گئے۔
سیاحوں کے ہجوم کے درمیان کھڑی وہ ایک پانچ چھ سال کی خوب صورت سی ترک بچی تھی۔ وہ گہرے جامنی بغیر آستین فراک میں ملبوس تھی اور گھنگھریالے بال کندھے پہ آگے کو ڈالے ہوئے تھے۔ وہ ریڈ کارپٹ پہ کھڑی کسی اداکارہ کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے ایک معصوم سا پوز بنائے کھڑی تھی اور اردگرد دائرے میں کھڑے سیاح کھٹاکھٹ اپنے کیمروں میں اس کی تصویریں مقید کر رہے تھے۔
وہ ہر تصویر کے بعد ذرا مختلف انداز سے کھڑی ہو جاتی اور چہرے پہ معصومیت طاری کیے کبھی آنکھیں پٹپٹاتی' کبھی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھتی' کبھی مسکراتی' کبھی ناک سکوڑتی' شاید ایک دو سیاح اس کی تصویر بنانے رکے ہوں گے تو دیکھا دیکھی یہ مجمع لگ گیا ہوگا۔
وہ اور ڈی جے بھی فوراً" اپنے کیمرے نکال کر تصویریں بنانے کھڑی ہو گئیں۔ اس بچی کے پوز اتنے پیارے تھے کہ تصویریں بنا بنا کر بھی ان کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حیا نے لمحے بھر کا توقف کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا تو دیکھا' جہان ساتھ ہی کھڑا لب بھینچے قدرے ناگواری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔
وہ شانے اچکا کر پھر سے سیاحوں کے جمگھٹے میں گھری بچی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"یار! عمر دیکھو اس کی' اور ایکشن کیسے یار رہی ہے۔"
ڈی جے ہنستے ہوئے تصویریں کھینچ رہی تھی۔
دفعتاً" مجمع کو چیر کر ایک لڑکی تیزی سے آگے بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے لمبے اسکرٹ اور کھلے سے سویٹر کے اوپر بھورا سادہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی رنگت سنہری تھی اور آنکھیں بھوری۔ وہ سولہ سترہ برس کی لگتی تھی۔ بائیں کہنی پہ اس نے ٹوکری ڈال رکھی تھی جس میں جنگلی پھول تھے۔
وہ ماتھے پہ تیوریاں لیے آگے بڑھی اور سختی سے اس بچی کا بازو پکڑا۔ بچی گھبرا کر پلٹی اور جیسے ہی اس لڑکی کو دیکھا' اس کے لبوں سے ہولے سے نکلا "عائشہ گل!"
"جواباً" وہ بھوری آنکھوں والی لڑکی ترک میں غصے سے کچھ کہتی ہوئی اس کا بازو پکڑ کر مجمع میں سے راستہ بنا کر اسے لے جانے لگی۔ وہ ترکی میں جو کہہ رہی تھی' وہ ایسا تھا کہ سیاح فوراً" پیچھے ہٹنے لگے۔ ریڈ کارپٹ شو ختم ہو گیا تھا۔
بچی اب مزاحمت کرتی' چڑچڑے پن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لڑکی' جس کا نام شاید عائشہ گل تھا' مسلسل بولتی ہوئی اسے لے کر جا رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی اور شاید نمی بھی۔
حیا گردن موڑ کر ان کو جاتے دیکھتی رہی۔
"آؤ! تمہیں اپنا بیوک ادا دکھاتا ہوں۔" جہان کی آواز پہ وہ چونکی' پھر خفیف سا سر جھٹک کر اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
جہان نے ایک بگھی روک دی تھی۔ ڈی جے نے البتہ چار لیرا فی گھنٹہ کے حساب سے سائیکل کرائے پر لے لی تھی اور اب وہ اسی پہ سوار ہو رہی تھی۔ حیا بگھی کے قریب آئی تو جہان نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔
وہ شاہانہ سی بگھی اوپر سے کھلی تھی۔ آگے ایک گھوڑا جتا تھا' اس کے ساتھ بگھی بان لگام تھامے بیٹھا تھا۔ پیچھے ایک خوب صورت سی دو افراد کے بیٹھنے کے لیے نشست بنی تھی جس پہ سنہری نقش و نگار بنے

تھے۔
وہ احتیاط سے اوپر چڑھی۔ مخملیں' شاہی نشست نہایت گداز تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی اس پہ بیٹھے۔
بگھی بان نے گھوڑے کو ذرا سی چابک لگائی تو وہ چل دیا۔ پتھریلی سڑک پہ اس کے ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔
"تو پھر پاکستان کے اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟"
حیا نے گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون پر نگاہیں جمائے پوچھ رہا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی مکمل توجہ نہیں دے گا' یہ تو طے تھا۔
"پاکستان اور پاکستان کے اچھے لوگ!" حیا گہری سانس لے کر سامنے کو دیکھنے لگی۔
سڑک دو رویہ سبز درختوں کی قطار سے گھری تھی۔ چند پیلے زرد پتے سڑک کے کناروں پہ بکھرے پڑے تھے۔ درختوں کی دونوں قطاروں کے درمیان بگھی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔
"ہم بہت ترقی یافتہ نہیں ہیں' بہت پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں۔ دھوکہ دہی' رشوت زنی' قتل و غارت اور بہت سی برائیوں میں بھی ملوث ہیں۔ ہمارے ہاں ظلم کھلے عام کیا جاتا ہے اور مظلوم بھی ہم ہی ہوتے ہیں۔ ہم پسماندہ بھی ہیں اور پست ذہن کے بھی' مگر اس سب کے باوجود جہان سکندر! ہم دل کے برے نہیں ہیں۔ ہمارے دل بہت سادہ' بہت معصوم' بہت پیارے ہوتے ہیں۔"
پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔
"کیا تم نے واقعی ابا سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں ہر روز بم بلاسٹ ہوتے ہیں؟"
"میں نے؟" موبائل کی اسکرین کو انگلیوں میں پکڑے وہ ذرا سا چونکا' پھر زیر لب مسکرا دیا۔ "شاید۔۔۔ کیا نہیں ہوتے؟"
"ہوتے تو ہیں۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے کیفے میں بھی بلاسٹ ہوا تھا۔ اس دن ہماری ایک فیرویل پارٹی تھی اور ہم فرینڈز بلاسٹ سے دس منٹ پہلے کیفے سے نکلی تھیں۔ بہت برا منظر تھا وہ۔ خون' ٹوٹا کانچ' جلی ہوئی دیواریں۔۔۔" اس نے یاد کر کے جیسے جھرجھری لی۔
"تو سیکیورٹی ادارے کیا کرتے ہیں؟"
"لگتا تو نہیں کہ کچھ کرتے ہیں۔ خیر! ترکی کے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟"
"میں تو ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں۔ ورکنگ کلاس کا ایک مزدور صفت شخص' جس کو مصروفیت کے باعث گھومنے پھرنے کا وقت بھی نہیں ملتا اور باوجود اس کے کہ میرے گھر سے بیوک ادا قریباً" دو گھنٹے کی مسافت پہ ہوگا' میں تین سال بعد ادھر آ رہا ہوں۔"
"واقعی؟" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔
جہان نے شانے اچکا دیے۔
"وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے بچت کے لیے ریسٹورنٹ میں ورکرز کم سے کم رکھے ہوئے ہیں' سو کام کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔" وہ اسی طرح اسکرین کو دباتا مسلسل کام کر رہا تھا۔
بگھی سڑک کی ڈھلان سے نیچے اتر رہی تھی۔ بل کھاتی سڑک کے دونوں اطراف میں خوب صورت بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ سڑک کے کنارے کتے ٹہلتے پھر رہے تھے۔
"یہ تختہ کمزور ہے۔" دفعتاً" جہان نے اپنے جوگر سے نیچے موجود تختہ تھپتھپایا اور پھر جھکا۔
"پلیز جہان! ساری دنیا کی ٹوٹی چیزیں تمہارا ہیڈک نہیں ہیں۔"
"اچھا!" وہ جو جھک رہا تھا' قدرے خفگی سے سیدھا ہوا۔ وہ پھر سے موبائل پہ کچھ لکھنے لگا۔
"فون رکھ بھی دو۔"
"مادام! آپ یہ مت بھولا کریں کہ آپ ایک غریب ورکر کے ساتھ ہیں جو اگر ایک دن کا آف لے گا تو سارے آرڈرز میں ہیر پھیر ہو جائے گی' سو اس بے چارے کو بہت سے کام یونہی آن دی موو بھگتانے پڑتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان تمام محنتوں کے باوجود وہ اگلے دس سال تک بھی بیوک ادا کے ان

بنگلوں جیسا آدھا بنگلہ بھی نہیں بنا سکتا۔"

اس کے کہنے پہ حیا نے لاشعوری طور پر سڑک کے دونوں اطراف بنے بنگلوں پہ نگاہ دوڑائی اور ایک لمحے کو ٹھٹک کر رک گئی۔

دائیں طرف جہان کے اس جانب جس بنگلے کے سامنے سے بگھی گزر رہی تھی' وہ اتنا عالیشان اور خوب صورت تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔

چار منزلہ' سفید اونچے ستونوں پہ وہ محل یوں شاہانہ انداز میں کھڑا تھا جیسے کوئی ببر شیر اپنے پنجوں پہ بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے چھوٹے سے باغیچے کے آگے ایک لکڑی کا سفید گیٹ تھا۔

بگھی آگے بڑھ گئی تو وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔ سفید محل کے لکڑی کے گیٹ پہ نام کی ایک تختی لگی تھی جس پہ قدیم لاطینی ہجوں کے انداز میں ترچھا کر کے انگریزی میں لکھا تھا۔

"اے آر پاشا۔"

اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو رکی تھی۔ اس کے انداز پہ جہان نے پلٹ کر اس گھر کو دیکھا تھا۔

"اب کیا تم ابھی سے میری جیب کا مقابلہ ان بنگلوں کے ساتھ کرنے لگی ہو؟"

وہ چونکی' پھر دوبارہ اس گیٹ کو دیکھا جو اب دور ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں تو۔" وہ سر جھٹک کر آگے دیکھنے لگی۔

پھر کتنی ہی گلیوں سے وہ خاموشی سے گزرے' یہاں تک کہ ایک جگہ جہان نے ترک میں کچھ کہہ کر کوچوان سے بگھی رکوا دی۔

"ہم نے پورے جزیرے کا چکر لگانا تھا' پھر ابھی سے کیوں رک گئے؟" وہ اترنے لگا تو حیا بول اٹھی۔

"نماز!" جہان نے سامنے مسجد کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

"اچھا!" وہ سر ہلا کر اٹھی' ایک ہاتھ راڈ پہ رکھا اور احتیاط سے پاؤں نیچے پیڈل پہ رکھ کر اتری۔ جہان پہلے ہی اتر کر مسجد کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مسجد چھوٹی مگر صاف ستھری سی تھی۔ جہان مردوں والے حصے میں چلا گیا تو وہ وضو کر کے عورتوں کے پریئر ہال میں آ گئی۔ وہ ظہر کا وقت تھا' مگر سورج بہت ٹھنڈا لگ رہا تھا۔

ہال کے ایک کونے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک بچی اسی کے انداز میں بیٹھی دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

حیا نے گیلے بازوؤں کی آستین نیچے کرتے ہوئے بغور ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ یہ وہی دونوں لڑکیاں تھیں جو ابھی دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ اسے نظر آئی تھیں۔ جامنی فراک والی چھوٹی بچی اور دوسری بھورے اسکارف والی سنجیدہ سی لڑکی۔

بچی منت بھرے شکایتی انداز میں اس لڑکی کے گھٹنے کو جھنجھوڑتی کچھ کہے جا رہی تھی' مگر وہ لڑکی جس کا نام شاید عائشے گل تھا' نفی میں سر ہلاتی گویا مسلسل اس کی تردید کیے جا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ حیا اسٹول کو چہرے کے گرد لپیٹتے ہوئے ان دونوں کو دیکھے گئی۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا شاید' وہ آپس میں مشغول تھیں۔

وہ جب نماز پڑھ کر اٹھی تو دیکھا' وہ بچی ابھی تک اس لڑکی کو منا رہی تھی اور شاید اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی اور زبان انجان تھی' مگر کبھی کبھی وہ بے بسی بھرے انداز میں چیخ کر ذرا زور سے عائشے گل۔۔۔ پلیز!" کہہ اٹھتی تو حیا کو سنائی دے جاتا۔

ایک آخری نگاہ ان دونوں پہ ڈال کر وہ باہر آ گئی۔

مسجد کے برآمدے میں وہ تنہا نماز پڑھ رہا تھا۔ حیا ننگے پاؤں چلتی ہوئی برآمدے تک آئی اور ایک ستون سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ ہوا سے اس کا سر پہ لیا اسٹول سر کی پشت تک پھسل گیا تھا۔

سامنے چند قدم کے فاصلے پہ وہ سجدے میں جھکا تھا۔ نیلی جینز اور اوپر سیاہ سویٹر جہان سکندر کا مخصوص لاپروا سا حلیہ۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ سر ستون سے ٹکائے اسے دیکھے گئی۔

وہ اب سجدے سے اٹھ کر تشہد میں بیٹھ رہا تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرنے والے جہان سکندر کی نماز بہت ٹھہری ہوئی اور پرسکون تھی۔ وہ چونکہ اس سے ذرا پیچھے کھڑی تھی۔ تو یہاں سے اس کا صرف ہلکا رخ ہی نظر آتا تھا۔ گردن کی پشت اور چہرے کا ذرا سا دایاں حصہ۔ وہ گردن جھکائے تشہد پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے دائیں رخ سلام کے لیے گردن موڑی تو حیا کو بالآخر اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ زیر لب مسکراتے اسے دیکھے گئی۔

دوسری جانب سلام پھیر کر اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا دعا مانگتا رہا' پھر ایک گہری سانس لے کر ہاتھ چہرے پہ پھیرتا وہ کھڑا ہوا اور واپس مڑا تو اسے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

"تم انتظار کر رہی تھیں؟" وہ ذرا مسکرا کر کہتا ہوا اس کی طرف آیا تو حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ہی باہر آئے تھے۔

"جہان!" چوکھٹ پر جب وہ جھک کر کھڑا جوگر پہن رہا تھا تو حیا نے اسے پکارا۔

"ہوں؟"

"تم مذہبی ہو؟"

"تھوڑا بہت۔" وہ تسمہ باندھ رہا تھا۔

"لگتے نہیں ہو۔"

تسمے کی گرہ لگاتی اس کی انگلیاں تھمیں' اس نے سر اٹھا کر قدرے ناسمجھی سے حیا کو دیکھا۔

"میں کیا کرتا کہ مذہبی لگتا؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ویسے تم نے دعا میں کیا مانگا؟"

"میں نے زندگی مانگی!" وہ تسمہ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"زندگی؟" حیا نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ اب عادتاً سویٹر کی آستینیں موڑ رہا تھا۔

"انسان وہی چیز مانگتا ہے' جس کی اسے کمی لگتی ہے' سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔ اگر زندگی ہے تو سب خوب صورت ہے' نہیں ہے تو سب اندھیرا ہے۔" وہ دونوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

"خوب صورتی کیا ہوتی ہے جہان!؟"

بیوک ادا کی سرد ہوا اس کے بال پھر سے اڑانے لگی تھی۔ شال سر سے پھسل کر اب گردن کے پیچھے اٹک گئی تھی اور جب اپنے بکھرتے بال دونوں ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے اس نے یہ سوال پوچھا تھا تو شدید خواہش کے باوجود وہ جانتی تھی کہ "وہ خوب صورتی حیا سلیمان کی آنکھیں ہیں" جیسی کوئی بات نہیں کہے گا' مگر جو اس نے کہا' وہ حیا سلیمان کے لیے قطعاً "غیر متوقع" تھا۔

"علی کرامت کی ماں!"

"کیا؟" اس نے ناسمجھی سے جہان کو دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

"میرے لیے خوب صورتی علی کرامت کی ماں پہ ختم ہو جاتی ہے۔ علی کرامت میرا ایک اسکول فیلو تھا۔ ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تھا' تب میں نے اس کی ماں کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھیں اور اس وقت ہسپتال سے آئی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی تھیں اور اس وقت کچن میں کھڑی ٹشو سے اپنا چہرہ تھپتھپا رہی تھیں۔ حیا! وہ چہرہ اتنا مقدس' اتنا خوب صورت تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔" اس کی بات پہ وہ چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"وہ۔۔۔ ترک تھیں یا پاکستانی؟" بہت دیر بعد وہ بولی۔

"وہ سیاہ فام تھیں۔ مصری سیاہ فام۔"

اور حیا کے حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی' تاہم وہ لب بھینچے خاموشی سے اس کے ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔

یہ وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے وہ جھک جاتی تھی' خاموش ہو جاتی تھی' کڑوے گھونٹ پی لیتی تھی اور۔۔۔ اور پھر بھی موم بن جاتی تھی۔ اگر یہی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اپنے ازلی طنطنے سے اس کو اتنی سناتی کہ ایسی بات کرنے کی وہ شخص دوبارہ کبھی ہمت نہ کرتا۔ حد ہو گئی بھلا سیاہ فام کہاں اتنے حسین ہو سکتے ہیں۔ یا پھر شاید جہان کا مطلب یہ تھا کہ اسے حیا سلیمان کے مقابلے میں ایک بد صورت ترین سیاہ فام

عورت بھی خوب صورت لگتی ہے۔

وہ زندگی میں پہلی دفعہ کسی بد صورت عورت کو سوچ کر حسد کا شکار ہوئی تھی مگر چپ رہی۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تو وہ واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ بیوک ادا جزیرے کی گلیوں میں چل چل کر اب اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ ڈی جے واپسی پہ پھر سے بالکونی میں کھڑے ہونے کے لیے قطعی راضی نہ تھی اور اس کا پورا ارادہ فیری میں گھس کر چاہے پیار سے' چاہے لڑ جھگڑ کر' مگر بیٹھنے کے لیے نشست ڈھونڈنے کا تھا۔ جہان کو ٹکٹ لینے میں خاصی دیر لگ گئی۔ پانچ بجے والی فیری شام کی آخری فیری تھی' سو سیاحوں کا سارا ہجوم ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے موجود تھا۔ اب اس کے بعد اگلا جہاز رات آٹھ بجے چلنا تھا اور پھر اگلی صبح تک کوئی جہاز نہیں آتا تھا۔ جو رہ گیا' وہ جزیرے پہ رات بسر کرے یا تیر کر واپس جائے۔

"اگر تم دونوں اسی رفتار سے چلتی رہیں تو فیری نکل جائے گی اور تمہیں واقعی تیر کر واپس جانا پڑے گا۔" وہ ان دونوں کی سست روی پہ خاصا جھنجلا کر بولا تھا۔ جواباً" وہ قدرے خفت سے ذرا تیز چلنے لگیں۔

بندر گاہ کھچا کھچ سیاحوں سے بھری تھی۔ وہ تینوں اس رش میں سے بمشکل راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جہان آگے تھا اور وہ دونوں پیچھے۔ اسے اب اپنے ریسٹورنٹ کی فکر ہونے لگی تھی کیونکہ بار بار وہاں سے اسے کالز آنے لگی تھیں۔ پراپرٹی کی مالکہ نے آکر پھر سے کوئی ہنگامہ کیا تھا۔ جہان اسے اس سارے معاملے پہ قدرے پریشان و متاسف لگا تھا گو کہ وہ اپنے تاثرات چھپانے کی مکمل کوشش کر رہا تھا' مگر وہ اس کا ہر رنگ اب پہچاننے لگی تھی۔

وہ تینوں فیری کی طرف جاتے بورڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جب کسی نے حیا کی کہنی کو ذرا سا چھوا۔

"ماڈم... ماڈم!"

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن موڑی۔

اس کے عقب میں ایک بارہ تیرہ برس کا ایک ترک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کوئی ٹھیلے والا تھا' اس نے گردن کے گرد اور دونوں ہاتھوں میں بہت سے ہار اور موتیوں کی لڑیاں ڈوریوں میں باندھ کر اٹھائی ہوئی تھیں اور اب وہ لڑیوں کا ایک گچھا حیا کے چہرے کے سامنے کر کے دکھاتا' ترغیب دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کبھی نہ رکتی مگر وہ موتی اور ان کی چمک اتنی خوب صورت تھی کہ اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ وہ بے اختیار وہ لڑیاں انگلیوں میں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ بالوں میں پرونے والی لڑیاں تھیں اور اتنی حسین تھیں کہ چند لمحے کے لیے وہ لمبے بالوں کی دیوانی لڑکی ارد گرد کو فراموش کر بیٹھی۔

"حیا... حیا!"

جہان دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان اور ڈی جے فیری کے تختے پہ چڑھ چکے تھے اور اب جھنجلاہٹ بھری کوفت سے اسے بلا رہے تھے۔

"ایک منٹ!" وہ انگشت شہادت اٹھا کر ان کو رکنے کا اشارہ کرتی پلٹ کر جلدی جلدی لڑیاں دیکھنے لگی۔

"ہاؤ مچ؟" اس نے دو لڑیاں الگ کر کے پوچھا۔

"تین لیرا... تین لیرا۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہیں۔" اس نے خفگی سے بچے کو دیکھا۔ پیچھے جہان اسے ناگواری بھرے انداز میں پھر سے آواز دے رہا تھا۔

"تم جاؤ' جگہ تلاش کرو میں دو منٹ میں آ رہی ہوں!" اس نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے جانے کا اشارہ کیا۔ ان تک ان کی آواز شاید پہنچ گئی تھی' تب ہی وہ دونوں سر ہلا کر مڑے اور فیری کے اندرونی راستے کی جانب بڑھ گئے۔

فیری نکلنے میں ابھی تین منٹ تھے اور وہ ان تین منٹوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"سیون لیرا۔" اس نے حتمی انداز میں لڑکے کو کہا اور پیسے نکالنے کے لیے سنہری کلچ کھولا' اس سے قبل کہ وہ نوٹ نکالتی' لڑکے نے ایک دم پرس جھپٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

لمحے بھر کو اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور جب سمجھ آیا تو وہ...

"رکو... رکو... میرا پرس!" چلاتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ جہان' ڈی جے' فیری' اس افتاد میں اسے سب بھول گیا۔

لڑکا پھرتی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ سیاح افراتفری میں فیری کی طرف بڑھ رہے تھے' کسی کے پاس توجہ کرنے کو وقت نہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی اس لڑکے کے پیچھے آئی۔ وہ بازار کی طرف مڑ گیا تھا اور اب ایک گلی کے عین وسط میں کھڑا تھا' حیا جیسے ہی بھاگتی ہوئی اس گلی میں داخل ہوئی' لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"رکو... رکو!" وہ غصے سے چلاتی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لڑکا خاصا پھرتیلا لگ رہا تھا' مگر وہ اتنا تیز نہیں بھاگتا تھا۔ تین گلیاں عبور کر کے وہ اس رہائشی علاقے میں داخل ہوا اور سرپٹ دوڑتا ہوا دائیں طرف کی قطار کے بنگلوں میں سے ایک کا گیٹ عبور کر گیا۔

وہ ہانپتی ہوئی اس گیٹ تک آئی۔ گیٹ نیم وا تھا۔ لڑکا اندر ہی کہیں گیا تھا۔ دور کہیں فیری کا بگل بج رہا تھا اور تب اسے احساس ہوا کہ فیری نکل چکی ہے۔ ڈی جے اور جہان جزیرے سے چلے گئے تھے اور وہ ادھر تنہا رہ گئی تھی۔ لیکن یہ وقت وہ سب سوچنے کا نہیں تھا۔ اسے اپنا پرس اور پیسے واپس لینا تھے ہر صورت۔

اس نے ایک لمحے کو اس نیم وا گیٹ کو دیکھا اور پھر اس کے پیچھے کھڑے اس عالیشان سفید محل کو اور پھر تیزی سے اندر آئی۔ یہ وہی سفید محل تھا جو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔

چھوٹے سے باغیچے میں خاموشی چھائی تھی۔ شام کے پردے اب نیلے پڑ رہے تھے۔ وہ پھولتے سانس کو ہموار کرتی متذبذب سی چلتی بنگلے کے داخلی دروازے تک آئی اور بیل کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

لکڑی کا اونچا منقش دروازہ قدیم طرز کا بنا تھا۔ اس کے آس پاس بیل نامی کوئی شے نہ تھی۔ وہ کیا کرے؟ یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر میں کیسے گھس جائے؟ لیکن وہ اچکا بھی تو اسی گھر میں چھپنے کی نیت سے داخل ہوا تھا' اسے بہرحال اندر جانا تھا۔

ایک مصمم ارادہ کر کے اس نے کندھے پہ پھسلتی شال درست کی اور دروازے کا سنہری ناب گھمایا۔ وہ قدیم وقتوں کی کوئی امر ہوئی شہزادی تھی جو راستہ بھٹک کر اس جزیرے پہ آنکلی تھی اور اب سلطان کے محل کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازہ چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہر سو اندھیرا تھا۔ اس نے چوکھٹ پہ قدم دھرا۔

"ہیلو؟" وہ دو قدم مزید آگے آئی اور پکارا اس کی آواز کی گونج در و دیوار سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

وہ کسی لابی میں کھڑی تھی۔ وہاں نیم تاریکی سی چھائی تھی۔ صرف کھلے دروازے سے آتی شام کی نیلگوں روشنی میں آگے جاتی راہداری سی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل عجیب سی بے چینی و خوف میں گھرنے لگا۔

"کوئی ہے؟" اب کے اس نے پکارا تو آواز میں ذرا ارتعاش تھا۔ ایک دم اس کے عقب میں ٹھاہ کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کلک کے ساتھ لاک لگنے کی آواز آئی۔

وہ گھبرا کر پلٹی اور دروازے کی طرف لپکی۔ ڈور ناب تاریکی میں بمشکل اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے زور سے ناب کھینچا' پھر گھمایا' مگر بے سود۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔

"اوپن! اوپن دی ڈور!" وہ دونوں ہتھیلیوں سے لکڑی کا دروازہ پیٹنے لگی۔ ساتھ ہی وہ خوفزدہ سی دبی دبی آواز میں چلا بھی رہی تھی۔

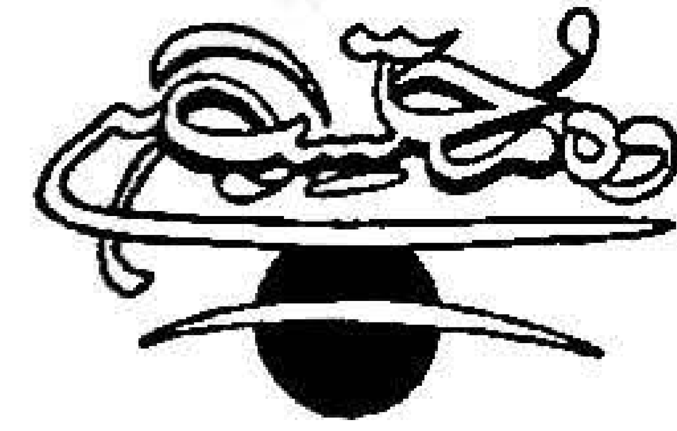
"شہزادوں کے جزیرے پہ خوش آمدید!"

بہت آہستہ سے کسی نے اس کے عقب میں کہا تھا۔

وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ام مریم



"آئی ایم سوری مسز حسن! مجھے آپ کے احساسات و جذبات کے مجروح ہونے کا احساس ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں آپ سے سچ چھپا نہیں سکتی، میڈیکل ٹیسٹ کے بعد جو رزلٹ سامنے آیا ہے، وہ یہی ہے کہ آپ میں ماں بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔" ڈاکٹر روبینہ کے الفاظ کسی بم کی طرح اس کی سماعت پر گرے تھے۔

وقار حسن کی آنکھوں تلے بھی جیسے اندھیرے چھا گئے۔ بھنچے ہوئے لبوں اور ضبط کی کوشش میں سرخ آنکھیں جھکائے انہیں اپنا دل یکلخت خالی ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ہر سو جیسے تیز ہواؤں کے جھکڑ تھے۔ ان کا بے کل و مضطرب دل جیسے اندر ہی اندر اتھاہ گہرائیوں میں اترتا جارہا تھا۔ ان کی سماعت میں ثانیہ کی آہیں، سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وہ ان کی طرح مضبوط اعصاب نہیں رکھتی تھی۔ جب ہی تو اس روح فرسا انکشاف نے بکھیر کے رکھ دیا تھا اسے۔

"وقار! سنا آپ نے، یہ کہہ رہی ہیں؟ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔" وہ روتے ہوئے ان کے کاندھے پہ سر رکھ کے گلوگیر آواز میں بولی۔ وقار حسن نے اپنی لہو رنگ آنکھیں اٹھا کر اس کے چہرے پہ بکھرتے آنسوؤں کو دیکھا۔

"ٹیک اٹ ایزی مسز حسن! ریلیکس، خدا کے ہر فیصلے میں مصلحت ہوا کرتی ہے آپ سمجھ دار ہیں، پلیز! خود کو سنبھالیں۔ پلیز مسٹر وقار!" ڈاکٹر روبینہ نے بے بسی سے کہتے ہوئے وقار حسن کو مخاطب کیا تو وقار حسن بہت ضبط سے مسکرائے۔

"تھینک یو ڈاکٹر!" پھر وہ ثانیہ سے مخاطب ہوئے۔ ثانیہ! اٹھو۔ چلتے ہیں۔ پلیز! حوصلہ رکھو۔

ناولٹ



وہ ثانیہ کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ڈاکٹر روبینہ نے بہت متاسفانہ نگاہوں سے اس جوڑے کو دیکھا تھا جو اس غیر متوقع خبر کے بعد بکھرنے کے مرحلے میں تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو گیا ہے ثانیہ! تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں۔ بی بریو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وقار حسن نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے تکیوں کے سہارے نیم دراز ثانیہ کو نڈھال سے انداز میں پڑے دیکھ کر ایک بار پھر دل جوئی کی تھی۔

"اب باقی کیا بچا ہے وقار! کیا ٹھیک ہو گا؟" ثانیہ نے دکھ سے کہتے ہوئے انہیں دیکھا تو وقار حسن نگاہ چرا گئے۔

"بہر حال! خدائی کاموں میں کیا زور۔ ہمیں اس کی مصلحت میں ہی اپنی بقا ڈھونڈنا ہو گی۔"

"کاش! ایسا نہ ہوتا۔ ساری زندگی آس میں بیت جاتی۔ دس سال بھی تو اسی آس کا دامن تھامے رکھا تھا وقار! مگر اس چیک اپ نے تو ہر امید توڑ دی ہے۔" وہ شدید کرب کا شکار تھی۔

"کیوں مایوس ہوتی ہو ثانیہ! ان ڈاکٹروں سے بڑا بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔ اس سے مانگو۔ مایوسی کفر ہے۔ مایوس مت ہو۔" انہوں نے ثانیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ڈھارس بندھائی۔

"پتا نہیں کیوں، میرا دل بہت ہول رہا ہے وقار! اماں جان سے کب تک یہ بات چھپی رہ سکے گی؟ اتنا بینک بیلنس، جاگیریں، وسیع پھیلا ہوا بزنس اور اس کا وارث کوئی ایک بھی نہیں۔ اماں کہاں برداشت کریں گی۔ آپ کی تمام محبت دھری رہ جائے گی۔ وہ آپ کی دوسری شادی کرا دیں گی۔" پلکوں کی دہلیز سے پھیلتی نمی اس کی کنپٹیوں سے ہوتی بالوں میں جذب ہونے لگی۔

وقار حسن نے اس کے خدشات پر ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

"کیسے یقین دلاؤں ثانیہ! کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا، چاہے عمر بھر اولاد نہ ہو۔ دیکھو! اگر میرے نصیب میں رب نے یہ خوشی رکھی ہے تو اللہ تمہارے ذریعے سے بھی دے سکتا ہے۔ اس کے گھر میں کمی نہیں ہے، دیر ہے، اندھیرا نہیں۔ تم سب اللہ پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟" وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہے تھے اور پتا نہیں وہ سمجھی تھی یا نہیں، البتہ خاموشی اختیار کر لی اور وقار حسن کے لیے یہی کافی تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں! یہ کچھ پیسے ہیں۔" وہ کچن میں آئی تو ماں کو چولہے کے پاس بیٹھے افسردگی سے راکھ کریدتے ہوئے دیکھ کر آہستگی سے پکارا۔

"پیسے۔" ماں نے سر اونچا کیا۔ ان کی سرمئی آنکھوں میں سرمئی غبار پھیلا تھا۔

وہ نظریں چرا گئی۔ یہ آنسوؤں کی نمی تھی جو اس کے باپ کی چارپائی کی مار کھا کر اس کی ماں کی آنکھوں میں اتر آیا کرتی تھی۔

"کہاں سے آئے؟" انہوں نے لپک کر وہ میلے کچیلے نوٹ اس سے جھپٹے۔

"ببلو اور منھی سے فیس لی ہے اماں!" وہ سر جھکائے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہی تھی۔

"مگر ابھی تو مہینہ ختم نہیں ہوا، انہوں نے فیس کیسے دے دی؟"

"میں نے خالہ سے خود کہہ کر لیے ہیں اماں!" اس نے سر نیہوڑائے ہوئے جواب دیا اس کی ماں گم صم ہو گئی۔

"کچھ پکانے کو لے آؤ اماں! شام ڈھل رہی ہے۔ اندھیرا ہو گیا تو پکانا مشکل ہو جائے گا، پھر تیل پہ علیحدہ خرچ اٹھے گا۔ پانچ روپے کا اتنا تھوڑا تیل دیتا ہے چاچا طفیل کہ چراغ بھی پورا نہیں بھرتا۔" وہ بولتے ہوئے آٹے کے کنستر کے پاس آ کر ڈھکن کھول کر اندر جھانکنے لگی اور جیسے دل ہول گیا۔ آٹا بمشکل اتنا تھا کہ بس اسی وقت پورا پڑتا اور اس کے پاس کل متاع یہ دو سو روپیہ۔

اس کا دل یاسیت میں گھرنے لگا۔ آٹا چھان کر پرات میں نکالا اور بیٹھ کر گوندھنے لگی۔

"پتا نہیں ہم تنی آزمائشوں نے ہمارے گھر کا رستہ ہی کیوں دیکھ لیا۔" مگر اگلے ہی لمحے وہ سہم گئی۔ "نہیں! یہ تو ناشکری ہے اور ناشکری خدا کو پسند نہیں۔ اللہ ہے نا، وہی مالک ہے۔" وہ اگلے ہی لمحے سب کچھ اسی رزاق پہ چھوڑ کر بے فکر ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ثانیہ! تم تیار نہیں ہوئیں؟" وقار حسن آفس سے آئے تو اسے اسی یاسیت کے حصار میں گھرے بیڈ پہ لیٹے دیکھ کر استفسار کیا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا وقار پلیز! آپ اکیلے ہی چلے جائیں۔" وہ بے زاری سے گویا ہوئی اور ریموٹ سے ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔

"ثانیہ! یہ کوئی بزنس کے حوالے سے دی گئی پارٹی یا عشائیہ نہیں۔ صالحہ تمہاری قریبی دوست اور پھر ہماری عزیزہ بھی ہیں، اگر ان کے بیٹے کی سالگرہ میں شریک نہیں ہوں گے تو کتنا ہرٹ ہوں گی وہ۔"

"یہی تو بات ہے وقار کہ میں نہیں جانا چاہ رہی۔ بیٹے کی سالگرہ ہے۔ نہیں برداشت ہو گی مجھ سے اپنی کمی، اپنی خامی کا احساس ایسے سے کتنا دل برداشت کرتا ہے مجھے، آپ کیا جانیں!" وہ ایک دم سے ضبط گنوا کر چلائی اور کرسٹل کا گلدان فرش پر دے مارا۔

وقار حسن اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ڈھیلے پڑ گئے۔

"او کے او کے، ریلیکس ثانی! ٹیک اٹ ایزی۔ مت جاؤ، مگر یوں ٹیمپر لوز مت کرو۔" انہوں نے کرسٹل واز کی بکھری کرچیوں پہ ایک اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے رسانیت سے کہا۔ ثانیہ گہرے گہرے سانس بھرتے ہوئے خود پہ قابو پانے لگی۔

وقار حسن نے ملازمہ کو پکار کر کچرا صاف کرنے کا کہا اور خود وارڈ روب سے اپنا سوٹ نکالنے کے بعد واش روم میں بند ہو گئے۔

"وقار....." وہ تیار ہونے کے بعد اپنا والٹ اور موبائل جیب میں رکھ رہے تھے، جب ثانیہ بے قراری سے پکارتے ہوئے اٹھ کر قریب آ گئی۔

"آپ میرے ہیں وقار؟ صرف میرے؟ اگر اماں جان آپ کو فورس کریں تب بھی آپ مجھے چھوڑ کر کسی اور سے شادی نہیں کریں گے نا؟" ثانیہ کی سرخ میں اضطراب اور وحشت تھی۔

"نہیں! اور اب تم بے فکر ہو جاؤ، جانتی ہو نا کہ میں اپنی بات پہ قائم رہتا ہوں۔ ہم بچہ ایڈاپٹ کر لیں گے۔ اماں کو بہلانا اتنا مشکل نہیں ہے مگر ڈونٹ یو وری۔" انہوں نے ثانیہ کا گال سہلا کر آہستگی سے مسکرا کر تسلی سے نوازا۔ ثانیہ جھکے ہوئے انداز میں سر ہلا کر رہ گئی، مگر اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

روا نے دعا مانگ کر منہ پہ ہاتھ پھیرے اور اٹھ کر جائے نماز تہ کرنے لگی۔ اماں چھوٹے کو گود میں دبکائے سر اٹھائے آسمان کو خالی نظروں سے تکے جا رہی تھیں۔

"اماں!" وہ آ کر آہستگی سے ان کے پاس بیٹھ گئی۔ "میں نے کہا تھا نا اماں! فکر مت کرو، اللہ مالک ہے۔ وہ سب سے بہتر سبب پیدا فرمانے والا ہے۔ اپنے بندوں کا رزق اس کے ذمے ہے۔ پتا ہے اماں! ببلی کی امی کی ایک دوست بہت بڑے بنگلے میں ملازمہ ہے۔ بلکہ ملازموں کی ہیڈ ہے۔ یعنی نوکرانیوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اس نے ببلی کی امی سے کہا تھا کہ اس کی مالکن کو اپنے بچوں کے لیے گھر پہ ٹیوشن پڑھانے کے لیے استانی چاہیے۔ بس تم دعا کرنا اماں! مجھے آج وہاں جانا ہے۔"

"اور وہ تمہارا باپ..... وہ اور بھی نکھٹو ہو جائے گا

ردا۔! اور پھر کیا پتا کیسے لوگ ہوں۔ میرا دل ڈرتا ہے پتر۔" اماں نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پہ ڈالی۔

"بے فکر ہو جاؤ اماں! میں استخارہ کر چکی ہوں۔ مثبت اشارہ ملا ہے تب ہی یہ قدم اٹھایا ہے۔" وہ ان کے ہاتھ تھام کر مسکرائی۔ اماں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"یہ کباب لو نا ثانی! بہت زبردست ٹیسٹ ہے" نئی رسیپی ٹرائی کی تھی۔" مسز جبار نے کباب اٹھا کر اس کی پلیٹ میں رکھا۔

"تم نے مائنڈ تو نہیں کیا۔ صالحہ! دراصل مجھے آنا تھا" مگر اچانک ہی طبیعت خراب ہو گئی۔" ثانیہ نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔

صالحہ اس کی بہت قریبی دوست تھی۔ جس سے کوئی بھی بات چھپی نہیں تھی" مگر یہ زخم ایسا تھا کہ وہ ابھی اس پہ پردہ ڈالے رکھنا چاہتی تھی۔

"ہوں! وقار بھائی نے بتایا تھا۔ اٹس او کے! میں نے مائنڈ نہیں کیا۔" صالحہ نے مسکرا کر اس کی تسلی کرائی۔

"تم گاؤں گئی تھیں؟ ساس کیسی ہیں تمہاری؟ اب تو وقار بھائی کی دوسری شادی کا رونا نہیں روتیں افوہ! بچے نہ ہونا بھی عورت کا قصور ہو گیا۔ مائی فٹ! کتنی دقیانوسی سوچ ہوتی ہے ان ٹپیکل وڈیرے ٹائپ لوگوں کی۔" صالحہ ناک چڑھا کر کہہ رہی تھی۔ ثانیہ کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔

"ڈاکٹر نے مجھے بانجھ قرار دیا ہے صالحہ! میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ وہ عورت اب جیت کے قریب ہے۔ وقار مجھے اپنی گرفت سے پھسلتے محسوس ہو رہے ہیں۔ تم جانتی ہو نا میں کتنی پوزیسو ہوں وقار کے لیے؟ ایک عالم سے ٹکرا کر میں نے اسے پایا تھا۔ عشق کی حد تک جنون ہے مجھے اس کا۔ بھلا کیسے شیئر کر سکوں گی اسے کسی کے ساتھ؟ وہ بھی عمر بھر کے لیے۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"ہاں! کہتی تو تم صحیح ہو ثانیہ! مگر کیا یہ ضروری ہے کہ تم اس عورت کو جیتنے دو؟ اس سے پہلے کہ تمہاری ساس وقار بھائی کی شادی کریں ہم خود یہ کام کر دو۔"

"کیا؟" ثانیہ صدمے سے چلائی۔

"چیخو مت ثانی! اور میری بات سنو۔" وہ اس کی طرف سرکی اور ان کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگی۔ ثانیہ کے چہرے پہ پہلے تذبذب پھیلا تھا" پھر تفکر اور آخر میں بھرپور آسودگی۔

"میں سمجھتی تھی میں ہی انٹیلی جنٹ ہوں" مگر آج تم نے ثابت کیا ہے کہ میں اگر ذہین ہوں تو تم چالاک بھی ہو۔" ثانیہ نے کہا دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو! کیسی ہو ڈیر؟"

"آئی ایم فائن" آج کیسے یاد کیا؟"

"مجھے تمہاری ہی یاد آتی ہے ہر دم۔ آئیڈیا جو اتنا زبردست دیا ہے۔ دل چاہتا ہے صبح سے شام نہ ہو اور میں وہ سب کر کے ان کا دل جیت لوں۔ کتنا حیران ہوں گے وہ اور میرے احسان مند بھی۔"

"ہاں! مگر طوطے تو تب اڑیں گے جب اس ڈرامے کا کلائمکس ہو گا۔" صالحہ نے ان کی بات کو بڑھاوا دیا اور دونوں ہنسنے لگیں۔

"اچھا یار! اب آئیڈیا دیا ہے تو میری مدد بھی کرو نا! کوئی لڑکی ڈھونڈو وقار کے لیے۔" ثانیہ نے وہ بات کی جس کے لیے فون کیا تھا۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں" بے فکر رہو" مگر یار! لڑکی نہیں عورت" اب اتنی بھی فراخدلی کا مظاہرہ نہ کرو۔" صالحہ نے ٹوکا تو ثانیہ ہنسنے لگی۔ صالحہ نے فون بند کیا تو ملازمہ جیسے اس کے فارغ ہونے کی ہی منتظر تھی۔

"بیگم صاحبہ! وہ ٹیوٹر آئی ہے" میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے" میں آتی ہوں۔" اس نے آئینے

کے سامنے آکر اپنا جائزہ لیا۔ آتشی بریزے کا سوٹ ہم رنگ لپ اسٹک اس کے یاقوتی لبوں پہ بہار دکھا رہی تھی۔ اپنے حلیے سے مطمئن ہو کر وہ بالوں میں برش کر کے ڈرائنگ روم میں آگئی۔

"السلام علیکم!" وہ اسے دیکھتے ہی بہت اعتماد سے گویا ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام! تم ہو ٹیوٹر؟" اس نے نخوت سے کہا۔

"جی۔" وہ مختصراً بولی۔

"نام؟"

"ردا اشفاق۔"

"باپ کیا کرتا ہے تمہارا؟" اور یہ وہ سوال تھا جس نے اس کا اعتماد پارہ پارہ کر دیا۔ کیا بتاتی کہ وہ جوا کھیلتا ہے یا یہ بتاتی کہ نشہ کرتا ہے۔ ماں کو گالم گلوچ اور مار پیٹ کر پیسے چھین لیتا ہے یا یہ کہ ایک ایک کر کے گھر کی تمام قیمتی اشیا وہ فروخت کر چکا ہے۔

"جی! کچھ نہیں" وہ بیمار رہتے ہیں۔" اس نے مجرمانہ سی شرمندگی سے بتایا۔

"اوہ! جب ہی تم۔ خیر! اپنی سی وی لائی ہو؟" صالحہ نے اس کے معمولی لباس پہ گہری نگاہ ڈال کر نخوت سے سوال کیا۔

"جی!" وہ اپنی گود میں دھری فائل اس کے سامنے ٹیبل پہ رکھ کر پھر بیٹھ گئی۔ فائل کو دیکھ کر اس کی پیشانی پہ تردد بکھر گیا۔

"تمہارا اکیڈمک ریکارڈ اگرچہ بہت شان دار ہے" مگر تعلیم تو بہت واجبی سی ہے" محض بی اے۔ پھر جاب ایکسپیرینس بھی نہیں ہے۔"

"جی! میں گھر میں بچوں کو ٹیوشن دیتی رہی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"اوکے! ایسا کرتی ہوں کہ تمہیں ٹرائل پہ رکھ لیتی ہوں۔ اگر تمہاری کارکردگی سے مطمئن ہوئی تو پھر سوچیں گے۔ میں تمہیں دو بچوں کے ایک ہزار روپے دوں گی۔ یہ تمہارے گھر کے حالات کی وجہ سے ہیں۔ اتنے پیسے تمہیں پہلے کبھی نہیں ملے ہوں گے" مجھے امید ہے کہ تم بچوں کو اچھی طرح پڑھاؤ گی۔ اوکے! پھر ابھی سے شروع کرو گی یا کل سے؟" وہ اس کا سرخ ہو جانے والا چہرہ جانچتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"جی! کل سے۔ ابھی تو میں نے اماں کو صرف انٹرویو کا بتایا تھا۔ چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" وہ اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ لڑکی کیسی رہے گی؟" ردا اندر بچوں کو ٹیوشن دے رہی تھی۔ ثانیہ دوسرے کمرے میں صوفے پر بیٹھی اسے بغور تکتے ہوئے صالحہ سے رائے چاہ رہی تھیں۔ صالحہ کو دھچکا لگا۔

"کیا کہہ رہی ہو ثانی! ہوش میں تو ہو؟ یہ اتنی کم عمر اور حسین لڑکی ہی تمہیں دکھائی دی ہے؟ مانا تمہیں جلدی ہے" مگر اس جلدی میں غلطی تو مت کرو۔" صالحہ بولنے پہ آئی تو چپ ہونے کا نام نہیں لیا۔

ثانیہ نے روا کی طرف دیکھا۔ ملگجا سا معمولی لباس پسینے اور میل سے چپکے بال اور گرد سے اٹے چہرے کے ساتھ تھکا تھکا سا انداز لیے وہ خاموش رہ کر بھی اپنی بدحالی اور کم مائیگی کا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی۔ وہ اسے کسی طرح بھی پرکشش محسوس نہ ہوئی۔ ثانیہ نے غیر ارادی طور پر اس کا موازنہ اپنے ساتھ کیا۔

قیمتی لباس' جدید انداز کے تراشے ہوئے بال' نفاست سے کیا گیا میک اپ اور خوشبوؤں میں بسے ہوئے وجود کے ساتھ شاہانہ انداز لیے ہوئے اس نے خود کو بہت برتر جانا۔

وہ اسے اپنے سامنے بے حد کم مایہ محسوس ہوئی۔ اس نے ناراض ہو کر صالحہ کی طرف دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ یہ معمولی لڑکی مجھے یعنی ثانیہ کو چت کر دے گی؟"

"نن۔۔ نہیں۔" صالحہ نے گڑبڑا کر نفی میں سر ہلایا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کچھ کہا تو ثانیہ ناراض ہو جائے گی۔

ثانیہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔ "صالحہ! تم صرف چالاک ہو' ذہین نہیں' جہاں تک میرا ذہن جا پہنچا ہے وہاں تک تم کبھی نہیں پہنچ سکتیں' اس لیے کہ میں نہ صرف ذہین ہوں' بلکہ چالاک بھی ہوں۔ اب سنو! میرا آئیڈیا کیا ہے۔ میں اس لڑکی سے وقار کی شادی کروں گی تو اس کی وجہ ایک تو اس کا کمزور بیک گراؤنڈ ہے' دوسرے یہ کم عمر بھی ہے' وقار میرے ممنون و مشکور ہو کے رہیں گے۔" اس نے ایک زہریلی مسکراہٹ لبوں پہ سجائی۔ "پختہ عمر کی عورت سے شادی کا رسک اس لیے نہیں لوں گی ڈیئر! کہ اگر وہ بھی ماں نہ بنی تو اس قربانی کا فائدہ؟ جب دل پہ پتھر رکھنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ وہ کام کیا جائے جس میں کامیابی کے امکان سو فیصد ہوں۔"

☆ ☆ ☆

"وکی! ایک بات کہوں؟" وقار حسن معمول کے مطابق مطالعہ میں مصروف تھے' جب ثانیہ نے سرک کر ان کے قریب ہوتے ہوئے اپنا سر ان کے شانے سے ٹیک دیا۔

"ہاں! بولو۔" انہوں نے صفحہ پلٹتے ہوئے بڑی فراخدلی سے اجازت دی' ورنہ ثانیہ جانتی تھی کہ دوران مطالعہ وہ کسی کا ڈسٹرب کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

"افوہ! پہلے کتاب تو ہٹائیں۔" ثانیہ نے صرف کہا نہیں' بڑے لاڈ بھرے انداز میں ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک طرف رکھ دی۔

"خیریت؟ بہت سنجیدہ ہو رہی ہو تم ۔۔؟" وقار حسن نے بادل ناخواستہ مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ایک بات مانیں گے؟"

"یار! کہو گی تو مانوں گا نا۔" وہ اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر بہت محتاط رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

"او کے! یہ طے ہے کہ مانیں گے ضرور' پرامس؟" ثانیہ نے ان کی بات پہ گرفت کی تھی یا دوسرے لفظوں میں پھیلی تھی۔ وقار حسن چونکے اور بغور انہیں تکا۔

"ایسی کون سی اہم بات ہے ثانیہ! کہ تم مجھ سے کہے بغیر ہی پرامس لے رہی ہو؟" ان کا لہجہ ان کی الجھن کا غماز تھا۔

"بتاؤں گی' مگر تب جب آپ ماننے کا وعدہ کریں گے۔" ثانیہ نے کاندھے اچکائے۔

"ایسے کیسے وعدہ کر لوں بھلا؟" وہ متردد ہوئے۔

"مجھ پہ بھروسا نہیں؟ بھلا آپ کے لیے غلط کر سکتی ہوں؟" وہ جذباتی ہونے لگی تو وقار پھنس کر رہ گئے۔

"یہ بات نہیں ہے ثانی' مگر۔۔"

"کم آن وکی! اتنا مت الجھیں' بس مجھ پہ ٹرسٹ رکھیں۔" وہ ٹھنکنے کے انداز میں بولی۔

وقار حسن چونک گئے۔ ثانیہ سے محبت لاکھ سہی' مگر وہ اس کی گھاگ فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ یوں بنا سوچے سمجھے' جانے بغیر وہ ہرگز کوئی وعدہ نہیں

کر سکتے تھے۔

"یوں پہیلیاں بوجھوانے کی بجائے صاف بات کیوں نہیں کرتیں ثانیہ؟"

"تو گویا آپ مجھ پہ بلیو نہیں کر رہے؟" ثانیہ نے چڑ کر کہا تھا۔

"یہ بات نہیں ہے ثانیہ پلیز۔" وہ گڑبڑائے۔

"یہی بات ہے۔۔ اور کیا مطلب نکلتا ہے آپ کی اس پس و پیش کا؟" وہ فوراً" ہی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر لائی۔

"مائی گڈنیس۔" وقار بے بس سے ہوئے۔

"او کے فائن! جانتی ہو نا میری بے چارگی کو؟ آنسو نہیں دیکھے جاتے مجھ سے تمہارے' اب بولو۔" وہ ہارے ہوئے انداز میں بولے تو ثانیہ مسکرا دی۔

"تھینکس وقار!"

"مگر وہ بات؟" ان کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"آپ شادی کر لیں وقار! ہم بچہ ایڈاپٹ نہیں کریں گے۔ مجھے آپ کا بچہ چاہیے۔ مجھ سے نہ سہی' دوسری عورت سے سہی' مگر۔۔"

وہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ وقار حسن بھونچکے سے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"آخر کیوں خفا ہیں مجھ سے؟" ثانیہ ان کے پیچھے پھر رہی تھی۔

"یہ مجھ سے نہیں' خود سے پوچھو۔" انہوں نے بھرپور برہمی سے کہا۔

"اس میں خفگی کی کیا بات ہے؟ ایک جائز قدم اٹھا رہی ہوں۔"

"پتا نہیں کس دل سے ثانی! کیا میں تمہیں جانتا نہیں؟ آئی نو ویٹ ثانی! کہ یہ تمہاری برداشت کا امتحان ہو گا اور میں یہ امتحان نہیں لوں گا۔" وہ بولتے چلے گئے۔

"کب تک؟ میں بھی جانتی ہوں کہ اماں جان زیادہ انتظار نہیں کریں گی' جو کام کل کسی اور کے ذریعے ہونا ہے' وہ میں کیوں نہ کر لوں۔ ذرا سا دل ہی تو بڑا کرنا ہے وکی! پھر صلہ بھی تو کتنا اچھا ملے گا۔ میں بتا رہی ہوں' وہ بچہ صرف میرا ہو گا۔ اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔" پھر ان کی خاموش نگاہوں کو محسوس کر کے یکایک سنبھلی۔

"میرا مطلب ہے وکی! وہ پہلا بچہ صرف میرا ہو گا' باقی کے جتنے بھی ہوئے' ان کی ذمہ داری آپ دونوں کی۔"

"یہ سب تو تب ہو گا ثانی! جب میں ایسا چاہوں گا۔ تمہیں اماں جان کی طرف سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سمجھا لوں گا۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ٹوکنے کے انداز میں کہا تھا' مگر ثانیہ پھٹ پڑی۔

"اماں جان کو روک لیں گے۔ سمجھا لیں گے' مگر کچھ وقت گزرے گا جب آپ خود کو نہیں روک پائیں گے' پھر میرا کیا ہو گا وقار؟ میرا کیا مقام ہو گا آپ کے اور اس کے بیچ وقار؟ یہ ایک بالکل جائز خواہش ہے۔ بچے آپ کا حق ہیں۔ میں آپ کو اس حق سے محروم نہیں کرنا چاہتی' پھر جب ایک کام کرنا ہی ہے تو پھر وہ ابھی کیوں نہیں' پلیز! مان جائیں۔" وہ تیز تیز بولتے ہوئے آخر میں ملتجی ہو گئی۔ وقار حسن نے اس کے چہرے کو دیکھا اور بغیر کچھ کہے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

"میں معذرت خواہ ہوں! میں یہ شادی نہیں کروں گی۔" وہ صالحہ کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

کل ثانیہ اور صالحہ اس کے گھر جا کے اس کی ماں سے بات کر آئی تھیں۔

صالحہ نے چونک کر غیر یقینی سے اسے دیکھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ پیش کش ٹھکرائی بھی جا سکتی تھی۔

"تم ہوش میں ہو لڑکی؟ وقار بھائی کا اتنا بڑا بزنس ہے' اس کے علاوہ خاندانی جاگیریں الگ۔"

"مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ آئی ایم سوری! آپ مائنڈ مت کریں۔ میں اس لیے انکار نہیں کررہی کہ وہ آل ریڈی میرڈ ہیں اور ان کی بیوی بھی موجود ہیں۔ میم! دراصل میرے گھر کے حالات مجھے شادی کی اجازت نہیں دیتے' میں اپنے گھر کی واحد کمانے والی ہوں' اگر میں اپنی خوشیوں میں مگن ہوجاؤں تو میری ماں اور بھائی' بہنوں کا کیا بنے گا۔" وہ یہ سب کہنا نہیں چاہتی تھی' یہ ایسا موضوع تھا کہ جس پر بات کرتے ہوئے اس کے اندر دکھ اترنے لگتا تھا۔

"تمہاری ماں کیا تمہارے اس فیصلے سے متفق ہے؟ آئی مین' کیا وہ تمہیں یوں عمر بھر بٹھانے کو تیار ہے؟" صالحہ نے پوچھا۔ ردا سر جھکا کر لب کچلنے لگی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ ماں نے اس کے انکار پر کس درجہ احتجاج کیا تھا۔

"تمہاری خاطر خود کو داؤ پہ مت لگا ردا! اتنا اچھا رشتہ نصیب سے ملتا ہے۔ تُو تو بختاور ہے میری بچی! ہمارا اللہ مالک ہے۔"

"میرا دل نہیں مانتا اماں! کہ اس طرح سے خود کو تیرے دکھوں سے علیحدہ کرلوں۔" وہ بے حد ملول تھی۔

"اری پگلی! شکر ادا کر۔ میری تو سانسیں آسان ہوں گی۔ ہمہ وقت ایک دھڑکا لگا رہتا ہے تیرے باپ سے۔ شرابی' جواری سب سے پہلے اپنی غیرت اور عزت کا سودا کرتا ہے۔ پھر ہی اس برائی کی دلدل میں قدم دھرتا ہے۔ کیا خبر کب وہ کچھ غلط کردے۔ وہ جوئے میں گھر کی ساری قیمتی اشیا ہار چکا ہے' سو اب تیری میری باری دور نہیں۔ اس کے اوباش ساتھیوں کی نظریں تو ویسے بھی تجھ پہ لگی ہوئی ہیں۔ تو سمجھ لے' یہ رب سے کی گئی میری التجاؤں کا ثمر ہے۔ ہاں کردے میری بچی۔" اماں اس کے سامنے روتے ہوئے ضبط کھو گئیں اور وہ اتنی ساکت تھی کہ ماں سے یہ تک نہ کہہ پائی کہ یہ تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوجاتی' کیا بھروسا تھا نصیب کا بھلا؟ جو عورت بچے کی خاطر اپنے شوہر کی شادی کرا رہی تھی' اسے اچھے رشتوں کی کیا کمی؟ اس کے پاس کیا تھا مفلسی اور کمزوری کے سوا؟ ایک اعلا تعلیم یافتہ' ہائی اسٹیٹس رکھنے والی ماڈرن عورت سے اس کا کیا مقابلہ' وہ اس تکون میں اپنی حیثیت' اپنا وقار کھودیتی اور یہی وہ نہیں چاہتی تھی۔

"کس سوچ میں پڑ گئیں؟ دیکھو! اگر تم محض اس وجہ سے انکار کررہی ہو تو میں ثانیہ سے بات کروں گی۔ آئی ایم شیور کہ وہ تمہاری فیملی کو سپورٹ کرے گی۔" صالحہ کی آواز نے اسے چونکایا۔

اس نے سر اٹھا کر خالی نظروں سے انہیں دیکھا اور ٹھنڈا سانس بھرا۔

"ٹھیک ہے! میں سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ارادہ استخارہ کے بعد فیصلہ کرنے کا تھا۔

☼ ☼ ☼

"وقار! آپ نے جواب نہیں دیا مجھے؟" وقار حسن ابھی کھانے کی ٹیبل پہ آکے بیٹھے ہی تھے جب ثانیہ نے وہی موضوع چھیڑا' جس سے وہ کترا رہے تھے۔ ان کا اچھا بھلا موڈ ایک دم غارت ہوگیا۔

"کیا چاہتی ہو تم؟" وہ زچ ہوئے۔

"آپ کی ہاں۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ وقار حسن بغور انہیں تکنے لگے۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں ثانیہ؟ کیا میں تمہیں جانتا نہیں؟ بندہ جو کام کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کا بیڑا اٹھانے کا مطلب؟"

"اسٹاپ اٹ وقار! طنز مت کریں مجھ پہ۔" وہ ایک دم سے پھنکاری۔ "آپ کا مطلب ہے میں بہت تنگ دل ہوں؟ سوکن برداشت نہیں کرپاؤں گی؟ وقار! یہ مشکل ضرور ہے' مگر بچے کی خاطر مجھے یہ جبر کرنا ہے خود پہ۔ مجھے آپ کی خوشی عزیز ہے وقار! میری ذرا سی ذہنی کشادگی ہمیں بہت بڑی خوشیاں دے سکتی ہے تو کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے؟" وہ انہیں سوالیہ نظروں سے تکنے لگی۔

"پتا نہیں! جو بھی کررہی ہو تم خود کررہی ہو' کل کو مجھے الزام مت دینا۔" وہ لاتعلقی سے کہہ کر کھانے کی سمت متوجہ ہوگئے اور ثانیہ کے اندر زہر بھرنے لگا۔

"ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہوگا؟ کہیں میں غلطی تو نہیں کررہی؟" وہ اندر سے خائف ہوئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک دیا۔ "اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔" اس نے ہر خدشے سے دامن چھڑالیا۔

"میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ میرا خیال ہے اگلے جمعے نکاح کی سنت ادا کردی جائے۔" ثانیہ نے گویا دھماکا کیا تھا۔ وہ ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"ثانیہ! تم ہتھیلی پہ سرسوں جما رہی ہو۔ پھر اماں جان۔ ان کا سوچا ہے؟ سرے سے ابھی خبر ہی نہیں ہے انہیں۔" ان کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی درشتگی سمیٹ لایا۔ ثانیہ نے یوں سر جھٹکا جیسے ناک سے مکھی اڑائی ہو۔

"اگر میں اماں جان کو انوالو کرتی تو یہ کام سالوں پہ اٹک سکتا تھا۔ ہر قسم کی گارنٹی چاہیے تھی انہیں۔ خاندان کی' ذات پات کی۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ دراصل وہ اماں جان سے ہی تو خائف تھی۔ وہ وقار کے لیے اپنے خاندان کی لڑکی منتخب کرتیں' جو حیثیت میں اس کے مقابلے پر ہوتی' سو اسی لحاظ سے اس کا مقام متعین ہوتا۔

"تو آپ کا کیا مطلب ہے' آپ کسی بھی راہ چلتی کو پکڑ کر اس گھر میں لے آئیں گی؟" وقار حسین کو شدید غصہ آیا۔ ثانیہ گڑبڑا سی گئی۔

"بھئی! میں نے یہ کب کہا کہ وہ راہ چلتی ہے؟ خاندانی بھی ہے اور شریف بھی' بس! ذرا گھریلو حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس طرح کسی غریب کے سر پہ ہاتھ رکھا جائے' ثواب بھی ملتا ہے۔" وہ بڑے محتاط سے انداز میں انہیں مطمئن کررہی تھی۔

"اوکے! تم کو چاہیے تھا کہ بات طے کرنے سے قبل مجھے آگاہ کرتیں۔ بہرحال! ابھی بھی یہ خیال رکھیے گا کہ وہ جو کوئی بھی ہو' میچور اور صورت حال سے پوری طرح آگاہ ہو۔ میں کسی کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا۔" ٹھوس انداز میں کہتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

نکاح سادگی سے کیا گیا۔ نکاح کے فوراً بعد رخصتی عمل میں لائی گئی۔ ردا کے رشتے دار وقار حسن کی شان دار شخصیت سے ازحد متاثر نظر آرہے تھے اور ردا کو انہوں نے بہت خوش نصیب قرار دیا تھا' جبکہ ردا خود اندر سے بے حد یاسیت کا شکار تھی۔ زندگی نے اچانک جو موڑ لیا تھا اس کے لیے ابھی وہ کسی طور آمادہ نہیں تھی۔

نکاح کے بعد ثانیہ نے ردا کو دیکھا تو چونک گئی۔ ردا گلابی اور سبز رنگ کے امتزاج اور نفیس کام سے مزین جدید انداز کے لہنگے میں ملبوس تھی۔ زیورات اور میک اپ نے اس کے حسن کو دو آتشہ کردیا تھا۔

ثانیہ دنگ رہ گئی۔ اس نے جب ردا کو دیکھا تو اس وقت وہ اسے اتنی حسین نہیں لگی تھی۔ شاید اپنے معمولی لباس اور پژمردہ چہرے کی وجہ سے۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ ردا پہن اوڑھ کر اتنی حسین لگے گی تو وہ کبھی اس کا انتخاب نہ کرتی۔

اس کا شعاعیں بکھیرتا دلکش روپ اسے رقابت کی آگ میں جلا کر خاکستر کررہا تھا۔

"حوصلہ کرو ثانیہ!" اسے ہاتھ مسلتے' لب کچلتے ہوئے دیکھ کر صالحہ نے اس کے اضطراب کا اندازہ لگایا تھا۔

"پتا نہیں کیوں صالحہ! مجھے لگ رہا ہے' کچھ غلط کر ڈالا میں نے۔ وقار کو دیکھا؟ ابھی سے اماں جان والی بات کو لے کر منہ پھلایا ہوا ہے مجھ سے۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوگئی نا صالحہ! تو۔ تو۔"

"کچھ نہیں ہوگا' تم اتنی کمزور تو نہیں ہو ڈیر۔" صالحہ نے نرمی سے حوصلہ بڑھایا۔ ردا کو رخصت کرا کے لاتے ہوئے ثانیہ اندر سے بالکل ڈھے گئی۔

☼ ☼ ☼

روا پتھر کے مجسمے کی طرح بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ کوئی احساس، کوئی جذبہ بھی دل کی سرزمین پہ نہیں پھوٹا تھا۔ وقار حسن اندر آئے اور دلکش گمبھیر آواز میں سلام کرکے اس کے پاس بیڈ پہ آکر ٹک گئے۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس ان کا اونچا پورا شان دار سراپا اپنی مسحور کن خوشبوؤں کے ساتھ اس کے حواسوں پہ چھانے لگا۔ انہوں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"آپ جانتی ہیں روا کہ یہ دوسری شادی کس وجہ سے کی گئی؟ آپ کو ثانیہ نے سب کچھ بتایا تو ہوگا۔"

"جی!" وہ چونکہ اس کے جواب کے منتظر تھے، سو اسے بولنا پڑا تھا۔

"عموماً" دو بیویاں رکھنے والا مرد گویا دو کشتیوں پہ پیر رکھتا ہے اور ناکامی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میں دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر ثانیہ کو اولاد کی بہت خواہش ہے، پھر میری اماں بھی یہی چاہتی تھیں۔ خدا کو بھی یہی منظور تھا کہ آج آپ یہاں موجود ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ ثانیہ کی طرح آپ کے حقوق بھی اسی ایمانداری سے ادا کروں، لیکن اگر کہیں مجھ سے کوتاہی ہو تو پلیز! مجھے آگاہ ضرور کیجیے گا۔" اس طویل گفتگو کے بعد انہوں نے اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔ اور جیسے ششدر رہ گئے تھے۔ وہ ان سے کم از کم بھی آدھی عمر تو ضرور چھوٹی تھی۔ انہیں زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ ایک دم جھٹکے سے اٹھ گئے اور تب سے وہ نہایت ہی بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سگریٹ پھونک رہے تھے۔

روا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اندر سے کچھ اور بھی سہم گئی۔ اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ مخاطب کرکے کچھ استفسار کرتی۔ اس نے اضطرابی کیفیت میں ہاتھ مسلے تو چونک اٹھے۔ سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور لب بھینچتے ہوئے ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گئے۔ روا دم سادھے بیٹھی رہ گئی۔

"تو اس میں اتنا خفا ہونے والی کون سی بات ہے وقار؟ ہر بات کو ایشو نہ بنالیا کریں۔" ثانیہ بظاہر اطمینان سے بولی، حالانکہ اندر سے وہ خود بھی روا جیسی حسین، کم عمر اور دلکش لڑکی سے ان کا سنجوگ کرنے کے بعد پچھتا رہی تھی، لیکن اسے وقار حسن کے سامنے اپنا بھرم تو قائم رکھنا ہی تھا۔

"نہیں! یہ سراسر زیادتی کی ہے تم نے ثانیہ! اچھا خاصا مذاق بنوا کے رکھ دیا ہے تم نے مجھے۔ کیا سوچیں گے لوگ "ایک تو ڈھلتی جوانی کی عمر میں شادی کررہا ہوں، اوپر سے اتنی کم عمر لڑکی۔ ثانیہ! ہمیں تو اولاد چاہیے تھی، کسی بھی عورت سے ہوجاتی، یہ لڑکی۔۔۔ مائی گڈنیس! اس کے کچھ خواب ہوں گے آخر۔" وہ بے بس سے ہوکر کہہ رہے تھے اور ثانیہ کو ان کی یہی ہمدردی مزید پریشان کررہی تھی۔

"نہیں آپ کے لیے کوئی بیوہ یا پھر طلاق یافتہ پختہ عمر کی کوئی خاتون دیکھتی، مگر اس سے اولاد نہ ہوتی تو پھر؟ اونہہ! ایک تو احسان کیا اس پہ نخرے۔" وہ کلس کر کہتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وقار حسن لب بھینچے وہیں کھڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں بالکل خفا نہیں ہوں میری جان! بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ پہلی مرتبہ تو تمہاری بیوی نے کوئی ڈھنگ کا کام کیا ہے۔ صحیح پوچھو! تو مجھے تو دھڑکا ہی لگا ہوا تھا کہ اگر یہ تمہاری شادی کی راہ میں آئی تو میرا بیٹا تو دنیا میں بے نام و نشان ہی رہ جائے گا۔" وقار حسن کے تمام خدشوں کو اماں جان کی باتوں نے لمحوں میں دور کردیا۔

"مگر اماں! ایک الجھن ابھی بھی ہے۔" وہ متذبذب تھے۔

"ہاں بولو پتر!" اماں جان سوالیہ نظروں سے انہیں تکنے لگیں۔

"ثانیہ نے لڑکی بہت تو عمر ڈھونڈی ہے، زیادہ سے زیادہ بیس کی ہوگی۔ یہ زیادتی نہیں ہے، جبکہ آپ کا بیٹا تو بڈھا ہورہا ہے؟" ان کی بات پہ اماں جان نے مسکرا کر انہیں دھپ لگائی۔

"چل ہٹ! اب ایسی بھی بات نہیں۔ کہاں سے بڈھا ہوگیا تو؟ ابھی چالیس کا بھی نہیں ہوا اور بڑھاپا نظر آنے لگا تجھے۔" انہوں نے خوشدلی سے کہا۔ "اب وہ بیوی ہے تمہاری، پوری دلی آمادگی کے ساتھ اسے اپناؤ بیٹا!"

وہ گویا بات سمیٹ چکی تھیں، وقار بھی خاموش ہوگئے۔

☼ ☼ ☼

"کھانا لاؤں آپ کے لیے؟" وہ ان کے آنے سے قبل یوں ہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی، انہیں دیکھا تو بہت محتاط لہجے میں پوچھا۔ ثانیہ تو سرشام ہی تیار ہوکر کہیں نکل گئی تھی۔ اس کے ساتھ ان کا رویہ بہت ترش تھا۔ ایک، دو بار روا نے خود بڑھ کر اسے مخاطب کیا تو اس کی تیکھی نظروں اور لہجے کی کاٹ نے اسے گویا چیر کے رکھ دیا۔ تب ہی وہ ان سے اچھی خاصی خائف ہوگئی تھی۔ دوسری سمت وقار حسن تھے "اپنے رویے سے اسے الجھاتے ہوئے، مگر ان کا رویہ بہرحال ثانیہ کی طرح زخمی کردینے والا بھی نہیں تھا۔

وہ یوں چونکے جیسے ابھی ابھی اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئے ہوں۔ ان کے کوٹ اتارتے ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہوئے۔ یہ ان کی نظروں کی گہرائی تھی جو اسے کنفیوژ کرگئی تھی۔ وہ گڑبڑا کر پلکوں کی چلمن عارضوں پہ گرا بیٹھی۔ چہرے پہ شفق پھوٹ پڑی تھی۔ معاً" وہ سنبھل کر مسکرائے۔

"نو تھینکس! کھا کر آیا ہوں، ہاں! البتہ اگر ایک کپ گرما گرم چائے مل جائے تو۔۔۔"

"جی! میں لاتی ہوں۔" اس نے پلکیں اٹھائیں۔ وہ ابھی تک اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس کا دل بہت بے ہنگم سے انداز میں دھڑکا۔ وہ سرعت سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔

کچن میں ملازمہ موجود تھی، مگر اس نے خود چائے بنائی۔ واپس آئی تو وقار حسن صوفے پہ نیم دراز تھے۔ اسے دیکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"کہاں جارہی ہیں؟ یہاں بیٹھیں۔" انہوں نے چائے کے ساتھ اس کا ہاتھ تھاما۔ وہ بے طرح گھبرائی۔

"وہ مم۔۔۔ میں آپ کے کپڑے نکال دوں، فریش ہولیں۔" فیروزی سوٹ میں دوپٹا سلیقے سے شانوں پہ پھیلائے لانبے سلکی بالوں کو چوٹی میں گوندھے، وہ گلاب کی منہ بند کلی کی طرح شگفتہ اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔

"مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔ پلیز! سٹ ڈاون۔" انہوں نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے پہلو میں موجود خالی جگہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ جھجکتے ہوئے سمٹ کر ٹک گئی۔ وقار حسن نے بغور اس کے دھیرے دھیرے کانپتے لبوں اور ہاتھوں کی لرزش کو دیکھا اور پھر بھاری آواز میں پوچھا۔

"آپ خوش ہیں اس شادی سے؟" روا کے چہرے پہ سرخی چھا گئی۔

"جج۔۔۔ جی! کیا مطلب؟" وہ واقعی اس سوال کی توقع نہیں کررہی تھی، بوکھلا کر بولی۔

"مطلب۔۔۔ میری اور آپ کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ ہوسکتا ہے، آپ کے گھر والوں نے کسی مجبوری کی بنا پہ۔۔۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے شادی سے پہلے سب کچھ صاف لفظوں میں بتادیا تھا۔" اس نے صاف اور دوٹوک بات کی۔ اس کی سمجھ میں اب آیا تھا کہ اس رات وقار حسن اسے دیکھنے کے بعد ڈسٹرب کیوں ہوئے تھے۔

"اس کا مطلب آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟" وہ اسے کھوج رہے تھے۔

"اگر اعتراض ہوتا تو میں یہاں نہ ہوتی۔" روا نے بہت نرمی سے مسکرا کر کہا۔ وقار حسن کے لبوں پہ بہت بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

☼ ☼ ☼

"شروع کریں نا وقار! آپ کو آفس سے دیر ہورہی

ہے۔" وہ ناشتے کی ٹیبل پہ ثانیہ کے ساتھ تھے اور ردا کے منتظر جب ثانیہ نے ٹوکا تھا۔

"ہاں! وہ میں۔۔۔ اکرم! تم جاؤ' ردا بی بی! سے کہو ناشتا کرلیں۔" ثانیہ سے کچھ کہتے کہتے انہوں نے اچانک ملازم کو مخاطب کیا۔

ثانیہ کے جبڑے بھینچ گئے۔ اکرم کے جانے کے بعد وہ بہت ضبط کرتے ہوئے بھی پھٹ پڑی۔

"کیوں؟ اس کے بغیر نوالہ حلق سے نہیں اتر رہا آپ کے؟"

وقار حسن نے جواب میں خشمگیں نظروں سے انہیں دیکھا۔ البتہ کچھ کہنے سے گریز کیا اور یہی چپ ثانیہ کو آگ لگا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ جواب میں اپنے اندر کی تپش باہر نکالتی'. ردا عنابی رنگ کے انتہائی اسٹائلش لباس میں اندر داخل ہوئی۔ ثانیہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور سخت طیش کے عالم میں ہاتھ مار کر اپنے سامنے دھرے ناشتے کے برتن گرا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تن فن کرتے ہوئے ردا کو دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی۔ ردا کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے متوحش نظروں سے وقار حسن کو دیکھا۔ وہ سختی سے لب بھینچے بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پہ برہمی کا تاثر تھا۔ ردا کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہوئی اور پتے کی طرح لرزتے دل سمیت دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

وقار حسن اٹھے۔ کرسی کی پشت پہ لٹکا ہوا کوٹ اٹھاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔

"ٹیک اٹ ایزی! اب آپ کو اس قسم کی صورت حال کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا پڑے گا۔"

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔"

"ردا! اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ بعد میں بات کریں گے۔ اگر ثانیہ کسی بات پہ خفا ہو تو برداشت کر لیجیے گا' وہ کچھ ڈسٹرب ہیں۔" انہوں نے ملائمت سے کہتے ہوئے اس کا رخسار تھپتھپایا۔ وہ گہرا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

وقار حسن کا تعلق جاگیردار گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے' جب ہی تمام امیدوں کے مرکز بھی وہی تھے۔ وہ تعلیم کی غرض سے "تقریباً" شہر ہی میں رہے تھے' یہی وجہ تھی کہ انہیں گاؤں حویلی اور سرداری و جاگیروں سے زیادہ شہر کی زندگی بھاتی تھی۔ کالج میں ثانیہ ان کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں میں بہت دوستی بھی تھی۔ دوستی محبت میں کب ڈھلی' انہیں تو پتا ہی نہ چل سکا۔ قاتل اداؤں اور خوب صورت چہرے والی ثانیہ کے بغیر انہیں زندگی ادھوری محسوس ہونے لگی' جب ہی تو تعلیم مکمل کرتے ہی انہوں نے اماں جان سے ثانیہ کے لیے بات کی تھی۔

"مگر بیٹا تمہاری بات تو بچپن سے ہی تمہارے ماموں کے گھر طے ہو چکی ہے۔"

"کیا؟" وہ بھنا گئے۔ "مجھے سلمیٰ اس حوالے سے بالکل پسند نہیں ہے۔" انہوں نے ایک قہر اٹھا دیا۔

"تمہارے بابا کو پتا چلے گا تو بہت خفا ہوں گے اور تمہارے ماموں' وہ تو ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ دیں گے۔ اپنے دل کو کچھ سمجھا پتر!" وہ لجاجت سے بولیں۔

"اماں جان! ثانیہ کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں ہو گا۔ یوں سمجھ لیں' اسے کھونے کا حوصلہ ہی مجھ میں نہیں ہے۔"

اور اماں جان خاموش ہو گئیں' مگر اگلی بار جب وقار حسن نے شہر سے آ کر پھر وہی بات کی تب انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

"مجھے آزمائش میں مبتلا مت کرو وقار پتر! میں نے بات کی تھی تیرے مامے سے۔ وہ تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔ کہہ رہا تھا اگر آپ نے ایسا سوچا بھی' میری دھی پہ کسی غیر کو ترجیح دی تو میں ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ لوں گا۔ اب بتا کیا اسے چھوڑ کر رہ لوں گی میں؟" وہ بے بسی کی انتہاؤں پہ تھیں۔

"اور مجھے؟ مجھے چھوڑ کر رہ پائیں گی اماں جان؟" وقار نے بہت بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی زبان پہ

ثانیہ کے الفاظ تھے۔ جب انہوں نے اپنی الجھن ثانیہ کے سامنے رکھی تو اس نے یہی بات کہی تھی۔

"بس تم ایسے کہہ دینا۔ دیکھنا! یوں مانیں گی۔" ثانیہ نے چٹکی بجائی تھی۔

اور اب واقعی اماں نے ہتھیار ڈال دیے تھے' انہوں نے ثانیہ کو حاصل کر لیا تھا۔

ان کی شادی کو تین مہینے ہوئے تھے' جب بابا جان اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اماں گاؤں میں اکیلی رہ گئیں۔ وقار حسن نے تو شہر میں خوب صورت بنگلہ خرید کر وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ گاؤں میں رہنے کے عادی ہی نہ تھے' پھر ثانیہ بھی تو ایسا نہیں چاہتی تھی۔

وقار سوئم تک اماں کے ساتھ رہے' پھر انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہا' مگر اماں جان نہیں مانیں۔

"نہ بیٹا! یہاں تمہارے بابا کی یادیں ہیں' پھر ہمارے تو سارے رشتے دار بھی یہیں ہیں۔"

"مگر حویلی میں تو آپ تنہا ہیں اماں جان!" وقار پریشان تھے۔

"ابھی تو پرسہ دینے والے آ رہے ہیں۔ کیسے جا سکتی ہوں میں؟ ہاں! تو دلہن کو میرے پاس چھوڑ دے' تیری نوکری کا مسئلہ ہے' تو چلا جا۔" تب تک انہوں نے اپنا بزنس نہیں شروع کیا تھا۔ وقار' ثانیہ کے چہرے کے بگڑتے زاویوں کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ مگر ثانیہ خاموش نہیں رہی تھی۔

"ہرگز نہیں! اتنا گھٹا ہوا ماحول ہے یہاں کا' پھر فوتگی والا گھر۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے وقار! میں ہرگز یہاں نہیں رک سکتی۔"

"مگر ثانی! اماں جان کیا کہیں گی کہ انہوں نے خود روکا ہے تمہیں۔"

"وہ جو بھی مرضی سوچیں۔ میں کہاں عادی ہوں ایسے ماحول کی۔ انہیں بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہماری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ انجوائے کرنے کے دن ہیں۔۔۔ نا کہ یہاں تعزیت کے لیے آنے والوں سے گلے مل کر روتی رہوں۔" وہ تلخی سے بولی۔

اور پہلی بار وقار حسن کی اس سے جھڑپ اسی بات پہ ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ثانیہ کے دل میں اماں جان کی طرف سے گرہ پڑ گئی تھی۔ وہ حویلی میں رکی تو تب بھی نہیں تھی' مگر جب وقار حسن اماں جان کی منت سماجت کر کے اپنے ساتھ شہر لائے تو تب بھی ثانیہ کی ہی بدکلامی اور ہمہ وقت رہنے والی ماتھے کی شکنوں کو دیکھ کر ہی انہوں نے واپس حویلی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وقار یہ سب دیکھتے تو تھے' مگر کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا' جب ہی ایک چپ سادھ لی تھی۔

پھر بہت سارا وقت بیت گیا۔ اماں جان ان کی اولاد کے لیے جتنی بے چین تھیں' اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ وہ جب بھی گاؤں آتے' اماں جان چپکے چپکے انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیتیں۔

"سلمیٰ ابھی تک تمہارے نام سے بیٹھی ہے۔" وہ آہ بھرتیں۔ یوں ثانیہ درحقیقت اماں جان سے نہیں' سلمیٰ سے خائف تھی۔ جب ہی باقاعدہ منصوبے سے ردا کو بیاہ لائی۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو' آپ کو مسٹر وقار! آپ کی مسز پریگننٹ ہیں۔" ڈاکٹر روبینہ کے الفاظ پر وہ اس قدر حیران ہوئے تھے کہ کئی ثانیوں کو کچھ بولنے کے تو کیا' حرکت کرنے کے بھی قابل نہیں رہے۔

آج صبح ہی اچانک اس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ وقار حسن تو اسی وقت اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہ رہے تھے' مگر ردا نے منع کر دیا تھا۔

"آپ آفس جائیے! شام کو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔"

"مگر آپ کی طبیعت۔۔۔"

"اتنی بھی خراب نہیں ہے۔" وہ مسکرائی۔ "آپ کی میٹنگ نہ ہوتی تو اور بات تھی' چلیں! میٹنگ ہی اٹینڈ کر کے آ جائیے گا۔" اس کی یہی عادت انہیں سب سے اچھی لگتی تھی کہ وہ ان کا بہت خیال رکھتی تھی' خود سے بھی زیادہ۔ آفس میں بھی ان کا دھیان ردا

میں اٹکا رہا۔

گھر واپسی پہ وہ اسے ساتھ لے کر کلینک آئے تھے' جہاں ضروری ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر روبینہ نے یہ خبر سنا کر انہیں حیران کر ڈالا تھا۔

"کیا بات ہے وقار صاحب! آپ کو خوشی نہیں ہوئی' جبکہ میرے خیال میں تو اس وقت آپ کے لیے سب سے اہم اور خاص خبر یہی ہونی چاہیے تھی؟" ڈاکٹر روبینہ نے مسکرا کر شگفتگی سے کہا' تب وہ سنبھل کر بے ساختہ مسکرائے۔

"یہ بات نہیں ہے ڈاکٹر! ایکچوئیلی میں اتنی جلدی اس خبر کی توقع نہیں کر رہا تھا۔" وہ متبسم نظروں سے ردا کا شرمگیں مسکان سے سجا گلابی چہرہ تکنے لگے' جہاں ان گنت رنگ بجے تھے۔

"بہرحال! اب تو آپ کو خدا کا شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مسز ثانیہ بیگم کا بھی مشکور ہونا چاہیے۔ آف کورس یہ آپ کی خوشی پوری کرنے کا وسیلہ ہیں۔" ڈاکٹر روبینہ نے کہا' پھر رائٹنگ پیڈ پہ چند دواؤں کے نام لکھنے کے بعد پرچہ پھاڑ کر انہیں تھمایا۔

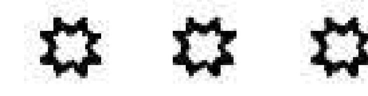
"یہ میڈیسن انہیں استعمال کرائیں اور چیک اپ بھی باقاعدگی سے کروائیں۔ ان کی ڈائیٹ کا چارٹ میں بنا کے دوں گی۔ انہیں بہت کیئر کی ضرورت ہے' بہت خیال رکھیے گا۔" ڈاکٹر نے انہیں ہدایت کی۔

"اماں جان تو بہت خوش ہوں گی' ابھی میں آپ کو ان سے ملانے لے جاتا' مگر اب ڈاکٹر نے سفر سے منع کر دیا ہے۔" راستے میں وقار حسن نے اس کے کترائے ہوئے سے انداز کو تکتے ہوئے مسکراہٹ دبا کر کہا تھا۔

"تو آپ انہیں یہیں لے آئیے نا! میں خود بہت بے چین ہوں ان سے ملنے' انہیں دیکھنے کو۔ اسی بہانے ان کی خدمت کا بھی موقع مل جائے گا۔" وہ انہیں دیکھے بغیر آہستگی سے بولی۔

"اوں ہوں! ابھی تو خدمت کیا کریں گی آپ۔ ابھی تو وہ آپ کو اپنی ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گی۔ آخر کو ان کی سالوں پرانی خواہش پوری کرنے والی ہیں آپ۔"

وقار حسن نے شرارتی انداز میں کہا۔ وہ سرخ ہو گئی۔ وقار حسن اس خوب صورت نازک سی لڑکی کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرائے تھے۔



"تمہیں بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے ثانی! یہ وقت جتنا بھی کڑا سہی' آخر بیتنے والا ہے۔ اگر تم نے اپنی اسی رقابت میں کچھ غلط کر دیا تو سمجھو! عمر بھر کا روگ پال لو گی۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ وہ اتنی جلدی پریگننٹ ہو گئی ہے' ورنہ خود سوچو! اگر ایک سال تک بھی ایسی امید نظر نہ آتی تو تمہارا کیا بنتا؟"

صالحہ نے ثانیہ کو رسان سے سمجھایا۔ وہ صالحہ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ غصے' طیش اور غم سے اس کی ذہنی حالت دگرگوں ہو رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں صالحہ! مجھے لگتا ہے میں نے خود اپنے لیے اچھا نہیں کیا۔ میں دن رات ان دیکھی آگ میں جل رہی ہوں۔" وہ سخت وحشت کا شکار تھی۔

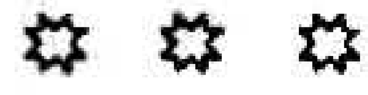
"اُفوہ! کچھ غلط نہیں ہوا۔ اب تو دن انگلیوں پہ گنے جا سکتے ہیں۔ اس کی ڈلیوری ہوئی نہیں اور اس سے تمہاری جان چھوٹی نہیں۔" صالحہ نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"یہ سب اتنا سہل نہیں ہو گا صالحہ! اماں جان بھی انوالو ہو چکی ہیں۔ خاص طور پہ اس چہیتی کے لیے گاؤں سے تشریف لائی ہیں۔ وہ تو پھولے نہیں سما رہیں اس خبر کے بعد۔ کیا بتاؤں صالحہ! کیسے کیسے نہیں دل جل رہا میرا۔" وہ دانت پیس رہی تھی یوں کہ جیسے بس نہ چل رہا ہو ردا اور اماں جان کو کچا چبا ڈالے۔

"جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے ہونے دو۔ جہاں تک ردا سے جان چھڑانے کی بات ہے تو بے فکر رہو۔ ایک سے ایک آئیڈیاز ہیں میرے پاس اسے دفعان کرنے کے لیے۔ وقت تو آنے دو۔ آخر کو تم میری پیاری دوست ہو۔ تمہارا دکھ مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہا ہے۔" صالحہ نے اس کا شانہ تھپکا۔

ثانیہ ضبط کی کوشش میں سرخ آنکھوں سے انہیں

تکتے ہوئے ہنوز بے یقین تھی' مگر جب صالحہ نے اس جھک کر سرگوشیوں میں اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تب وہ مطمئن ہو گئی۔



"خون سفید ہونے کی نشانی ہے' ورنہ بھلا ایسا بھی ہوا کرتا ہے۔ بڑے دعوے کیے جاتے تھے۔ مدر ٹریسا بننے کی بڑی شان دار کوشش کی تھی۔ سب کچھ خاک میں مل گیا۔ بھئی! کسی سے کیا کہیں' جب اپنا سکہ ہی کھوٹا نکلے تو۔۔۔"

اس نے وقار حسن سے اپنی ماں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ناتے تو خیر وہ اس کی کوئی بھی بات نہیں تھے' مگر آج کل تو کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آفس جاتے ہوئے اسے یہاں چھوڑ گئے تھے اور اس کے باپ کو اس کے لتے لینے یا دوسرے لفظوں میں دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ اتنی خفت زدہ ہوئی کہ منہ سے ایک لفظ نہ نکال سکی۔ دیکھا جائے تو وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ وہ واقعی بھلا بیٹھی تھی انہیں' مگر یہ بات کہنے کا اس کی ماں کو تو حق تھا' انہیں بالکل نہیں۔ بہرحال وہ اس کی ذمہ داری تو نہیں تھے۔ اس کی ماں نے اس کا خجالت سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھا تو آہستگی سے ہاتھ دبا کر اسے پرسکون رہنے کا کہا تھا۔ وہ تو اس کے امید سے ہونے کا سن کر جیسے نہال ہی ہو گئی تھیں۔ باقاعدہ شکرانہ ادا کیا تھا اور ساتھ اسے ڈھیر ساری نصیحتیں بھی جن میں سرفہرست اپنی سوکن کا خیال رکھنے کی تاکید تھی کہ بلاشبہ بڑی عظیم عورت تھی جس نے دل پہ پتھر رکھ کے یہ قدم اٹھایا تھا۔

شام کو وقار حسن نے آنے کی بجائے ڈرائیور بھیجا تو اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ ماں کے سامنے الگ نظریں چرانے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ان کا امیر کبیر لین لارڈ داماد ان کے اس تنگ و تاریک ٹوٹے پھوٹے گھر میں آنا اپنی توہین سمجھتا تھا۔

"یہ رکھ لیں ابا!" بیرونی دروازہ پار کرنے سے قبل اس نے اپنے بیگ سے ہزار ہزار کے کچھ نوٹ نکال کر چرس بھری سگریٹ کے کش لگاتے باپ کی مٹھی میں دبائے تھے۔ اس کی ماں چیختی رہ گئی' مگر وہ پلٹ کر دیکھے بنا دہلیز پار کر گئی تھی۔



"کیا بات ہے' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

ثانیہ رات کھانے کی ٹیبل پہ نہیں تھی۔ جب صبح ناشتے پر بھی انہیں غیر حاضر پایا تو وقار حسن اس کی طبیعت پوچھنے چلے آئے۔

"آپ آفس جائیں! آپ کو دیر ہو رہی ہو گی۔" ثانیہ نے ان کی بات کے جواب میں گویا پتھر پھوڑے۔

وقار حسن نے چونک کر ان کے چہرے کو دیکھا' جہاں وحشت' اضطراب' بے کلی' سب ہی کچھ مترشح تھا' گو کہ وہ بہت محتاط زندگی گزار رہے تھے۔ ردا سے نکاح کے بعد انہوں نے بہت کوشش کی تھی کہ ثانیہ کی کسی بھی لحاظ سے حق تلفی نہ ہو' اس کے باوجود انہیں لگ رہا تھا ثانیہ ڈسٹرب رہنے لگی ہے تو اس کی وجہ شاید اماں جان کی اس گھر میں موجودگی اور ردا کو حد سے زیادہ اہمیت دینا تھا۔

"مجھے دیر نہیں ہو رہی۔ تم بتاؤ کیا پرابلم ہے؟ کیوں پریشان ہو؟" وقار حسن نے اپنے ہاتھ میں پکڑا کوٹ اور بریف کیس وہیں صوفے پہ رکھے اور ان کے قریب آ بیٹھے۔

(پاگل مت بنو ثانیہ! بنا بنایا کھیل مت بگاڑو' سمجھ لو یہیں سے تم اپنی آئندہ زندگی کے لیے سنگ بنیاد رکھو گی' اچھی یا بری۔)

اس نے وقار حسن کا ہاتھ زور سے جھٹکا تھا اور چیخ چلا کر اپنا تمام ہیجان نکال دینا چاہتی تھی جب اس کے دماغ میں جیسے صالحہ کی باتوں کی آواز بازگشت بن کر سرسرائی' تب وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لب بھینچے ہوئے خاموش ہو گئی۔ وقار حسن اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بہت دھیان سے دیکھ رہے تھے۔

"آر یو او کے؟" وہ نرمی سے استفسار کر رہے تھے۔
"یس! ایم او کے ناؤ۔" انہوں نے گہرے گہرے سانس بھرے۔
"ہاں! میں بنا بنایا کھیل نہیں بگاڑوں گی، مگر یہ بڑھیا چلی کیوں نہیں جاتی؟ مجھے لگتا ہے اس کی وجہ سے ضرور کچھ غلط ہوگا۔" وقار حسن کے جانے کے بعد وہ ہاتھ مل مل کے سوچتی رہی، مگر پھر اچانک اس کے ذہن میں کوئی کوندا سا لپکا تھا۔ اگلے ہی پل وہ بہت پُرجوش نظر آنے لگی۔

☼ ☼ ☼

پھر وقت بہت تیزی سے گزرا تھا۔ ثانیہ نے خود پہ چاپلوسی، ہمدردی اور جھوٹی محبت کا ملمع چڑھا لیا اور بہت کامیابی سے وہ ان چاہا اور نفرت انگیز رول نبھائے گئی۔ پھر وہ وقت بھی آیا تھا، جس کے لیے اس نے بہت دل مارا تھا۔ بہت ساری زیاں اپنے حصے میں لکھوایا تھا۔ اور پل پل سولی پہ لٹکی تھی۔
روا نے شہر کے مہنگے ترین اسپتال میں ایک صحت مند اور خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقار حسن اور اماں جان کے ساتھ ساتھ ثانیہ بھی دل سے خوش ہوئی تھی۔
"یہ میرا بیٹا ہے، صرف میرا، اس کا ہر کام میرے ذمے۔" اس نے ننھے بچے کو گود میں لے کر چٹاچٹ چومتے ہوئے جس مجنونانہ انداز میں اعلان کیا تھا، اس کی شدت اور گہرائی کو پائے بغیر وقار حسن اور اماں جان بھرپور طمانیت سے مسکرائے تھے۔
ثانیہ نے اپنا کہا سچ بھی کر کے دکھایا تھا۔ اس نے بچے میں گم ہو کر گویا دنیا ہی بھلا ڈالی تھی۔ یہ ایک عورت کی ترستی ہوئی ممتا بھی تھی اور ملکیت کا جذبہ بھی۔ روا کو، اسامہ کو صرف اس وقت دیا جاتا، جب اسے فیڈ کروانا ہوتا۔ رات کو بھی ثانیہ ہی اسے اپنے ساتھ سلاتی تھی۔
"اسے فیڈر سے بھی دودھ پلایا کرو، اتنا عادی مت بناؤ اسے۔" بھوک سے بے تحاشا روتے اسامہ کو روا کے حوالے بادل ناخواستہ کرتے ہوئے اس نے ایک نیا آرڈر لگایا۔
روا چونک سی گئی، وہ ماں تھی اور اپنی ممتا کو کیسے تھپک کر سلا رہی تھی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ بچے کو ثانیہ کے حوالے کرنے پہ مجبور تھی۔ اس بات پہ تڑپ کر ثانیہ کو دیکھنے لگی۔
"کیا مطلب ہے دلہن؟ ماں کی موجودگی میں بچے کو بوتل کا بازاری دودھ پلانے کی کون سی آفت آئی ہوئی ہے؟" اماں جان کی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ یہ بات چپ چاپ سنتیں۔ ٹھنڈے سے لہجے میں ٹوک دیا۔
ثانیہ نے پہلے تو سرد نظروں سے انہیں دیکھا، پھر رسانیت سے بولی۔
"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے میکے بھی جانا ہوگا، ظاہر ہے اسامہ تو وہاں نہیں رہے گا جا کے۔"
"وہاں کیا مضائقہ ہے؟ جب ماں رہ سکتی ہے تو بیٹا کیوں نہیں؟" اماں جان کا لہجہ ہنوز تیکھا اور سرد تھا۔
"اس لیے کہ ماں اس ماحول کی عادی ہے، مگر یہ ہمارا خون ہے۔ وقار حسن کا بیٹا ایسے معمولی گھر میں جا کے کیوں رہے؟" ثانیہ زہریلے لہجے میں کہہ کر جھٹکے سے مڑ کے چلی گئی۔
روا ساکت بیٹھی تھی۔ اماں جان نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو اس کی آنکھوں میں دھند سی اتر آئی۔

☼ ☼ ☼

روا غیر یقینی سے آنکھیں پھاڑے اماں جان کو سفید لبادہ اوڑھے آخرت کے سفر کے لیے بالکل تیار دیکھ رہی تھی۔ ان کا وجود اس کے لیے ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھا۔ وہ وقار حسن سے زیادہ ان سے نزدیک ہو گئی تھی، مگر اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک دم سے تپتی دھوپ میں آ کھڑی ہوئی ہے۔ سوئم تک وہ اسی غیر یقینی کے حصار میں مقید رہی تھی۔
اسے علم تھا کہ وہ کبھی بھی ثانیہ کے برابر کی حیثیت نہیں پا سکتی، اس کے باوجود کہ وہ وقار حسن کی بیوی ہے۔ پرسہ دینے والے بھی اسی سوسائٹی کے لوگ تھے، جس سے وقار حسن اور ثانیہ تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو ثانیہ اور وقار حسن سے ہی ہمدردی تھی۔ اسے تو وہ سب کسی غاصب کی نظر سے دیکھتے تھے، ایسے میں روا کا جی چاہتا، وہ کسی ایسی جگہ جا چھپے جہاں اس قسم کی نظریں نہ ہوں۔ وہ اندر سے کمزور پڑ رہی تھی۔ وقار حسن کی توجہ اور ہمدردی کی خواہاں تھی، مگر آج کل تو وقار حسن کے پاس اس کے لیے جیسے بالکل وقت نہیں تھا۔ وہ ثانیہ کی وجہ سے ازحد ڈسٹرب تھے، جو اماں جان کی وفات پہ ایک دم کمہلا کے رہ گئی تھی۔ اماں جان کی بیماری کے دنوں میں ثانیہ، اسامہ کے ساتھ ساتھ اماں جان کا بھی بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ اس نے ان چار مہینوں میں اماں جان کی اتنی خدمت کی تھی کہ وہ ماضی کی تمام ناراضگیاں بھلانے پہ مجبور ہو گئی تھیں اور مرتے دم تک ان کے لبوں پہ ثانیہ کے سکھوں کی دعائیں ہی تھیں۔
"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے ثانی! یہ تم ہی ہو؟ ارے! تمہیں اس بڑھی کے مرنے پہ اتنا اثر لینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ اگر وقار بھائی کو متاثر کرنے کی سعی تھی تو جانو! وہ تو آل ریڈی تمہاری مٹھی میں تھے اور رہیں گے۔ روا بے چاری اپنے حسن جہاں سوز اور تمام تر جوانی و نوخیزی کے باوجود ایک کونے میں کھڑی نظر آتی ہے۔"
اماں جان کا چہلم تھا۔ ثانیہ سفید لباس میں ملبوس چہرے پہ حزن و ملال لیے گود میں سوئے اسامہ کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی، جب صالحہ نے اسے حیرانی سے تکتے ہوئے کسی قدر اچنبھے سے کہا تھا۔
ثانیہ نے دل سوزی سے لمبی آہ بھری۔
"نہیں صالحہ! میں نے مان لیا، غلطی پہ میں ہی تھی۔ اماں جان تو بے چاری بہت اچھی خاتون تھیں۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ مجھے دکھ ہوا کہ خوامخواہ اتنے سال ان سے بدگمان رہی۔ اب انہیں قریب سے دیکھا تو ان سے محبت کرنے پہ مجبور ہو گئی۔"

"اچھا؟" صالحہ نے تحیر بھرے لہجے میں کہا اور گہری کھوجتی ہوئی نظروں سے ثانیہ کا چہرہ دیکھنے لگی جیسے اس کے اندر کا بھید پانے کی کوشش کر رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

"کتنے دنوں کے لیے جا رہے ہیں؟" ردا وقار حسن کا سوٹ کیس تیار کر رہی تھی۔ جب سے اسے ان کے بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے کا پتا چلا تھا' ثانیہ کے ساتھ یہاں تنہا رہ جانے کے خیال سے ہی ہراساں ہو گئی تھی۔

"صرف دو ہفتوں کے لیے۔ یوں گزر جائیں گے۔ آپ نے بتایا نہیں کیا لے کے آؤں آپ کے لیے؟" وقار حسن نے مسکرا کر تسلی دی۔ اسے اس قدر اداس دیکھا تو انہیں اس پر بے تحاشا پیار آیا۔

"یہاں رہ کر بھی تو ہر وقت آپ کے ساتھ نہیں ہوتا ردا! پھر اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں؟ اگر چاہیں تو اتنے دنوں اپنے پیرنٹس کے ہاں رہ لیں۔" وہ ایک بار پھر جیسے اسے بہلا رہے تھے۔ ردا نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"اسامہ کے بغیر اتنے دنوں رہنا بہت مشکل ہے۔ وہ وہاں میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتا؟" اس کے دل کا دکھ زبان پہ اتر آیا۔ وقار حسن نے لب بھینچ لیے تھے۔

"آپ جانتی ہیں ردا... اسامہ' ثانیہ کے لیے..."

"مگر میں اس کی سگی ماں ہوں وقار! میں اس کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔" ان کی بات کاٹ کر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ وقار حسن نے سخت تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ردا! یہ سگی اور سوتیلی کا لفظ آج کے بعد آپ کی زبان پہ نہیں آنا چاہیے۔ ثانیہ نے جو قربانی دی ہے' وہ آپ کو یاد رکھنا چاہیے۔"

وہ سخت نروٹھے پن سے کہتے ہوئے پلٹ کر باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ثانیہ آپا؟ میں کہاں جاؤں گی آخر؟" ردا کے تو قدموں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

وقار حسن کو گئے صرف تیسرا دن تھا کہ اس پہ یہ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ثانیہ نے اس کا مختصر سامان اس کے آگے پھینک کر اسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

"خبردار! مجھے آپا مت کہنا۔ تمہیں اتنے مہینے کیسے برداشت کیا' یہ صرف میں جانتی ہوں' کمتر بے مایا عورت! تم اس قابل ہو کہ میرا شوہر شیئر کر سکو؟ مگر بعض اوقات مجبوریاں بھی انسان سے کیا کچھ کرایا کرتی ہیں۔" ثانیہ کا لہجہ حقارت زدہ تھا۔ ردا کا سانس اٹکنے لگا۔

"مگر آپ نے خود..." الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

"ہاں! خود پیا تھا یہ زہر کا گھونٹ' صرف اولاد کی خاطر۔ اب تمہیں مزید کیوں برداشت کروں؟ یہ لو! یہ اتنی رقم ہے کہ تم اور تمہارے نکمے باپ اور بیمار مرنے کے قریب ماں کے لیے باقی زندگی کافی ہوں گے۔ اتنی دور دفع ہو جاؤ کہ وقار حسن کبھی تمہاری پرچھائیں کو بھی نہ پا سکیں" ثانیہ نے نوٹوں کی گڈیاں اس کے آگے پھینکتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ پھر ردا کی منت سماجت' رونا' تڑپنا کچھ بھی کام نہیں آیا۔ ثانیہ نے ملازموں سے کہہ کر اسے دھکے دے کر وہاں سے نکلوا دیا۔

☼ ☼ ☼

ایک سال بعد۔

کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ باہر موسم اپنی شدتوں پہ تھا۔ پردے گرے ہوئے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس کے باوجود بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی خوف ناک چمک اس نیم تاریک کمرے کو لمحہ بھر کے لیے روشن کر جاتی تھی۔ ثانیہ ایزی چیئر پہ بے دم سی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذات تھے جو پنکھے کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ یہ وقار حسن کا خط اور ان کی طرف سے دیا گیا طلاق نامہ تھا۔

ہاں! وہ سب اس کے ہاتھوں سے جا رہا تھا' جس کے لیے اس نے ہر جائز ناجائز قدم اٹھانے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ کچھ گناہ ظاہر تھے' کچھ پوشیدہ۔ ردا کی زندگی برباد' اماں جان کی تو زندگی کا چراغ ہی بجھا ڈالا۔ اماں جان کی زندگی میں ردا کو برباد کرنے کا خواب ادھورا ہی رہتا' سو اس نے انہیں خدمت کے بہانے سلو پوائزن دینا شروع کیا اور محض چار ماہ میں اپنا گوہر مقصود حاصل کر لیا۔ اس کے اس گناہ کو منوں مٹی کی تہہ نے دنیا کی نظر سے پوشیدہ کر دیا تھا' مگر رب تعالیٰ پوشیدہ اور ظاہر' تمام گناہوں سے واقف ہے اور بلاشبہ اس کا حساب بے حد شفاف ہے۔ دنیاوی میزان کے پلڑوں کو ہم چور دروازوں سے حاصل کی گئی ڈنڈیاں مار کر اپنی حسب خواہش اوپر نیچے کرتے رہتے ہیں مگر اس کا عدل اس سب سے بالاتر ہے۔ وہ سزا دینے پر آئے تو بس ایک جھٹکا کافی ہوتا ہے۔

ردا کی گمشدگی نے وقار حسن کو پاگل سا کر دیا تھا۔ وہ اپنی اداکاری سے انہیں مزید دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ شاید ایسا ہو بھی جاتا اگر جو صالحہ انہیں چاروں شانے چت نہ کرا دیتی۔ صالحہ نے اس کے سامنے وقار حسن پہ وہ ساری باتیں مزید چار لگا کر عیاں کی تھیں جن کا مشورہ دینے والی وہ خود تھی۔ صالحہ جو اس کی بہترین دوست اور غمگسار تھی۔

"حیران مت ہو ثانی! کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ یاد کرو! برسوں قبل تم نے بھی میرے ساتھ ایسا کیا تھا۔ وقار حسن صرف تمہاری نہیں' میری بھی محبت تھا۔ مگر تم نے اسے مجھ سے چھین لیا۔ ہاں! میں تو یہی کہوں گی کہ تم نے چھینا۔ اگر تم بیچ میں نہ آتیں تو آج وہ میرا ہوتا۔ تب سے میرا سینہ جھلس رہا تھا۔ آج وہاں ٹھنڈک ہے' سکون ہے۔" وہ خباثت سے مسکرائی۔

وقار حسن تو اس لرزا دینے والے انکشاف کے بعد خاموشی سے پلٹ گئے تھے' مگر صالحہ وہیں کھڑی رہی تھی' ان کا جی جلانے کو۔

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی آستین کی سانپ۔" وہ سٹریائی انداز میں چلائی۔

"خیر تو تم مناؤ ثانیہ بیگم! اب وقار تمہارے ساتھ کیا کرے گا۔" وہ طنز سے مسکرائی۔

اور وقار حسن نے جو کیا تھا' وہ انہیں دیوانہ کر رہا تھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ثانیہ! تم ایسی گھٹیا ذہنیت کی مالک نکلو گی۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا ہوں... تم سے تمام تعلق توڑ کر... ردا کو بھی ڈھونڈ لوں گا' مگر تم سوچو کہ تمہارے حصے میں کیا آیا؟"

یہ ان کے خط کے الفاظ تھے جو ثانیہ دن میں ستر ہزار بار پڑھتی اور خشک آنکھوں سے روتی۔

ہاں! بھلا کیا پایا تھا اس نے؟ کیوں اس نے خود کو فرعون کی طرح خدا سمجھتے ہوئے اتنے بڑے فیصلے کر ڈالے؟

آخر ایک وقت ہی تو ہوتا ہے ظلم کا' مہلت کا بھی' پھر وہ کن فرمانے والا ساری رسیاں ایک جھٹکے سے کھینچتا ہے اور زمین پہ بسنے والا' خود کو خدا سمجھنے والا کسی حقیر کیڑے کی مانند مسل کر رہ جاتا ہے۔ یہی خدائی فیصلے ہیں کہ وہ فرماتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

مگر ثانیہ کو جب تک سمجھ آئی تھی' وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

☼

بشریٰ احمد



شادی کے لیے ہر لڑکی کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ضرور ہوتا ہے۔ سو میرا بھی تھا۔ اس میں اچنبھے کی تو کوئی بات نہ تھی‘ لیکن امی کو میری باتیں احمقانہ لگتی تھیں۔

”پھر کیا کہوں فرقان کے گھر والوں کو؟ تمہارے ابا کو تو لڑکا بہت پسند آیا ہے۔“ ہر تیسرے دن امی اور میرے درمیان کچھ اسی قسم کے موضوعات پر گفتگو کی ابتدا ہوتی۔

”خدا کا نام لیں امی! وہ ”لڑکا“ ہے؟“ میں بدکی۔

”نہیں تو کیا لڑکی ہے“ امی جواباً مجھے گھور کر دیکھتیں۔

”لڑکا ہرگز نہیں ہے۔ آدمی ہے پورا۔ مجھ سے کم از کم آٹھ سال بڑا ہوگا وہ۔“ میں نے روہانسی ہو کر جتایا۔

”اتنا فرق چل جاتا ہے۔“ امی نے بے حسی کا مظاہرہ کیا۔

”تو ٹھیک ہے‘ ہاں کردیں‘ میری مرضی کیوں پوچھ رہی ہیں۔“

میں نے خفگی سے منہ پھلایا۔ امی ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ گئیں۔ میں جانتی تھی کہ ہوگا تو وہی جو میری مرضی ہے۔ میں امی‘ ابا کی اکلوتی اولاد تھی۔ میرے بعد دو بھائی اس دنیا میں مزید آئے تھے لیکن دنیا میں آکر آنکھیں کھولنے کے چند لمحوں بعد ہی وہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند گئے تھے۔ امی‘ ابا نے مزید اولاد کی خواہش دل میں دفن کردی۔ ان کی امنگوں‘ آرزوؤں کا مرکز میری ذات ہی تھی۔ بے جا لاڈ پیار نے میری شخصیت میں زیادہ بگاڑ پیدا نہیں کیا تھا۔ ہاں چھوٹی موٹی فرمائشیں اور ضدیں پوری کروانا تو خیر حق تھا میرا لیکن اس بار معاملہ الگ ہی درپیش تھا۔

میں بی اے کرکے فارغ ہی ہوئی تھی کہ امی‘ ابا کو میرے بیاہ کا شوق چرا گیا۔ آپس کی بات ہے بیاہ کا شوق تو مجھے بھی تھا۔ بچپن میں گڈے گڑیاؤں کی شادیاں کرتے کرتے ہر لڑکی کے ذہن میں کب اپنی شادی کے متعلق ارمان جاگنے لگتے ہیں‘ پتا بھی نہیں چلتا۔ من پسند جیون ساتھی کا سپنا انجانے میں میری پلکوں پر بھی آن کر سج گیا تھا۔

بی اے کرنے کے بعد آگے تعلیم جاری رکھنا میری خواہش ضرور تھی مگر ضد یا جنون نہیں۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کا یونیورسٹی جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ابا بہت روشن خیال سہی‘ مگر اس معاملے میں وہ بھی اپنی خاندانی روایات کے اسیر تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھائی کا شوق اپنی جگہ‘ مگر میں کچھ ایسی خاص ذہین بھی نہ تھی۔ بی اے میں ابا نے تین جگہ مجھے ٹیوشن رکھوا کر دی تھی تب کہیں جا کر بی اے کلیئر ہوا۔

میں جانتی تھی کہ ایم اے میرے بس کا روگ نہیں۔ اب کم از کم ہر آئے گئے کے سامنے منہ بسور کر شکوہ تو کرسکتی تھی کہ اتنا شوق تھا پڑھنے کا مگر ابا نے اجازت ہی نہیں دی۔ ابا الگ خوش کہ اکلوتی اولاد ہونے کے باوجود میں نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا مگر اب کے بار مسئلہ کچھ ٹیڑھا ہی تھا۔ امی‘ ابا کی خواہش تھی کہ میں زندگی کے سب سے اہم فیصلے پر بھی ویسے ہی فرماں برداری کا مظاہرہ کروں۔ میں کر بھی دیتی اگر آنے والے رشتوں میں سے کوئی میرے معیار سے ذرا سی بھی مطابقت رکھتا۔

رشتے میرے واقعی بہت آرہے تھے۔ اس کا بڑا سبب میری خوبصورتی تھی۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہ سمجھا جائے تو میرا شمار صرف خوبصورت نہیں‘ بلکہ خوبصورت ترین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ پھر میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ابا کا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ کچھ لوگ اس امید پر چلے آتے کہ ابا کا جو کچھ بھی ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ میرا ہی ہے لیکن ابا بڑی زیرک نگاہیں رکھتے تھے۔ ایسے آنے والوں کو چائے پانی پلا کر اتنی سرد مہری سے رخصت کرتے کہ وہ پھر آنے کی ہمت ہی نہ کرتے‘ سو یہ اطمینان تھا کہ ابا میرا ہاتھ لالچی لوگوں کے ہاتھوں میں ہرگز نہیں تھمائیں گے لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ ابا کے قائم کردہ معیار شرافت و نجابت کی کسوٹی پر کوئی ایسا ویسا بھی پورا اتر گیا

تو ابا میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھمانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگائیں گے اور ہوا بھی یہ ہی۔

پہلے واجبی سی شخصیت والے عرفان شاہد صاحب ابا کی نگاہوں میں معتبر ٹھہرے۔

وہ تو شکر ہوا کہ ان کی ماں بہنیں امی کو تیز طرار لگیں یوں یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس کے بعد فرقان صاحب ٹپک پڑے۔ شخصیت ان کی بھی واجبی ہی تھی مزید یہ کہ عمر ٹھیک ٹھاک تھی آخر میرے بھی دل کے کچھ ارمان تھے۔

کوئی دراز قد' وجیہہ شخص' جو سنجیدگی اور متانت کا پیکر ہو۔ چھچھورا ہرگز نہ ہو' بھاری سی آواز لیکن بات دھیمے سروں میں کرتا ہو' عورتوں کی عزت کرنا جانتا ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ اس میں عورتوں والی کوئی خصوصیت نہ پائی جاتی ہو۔

مجھے زہر لگتے تھے ایسے مرد جو گھر کے معاملات میں بلاوجہ ٹانگ اڑانے کے شوقین ہوتے تھے۔ مرد تو کھاتا کماتا ہی بھلا لگتا ہے۔ عورتوں والے مشغلے اس پر ذرا زیب نہیں دیتے۔ کچن میں بیوی کا دم چھلا بن کر اس کے ساتھ کام کروانے کا شوق' بلاوجہ کا ہنسی' ٹھٹھول یا سادے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ خدمت گزار یا زن مرید ٹائپ کے خاوندوں سے میں سخت الرجک تھی اس کی بڑی وجہ میرے گردو پیش میں پائی جانے والی ایک دو مثالیں تھیں۔

فاخرہ باجی میری پھوپھی زاد بہن۔ ان کے شوہر وقار بھائی خاوندوں کی ایسی ہی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ فاخرہ باجی شادی سے پہلے اچھی خاصی اسمارٹ تھیں لیکن شوہر ایسے ملے' جو انہیں ہل کر پانی بھی نہ پینے دیتے۔ چلیں' یہ تو کچھ مبالغہ ہو گیا۔ مگر وقار بھائی تھے ایسے ہی۔ کبھی کچن میں پائے جاتے تو کبھی واشنگ مشین میں سے کپڑے نکال کر نچوڑ رہے ہوتے۔ قصور بلاشبہ فاخرہ باجی کا بھی تھا۔ انہیں اللہ میاں کی گائے جیسا شوہر قسمت سے مل ہی گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ وہ ان کے ساتھ گائے جیسا ہی برتاؤ کرتیں۔ خیر! ان کی گھریلو زندگی سے مجھے کیا سروکار ہوتا تھا۔ میں تو بتانا چاہ رہی تھی کہ ایسے مرد مجھے بہت برے لگتے تھے۔

ایسی ہی ایک اور مثال میری بیسٹ فرینڈ ناجیہ کے میاں کی تھی۔ سال بھر پہلے ناجیہ بیاہ کر پہلے چکوال اور پھر پنڈی پہنچ گئی تھی۔ اس کا سسرال چکوال میں تھا جبکہ شوہر کی ملازمت راولپنڈی میں تھی۔ شادی کے محض ایک مہینے بعد وہ سسرالی جھمیلوں سے جان چھوٹنے پر شکر مناتی شوہر کے ساتھ پنڈی سدھار گئی۔

وہاں فارغ وقت گزارنے کا طریقہ اس نے یہ ایجاد کیا کہ گھنٹہ پیکج کروا کر اپنے گھر والوں اور سہیلیوں کے کان کھاتی' چونکہ میں اس کی سب سے قریبی دوست تھی' سو مجھے تو تقریباً" ہر روز ہی اس کے "ندیم نامے" سے مستفیض ہونا پڑتا۔ جی ہاں' ندیم نام تھا اس کے میاں کا۔ صبح چپ چاپ اپنا ناشتا بنا کر مہارانی صاحبہ کا ناشتا بھی تیار کرتا اور آفس کی راہ لیتا۔ دوپہر کا کھانا ناجیہ مارے باندھے پکا لیتی۔ شام کو یہ ڈیوٹی پھر سرتاج حضور کے ذمے تھی' ورنہ ہوٹل زندہ باد۔

"تمہیں شرم نہیں آتی ندیم بھائی سے یہ سارے کام کرواتے ہوئے؟" میں کبھی کبھار تو زچ ہو کر اسے لتاڑ ہی دیتی۔

"کیا کروں یار! مجبوری ہے تمہیں پتا تو ہے' آج کل میں کس کنڈیشن سے گزر رہی ہوں۔" وہ لہجے میں زبردستی کی نقاہت طاری کرتی۔

محترمہ کے اماں جان بننے میں ابھی پورے پانچ مہینے باقی تھے۔ پریگننسی رپورٹ مثبت آنے کے بعد سے اس کا یہ ہی حال تھا۔ ڈاکٹر نے اسے آرام کی عمومی سی تلقین کی ہوگی جبکہ محترمہ نے ریسٹ سے مراد مکمل بیڈ ریسٹ لی۔ شوہر بھی ایسا جو اپنی ماں کی خدمت کے ساتھ ساتھ ہونے والے بچے کی ماں کی خدمت کو بھی فرض عین سمجھتا تھا۔ کبھی کبھار تو میں چپ کر کے اس کا "ندیم نامہ" سنتی رہتی اور کبھی "آواز نہیں آ رہی یار! ہیلو ہیلو۔" کہہ کر فون بند کر دیتی۔

فون بند کرنا میرے اختیار میں تھا مگر بھانت بھانت کے رشتوں کے لیے گھر کے دروازے بند کرنا میرے دائرۂ اختیار سے قطعی باہر تھا۔ جس کا جی چاہتا منہ

اٹھا کر رشتہ لے کر چلا آتا۔

ان ہی دنوں عماد احمد کا پرپوزل آ گیا۔ موصوف میری مامی کے دور پرے کے رشتے داروں میں سے تھے۔ والد حیات جبکہ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں ہی شادی شدہ۔ برسر روزگار بھی تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ٹھیک ٹھاک ہینڈسم بھی پہلی بار کوئی رشتہ ایسا آیا تھا کہ میں اس کے متعلق سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی۔ امی بھی ماموں' مامی سے صلاح مشورہ کرنے لگیں۔

اس روز بھی مامی اسی مقصد کے لیے تشریف لائی تھیں۔ میں نے دوپہر کے کھانے میں سالن' روٹی کے علاوہ مزے دار سا چائنیز پلاؤ بھی بنا لیا۔

"واہ بھئی مزا آ گیا کھا کر۔" مامی نے خوب ہی پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اس کے بعد دل کھول کر تعریف بھی کی۔ میرے لب مسکرا اٹھے۔ اپنی تعریف کس کو بری لگتی ہے لیکن اگلے ہی پل میری مسکراہٹ کو بریک لگ گئے۔

"چائنیز پلاؤ عماد بھی بہت اچھا بناتا ہے۔ بہنوں کی شادیوں کے بعد کچن اس نے ہی سنبھال رکھا ہے حالانکہ علیم بھائی تو بہت کہتے ہیں کہ بیٹا کوئی باورچی رکھ لو۔ آفس سے تھک ہار کر آنے کے بعد کچن میں گھس جاتے ہو' مگر نہیں مانتا۔ بہت اچھا مزاج پایا ہے عماد نے۔ ہنس مکھ طبیعت اور دوستانہ مزاج۔ سچ روبینہ! ہماری عائزہ راج کرے گی۔"

مامی' امی سے مخاطب تھیں۔ میں اس وقت تو خاموش رہی' مگر مامی کے جانے کے بعد امی سے صاف انکار کر دیا۔

"مجھے کسی باورچی سے شادی نہیں کرنی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے عائزہ! اتنی ناشکری ٹھیک نہیں۔"

"امی! یہ ناشکری نہیں۔ آپ خود سوچیں' کسی ایسے بندے کے ساتھ آپ کا گزارا کیسے ہو سکتا ہے جس کی عادتیں ہی آپ کو پسند نہ ہوں۔"

"دیکھا نہ بھالا' عادتیں تمہیں ناپسند کیسے ہونے لگیں؟" امی جرح کے موڈ میں تھیں لیکن خلاف توقع اس بار ابا میری مدد کو آئے۔

"ٹھیک ہے اگر عائزہ کی مرضی نہیں تو کوئی زور زبردستی نہیں۔"

میں نے ابا کو تشکر آمیز انداز میں دیکھا۔ بعد میں کہیں جا کر بات کھلی کہ عماد کے والد اور ابا کے درمیان' گفتگو میں مسلک پر کوئی اختلافی نکتہ اٹھ گیا تھا۔ دونوں اپنے موقف سے پیچھے نہ ہٹے۔ یوں ابا کا دل اس رشتے سے کھٹا ہو گیا۔ بہرحال میں تو مطمئن تھی۔

مامی کو البتہ کافی دکھ ہوا تھا۔ امی کی سب بہنوں میں امی ہی بڑی بھاوج کے زیادہ قریب تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ انہیں بڑی بھابھی والا مان اور مرتبہ دیا۔ چھوٹی خالائیں کبھی کبھار نند ہونے کا ثبوت دے دیتی تھیں' اس لیے مامی کا قلبی تعلق امی اور امی کی وجہ سے مجھ سے زیادہ تھا۔ انہوں نے بڑی رنجیدگی سے امی سے کہا تھا۔

"اتنا اچھا رشتہ لائی تھی روبینہ! میں اپنی عائزہ کے لیے لیکن چلو جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ نگینہ کہہ رہی تھی کہ اگر آپا کا ارادہ نہیں بن رہا تو ان لوگوں کو میری فرحین دکھا دیجیے۔"

مامی نے منجھلی خالہ کا نام لیتے ہوئے بتایا۔ فرحین ان کی بڑی بیٹی تھی۔ مجھ سے ڈیڑھ برس چھوٹی تھی میری اس سے اچھی خاصی دوستی تھی۔

"ٹھیک ہے بھابھی! وہ بھی اپنی ہی بچی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ رشتہ اس کے نصیب کا ہی ہو۔"

امی نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ میں جانتی تھی کہ امی کو یہ رشتہ ہاتھ سے نکلنے کا خاصا قلق ہے اور یہ قلق اس وقت سوا ہو گیا' جب فرحین اور عماد کا رشتہ طے ہونے کے فوراً" بعد ان کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

فرحین مجھ سے چھوٹی تھی۔ امی کا خیال تھا کہ پہلے میری شادی ہونی چاہیے تھی۔ خیر' مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں نے پورے جوش و خروش سے شادی میں شرکت کی۔

مہندی کی رات ڈھولک کی تھاپ پر تان بلند کرتے ہوئے میں کسی کی نگاہوں کے ذریعے دل میں اتر گئی اور مجھے خبر تک نہ ہوئی۔ حسن عماد کے گہرے دوست تھے۔ دونوں کے معروضی حالات ملتے جلتے تھے۔ حسن کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بڑے شادی شدہ بھائی امریکہ میں سیٹل تھے۔ ایک چھوٹی بہن تھی جس کو چند ماہ قبل ہی گھر بار کا کیا تھا۔ بہن اپنی شادی کے بعد بھیا کے لیے لڑکی تلاش کرتی پھر رہی تھی لیکن بھیا نے بہنا کو اس زحمت سے بچا لیا۔ لڑکی انہوں نے خود تلاش کر لی۔

فرحین کی شادی کے ٹھیک ایک مہینے بعد حسن کی چھوٹی بہن اور بہنوئی حسن کا رشتہ لیے ہمارے گھر آن موجود ہوئے۔ تائید کنندہ کے طور پر عماد اور فرحین ساتھ تھے۔ عماد تو خیر حسن کا گہرا دوست تھا۔ فرحین صاحبہ جن کی حسن سے آشنائی ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے تھے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"بجی عائزہ! ایکدم پرفیکٹ مین ہیں حسن بھائی۔ ہینڈسم' ڈیشنگ اور اسمارٹ۔۔۔ پھر اتنی اچھی جاب شخصیت میں عجیب سی متانت اور ٹھہراؤ۔"

"بس کرو بیگم! کہیں میں حسن سے جیلس نہ ہونے لگ جاؤں۔" اتنے میں ہی عماد نے انٹری دی تھی میں اور فرحین ہنس پڑے۔

اب عماد صاحب اپنے دوست کی وکالت کرنے لگے ان سے تو میں کیا کہتی چپ چاپ ہنستی رہی لیکن جیسے ہی وہ کمرے سے نکلے۔ میں نے فرحین کی کلاس لی۔

"اتنی وکالت جو آپ موصوف کی کر رہی ہیں ابھی جانتی ہی کتنا ہیں آپ ان کو۔ محض ایک دوبار کی ملاقات ہوئی ہو گی تمہاری اور ان کی۔"

"ارے نہیں عائزہ! ہر دوسرے دن تو حسن بھائی ہمارے گھر آئے ہوتے ہیں۔ دراصل بہن کی شادی کے بعد اکیلے ہو گئے ہیں نا۔ بازار کا کھانا پسند نہیں آتا۔ خود اتنے پھوہڑ ہیں کہ انڈا ابالنے اور چائے بنانے میں بھی ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں۔ یا تو عماد انہیں فون کر کے رات کے کھانے پر بلا لیتے ہیں ورنہ وہ خود ہی آن پہنچتے ہیں۔ سمجھو وہ تو ہمارے گھر کے فرد ہیں۔" فرحین اپنی ہی رو میں بولے جا رہی تھی مگر میرا دھیان اس کے بیان کے ابتدائی حصے میں ہی اٹک گیا تھا۔

یعنی ان میں کسی قسم کے زنانہ اوصاف نہیں پائے جاتے۔ میرا دل جھوم ہی اٹھا۔

فرحین دو گھنٹے میرا مغز چاٹ کر گئی تھی اور اس کے جانے کے دو منٹ بعد میں امی کو جا کر رضامندی دے آئی تھی اور پھر تو جیسے سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں کیسے ہوئیں' رسومات کتنے دن چلیں اور کب اور کیسے میں' حسن کے سنگ رخصت ہو کر حسن ولا پہنچ گئی۔۔۔ سب کچھ جیسے ایک خواب تھا اور جب حسن نے میری کلائی میں خوب صورت سا کنگن پہنایا تو یہ میرے خواب کی حسین ترین تعبیر تھی۔

میں خوش تھی' بے تحاشا خوش۔

شادی کے بعد حسن بہت محبت کرنے والے شوہر ثابت ہوئے۔ ان کی سنگت میں زندگی کے خوب صورت ترین دور کا آغاز ہوا تھا۔ شروع شروع میں مجھے تنہائی سے ذرا سی گھبراہٹ ہوتی تھی کہ حسن کی جاب نائن ٹو فائیو والی تھی۔ اکیلے دن گزارنا مسئلہ بن جاتا تھا' لیکن پھر عادت ہو ہی گئی تھی۔ گھر کے سارے کام میں حسن کی آمد سے پہلے نبٹا لیتی۔ وہ آفس سے آجاتے تو ہم گھومنے پھرنے نکل جاتے۔ کبھی فرحین اور عماد کی طرف' کبھی میں اپنے گھر' تو کبھی ویسے ہی لانگ ڈرائیو کے مزے لوٹ کر آئس کریم کھا کر گھر کا رخ کرتے۔

ڈنر کبھی باہر نہ کرتے' نہ باہر سے کچھ پکا پکایا گھر لاتے کہ حسن بہترین سے بہترین ہوٹل کے کھانے کو بھی غیر معیاری اور مضر صحت کھانوں کی فہرست میں شامل کر دیتے تھے۔ انہیں گھر کا پکا ہوا ہی چاہیے ہوتا تھا۔ ہماری شادی سے پہلے سامعہ (نند) جب بھی بھائی سے ملنے گھر آتی۔ کئی طرح کے کھانے بنا کر فریز کر جاتی' ورنہ ڈنر اکثر و بیشتر وہ عماد کی طرف ہی کرتے تھے اور ایک کھانے پینے کی عادتوں پر ہی کیا موقوف'

حسن ہر معاملے میں پرفیکشنسٹ تھے۔ اگر پتلون کی کریز صحیح نہ بنی ہوتی تو صبح آفس جانے سے پہلے افراتفری کے عالم میں بھی دوسری پتلون مجھے تھما دیتے۔

"اسے ذرا دھیان سے پریس کرنا جان! تم جانتی ہو کہ میں اپنی ڈریسنگ کے معاملے میں کتنا کانشس ہوں۔"

وہ بہت پیار سے مخاطب کرتے۔ شروع شروع میں مجھے حسن کی کوئی عادت کوفت میں مبتلا نہیں کرتی تھی۔ وہ ویسے ہی تھے جیسے میں نے چاہا تھا، لیکن شادی کے ایک سال بعد جب مغیو میری گود میں آگیا تو جہاں زندگی کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا، وہاں ذمہ داریوں کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ اب کبھی کبھار حسن کی عادتیں مجھے بے زار کردیتیں۔ وہ ذرا سے بھی کوآپریٹو شوہر ثابت نہ ہو رہے تھے۔

انہیں احساس ہی نہ تھا کہ مغیو کے بعد میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اگر میری ساس حیات ہوتیں یا گھر میں میرے علاوہ مغیو کو سنبھالنے والا کوئی اور موجود ہوتا تب شاید اتنا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مغیو میرا پہلا بچہ تھا۔ ناتجربہ کاری کے باعث میرے سنبھال میں ہی نہ آتا تھا اور پھر اس کے حلق میں کوئی قدرتی لاؤڈ اسپیکر فٹ تھا، رونے پر آتا تو نہ دودھ پیتا، نہ کسی اور دھیان میں لگتا، حلق پھاڑ کر روتا رہتا۔ میں اسے تھپک تھپک کر تھک جاتی، کبھی کندھے سے لگائے کمرے کے چکر کاٹنے لگ جاتی۔ بہت چیخ و پکار کے بعد گھنٹہ، آدھا گھنٹہ کے لیے اس کی آنکھ لگتی تو میرا اپنا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا۔ ذرا دیر کو کمر ٹکانے کا خیال آتا کہ گھر کے ادھورے کام اپنی جانب متوجہ کرلیتے۔

حسن کو ماسیوں کے ہاتھ کا کام پسند تھا اور نہ ماسیوں پر اعتبار تھا۔ پہلے تو دو بندوں کا کام ہوتا تھا، میں جھٹ پٹ نبٹا لیتی تھی۔ مجھے خود بھی ماسیوں کے کام کی عادت نہ تھی کہ حسن کی طرح میں خود کافی نفاست پسند طبیعت کی مالک تھی، لیکن اب دوسرا معاملہ تھا۔ چھوٹے بچے کے ساتھ گھر بھر کے کام مجھ سے نہ نبٹائے جاتے یا اگر حسن خود تعاون کرنے والے شوہر ہوتے تب بھی شاید اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔ یہ نہ تھا کہ وہ میرا خیال نہ رکھتے تھے۔ فریج میں دودھ، فروٹ، جوسز طرح طرح کی سوغاتیں بھری پڑی تھیں۔ وہ مجھے اپنی ڈائٹ کا خیال رکھنے کی بار بار تلقین بھی کرتے، مگر مجھے ڈائٹ کے ساتھ ساتھ آرام بھی چاہیے تھا، جو حسن کے معمولات کی وجہ سے ممکن نہ تھا۔ مغیو مجھے ساری ساری رات جگاتا۔

ایک ہی بیڈ روم میں ہونے کے باوجود حسن کبھی کروٹ بدل کر نہ پوچھتے کہ "یہ کیوں رو رہا ہے" یا "لاؤ ذرا دیر کو مجھے دو، تم کمر سیدھی کرلو۔" مغیو کی کسی قسم کی چیخ و پکار ان کی گہری نیند پر اثر انداز نہ ہوتی تھی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ انہیں بیٹے سے پیار نہ تھا۔ بلاشبہ مغیو میں ان کی جان تھی، لیکن ان کا بیٹے سے سارا لاڈ پیار رات دس بجے تک ہوتا تھا، وہ اپنے معمولات میں کسی کمپرومائز کے عادی نہ تھے۔ صبح آفس کے لیے انہیں جلد اٹھنا ہوتا تھا، اس لیے رات کو جلد سو جاتے اور اٹھنا تو مجھے بھی ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا کہ انہیں آفس کی تیاری میں مدد کروانا اور ناشتا بنا کر دینا اب بھی میری ڈیوٹی تھی۔ کوئی کوئی رات تو بالکل رت جگے میں کٹتی تو صبح حسن کے اٹھانے پر میں بمشکل آنکھیں کھول کر التجا کرتی کہ ناشتا خود ہی بنالیں۔ ڈبل روٹی کے دو توس سینکنا اور آملیٹ بنانا کچھ اتنا بھی مشکل کام نہ تھا۔ اکثر حسن کا ناشتا اسی قسم کا ہوتا، لیکن ایسے میں وہ بڑی بے چاری سی شکل بنالیتے۔

"اچھا سو جاؤ، کوشش کرتا ہوں پراٹھا بنانے کی۔ دراصل آج میرا جی قیمے والا پراٹھا کھانے کو کر رہا ہے۔ رات کو جو قیمہ بھونا تھا وہ فریج میں ہی رکھا ہے نا۔"

وہ بڑی معصومیت سے دریافت فرماتے اور میں مندی مندی آنکھیں کھول کر جمائیوں پر جمائیاں روکتی چپل گھسیٹتی کچن میں جا پہنچتی۔

وہ سادہ پراٹھا بنانے سے ناآشنا تھے۔ قیمے والا پراٹھا تو شاید قیامت تک نہ بنا پاتے اور ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد میری خفا خفا سی شکل پر نظر ڈالتے تو ہنس کر میری ناک دبا دیتے۔

"بھئی! جس دن تم سی آف نہ کرو، آفس میں میرا دن بہت برا گزرتا ہے۔"

ایک وقت تھا کہ میں ان کی محبت بھری باتوں پر پھولے نہ سماتی، لیکن اب مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

مسلسل بے آرامی اور خوابی کی وجہ سے آخر کار میری طبیعت ناساز ہوگئی۔ ٹھیک ٹھاک بخار چڑھ گیا تھا۔ بخار کے ساتھ سارا جسم بھی بری طرح دکھنے لگا۔ صبح حسن کو بمشکل ناشتا بنا کر دیا۔ مغیو کو سنبھالنا دشوار ترین کام لگ رہا تھا۔ امی، ابا ان دنوں عمرے کی سعادت کے لیے دیار مقدس گئے ہوئے تھے۔ ورنہ میں امی کو اپنے پاس بلا لیتی۔ اب تو ان حالات سے مجھے خود ہی نپٹنا تھا۔

رات حسن ڈاکٹر سے دوا دلوا لائے تھے۔ ہلکا پھلکا ناشتا کرکے دوا لی۔ روتے دھوتے مغیو کو کاٹ میں زبردستی لٹا کر کمرا سمیٹا۔ آفس جانے سے پہلے حسن پورا بیڈ روم تلپٹ کر جاتے تھے۔ ان کی ساری نفاست پسندی، اپنی ذات تک محدود تھی، ویسے بے ترتیبی پھیلانے کے ماہر تھے۔

کمرا کچھ سمیٹ میں آیا تو روتے بلکتے مغیو کو کاٹ میں سے نکال کر فیڈ کروایا۔ وہ بے چارہ اتنا نڈھال ہوچکا تھا کہ دودھ پیتے پیتے سو گیا۔ میں بھی اس کے برابر لیٹ گئی۔ دوا میں شاید غنودگی تھی، جو میں دو گھنٹے تک بے سدھ سوتی رہی۔

مغیو کے رونے کی آواز پر آنکھ کھلی۔ اللہ جانے وہ کب سے اٹھا ہوا تھا۔ اس کی نیپی بدل کر پھر فیڈ کروایا۔ اب وہ کھیلنے کے موڈ میں تھا۔ میں نے مطمئن ہوکر اسے بے بی کاٹ میں ڈالا اور کچن میں چلی آئی۔

بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ امی کی بات یاد آئی کہ دودھ پلانے والی ماؤں کو زیادہ بھوک لگتی ہے، صبح ناشتا برائے نام کیا تھا۔ کھانا بنانے کی اب بھی ہمت نہ تھی۔ ایک بڑا سا سیب دھو کر کھایا۔ ساتھ ایک گلاس دودھ کا پی لیا۔ توانائی کچھ بحال ہوئی تھی۔

شام کو حسن جلدی آگئے، شاید میری طبیعت خرابی کا خیال کرکے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

"کیا ہوا یار! گھر میں اتنی ابتری، کیا طبیعت ابھی تک صحیح نہیں ہوئی۔" انہوں نے پہلے گھر کی بے ترتیبی نوٹ کی، پھر میری طبیعت پوچھی۔

"بخار تو اتر گیا، کمزوری باقی ہے۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

"اپنی ڈائٹ کا خیال نہیں کروگی تو یہ ہی حشر ہوگا۔ فریج بھرا پڑا ہے فروٹس سے، کھایا کرو نا۔" انہوں نے ہمیشہ والی نصیحت دوہرائی۔ میں چپ رہی۔

"اچھا یہ بتاؤ، پکایا کیا ہے، صبح تم نے میرا لنچ باکس بھی تیار کرکے نہیں دیا تھا۔ سچ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں، جو بھی ہے فٹافٹ لادو۔"

انہوں نے آفس سے جلد آنے کی وجہ بتا کر خوش فہمی کے غبارے سے ہوا نکال دی۔ جی میں تو آیا کہہ دوں "فریج بھرا پڑا ہے پھلوں سے۔ کچھ بھی نکال کر کھالیں" لیکن کہا تو صرف یہ کہ "حسن! ہمت نہیں تھی کچن میں گھسنے کی۔ اب بھی چکر آرہے ہیں۔"

"اچھا تو کھڑی کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔" حسن نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھایا۔

"طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس چلیں؟" انہوں نے ذرا سی فکرمندی دکھائی۔

"نہیں! دوا تو ابھی باقی ہے، کھالوں گی۔ کمزوری تو جاتے جاتے ہی جائے گی۔" میں نے انکار کردیا۔

"چلو جیسے تمہاری مرضی، میں تو سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر سے واپسی پر عماد وغیرہ کی طرف نکل جائیں گے۔ تمہارے اندر تو پکانے کی ہمت نہیں ہے، آج انہیں ہی میزبانی کا شرف عنایت کردیں۔"

انہوں نے کیا بہترین حل تجویز کیا تھا، میں بھنا ہی تو گئی۔ فرحین خود دو اوپر تلے کے بچوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہوئی رہتی تھی۔ ایسے میں ہم بن بلائے مہمان بن کر نازل ہوجاتے۔ میں نے چڑ کر یہی حقیقت حسن کو جتلائی تھی۔

"ارے یار! دوست ہے میرا' تکلف یا غیریت کیسی' جو دال دلیہ پکایا ہوگا کھالیں گے۔"

سادگی اور معصومیت کی انتہا تھی۔ گویا کھا کر بھی ان پر احسان کریں گے۔ مجھے تاؤ تو خوب آیا مگر حسن سے بحث فضول تھی کہ ان پر میری کسی بات کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔

"آپ نے جانا ہے تو جائیں' میں گھر پر ہی آرام کروں گی۔" میں نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔

"او کے' پھر دروازہ بند کرلو اور ہاں اپنے لیے بھی کچن میں گھسنے کی ضرورت نہیں۔ فرحین سے کہہ دوں گا' تمہارے لیے بھی کچھ پیک کرکے بھیج دے گی۔" انہوں نے کہا۔

میں غصے اور کوفت کے مارے کچھ بول ہی نہ پائی اور وہ سوئے ہوئے مغیو کو پیار کرکے چلتے بنے۔ گھومتے سر کو ہاتھوں میں تھام کر میں کتنی دیر بیٹھی رہی' لیکن بیٹھے رہنے سے کب کام چلتا تھا۔

حسن آج استری شدہ آخری سوٹ پہن کر آفس گئے تھے۔ استری کرنے والے کپڑوں کا ڈھیر اکٹھا ہو رہا تھا۔ میں کم از کم حسن کے تین' چار سوٹ پریس کرکے رکھنا چاہ رہی تھی' ابھی لائٹ بھی تھی اور مغیو بھی سو رہا تھا۔ ایسا اتفاق قسمت سے ہوتا تھا' سو میں اس اتفاق کو خوش قسمتی گردانتے ہوئے گھومتے سر کو فراموش کرکے کپڑے پریس کرنے میں جت گئی۔

رات نو بجے حسن کی واپسی ہوئی تھی۔ بشاش موڈ اور فریش چہرہ۔

"یہ لیں جناب! آپ کا کھانا۔" انہوں نے ایک لنچ باکس مجھے تھمایا۔

"میں نے کھچڑی بنا کر کھالی ہے۔" میں نے سرد انداز میں کہتے ہوئے لنچ باکس ان کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

"ارے چکھو تو سہی عماد نے کیا مزے دار کڑھی چاول بنائے ہیں' جب میں گیا تو کڑھی کے لیے پکوڑے تل رہا تھا۔ پہلے چائے کے ساتھ پکوڑے کھائے' پھر مزے دار کھانے کا دور چلا۔ سچ مزا آگیا' بہت ذائقہ ہے عماد کے ہاتھ میں۔"

"فرحین کیا میکے گئی ہوئی تھی؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔

میں جانتی تھی کہ فرحین کی موجودگی میں تو عماد کو کچن میں گھس کر اپنے جوہر آزمانے کا موقع شاذونادر ہی ملتا ہے۔ فرحین کے بقول ایک بار عماد کچن میں گھس جاتا تو کچن کی ساری چیزیں تلپٹ کرنے کے ساتھ راشن کے بے دریغ استعمال سے بجٹ بھی تلپٹ کرکے رکھ دیتے ہیں' اسی لیے ان کے کچن کے داخلے پر سخت پابندی ہے۔ آج حسن کی بات سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ فرحین' خالہ کے ہاں گئی ہوگی' جب ہی عماد نے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا۔

"ارے نہیں یار! تمہاری کزن بھی تمہاری طرح بستر سنبھالے پڑی ہے۔ اس کی بھی دو' تین دن سے طبیعت خراب ہے' بلکہ عماد نے تو آج آفس سے چھٹی بھی اسی لیے کی' بچے بھی ماں سے زیادہ باپ کو پہچانتے ہیں' فرحین تو مزے سے منہ پر چادر تانے پڑی رہی' عماد بچوں کو بھی سنبھال رہا تھا اور کچن بھی۔" حسن نے مجھے تفصیلی رپورٹ دی۔

"کتنے مزے سے یہ سب مجھے بتا رہے ہیں' اپنے دوست سے کچھ سبق سیکھ لیں کہ بیوی' بچوں کا خیال کیسے رکھا جاتا ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"تو کیا میں تم لوگوں کا خیال نہیں رکھتا؟" حسن نے مصنوعی خفگی سے مجھے گھورا۔

"کم از کم ایسے تو نہیں رکھتے جیسے عماد بھائی رکھتے ہیں۔" میں نے صاف گوئی سے انہیں جتایا۔ وہ ہنس پڑے۔

"تم تو جانتی ہو یار! میں مردوں کی اس ٹائپ سے تعلق ہی نہیں رکھتا اور تم خود بتاؤ' مرد' عورتوں والے کام کرتے اچھے لگتے ہیں کیا؟" وہ پوچھ رہے تھے۔

"نہیں ہرگز نہیں' لیکن کبھی کبھار مجبوری میں تو کرسکتے ہیں نا اور فرحین کب عماد بھائی سے کام کرواتی ہے' لیکن عماد بھائی خود اس کے خیال سے اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔"

"اچھا تم مجھے بھی گھر کے کام سکھادو' میں بھی کرلیا کروں گا' اب خوش۔" انہوں نے پیار سے میری

ٹھوڑی چھوئی۔

”بس رہنے دیں۔“

میرے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

ذہن میں عماد اور فرحین کا گھر گھوم رہا تھا۔ ابھی دس دن پہلے کی بات تھی ہم چھوٹے ماموں کے پوتے کی رسم عقیقہ میں شرکت کے لیے گھر سے نکل رہے تھے کہ عماد کا فون آگیا۔

”ہمیں بھی لیتے چلنا یار! گاڑی کچھ مسئلہ کر رہی ہے۔“ حسن نے فون سن کر گاڑی ان کے گھر کی طرف موڑ دی' وہاں پہنچ کر ذرا سی کوفت ہوئی' فرحین ابھی تک تیار نہ ہوئی تھی۔

”سوری بھئی! دراصل لائٹ ابھی آئی ہے' موٹر میں پانی بھی ختم تھا' پہلے بچوں کو نہلایا' پھر عماد نہانے گئے' بس میں بھی دو منٹ میں شاور لے کر آتی ہوں۔“ وہ استری اسٹینڈ پر دوپٹہ پھیلائے اپنا دوپٹہ پریس کرنے میں مصروف تھی' اتنے میں عماد تولیے سے بال رگڑتے ہوئے چلا آیا۔

”او بندی خدا کی' کبھی موقع محل کی نزاکت بھی سمجھ لیا کرو۔ عائزہ بھابھی! آپ ہی سمجھائیں اپنی دوست کو' ایسے رگڑ رگڑ کر کپڑے پریس کرتی ہے کہ آدھا گھنٹہ ایک شرٹ پر لگا دیتی ہے' جانے کون سی نادیدہ شکنیں نظر آ رہی ہوتی ہیں اسے۔“

”بس کریں عماد! دیکھیں تو سہی' آج سب کے کپڑے کتنی جلدی پریس کیے ہیں میں نے۔“ فرحین روہانسی ہوئی۔

”اچھا تو اب جاؤ' سب کے کپڑے پریس کر دیے نا' یہ آخری دوپٹہ رہتا ہے' یہ میں پریس کر دیتا ہوں۔ تم نہا لو جلدی سے۔“ عماد نے اسے آئرن اسٹینڈ کے سامنے سے ہٹایا۔

”رہنے دیں عماد! بس دو منٹ میں کر لوں گی۔“ فرحین کو شاید ہمارے سامنے میاں سے کام کروانے میں خفت محسوس ہوئی۔

”او جاؤ بابا! بھابھی اور حسن کوئی غیر ہیں کیا۔ پتا ہے انہیں کہ میری زوجہ مجھے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی' لیکن آج تو مجبوری ہے۔ ماموں نے تقریب کا جو ٹائم دیا تھا۔ اس سے آدھا گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں ہم' کچھ وقت سفر میں بھی لگے گا' تم فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔“ عماد نے اسے احساس دلایا۔

”ہاں واقعی دیر ہو رہی ہے۔“ گھڑی پر نظر ڈال کر فرحین کو بھی احساس ہوا تو جھٹ واش روم میں گھس گئی۔ عماد نے پہلے فرحین کا دوپٹہ پریس کیا۔ پھر اپنی دو سالہ بیٹی کی پونیاں بنا کر اسے تیار کیا اور جتنی دیر میں فرحین تیار ہوئی' عماد دونوں بچوں کے فیڈر تیار کر لایا تھا۔

عماد اور فرحین کی زندگی میں جو انڈر اسٹینڈنگ اور تعاون والی فضا نظر آتی تھی' اس کا کریڈٹ یقیناً عماد کو جاتا ہے۔ گھر بار کی ذمہ داری سنبھالنا یقیناً عورت کا ہی کام ہے' لیکن اگر اسے خیال رکھنے والا ہمدرد ساتھی نصیب ہو جائے' آڑے وقت میں اس کا ہاتھ بٹانا اپنی مردانہ انا کے خلاف نہ سمجھے تو زندگی سہل طریقے سے گزرنے لگتی ہے۔ ہاں! اگر عورت اس تعاون کا ناجائز فائدہ اٹھائے تو وہ بھی غلط ہے۔ زندگی کی شاہراہ پر سبک خرامی سے سفر کرنے کے لیے دو انتہاؤں کے درمیان راستے کو اپنانا ہی دانش مندی ہے۔ یہ حقیقت مجھے اب جاکر سمجھ آئی تھی۔

اور ایسا نہیں کہ حسن سے شادی کا فیصلہ مجھے اب اپنی حماقت لگتا تھا یا مجھے اس فیصلے پر کسی قسم کا پچھتاوا ہے۔ حسن مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر پیارے ہیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتی کہ مجھے ان کے علاوہ کسی اور کا ساتھ نصیب ہوتا۔ ہاں! حسن کی تعاون نہ کرنے والی طبیعت کی وجہ سے کبھی کبھار زندگی میں کچھ کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے' شاید ایک دم سر پر پڑنے والی ذمہ داریوں کی بوکھلاہٹ اس کا سبب ہے یا واقعی گھریلو معاملات سے حسن کی لاتعلقی اب مجھے کھلنے لگی ہے' لیکن مجھے امید ہے کہ میں اپنی محبت کے بل پر حسن کا مزاج بدلنے کی کوشش کروں گی' یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ خود ہی ایڈجسٹ کرنا سیکھ جاؤں۔ میں ہر دو صورتوں میں امید ہی کر سکتی ہوں' کیونکہ امید پہ دنیا قائم ہے۔

✡

غزالہ خالد





ٹن ٹو... ٹن ٹو... ٹن ٹو... ٹن ٹو... متواتر بجتی ہوئی بیل نے اسماء کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔ اس نے روتی ہوئی بیلی کو گود میں اٹھایا۔ چھوٹو کے ہاتھ میں بسکٹ تھمایا اور تقریباً بھاگتے ہوئے جا کر دروازہ کھولا تو باہر توقع کے عین مطابق عاصم غصے میں بھرا کھڑا تھا۔ اندر آ کر اس نے پاؤں مار کر پوری قوت کے ساتھ دروازہ بند کیا اور چلایا۔

”کہاں تھیں آخر' کیا بہری ہو گئی تھیں۔ اتنی دیر سے گھنٹی بجا رہا ہوں' کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔ پتا بھی ہے کتنا تھکا ہوا آتا ہوں لیکن یہاں کس کو پروا ہے۔“

”ہاں ہاں' تھکے ہوئے آتے ہو۔ پتا ہے' سب پتا ہے۔ میں کون سا پاؤں پسارے بستر پر پڑی تھی' میں بھی کام ہی کر رہی تھی۔“

اسماء نے بھی ترخ کر جواب دیا تو عاصم کو مزید غصہ آگیا۔

”ہاں مجھے بھی پتا ہے کیا کام کر رہی تھیں' ٹیلی فون پر گپیں ماری جا رہی ہوں گی اور کیا کام ہو رہا ہو گا۔“

”ہاں' تین مہینے کی بیلی' دو سال کے چھوٹو اور ساڑھے تین سال کے ٹیپو کو ایک دن سنبھال کے دکھائیں ذرا پھر پوچھوں گی کہ فون پر لمبی لمبی گپیں مارنے کا وقت کہاں سے ملتا ہے۔“ اسماء نے تلملاتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا' اب میرے گھر پہنچتے ہی لڑنا مت شروع کر دینا' سارا دن دفتر میں سر کھپا کے آؤ تو گھر میں بھی دو گھڑی سکون نہیں ملتا۔ جاؤ ذرا ایک کپ چائے بنا دو'

میں نہانے جارہا ہوں۔" عاصم نے الگنی سے تولیہ گھسیٹا اور بکتا جھکتا غسل خانے میں گھس گیا۔

بیلی نان اسٹاپ روئے چلی جارہی تھی اور چھوٹو اور ٹیپو بسکٹ ایک دوسرے سے چھیننے کے چکر میں گتھم گتھا تھے۔ اسماء نے دو دو ہاتھ دونوں کی کمر پہ لگا کے بڑی مشکل سے انہیں علیحدہ کیا اور روتی ہوئی بیلی کو گود میں لے کر ایک ہاتھ سے اس کی فیڈر تیار کر کے اس کے منہ میں ٹھونس دی۔ بچی بھوکی تھی۔ دودھ ملا تو نیند سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس کی نیند سے بوجھل پلکیں دیکھ کر اسماء نے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے بیلی کی نیند پکی ہونے کا انتظار کرلیا جائے' اگر ابھی لٹا کر چلی گئی تو دوبارہ دھاڑنا شروع کردے گی۔ اتنے میں میاں صاحب تولیے سے سر پونچھتے ہوئے غسل خانے سے نمودار بھی ہوگئے اور بولے۔

"چائے کہاں ہے؟"

"شی۔" اسماء نے انگلی ہونٹوں پہ رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر دھیرے سے بولی۔ "بیلی ابھی ابھی سوئی ہے' شور کریں گے تو اٹھ جائے گی پھر کوئی کام نہیں کرنے دے گی۔"

"ارے یعنی کہ تم نے ابھی تک چائے بھی نہیں بنائی' جب سے اس کو ہی گود میں لیے بیٹھی ہو؟" عاصم بگڑ گیا۔ "کہا بھی تھا کہ میرے سر میں درد ہے لیکن تمہیں کوئی پرواہی نہیں ہے۔ یہ اوقات ہے میاں کی کہ دن بھر کا تھکا ہوا آتا ہوں تو ایک کپ چائے بھی نصیب نہیں ہوتی۔"

"یہ پھر تھکا ہوا تھا" کی گردان شروع کردی۔ "سب پتہ ہے مجھے کہ ان گورنمنٹ کے دفتروں میں کتنا کام ہوتا ہے' بس حاضری لگانے ہی دفتر جاتے ہیں۔ ٹانگیں پسار کے اخبار پڑھتے ہیں' دو چار فون کھڑکاتے ہیں' دوستوں سے گپ شپ لگانے اور چار چھ کپ چائے کے چڑھانے کے بعد گھر واپس آجاتے ہیں۔ یہ کام کام کام کا رعب کسی اور پر ڈالنا۔ اللہ نے مرد کیا بنا دیا' عورت کو بالکل ہی گھر کی باندی سمجھ لیا ہے اور میں جو صبح سے گھن چکر بنی رہتی ہوں' اس کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔"

اسماء نے بھی بیلی کی نیند کو بھلا کر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

"ہاں گھن چکر' خوب!" عاصم طنزیہ لہجے میں بولا۔ "آفس سے آنے کے بعد ابھی تک ایک کپ چائے تو نصیب ہوئی نہیں مجھے۔ سب پتہ ہے کیسے گھن چکر بنی رہی ہوگی۔ ٹی وی پر ایک کے بعد ایک فضول قسم کے ڈرامے دیکھے ہوں گے' دروازے پر کھڑے ہو کے پڑوسنوں سے حالات حاضرہ' سیاست' فلم اور سسرال والوں کے موضوع پر بات چیت کی ہوگی۔ بیوٹی پارلر کا چکر لگایا ہوگا اور ٹیلی فون پہ گپیں ماری ہوں گی۔ اب ظاہر ہے اتنے سارے کام کیے ہیں تو گھن چکر تو بنی ہی ہوگی۔"

اتنی لمبی طنزیہ گفتگو کا انجام المیہ ہی ہونا تھا اور ہوا بھی یہی' یعنی اسماء کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

"ذرا سی چائے بنانے میں دیر ہوگئی تو اتنی باتیں سنا دیں۔ یہ نہیں دیکھ رہے کہ گھر صاف ستھرا ہے' بچے صاف ستھرے ہیں' کچن میں کھانا تیار ہے' برتن دھلے ہوئے ٹھکانے پہ رکھے ہیں اور آفس سے آنے کے بعد نہانے گھسے تو گھر میں پہننے کے کپڑے تک استری ہوئے پہلے سے کھونٹی پہ لٹکے ہوئے تھے پھر بھی طعنے دینے سے باز نہیں آتے۔ یااللہ! اب تو ہی کچھ نوٹس لے ورنہ تو یہ روز روز کی لڑائیاں کبھی ختم نہ ہوں گی۔"

بات کرتے کرتے اسماء نے اچانک آسمان کی طرف منہ کر کے اللہ میاں کو مخاطب کیا تو باوجود غصے کے عاصم کو ہنسی روکنا مشکل ہوگیا۔ اس وقت ذرا سی مسکراہٹ نے بارود کو چنگاری دکھانے والا کام کیا۔ اسماء اور بھی بھڑک گئی۔

"ہنسو ہنسو جی بھر کے ہنسو' تمہاری یہی بات مجھے سب سے زیادہ زہر لگتی ہے کہ میں سنجیدہ ہوتی ہوں تو تم مذاق کرنے لگتے ہو۔ میں مذاق میں بات کروں تو تم طنزیہ ہوجاتے ہو اور اگر غلطی سے بھی میں طنزیہ ہوجاؤں تو اس کے لیے تو تم نے فارمولا تیار رکھا ہی ہوا ہے۔"

"کون سا فارمولا!" عاصم نے چڑ کے پوچھا تو بولی۔

"وہی حلق' نرخرے اور پھیپھڑوں کے آزادانہ استعمال والا فارمولا' یعنی اتنی زور سے چیختے ہو کہ میں سہم کر خود ہی چپ ہوجاتی ہوں۔"

عاصم نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کی اور برا سا منہ بنا کے بستر پر لیٹ کے ٹی وی آن کرلیا۔ ٹی وی کی آواز اتنی تیز تھی کہ بیلی نے کسمسا کے پھر رونا شروع کردیا اور اسماء جو اپنے آنسو پونچھتے ہوئے چائے بنانے باورچی خانے کی طرف جارہی تھی' دوبارہ اسے گود میں لے کے ٹہلانے لگی اور عاصم کا منہ پھر سے سوج کے کپا ہوگیا۔ خدا خدا کر کے بیلی سوئی تو اسماء چائے بنا کر عاصم کے پاس لے آئی لیکن اب عاصم صاحب بگڑ چکے تھے۔

"لے جاؤ چائے' یہ کوئی چائے پینے کا وقت ہے۔ اب میں کوئی چائے وائے نہیں پیوں گا' کھانا کھاؤں گا۔ کھانا لا کے دو تاکہ میں کھاؤں اور سوؤں۔ صبح پھر چھ بجے اٹھنا ہے اور سارا دن خوار ہونا ہے۔"

اسماء نے خاموشی سے چائے کا کپ دوبارہ باورچی خانے میں رکھا اور کھانا گرم کرنا شروع کردیا' اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی نے بجنا شروع کردیا۔ اسماء انتظار کرتی رہی کہ شاید عاصم اٹھ کر فون سن لے لیکن نہیں بھئی' وہ تو تھکے ہوئے آئے تھے' فون کیسے اٹھا لیتے اور بچے ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ ان کا ہاتھ ٹیلی فون کے اسٹینڈ تک جاتا ہی نہیں تھا۔ ناچار اسماء کو ہی کام ادھورا چھوڑ کر فون اٹھانا پڑا۔ حیدر آباد سے اس کی بڑی نند کا فون تھا جیسے ہی فون اٹھا کر اسماء نے کہا۔

"ہیلو آپا! السلام علیکم۔" ویسے ہی عاصم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا کہ اسے بات نہیں کرنی۔ مجبوراً اسماء کو جھوٹ بولنا پڑا۔

"وہ عاصم تو ذرا باہر گئے ہوئے ہیں' آئیں گے تو آپ کو خود ہی فون کرلیں گے۔" اس کے بعد "آپ کیسی ہیں؟ بچے خیریت سے ہیں؟ دولہا بھائی کا کیا حال ہے' انہیں سلام کہیے گا" جیسے جملے بول کر اور اپنی اور بچوں کی خیریت بتا کر اسماء نے فون بند کردیا۔ بمشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے لیکن عاصم کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔

"آس پڑوس کی رشتے داروں کی' جاننے والوں کی' ان کے سسرال والوں کی اور کوئی رہ گیا ہو تو اس کی بھی خیریت پوچھ لیتیں۔ پہلے چائے نہیں ملی اور اب کھانا مانگا تو پھر فون پر باتیں شروع ہوگئیں۔"

"اللہ سے ڈرو عاصم! ایک تو تمہاری بہن نے تم سے بات کرنے کو فون کیا پہلے تو مجھ سے جھوٹ بلوایا کہ گھر پر نہیں ہو' اب اگر میں بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تو بے چاری کا دل کتنا برا ہوا اور وہ تو مجھے ہی برا کہتیں کہ نند سے سیدھے منہ بات تک نہیں کی۔ اگر میں نے دو چار جملے خیر خیریت کے پوچھ لیے تو اس پہ بھی اتنا شور مچا رہے ہو۔" اسماء بھی بگڑ کر بولی۔

"ہاں ہاں' کرلوں گا میں انہیں خود ہی فون۔ ابھی میرا موڈ نہیں تھا ان کی ادھر ادھر کی باتیں سننے کا' جب وقت اور موڈ ہوگا تو خود ہی کرلوں گا۔"

"ہونہہ!" اسماء نے ہنکارا بھرا اور جا کر کھانا لے آئی۔ میز پر کھانا لگایا اور دونوں بچوں کو پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلانا شروع کردیا۔ عاصم نے بھی اپنی پلیٹ میں سالن نکالا اور پہلا نوالہ لیتے ہی چیخا۔

"اف۔۔۔ میرے خدا۔۔۔ اتنی مرچیں۔۔۔ ارے رات کے وقت سالن میں اتنی مرچیں جھونک دیں۔ تم تو مجھے معدے کا مریض بنا کر ہی چھوڑو گی۔" اسماء حیران رہ گئی۔

"مرچیں۔۔۔ عاصم کہاں ہیں مرچیں۔ ذرا ان بچوں کو دیکھیں کیسے خاموشی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ اگر مرچیں تیز ہوتیں تو یہ معصوم کھا سکتے تھے بھلا۔"

عاصم نے بچوں کو دیکھا جو واقعی ذوق و شوق کے ساتھ نوالے پہ نوالہ کھا رہے تھے لیکن وہ عاصم ہی کیا جو مان جائے' بولا۔

"ہاں بے چارے جب سے روٹی سالن کھانے کے

قابل ہوئے ہیں' ایسا ہی تیز مرچ مسالوں والا کھانا کھا رہے ہیں' آخر عادت کیوں نہ ہوگی۔"

"پھر تو اب تک آپ کو بھی عادت ہو جانی چاہیے' آخر شادی کو پانچ سال ہونے والے ہیں۔" اسماء اطمینان سے بولی تو عاصم بھنا گیا۔

"میں نے بچپن سے اپنی ماں کے ہاتھ کا پکا نہایت ذائقہ دار کھانا کھایا ہے' میری عادت اس مسالے والے ملغوبے کی کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔" عاصم بولتا جا رہا تھا اور بڑے بڑے نوالے کھاتا جا رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسری روٹی بھی ختم کرلی تو اسماء دل ہی دل میں جل گئی۔

"ہونہہ۔۔۔ مزے سے پیٹ بھر کے کھا رہے ہیں اور صرف مجھے جلانے کو کھانے کی برائیاں کر رہے ہیں۔" عاصم کھانا کھا کر آرام سے بیڈ روم میں جا کے لیٹ گیا اور لائٹ بند کرلی۔ اسماء نے کھانے کے برتن دھوئے' بچوں کو سلایا اور پھر خود بھی تھکن سے چور وجود کو لے کر بستر پر آ کے لیٹ گئی۔ عاصم کے دھیمے دھیمے خراٹے فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ وہ گہری نیند میں تھا جبکہ اسماء کے لیٹتے ہی ببلی اٹھ چکی تھی اور اسماء اسے دھیرے دھیرے ہلا کر ایسے سلا رہی تھی کہ عاصم کی نیند خراب نہ ہو جائے۔

ببلی کے سونے کے بعد اسماء نے لیٹ کر ایک مرتبہ پھر عاصم کی گہری نیند کو حسرت سے دیکھا اور سوچا۔ اے کاش۔۔۔ میں بھی ایک میاں ہوتی۔ شوہر ہونے کے کتنے فوائد ہیں۔ یہی سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ صبح اٹھی تو دنیا بدل چکی تھی۔ ارمان اور حسرتیں اس طرح بھی پوری ہو سکتی ہیں' اسماء نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ عاصم دھیرے دھیرے آوازیں دے کر اسماء کو اٹھا رہا تھا۔

"اسماء۔۔۔ اسماء۔۔۔ اٹھ جاؤ۔۔۔ بھئی جلدی کرو نا' ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ بس اب اٹھ بھی جاؤ' میں نے کپڑے استری کر دیے ہیں' جلدی سے تیار ہو جاؤ' آفس کو دیر ہو رہی ہے۔ اوہو۔۔۔ دیکھو ببلی رو رہی ہے' میں جب تک اسے چپ کرواتا ہوں' تب تک تم جلدی سے باہر آجاؤ۔"

"ہیں۔۔۔ یہ کیا' اسماء کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کا گلابی جوڑا نفاست سے استری شدہ ہینگر میں لٹکا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی ہلکے گلابی سینڈل بھی سلیقے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو انڈا پراٹھا اور گرما گرم چائے میز پر سجی تھی۔ اسماء کے منہ سے خوشی سے چیخیں نکلنے ہی والی تھیں کہ فوراً" اپنے اوپر قابو پالیا۔ سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے' اسی لیے چلا کر بولی۔

"ارے یہ گلابی سوٹ کیوں استری کر دیا' آج تو مجھے نیلا سوٹ پہننا ہے' فوراً" استری کر کے دو۔"

عاصم نے بوکھلا کر روتی بلکتی ببلی کے منہ میں فیڈر ٹھونسی اور جلدی سے الماری کی طرف بھاگا کہ نیلا جوڑا نکال کر استری کر دے' ابھی وہ الماری تک پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ چھوٹو روتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا اور دودھ دودھ چلانا شروع کر دیا۔ عاصم نے فیڈنگ مگ میں دودھ بھر کے اسے دیا اور پھرتی سے الماری سے نیلا سوٹ نکال کر استری اسٹینڈ کی طرف بھاگا لیکن اتنے میں اسماء نے ایک بار پھر اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر حلق اور نرخرے کا پورا پورا استعمال کرتے ہوئے آواز لگائی۔

"اوہو! یہ ہاف فرائی انڈا کیوں بنا دیا۔ آج میں ہاف فرائی نہیں کھاؤں گی' آملیٹ بنا کے دو۔ جلدی کرو' مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔"

بے چارہ عاصم استری کو چھوڑ کر پلٹ کے دوبارہ باورچی خانے کی طرف دوڑا اور جلدی جلدی آملیٹ بنا کے اسماء کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اسماء نے پوری آواز سے ٹی وی کھولا اور گنگناتے ہوئے ناشتہ شروع کر دیا۔ عاصم اچھی بیویوں کی طرح اسماء کا نیلا جوڑا پھرتی سے استری کرنے لگا۔ اسماء کو تھوڑی سی شرمندگی تو ہوئی لیکن اسے بھی آج سارے حساب

برابر کرنے تھے۔ ایک نوالہ لے کر چیخی۔

"ارے اتنا نمک ڈال دیا، تمہیں تو آج تک ایک انڈا بنانا بھی نہیں آیا۔ جلدی سے کپڑے استری کرو اور ٹیپو کو تیار کردو کہ اسے اسکول کی دیر ہو رہی ہے۔"

عاصم نے گھبرا کے زیادہ تیزی سے استری کرنا شروع کردی، جیسے تیسے استری ختم کرکے ٹیپو کو اٹھایا، بہلا بہلا کے اسے ناشتہ کروایا، ابھی اسکول کے لیے تیار کرنا شروع کیا ہی تھا کہ چھوٹو کو باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ ادھر ٹی وی کی تیز آواز سے بلی بھی اٹھ کر چیاؤں پیاؤں کرنے لگی۔

اب عاصم کی حالت دیکھنے والی تھی، وقت تھا کہ گزرا جارہا تھا اور کام کسی طرح ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ عاصم کو حواس باختہ دیکھ کر اسماء کی سمجھ میں آیا کہ "سچی" خوشی شاید اسی کو کہا جاتا ہے جو اس وقت اسے ہو رہی تھی۔ یہ خیال بھی آیا کہ ٹی وی کا ریموٹ چھوڑ کر اگر اس وقت بلی کو گود میں اٹھا کے ذرا بہلا لوں یا ٹیپو کو اسکول کے لیے تیار کردوں تو بے چارے عاصم کو ذرا سہولت ہوجائے گی لیکن دل نے فوراً "سمجھایا کہ نہیں، ایسا ہرگز نہ کرنا۔ نظام سقہ کی طرح اگر ایک دن کی حکومت مل ہی گئی ہے تو گن گن کے بدلے لو۔ یہ خیال آتے ہی اسماء نے اخبار پھیلا کے اپنے سامنے کیا اور آرام سے بیٹھ کر سارے دن کی پلاننگ شروع کردی۔ طرح طرح کے طریقے سوچنے کے بعد اسماء کو خیال آیا کہ عاصم کے ساتھ اس سے ہی سیکھا گیا رویہ روا رکھنا چاہیے۔ یعنی وہ سنجیدہ ہو تو اسماء مزاحیہ، وہ مزاحیہ ہو تو اسماء طنزیہ اور اگر بھولے سے بھی وہ کہیں طنزیہ ہوجائے تو پھر اس کی طرح حلق، نرخرے اور پھیپھڑوں کو استعمال کرتے ہوئے اسے سہانا ہوگا۔

یہ سب سوچنے کے بعد اسماء نے آفس کے لیے تیاری شروع کردی اور تیاری کے دوران پورے گھر کو ملیٹ کرکے رکھ دیا۔ تولیہ بستر پر پھینکا تو سلیپنگ سوٹ زمین پر، ڈریسنگ ٹیبل کی ایک ایک چیز بکھیری، سینڈل پہنتے وقت چپلیں اچھال اچھال کے اتاریں اور عاصم بلی کو گود میں لیے دنیا بھر کی بے چارگی چہرے پر سجائے آگے پیچھے پھرتا رہا۔ ٹیپو کی اسکول وین کے ہارن پر عاصم ہی ٹیپو کو وین میں سوار کرا کے آیا اور دوبارہ اسماء کے آگے پیچھے پھرنا شروع کردیا۔ چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسماء سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن ہمت نہیں ہو رہی۔ اسماء بھی سب سمجھ رہی تھی، اسی لیے اس نے چہرے کو رعب دار بنالیا تاکہ وہ چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی کچھ بول نہ سکے۔ بے چارے کی مونچھیں بار بار تھرتھرا کے رہ جاتی تھیں۔ آخر کار جب اسماء گھر سے نکلنے لگی تو عاصم نے ہمت کرکے دل کی بات کہنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ بیٹھی ہوئی آواز میں بڑی مشکل سے بولا۔

"اسماء۔ وہ۔ وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر تم اجازت دو تو آج میں ٹیپو کے اسکول سے آنے کے بعد اپنے اَبّا کے گھر چلا جاؤں۔ تمہارے آفس سے آنے کے وقت سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ دراصل ابا بڑے دن سے یاد کر رہے تھے نا، اس لیے میں نے سوچا کہ آج مل کے آجاؤں۔"

"آہا" اسماء کی تو دل کی کلی کھل گئی۔ ڈانٹ پلانے کا اس سے بہترین موقع پھر کہاں مل سکتا تھا۔ سو ڈپٹ کر بولی۔

"خبردار کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے سب پتہ ہے کہ تم کتنی جلدی آجاؤ گے اور آج تو ویسے بھی میرے ابا ایک ہفتے کے لیے رہنے آرہے ہیں، کہیں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

عاصم کی سٹی گم ہوگئی "کیا۔؟ تمہارے ابا رہنے آرہے ہیں، وہ بھی ایک ہفتے کے لیے۔"

"کیوں، میرے ابا کے آنے کا سن کر تمہارے چہرے پہ بارہ کیوں بجنے لگے۔ سب سمجھ رہی ہوں میں، تمہارے آرام میں خلل جو پڑے گا، اسی لیے تم کیوں چاہو گے کہ میرے ابا یہاں آکے رہیں۔ میں کہتی ہوں کہ آخر یہ سسر اور داماد کی رسہ کشی کب تک چلے گی۔ گھر میں سکون سے رہو، ابا کے لیے دو چار اچھی اچھی ڈشیں بنالینا، دوپہر تک وہ پہنچ جائیں گے اور ہاں، میرا وہ ملد سوٹ کلف لگا کے استری کرکے تیار رکھنا، رات کو مجھے اپنی سہیلیوں کے ساتھ دعوت میں بھی جانا ہے۔"

اسماء نے عاصم کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر مسکرا کر دوبارہ بولی۔

"آخر تم سارا دن کرتے کیا ہو، سارا دن سوتے رہتے ہو یا فون پر دوستوں سے لمبی لمبی گپیں لگاتے ہو۔ کام کہو کام، گھر میں پڑے پڑے موٹے ہوتے جارہے ہو۔"

اسماء کی بات کے اختتام پر عاصم کی موٹی موٹی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے لبالب بھر چکی تھیں لیکن پھر بھی جب اسماء گھر سے نکلنے لگی تو اسے پکار بیٹھا۔

"وہ۔ وہ اسماء۔ ذرا ایک منٹ بات سننا پلیز۔"

اسماء دوبارہ چیخی۔ "اوفوہ۔ کتنی بار کہا ہے کہ جب میں گھر سے نکلنے لگوں تو پیچھے سے آواز مت دیا کرو، بتاؤ کیا کام ہے؟"

"وہ گھر کا سودا سلف ختم ہوگیا ہے۔ میں نے لسٹ بنا کر رکھی تھی، واپسی میں یہ لیتی آنا اور آج ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا کیونکہ چھوٹو کی طبیعت کافی دن سے خراب ہے، آج اسے ڈاکٹر کو بھی دکھانا ہے۔"

عاصم نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ اسماء جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ عاصم کو کچھ اور یاد آگیا۔

"اور ہاں دوسرے کمرے کے باتھ روم کا نل کب سے ٹوٹا ہوا ہے۔ آج تمہارے ابا آرہے ہیں تو مشکل ہوجائے گی۔ نل ٹھیک کرنے کے لیے پلمبر کو بھی ساتھ لے کر آنا۔"

عاصم نے ڈرتے ڈرتے کہا تو اسماء غصے سے چیخ اٹھی۔ "بس یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے۔ توبہ گھر سے قدم نکالنا مشکل کردیا۔ کام ہیں کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہو رہے۔"

"اچھا اچھا اب کچھ نہیں بولوں گا، خدا حافظ۔"

عاصم نے بھرائی ہوئی آواز میں جلدی سے اسماء کو خدا حافظ کہا تو اسماء دوپٹہ سنبھالتی گھر سے باہر نکل آئی۔ سوچ کر تو یہ نکلی تھی کہ شاید باہر ہر طرف عورتیں ہی عورتیں نظر آئیں گی اور جس طرح اس کی زندگی بدلی دوسرے خواتین و حضرات کی ذمہ داریاں بھی ایک دوسرے سے تبدیل ہوگئی ہوں گی لیکن باہر جاکر پتہ چلا کہ تبدیلی صرف اس کی ہی زندگی میں آئی ہے، یعنی نظام سقہ کی طرح ایک دن کی بادشاہت صرف اسی کو نصیب ہوئی ہے۔

باہر زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ مرد اپنے دفاتر جارہے تھے اور خواتین دروازوں پہ کھڑی انہیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ اسماء نے گردوپیش پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے دفتر کی طرف روانہ ہوگئی۔ مزے کی بات یہ کہ اسماء کے قدم اور ذہن آٹومیٹک مشین کی طرح خود بخود کام کر رہے تھے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ روز اسی طرح بس میں بیٹھ کر دفتر جاتی ہو۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی پتہ تھا دفتر میں اسے کون کون سے امور سرانجام دینے ہیں۔ ٹھیک کہا ہے سیانوں نے کہ خدا چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔

اسماء بھی دو دو بسیں بدل کر دفتر پہنچی تو ٹیبل پر فائلوں کا انبار اس کا منتظر تھا۔ کام نمٹاتے نمٹاتے کب لنچ ٹائم گزرا اسے کچھ پتہ نہیں چلا۔ اس پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کھڑوس باس کی طرف سے طلبی اور کام صحیح طور پر نہ کرنے کی وجہ سے کھنچائی الگ ہوتی رہی۔ آفس ٹائم کے بعد بھی ایک گھنٹہ رک کے کام ختم کیا، تب جاکر گھر جانے کی اجازت ملی۔ درمیان میں بڑی مشکل سے صرف ایک کپ بدمزہ چائے اور چار بسکٹ حلق سے اترے تھے، شام کو دکھتے ہوئے بدن اور سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ دوبارہ گھر کی راہ لی۔ بسوں کے رش اور جگہ جگہ ٹریفک جام نے مزید حشر بگاڑ دیا۔ بس سے اتر کر عاصم کی دی ہوئی لسٹ کے مطابق گھر کا سودا سلف خریدا، قریبی مارکیٹ سے بھی

پندرہ منٹ کی مسافت پر گھر تھا۔ ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ خیال آیا، گھر میں باتھ روم کا نل بھی خراب ہے۔ دوبارہ مارکیٹ کی طرف گئی تاکہ پلمبر کو ساتھ لے جاسکے۔ پلمبر نے پہلے تو نل ٹھیک کرنے کے پیسے بہت زیادہ بتائے۔ بڑی مشکل سے پیسوں کا مسئلہ حل ہوا تو نخرے دکھاتا ہوا بولا۔

"آج تو ٹائم نہیں ہے، ایڈریس چھوڑ جائیں، کل آکر نل ٹھیک کردوں گا۔"

اب اسماء کی بالکل ہمت نہیں تھی کہ کسی اور پلمبر کو ڈھونڈ کر نئے سرے سے بات کرتی۔ مجبوراً اسے ہی اپنا ایڈریس کاغذ پر لکھ کر دیا اور سامان کے بڑے بڑے تھیلے اٹھائے گھر کو روانہ ہوگئی۔ گھر پہنچ کر ایک دفعہ بیل بجانے کے بعد کچھ سیکنڈ انتظار کرنا دوبھر ہوگیا، اس لیے بٹن پر انگلی رکھ کے ہٹانا بھول گئی۔ یہی خیال آیا کہ موصوف آرام سے گھر میں بیٹھے سوچ رہے ہوں گے کہ دروازہ کھولنے کی ایسی جلدی بھی کیا ہے، عیش کرکے آرہی ہے۔ یہاں حالت یہ ہے کہ ہڈی ہڈی دکھ رہی ہے۔ ابھی چھوٹو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔

دروازہ کھلا تو عاصم ملگجے کپڑوں، بکھرے ہوئے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ بوکھلایا ہوا کھڑا تھا۔ بیلی اس کی گود میں چیخیں مار مار کے رو رہی تھی۔ چھوٹو بخار میں پھنک رہا تھا اور ٹیپو سارے کھلونے کمرے میں بکھیرے بیڈ پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔

اسماء نے خلاف معمول خاموشی سے یہ سب دیکھا اور لاؤنج کے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ عاصم نے سودے کے تھیلے اس کے ہاتھ سے لیے اور باورچی خانے میں چلا گیا۔ اسماء کی نظر سامنے پڑی تو دیکھا اس کے خوش خوراک ابا جان تشریف لاچکے تھے اور اس وقت ٹانگ پہ ٹانگ رکھے مرغی کے چوزے کی یخنی نوش جاں فرما رہے تھے۔ اسماء نے اٹھ کر انہیں سلام کیا، خیریت پوچھی تو بولے۔

"بس کچھ مت پوچھو، طبیعت سخت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے کمزوری بتائی ہے، خوراک کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی ہے، اسی لیے تازہ پھلوں کے جوس کے بعد اب چوزے کی یخنی پی رہا ہوں۔"

"ہاں ہاں ابا جان! بالکل ٹھیک کررہے ہیں۔ آپ ہارٹ، شوگر اور بلڈ پریشر کے پرانے مریض ہیں۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی ہدایات پر ضرور عمل کریں۔ کھانے کے بارے میں تو آپ نے عاصم کو بتادیا ہے ناکہ کیا کھائیں گے؟ ظاہر ہے کھانا بھی ڈاکٹر نے پرہیزی ہی بتایا ہوگا۔ یہ عاصم تو کم عقل ہے، کہیں آپ کے لیے مرغن کھانا نہ پکالے۔"

اسماء کی فکرمندی کے جواب میں ابا جان سڑپ سڑپ یخنی پیتے ہوئے بے نیازی سے بولے۔

"بھئی اب میں اتنے دن بعد آیا ہوں تو میرا داماد مجھے پھیکے سیٹھے بدمزہ کھانے تو کھلائے گا نہیں۔ ظاہر ہے اس کا بھی دل چاہے گا کہ اپنے سسر کو اپنے ہاتھ کے مزے مزے کے کھانے کھلائے۔ اب تم جانتی ہو ہم تو بڑے ہیں، ہم سب کا دل رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جو کہتا ہے، وہ بھی کرتے ہیں اور اپنا دل جو کہتا ہے وہ بھی کرتے ہیں۔ جوس اور یخنی اپنی جگہ، قورمہ بریانی اپنی جگہ، اور ضروری تو نہیں کہ ڈاکٹر کی سب باتیں ہی مانی جائیں۔"

ابا جان کی بات سن کر اسماء دل ہی دل میں جلتی بھنتی اپنے کمرے میں پہنچی تو عاصم بھی پیچھے پیچھے آگیا۔

"وہ میں نے تم سے کہا تھا کہ پلمبر کو لیتی ہوئی آنا، بھول گئیں نا۔ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ بھول جاؤ گی، سودے میں بھی اتنی چیزیں کم ہیں۔ حالانکہ میں نے لسٹ میں سب کچھ لکھ کے دیا تھا اور کہا بھی تھا کہ جلدی آنا، چھوٹو کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے لیکن تمہیں تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔"

اسماء کا ضبط جواب دے گیا۔

"خاموش ہوجاؤ، خدا کے لیے خاموش ہوجاؤ۔ دن بھر کی تھکن کے بعد اب گھر میں گھسی ہوں تو تمہاری لن ترانیاں شروع ہوگئیں۔ پلمبر سے کہہ دیا ہے وہ کل آکے نل ٹھیک کردے گا۔ لسٹ میں لکھا دوسرا سامان بھی کل دکان والا گھر پہنچادے گا اور آفس میرے باپ

کا نہیں ہے کہ جب دل چاہے اٹھ کے آجاؤں' خود بھی ذرا گھر سے نکلنا سیکھو۔ چھوٹو کو لے جا کر ڈاکٹر کو تو دکھا سکتے ہو۔ یہیں دو قدم پر ڈاکٹر کا کلینک ہے' ہر کام کے لیے مجھے ہی کیوں دیکھتے ہو۔"

اسماء کے جواب میں عاصم بھی بھڑک اٹھا۔ "تو میں کون سا فارغ بیٹھا تھا' صبح سے بچوں نے چین نہیں لینے دیا پھر دوپہر کو مرے پہ سو دُرّے۔ تمہارے ابا جان آگئے' جب سے اپنے طعنے تشنوں سے میرے کلیجے پر آرے نشتر سب چلا رہے ہیں اور مستقل کھا پی رہے ہیں۔"

عاصم کی بات سن کر اسماء نے نظریں چرا لیں۔ اس کا خود تھکن اور بھوک سے برا حال تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ گھر میں گھستے ہی ٹانگیں پھیلا کے بستر پر پڑ جائے لیکن گھر کے دسیوں کام اس کے منتظر تھے۔ خصوصاً" چھوٹو کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اسماء نے کہا۔

"اچھا پہلے ذرا مجھے ایک کپ چائے بنا دو پھر ڈاکٹر کے ہاں چلو۔"

عاصم گڑبڑا گیا۔ "چائے بنانے اور پینے میں تو دیر لگ جائے گی' اتنے میں ڈاکٹر کا ٹائم تو ختم ہو جائے گا۔ پہلے ہی وہاں مریضوں کی لائن لگ گئی ہوگی۔ ہمارا نمبر تو بہت دیر میں آئے گا' بس جلدی سے نکل چلو۔"

اسماء نے بچی کھچی ہمت کو جمع کیا اور ٹیٹو کو ابا جان کے حوالے کرکے دونوں بچوں کو لے کر عاصم کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں آگئی۔ اف ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر تو لگتا تھا آدھا شہر ہی بیمار ہے' انہیں پچیسواں نمبر دیا گیا جبکہ ابھی بارھواں نمبر چل رہا تھا۔ اسماء اور عاصم بچوں کو لے کر خاموشی سے اپنی باری کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب غرور سے تنی گردن لیے اپنے بچے کی انگلی تھامے تشریف لائے اور سیدھے ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھے۔ اسسٹنٹ پیچھے بھاگا۔

"ارے صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں' پہلے نمبر لیں پھر اپنی باری کا انتظار کریں۔"

لیکن ان صاحب نے کہا۔ "میرے بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہے اور نمبر لے کر اپنی باری کا انتظار کرنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

اسسٹنٹ بولا۔ "بالکل درست فرمایا آپ نے یہ چائلڈ اسپیشلسٹ کا کلینک ہے تو یہاں سب ہی اپنے بچوں کو دکھانے آئے ہیں' آپ بھی ذرا صبر سے بیٹھیں' آپ کی باری بھی آجائے گی اور ویسے بھی آپ کے بچے کی طبیعت اتنی خراب نہیں لگ رہی کہ ایمرجنسی میں دکھانے کی ضرورت ہو۔ مہربانی کرکے بیٹھ جائیں۔"

لیکن وہ صاحب نہ مانے' اسسٹنٹ سے فرمائش کی کہ ڈاکٹر صاحب سے بات کروائی جائے۔ کہنے کا انداز اتنا رعب دار تھا کہ اسسٹنٹ نے فوراً" انٹرکام پر ڈاکٹر صاحب سے بات کروا دی۔ ان صاحب نے ڈاکٹر کو اپنا لمبا چوڑا نام اور اس سے بھی لمبا چوڑا عہدہ کچھ اس طرح بتایا کہ ڈاکٹر صاحب استقبال کو خود ہی دروازے پر آگئے' بس غضب ہو گیا۔ اسماء کے تو سر پر لگی اور تلووں پر بجھی۔ پنجابی فلموں کے ولن کی طرح "ٹوئے یہ نہیں ہو سکتا" کہتی آگے بڑھی۔ عاصم نے لاکھ ہاتھ پکڑ کے بٹھانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تو نیند' بھوک اور تھکن کی وجہ سے اس کا ویسے بھی زمین سے الجھنے اور آسمان سے جھگڑنے کا دل چاہ رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بھی بے نقط سنائیں اور مغرور صاحب کے ہوش بھی ٹھکانے لگائے۔ اسماء کو بولتے دیکھ کر آس پاس بیٹھے دوسرے لوگوں کی بھی ہمت ہوئی اور سب نے اسماء کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ آخر کار ڈاکٹر صاحب نے ہار مان کر اسماء سے کہا۔

"اچھا پہلے ان صاحب کے بچے کا معائنہ کر لینے دیں پھر اس کے بعد سب سے پہلے آپ کے بچے کو دیکھوں گا۔"

لیکن اسماء نہ مانی' اس کا کہنا تھا کہ "اصول اصول ہے' سب کو اپنی اپنی باری پر آنا چاہیے۔" اتنی طویل بحث و تکرار سے گھبرا کر مغرور صاحب ہی اپنے بچے کو لے کر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئے تو سب نے سکون کی سانس لی اور دوبارہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر باری کا انتظار شروع کر دیا۔ اسماء کو اپنے غصے پر حیرت اور ہمت پر فخر سا محسوس ہوا لیکن وہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھی کہ اس وقت اس نے جس ہمت و جرأت سے ان بڑے نام و اعلا کام والے حضرت کو بھگایا ہے' اس کی وجہ یقینی طور پر اس کے سارے دن کی تھکن تھی' جس نے اس کے مزاج کو چڑچڑا بنایا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ اس وقت ایک زیادتی اور بے اصولی ہوتے دیکھ کر اس کے اندر جمع غبار مثبت انداز میں باہر نکل گیا لیکن آج اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ اگر مرد جیسے مضبوط اعصاب کے مالک کہیں قطاروں میں کھڑے جھگڑتے نظر آتے ہیں تو کہیں بسوں میں ذرا ذرا سی بات پر گالم گلوچ کو تیار ہو جاتے ہیں۔ کبھی دکانداروں سے بلاوجہ کی بحث و تکرار میں مصروف ملتے ہیں اور کبھی کسی کے بے ضرر سے مذاق پر مرنے مارنے کو تل جاتے ہیں تو اس کی وجہ بھی آج کل کے مشینی اور تیز رفتار دور میں روزگار کی فکر اور مسابقت کی دوڑ ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی' اخراجات کی زیادتی اور وسائل کی کمی سے اچھا بھلا انسان چڑچڑا اور ذہنی تناؤ کا شکار ہو کر اسی طرح کی حرکتیں کرتا نظر آتا ہے۔

یہی سب سوچتے سوچتے اسسٹنٹ نے پچیسواں نمبر پکار لیا اور اسماء اور عاصم بچوں کو لے کر ڈاکٹر کے کمرے میں چلے گئے۔

✡ ✡ ✡

گھر پہنچنے کے بعد اسماء نے پھر محسوس کیا کہ عاصم مسکین سی شکل بنائے اس کے آگے پیچھے گھوم رہا ہے۔ لگتا تھا کہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن اس وقت بھی بے چارے کی مونچھیں تھرتھرا کے ہی رہ جاتیں۔ اسماء کو اس بار اس پر ترس آگیا۔

"ہاں عاصم! بولو کیا کہنا چاہ رہے ہو؟"

"وہ اسماء! تم نے کہا تھا نا کہ تمہارا سفید سوٹ کلف لگا کے استری کرکے تیار رکھوں تو وہ میں بھول گیا۔ سارا دن اتنی مصروفیت رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ تم اس وقت کوئی دوسرا سوٹ پہن لو بلکہ مجھے اپنے کپڑے نکال کے دو میں ابھی استری کر دوں گا۔"

عاصم نے ہمت کرکے کہہ ہی دیا۔ اسماء نے سوچا' اس وقت کون کم بخت دعوت میں جا رہا ہے۔ سارا دن کی تھکن اور اب ڈاکٹر کو دکھانے کے چکر میں رات کے دس بج چکے تھے لیکن عاصم کو اس کی لاپروائی پر دو چار باتیں سنانا بھی ضروری تھا۔

"ماشاء اللہ! ایک کام کہہ کر گئی تھی' تم سے وہ بھی نہیں ہوا۔ رہنے دو' اب میں کسی دعوت میں نہیں جا رہی۔ صبح سے موڈ بنا لیا تھا کہ سفید سوٹ ہی پہن کر جاؤں گی' کوئی دوسرا سوٹ پہننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس سے تو بہتر ہے منہ سر لپیٹ کر گھر میں ہی پڑی رہوں۔"

اسماء نے منہ سر لپیٹ کر پڑے رہنے کے خوش کن تصور کا سوچا اور چاہا کہ اس پر فوراً" عمل بھی کرے لیکن پیٹ میں دوڑتے چوہوں نے اس تصور پر عمل کرنے سے باز رکھا' لہٰذا ایک مرتبہ پھر زور سے چیخی۔

"اب گھر میں کچھ کھانے کو بھی ہے یا نہیں؟"

"ہاں ہاں' سب کچھ پکا ہوا ہے۔ کباب' پلاؤ' مرغی کا قورمہ اور کھیر۔ بس ابھی لے کر آتا ہوں۔" عاصم تیزی سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔

"ہو ہو! آج اتنی چیزیں کیسے پکا لیں؟ اچھا میں سمجھ گئی۔ ابا جان کے ڈر کی وجہ سے یہ سارا اہتمام ہوا ہوگا۔ چلو اسی بہانے ہمیں بھی گھر میں کچھ اچھا کھانا نصیب ہوگا۔"

اسماء نے طنزیہ انداز میں کہا اور ہاتھ دھو کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئی' جہاں والد صاحب پہلے سے کیل کانٹوں سے لیس تیار بیٹھے تھے۔ ہر نوالے پر دونوں باپ بیٹی نے ڈھیروں نقص نکالتے ہوئے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پیٹ کی آگ بجھی تو بستر یاد آنے لگا۔ کھانے کی میز

سے اٹھ کر اسماء سیدھی اپنے بیڈ روم میں جا کر بستر پر لیٹ گئی لیکن بستر پر لیٹنے کے بعد یہ سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کل بجلی' گیس اور ٹیلی فون کے بل جمع کروانے کے ساتھ ساتھ ٹیپو کے اسکول کی فیس بھی جمع کروانی ہے اور پیسے ہیں کہ تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ اس دفعہ تو مہینہ پورا کرنا مشکل ہو جائے گا۔

صبح چھ بجے اٹھ کر پھر وہ دوبسیں بدل کر آفس جانے اور ایک مشقت بھرا دن گزارنے کے خیال سے نیند آتے آتے آدھے راستے سے ہی پلٹ گئی۔ بڑی مشکلوں سے سینکڑوں کروٹیں بدلنے اور ڈیڑھ دو ہزار بھیڑیں گننے کے بعد نیند آئی ہی تھی کہ عاصم کی زوردار چیخ سے آنکھ کھل گئی۔ سانس بحال' اور ہوش ٹھکانے آئے تو دیکھا کہ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور عاصم آنکھیں پھاڑے بستر پر بیٹھا تھا۔ اسماء کو اٹھتے دیکھ کر بولا۔

"ارے ارے کہاں چلیں' ایک منٹ ٹھہرو آج میں اپنے کپڑے خود استری کرلوں گا اور ناشتہ بنانے میں تمہاری مدد بھی کروں گا اور ہاں ببلی کی فکر مت کرنا' ببلی اگر اٹھ گئی تو میں اسے بھی سنبھال لوں گا ورنہ یہ تمہیں کام نہیں کرنے دے گی۔"

پہلے تو اسماء کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو خیال آیا کہ شاید ایک دن گزر چکا ہے اور نظام سقہ کی حکومت ختم ہو چکی ہے لیکن یہ عاصم کو کیا ہوا؟ عاصم کے مزاج میں یہ تبدیلی کیسے آگئی؟ اسماء حیران ہو کر بولی۔

"عاصم! کہیں ہم دونوں خواب تو نہیں دیکھ رہے تھے؟ ایک جیسا خواب؟"

عاصم بھی حیران رہ گیا۔ اسماء پھر پریشان ہوئی۔

"لیکن عاصم! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں کو ایک ہی وقت میں ایک جیسا خواب نظر آئے۔"

"ارے میری پیاری بیوی! کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ اللہ میاں نے ہماری روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آکر از خود نوٹس لے ہی لیا ہے ورنہ تو ہماری یہ روز روز کی لڑائیاں خدا جانے کیا غضب ڈھاتیں۔"

عاصم نے اسماء کی حیران و پریشان شکل دیکھ کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اسماء سب کچھ سمجھ گئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو عاصم! اب میں بھی کبھی یہ خواہش نہیں کروں گی کہ کاش میں ایک میاں ہوتی بلکہ بلاناغہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کروں گی کہ 'میں ایک بیوی ہوں اور جیسے ہی تم گھر واپس آکر بیل بجایا کرو گے' جھٹ پٹ دروازہ کھول دوں گی اور تھکن کے باوجود مسکراتے چہرے کے ساتھ تمہارا استقبال کروں گی۔"

"ارے واہ بیگم صاحبہ! شکر ہے اللہ میاں کے از خود نوٹس لینے سے تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آئی۔"

عاصم شرارت سے بولا تو اسماء پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"میری سمجھ میں تو بہت کچھ آگیا لیکن اس از خود نوٹس سے میرے میاں کیا سیکھے اور سمجھے' یہ تم نے اب تک نہیں بتایا؟"

"ارے جناب! میں بھی سمجھ گیا ہوں کہ میں ہر وقت میاں ہونے کا رعب نہیں جماؤں گا۔ آفس جاتے وقت چیزیں نہیں پھیلاؤں گا' وقت ضرورت بچوں کو سنبھالنے میں اپنی ہتک محسوس نہیں کروں گا۔"

عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسماء بولی۔ "سب سے بڑی بات تو تم نے کہی ہی نہیں۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ وعدہ کرو کہ بات بات پر مجھے آرام طلبی کے طعنے نہیں دو گے اور ہاں 'اپنا وہ حلق' نرخرے اور پھیپھڑوں کے آزادانہ استعمال والا فارمولا بھی بھول جاؤ گے۔"

"ارے میرے آفس کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔" بات کرتے کرتے عاصم کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ چلا اٹھا اور اسماء ببلی کے رونے کی آواز سن کر بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

☆

کوئی جگنو شبِ تاریک سے مانگا جائے
تاکہ سورج کی عنایات کو پرکھا جائے

ایسا مرہم کوئی ایجاد کریں اہلِ ہنر
جس کو اس دور کے زخموں پہ لگایا جائے

یوں تو ہوتی ہے محبت ہی محبت کا جواب
پھر بھی کب میں نے کہا ہے، مجھے چاہا جائے

امن اور چین سے دو وقت کی روٹی مانگو
اور اس دور میں کیا ہے، جسے مانگا جائے

میں محبت، مرا پیغام وفا، حسنِ سلوک
اک صحیفہ مری خاطر بھی اتارا جائے

یا بدلتے ہوئے حالات، میں یا فکرِ معاش
اور اس دور میں کیا ہے جسے سوچا جائے

رات دن دونوں برابر کی ضرورت ہیں اثر
کس کو کیا جانیے کس وقت پکارا جائے

رشید اثر

اب بھی وہ ہمیں ملا کہاں ہے
دیوارِ وصال درمیاں ہے

یہ شہر بلندیوں سے دیکھو
دریائے رواروی رواں ہے

دل بات کرے تو لب نہ بولیں
یہ کیسا عذابِ جسم و جاں ہے

اک عمر تری تلاش کے بعد
میں ہوں، مری عمرِ رائیگاں ہے

ہر سو تجھے ڈھونڈتی ہیں آنکھیں
تو ہے تو کہیں، مگر کہاں ہے

دل سے تری یاد اتر رہی ہے
سیلاب کے بعد کا سماں ہے

مسعود عثمانی

امیدِ فردا،

چلو اک نظم لکھتے ہیں
مسلسل بارشوں کے موسموں میں
دھوپ نکلے تو
کتنے رنگ چمکیں گے
ہوا کے تیز جھونکوں سے
بدن کی شاخ جھولے تو
فضا میں پھول مہکیں گے
وفا کی چاند راتوں میں
محبت خواب دیکھے تو
بدن سے ساز پھوٹیں گے
گلوں کے ہونٹ پہ
تتلی اگر پر رکھ دے تو
صدا آئے
محبت خواب ہے اور خواب کی آنکھیں
شفق کے رنگ ہیں
کرنوں سے پھوٹی ہیں
بھلا دیں درد کے لمحے
جو صدیوں سے مسلط ہیں
مسلسل بارشوں سے گھر کی جو دیوار ٹوٹی ہے
ہوا کے تیز جھونکے کاٹتے ہیں
کس طرح سانسیں
فضا میں خوف طاری ہے
مگر آنکھیں سنہری خواب بنتی ہیں
کہ امید باقی ہے
نئے سورج کے اگنے کی

عینی رضا سید

سنگ کو تکیہ بنا، خاک کو چادر کرکے
جس جگہ نکلتا ہوں، پڑ رہتا ہوں بستر کرکے

اب کسی آنکھ کا جادو نہیں چلتا مجھ پر
وہ نظر بھول گئی ہے مجھے پتھر کرکے

مہرباں اس کو نہ پایا تو پلٹ آئے ہم
ہاتھ کے ہاتھ حساب اپنا برابر کرکے

مجھ کو بھی پڑ گیا ایک اور ضروری کام
وہ بھی گھر پر نہ رہا وقت مقرر کرکے

پوچھنا چاہتا ہوں میں یہ ان آنکھوں سے جمال
کس کو آباد کیا ہے، مجھے بے گھر کرکے

جمال احسانی

سائرہ غلام نبی

ہنسیں مسکرائیں

درخواست

ایک ہالی ووڈ اسٹار کی شادی تھی۔ اس کی گاڑی خراب ہوگئی تو اس نے اپنی ہونے والی بیوی کو فون کیا۔
"جیکی! میری گاڑی خراب ہوگئی ہے۔ دیکھو' جب تک میں نہ آجاؤں' تب تک کسی سے شادی نہ کرنا۔"

شمع مسکان جام پور

جھگڑے کی وجہ

اپنے نئے پڑوسی کے گھر سے روزانہ لڑائی جھگڑے کی آوازیں سن سن کر ایک صاحب تنگ آگئے اور پڑوسی کے دروازے پر پہنچے۔ ایک چھوٹا بچہ باہر نکلا' انہوں نے بچے سے کہا۔
"میں تمہارے لڑائی جھگڑے سے تنگ آچکا ہوں' میں تمہارے ابو سے ملنا چاہتا ہوں' ان کا نام کیا ہے؟"
"اسی بات پر تو روزانہ ہمارے گھر جھگڑا ہوتا ہے۔" بچے نے کہا۔

زوباریہ خالد..... لاہور

حاضر دماغی

دو وکیل ایک ہوٹل میں گئے اور دو بوتلوں کا آرڈر دیا اور اپنے بریف کیسوں سے سینڈوچ نکال کر کھانے لگے۔ ہوٹل کا مالک ان کے پاس آیا اور کہا۔
"آپ یہاں اپنا سینڈوچ نہیں کھا سکتے۔" وکیلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' کاندھے اچکائے اور اپنے سینڈوچ تبدیل کرلیے۔

اقتباس۔ ردا بٹ

مظلوم

نوبیاہتا بیوی جو ایک ابھرتی ہوئی فلم اسٹار تھی فلم پروڈیوسر کو دیکھتے ہی بلک بلک کر رونے لگی۔
"ارے ارے روتی کیوں ہو؟ بات کیا ہے؟" فلم پروڈیوسر نے پوچھا۔
"مجھے دھوکا دیا گیا ہے۔ مجھے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔ شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ جس اسکرپٹ رائٹر سے میں نے شادی کی ہے وہ پہلے بھی شادی کرچکا ہے اور اس کے پانچ بچے ہیں۔" فلم ایکٹریس نے روتے ہوئے کہا۔
فلم پروڈیوسر نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔
"حقیقت میں تم پر بڑا ظلم ہوا ہے۔"
فلم ایکٹریس نے مزید جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔
"صرف مجھ پر ہی نہیں' میرے چھ بچوں پر بھی ظلم ہوا ہے۔"

سب ایسا ہی کہتے ہیں!

صاحب نے دفتر میں ایک نیا چپڑاسی رکھا۔ وہ دفتر کا کام تو اچھا کرتا تھا مگر صاحب اس سے بہت تنگ تھے' کیونکہ وہ ہر شخص کو صاحب سے ملنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ جس سے صاحب کے کام کا حرج ہوتا۔ ایک دن اسی بات پر ناراض ہوکر صاحب نے چپڑاسی سے کہا۔
"تم بالکل بے کار آدمی ہو۔ تمہارا مجھے کیا فائدہ؟"
"میں کیا کروں حضور؟ اگر میں کہوں صاحب اندر نہیں ہیں تو کوئی میرا اعتبار نہیں کرتا۔ سب کہتے ہیں بڑا ضروری کام ہے اور صاحب نے ہی بلایا ہے۔"
صاحب نے سختی سے کہا۔
"آئندہ یاد رکھو! کوئی کچھ بھی کہے' تم پروا مت کرو۔ کہہ دیا کرو' سب ایسا ہی کہتے ہیں۔"
"بہت اچھا حضور!"
چپڑاسی' صاحب کی تازہ ہدایات لیے کمرے کے باہر آکر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو ایک موٹی سی عورت آئی اور باہر بیٹھے ہوئے چپڑاسی کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے بڑے رعب سے کمرے میں داخل ہونے لگی۔ چپڑاسی نے اسے روکا اور کہا۔
"آپ اندر نہیں جاسکتیں۔ یہ صاحب کا آرڈر ہے میم صاحب!"
"لیکن میں تو صاحب کی بیوی ہوں۔"
"ہاں' ہاں!" چپڑاسی بڑی بے پروائی سے بولا۔ "سب ایسا ہی کہتے ہیں۔"

انیلا۔ کراچی

اختتام

دو بچے آپس میں ریڈیو ریڈیو کھیل رہے تھے اور بحث اس بات پر ہو رہی تھی کہ اناؤنسر کون بنے گا اور پروگرام کون سنائے گا۔ بالآخر ٹاس پر فیصلہ ہوا۔ ہارے ہوئے بچے کو اناؤنسر بننا تھا چنانچہ اس نے مندرجہ ذیل اناؤنسمنٹ کی۔
"سامعین! رات کے بارہ بجے ہیں۔ اب ہماری نشریات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ خدا حافظ۔"

حسن انتخاب

رمضان نے شادی کے لیے ایک دولت مند لڑکی تلاش کی اور ایک نظر اپنی والدہ کو دکھانے کے لیے کھانے پر مدعو کیا۔ اس کی والدہ نے لڑکی کو دیکھا تو دم بخود رہ گئیں۔ وہ رمضان کو ایک طرف لے گئیں اور ناگواری سے سرگوشی میں بولیں۔
"پوری دنیا میں تمہیں یہی لڑکی ملی تھی شادی کے لیے؟ اس کے تو چہرے پر بال ہیں۔ آنکھوں سے بھینگی ہے۔ دانت ٹیڑھے میڑھے ہیں اور ذرا رنگت تو دیکھو! الٹے توے جیسی۔" رمضان نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"آپ کو سرگوشیوں میں بات کرنے کی ضرورت نہیں آرام سے اونچی آواز میں بات کریں۔ وہ بہری بھی ہے۔"

لبنیٰ۔ کراچی

بے بسی

بھول آیا ہو جو گھر پر کارتوس
دیکھنا پھر اس کا حلیہ چاہیے
منحصر ہو نقل پر جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

صحیح طریقہ

کھیت میں ہل چلاتے ہوئے کسان بار بار چلا رہا تھا۔
"شاباش پپو' شاباش گڈو' شاباش ساون۔"
ادھر سے گزرتے ہوئے اس کے ایک کسان ساتھی نے پوچھا۔
"تم نے اپنے بیل کے تین نام کیوں رکھ دیے ہیں؟"
"نہیں' اس کا نام پپو ہے۔ دراصل پپو اپنی طاقت سے بے خبر ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اکیلا ہل نہیں چلا سکتا۔ چنانچہ دوسرے دو فرضی ناموں سے میں اس پر ظاہر کرتا رہتا ہوں کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ گڈو اور ساون اس کی مدد کررہے ہیں۔"

پندرہ بچے

نجومی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھیے صاحب! میں کسی کو جھوٹی تسلی یا امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کہتا ہے کہ انتالیس سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوجائے گا۔ اڑتیس برس کی عمر میں آپ کی شادی ہوگی اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔"
"کیسی فضول باتیں کررہے ہو۔" سائل بگڑ کر بولا۔
"اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہوگی اور

انتالیس سال کی عمر میں، میں مرجاؤں گا اور میرے سولہ بچے ہوں گے۔۔۔ کیسے۔"

"آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہوگی وہ پندرہ بچوں کی ماں ہوگی۔" نجومی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

رابعہ - لاہور

بدحواسی

اچانک بڑی شدت کا طوفان بادوباراں آگیا۔ درخت جڑوں سے اکھڑنے لگے۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ مکانوں کی چھتیں اڑنے لگیں۔

ایک غائب دماغ پروفیسر ادھر ادھر بھاگ کر لوگوں کو جمع کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

ہمیں اب یہ سوچنا چاہیے کہ ہمیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟

ایک صاحب ان کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور بولے۔ "سب سے پہلے گھر جا کر پتلون پہننی چاہیے۔"

سیدہ فرزانہ عرفان، حجرہ شاہ مقیم

خودبینی

اٹلی کے مشہور شاعر وانزیو کے پاس اس کے کسی مداح نے خط لکھا۔ مداح کو اس کا پتا معلوم نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے لفافے پر "اٹلی کے سب سے بڑے شاعر کو ملے" لکھ کر پوسٹ کر دیا۔ پوسٹ مین، وانزیو کے پتے سے واقف تھا۔ وہ یہ خط لے کر جب وانزیو کے پاس پہنچا تو لفافے کے پتے کو پڑھ کر وانزیو نے اسے پوسٹ مین کو واپس کر دیا اور کہا۔

"یہ میرا خط نہیں ہو سکتا۔"

پوسٹ مین نے اسے حیرت سے دیکھا۔ وانزیو نے اس کی حیرت کو تاڑتے ہوئے جواباً" کہا۔

"تم ہی بتاؤ یہ خط میرا کیسے ہو سکتا ہے، میں اٹلی کا نہیں دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہوں۔"

کون کم بخت

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔

"آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟"

"یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔" بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

"کون کم بخت اس بدذات کمینی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے۔ بکواس کرتی ہے اور سارے پیسے اس کو دیتا ہوں، خواہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہ ہو۔"

اللہ معاف کرے

ایک مذہبی رہنما کو جلسے میں تقریر کرنی تھی کیونکہ ان کے اعزاز میں یہ جلسہ ہو رہا تھا۔ ایک وزیر نے تقریر سے قبل مذہبی رہنما سے تعارف کراتے ہوئے ان کی بہت تعریف کی۔ تعارف ختم ہوا تو دینی رہنما تقریر کے لیے اٹھے اور بولے۔

"اللہ تعالیٰ وزیر صاحب کو ان کی مبالغہ آرائی پر معاف کرے اور مجھے اپنی تعریف سن کر لطف اندوز ہونے پر۔"

نمو رزاق - ڈیفنس

عالمی ریکارڈ

ایک سوئمنگ کلب کے نوٹس بورڈ پر چسپاں ایک عبارت ملاحظہ کیجئے۔ ای این والٹر نے پانی کے اندر رہنے کا عالمی ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ وہ مسلسل چھ گھنٹے، بتیس منٹ اور بیالیس سیکنڈ زیرِ آب رہا۔

مرحوم کی تدفین صبح آٹھ بجے کلب سے ملحق قبرستان میں ہوگی۔ ممبران سے شرکت کی درخواست ہے۔



شگفتہ جاہ



رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا۔

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرما رہے تھے۔

"جس کو جسم میں کوئی تکلیف (جسمانی تکلیف) پہنچے پھر وہ اس (تکلیف پہنچانے والے) کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔"

(ابن ماجہ)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا،

خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہوجائے بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو۔ اور تمہاری بردباری کی صفت بڑی ہو۔ اور اپنے رب کی عبادت میں تم لوگوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔

ایمان کی چوٹی،

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے۔

"ایمان کی چوٹی اللہ کے فیصلے کی وجہ سے پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کرنا اور تقدیر پر راضی ہونا ہے اور توکل میں مخلص ہونا اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات کو بے چون وچرا لینا اور اللہ کے سامنے گردن جھکا لینا ہے۔

حضرت عمرؓ بن خطاب کی نصیحت،

اپنے تمام معاملات میں اُن لوگوں سے مشورہ کیا کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

حضرت حسنؓ بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نصیحت،

حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"یہ جان لو کہ علم اور بردباری زینت ہے اور وعدہ پورا کرنا مردانگی ہے اور جلد بازی بے وقوفی ہے اور سفر کرنے سے انسان کمزور ہوجاتا ہے اور کمینے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا عیب کا کام ہے اور فاسق فاجر لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے انسان پر تہمت لگتی ہے۔

اچھی باتوں کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔ "تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (اچھی باتوں کا حکم دینا اور بری باتوں سے روکنا) ضرور کرتے رہنا ورنہ تم پر تمہارے برے لوگ مسلط کردیے جائیں گے، پھر تمہارے نیک لوگ بھی دعا کریں گے تو قبول نہیں ہوگی۔"

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا،

حضرت قیس بن سلع انصاری کے بھائیوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ان کی شکایت کی اور کہا کہ "یہ اپنا مال فضول خرچ کرتے ہیں اور ان کا ہاتھ بہت کھلا ہے۔"

انہوں نے عرض کیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کھجوروں میں سے اپنا حصہ لے لیتا ہوں اور اس کو اللہ کے راستے میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہوں۔"

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور تین مرتبہ فرمایا۔

"تم خرچ کرو۔ اللہ تم پر خرچ کرے گا۔"

اس کے بعد جب میں اللہ کے راستے میں نکلا تو میرے پاس سواری کا اونٹ بھی تھا اور آج میں اپنے خاندان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔" (یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے بھائیوں سے زیادہ مال دے رکھا ہے۔)

قناعت،

حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا۔

"اے ابن آدم! تو آج کے دن کی فکر کر اور آئندہ کی فکر نہ کر اور جلدی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اگر کل تجھے موت نہیں آتی ہے تو کل کی روزی تیرے پاس خود ہی آجائے گی اور یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ تو اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا کما رہا ہے وہ تو دوسروں کے لیے جمع کر رہا ہے۔"

مسلمان کے عیب کو چھپانا،

حضرت شعبی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ایک آدمی نے آکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جسے میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک دفعہ زندہ قبر میں دفن کردیا تھا لیکن پھر مرنے سے پہلے اسے باہر نکال لیا۔ پھر اس نے ہمارے ساتھ اسلام کا زمانہ پایا اور مسلمان ہوگئی پھر اس سے ایسا گناہ سرزد ہوگیا جس پر شرعی سزا لازم آتی ہے۔ اس پر اس نے بڑی چھری سے خود کو ذبح کرنے کی کوشش کی۔ ہم لوگ موقع پر پہنچ گئے اور اسے بچا لیا لیکن اس کے گلے کی کچھ رگیں کٹ گئی تھیں۔ ہم نے اس کا علاج کردیا وہ ٹھیک ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے توبہ کی اور اس کی ذہنی حالت بہت اچھی ہوگئی۔ اب ایک قوم کے لوگ اس کی شادی کا پیغام دے رہے ہیں۔ کیا میں انہیں ساری بات بتادوں؟"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے تو اس کے عیب کو چھپایا تھا، تم اسے ظاہر کرنا چاہتے ہو؟ اللہ کی قسم! اگر تم نے اس لڑکی کی کوئی بات بتائی تو میں تمہیں ایسی سزا دوں گا جس سے تمام شہر والوں کو عبرت ہوگی۔ بلکہ اس کی شادی اس طرح کرو، جس طرح ایک پاک دامن مسلمان عورت کی کی جاتی ہے۔"

موتی مالا،

• جن اقوام میں استاد کو احترام کا درجہ دیا جاتا ہے، وہ اقوام عالم کی راہبری کرتی ہیں۔ (آسکر وائلڈ)

• جذبوں اور روایتوں کی تعمیر کیجیے۔ خوبصورت معاشرہ جنم لے گا۔ (گارڈن باٹرن)

• انسان کا کردار اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس چیز سے خوش ہوتا ہے اور کس کو پسند کرتا ہے۔ (سموئیل جانسن)

• ناکامی جرم نہیں، مقصد کا پست ہونا جرم ہے۔

• دوست کے ناراض ہونے کے خیال سے حق بات نہ کہنا حق دوستی ادا نہ کرنے کے برابر ہے۔

نمرہ، اقرا۔ کراچی

عقل بڑی دولت،

ہمیں ہر اس چیز سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کیے جانے کے قابل ہو اور ہر اس چیز سے نفرت کرنا چاہیے جو نفرت کے قابل ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں کا فرق دیکھنے کے لیے عقل کی دولت بھی ہو۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

قرآن کی سچائی،

ممتاز مغربی دانشور گیری ملر نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام ابولہب تھا۔ ابولہب کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جاتے وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات جھٹلاتا۔ اگر

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے کہ یہ چیز سفید ہے تو وہ جھوٹ بول اٹھتا۔

"نہیں، یہ کالی ہے۔" اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے کہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں، رات ہے۔

قرآن میں ابولہب کا ذکر بھی آیا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقدر ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا۔ کافر ہی رہے گا۔

گیری ملر لکھتا ہے۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابولہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ اگر وہ مسلمانوں سے کہتا۔ "دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مسلمان بنالو۔" اور جب وہ مسلمان بنالیتے تو کہتا۔ "لو بھئی۔ تمہارا قرآن جھوٹا ثابت ہوگیا۔ اب بولو۔"

لیکن ابولہب نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا

- جو شخص لالچ کرتا ہے، اس کی روزی میں تو اضافہ نہیں ہوتا البتہ اس کی عزت اور قدر کم ہو جاتی ہے۔
- جو کسی کی غیبت سنتا ہے گویا وہ خود غیبت کرتا ہے۔
- اپنے بیٹے کو اپنی تعلیم نہ دلاؤ کہ وہ تمہارے دور کے لیے پیدا نہیں ہوا۔
- اے ابن آدم! جب تو دیکھے کہ تیرا پاک پروردگار تجھے پے در پے نعمتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا۔
- درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو سزا دینے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔
- تمہارے دوست تین ہیں۔

1۔ تمہارا دوست۔
2۔ تمہارے دوست کا دوست۔
3۔ تمہارے دشمن کا دشمن۔

ندا، فضہ۔ کراچی

حرفِ دانش

- جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ بتانے کی جرأت نہیں ہوتی۔
- یہ ہماری آنکھیں نہیں بلکہ دوسروں کی آنکھیں ہیں جو ہمیں برباد کرتی ہیں۔ اگر سوائے آپ کے دنیا کے تمام لوگ اندھے ہوتے تو آپ کبھی بھی عمدہ لباس اور عیش تما سامان کی پروا نہ کرتے۔
- جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے، وہ سب کسی نہ کسی دن بخش دیا جائے گا اس لیے ابھی بخشش کرو

تاکہ بخشش کا موسم تمہارا ہو۔ نہ کہ تمہارے وارثوں کا۔

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

بات سے بات

- جاگنے والے زندہ ہوں تو سونے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔
- کسی انسان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو جو تم اپنے ساتھ نہیں چاہتے۔
- پریشانی حالات سے نہیں خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔
- جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے۔ جو اللہ کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔
- انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکتا، وہ مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ (واصف علی واصف)

عائشہ، تحریم۔ کراچی

اونچی عمارتیں بنانا

حضرت عبداللہ رومیؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت ام طلقؓ کے گھر ان کی خدمت میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ان کے گھر کی چھت نیچی ہے۔ میں نے کہا۔ "اے ام طلقؓ! آپ کے گھر کی چھت بہت نیچی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"اے میرے بیٹے! حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے گورنروں کو یہ خط لکھا کہ تم اپنی عمارتیں اونچی نہ بناؤ کیونکہ تمہارا سب سے برا دن وہ ہوگا، جس دن تم لوگ اونچی عمارتیں بناؤ گے۔"

مدیحہ۔ فیصل آباد

نشے کی تباہ کاریاں

نشہ وہ ہے جس نے ہاروت، ماروت کو بھی بہکایا جب اللہ تعالیٰ نے ہاروت ماروت کو اس زمین پر بھیجا تو ان کی آزمائش مقصود تھی۔ ان سے کہا تین گناہ مت کرنا۔ شراب، قتل اور زنا سے دور رہنا۔ ایک زہرہ نامی عورت نے پہلے زنا کی دعوت دی تو انہوں نے کہا۔ "میرے رب نے اس سے منع فرمایا ہے۔ یہ سخت گناہ ہے۔" پھر قتل کے لیے آمادہ کیا۔ اس سے بھی انکار کیا۔ پھر جب نشہ کی دعوت دی تو اس کے بہکاوے میں آگئے کہ یہ ہلکا گناہ ہے قابل معافی ہے لہٰذا شراب پی لی۔ اس نشے کے جادو نے قتل بھی کروایا اور زنا بھی۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

انمول موتی

- دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑ دینا کوئی خوبی کی بات نہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق ادا کیا جائے۔
- کامل انسان وہ ہے جس سے اس کے دشمن بھی بے خوف ہوں۔
- انسان زندگی میں کچھ بھی کرے، مگر اس عالی شان زندگی کا خاتمہ موت ہے اور موت کے بعد۔ عظیم الشان انسان بھی اتنا ہی بے بس اور غریب ہے جتنا کہ اپنی پیٹھ پر کئی اینٹیں ایک ساتھ لاد کر سیڑھیاں چڑھنے والا مزدور۔

لفظوں کی خوشبو

- سڑک کنارے کمرے میں بیٹھ کر زندگی کا مفہوم سمجھنے والا اس زندگی کو نہیں سمجھ سکتا جو سڑک پر سے گزر رہی ہے۔
- تنہائی کے مسافر بیمار روحوں کی طرح اذیت کی منزلیں طے کرتے ہیں۔
- ہم جتنے بلند ہوتے ہیں اتنے تنہا بھی۔
- یادیں اس حنا کی مانند ہیں جو سوکھ جانے کے بعد رنگ لاتی ہیں۔
- زندگی ایک ایسی ٹرین ہے جو ہمیشہ ایسے اسٹیشن پر رکتی ہے جہاں آپ اترنا نہیں چاہتے۔

عظمیٰ، نادیہ۔ کراچی

اچھی باتیں

* جس چیز کا ہمیں اشتیاق ہو، وہ ہمیں حاصل نہ ہو، ہمارے دل کو اس چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے جو ہمیں حاصل ہو۔
* جب تم نے ہوا پر اپنا راز ظاہر کر دیا ہے تو اب اگر ہوا اسے درختوں پر ظاہر کر دے تو تم ہوا کو برا مت کہو۔
* حق کی سننے والا حق کا اظہار کرنے والے سے کچھ کم نہیں ہے۔
* دوست کو دوستی سے پہلے پرکھو ورنہ بعد میں دوستی کے مجرم بن جاؤ گے۔

نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

سبین شناء ـــــــ سکھر
کچھ درد نہاں، کچھ فکرِ جہاں، کچھ شرمِ خطا، کچھ خوف سزا
اک بوجھ اٹھائے پھرتا ہوں اور بوجھ بھی کتنا بھاری ہے

صبا سحر ـــــــ کراچی
جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر ہم

ثمینہ اکرم ـــــــ کراچی
نہ صدف بنی نہ گہر ہوئی یونہی جلتی بجھتی بسر ہوئی
کبھی زندگی کے چراغ کی نہ ہی شب ڈھلی نہ سحر ہوئی
مرے خامشی میرے خواب تھے، ان ہی آہٹوں کا سراب تھے
کئی راستوں سے گزر کے بھی جا ہ جن کی گردِ سفر ہوئی

فرحت نسیم ـــــــ لاہور
یہ تیرے خط، تیری خوشبو یہ تیرے خواب و خیال
متاعِ جاں ہیں ترے قول اور قسم کی طرح
گزشتہ سال انہیں میں نے گن کے رکھا تھا
کسی غریب کی جوڑی ہوئی رقم کی طرح

اقراء ـــــــ اوکاڑہ
آنکھوں نے بنا ڈالے ایک بات پہ ڈھیر سے
خشکی کے سمندر میں پانی کے جزیرے سے

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ
ہری بھری تھی ٹہنی سرخ گلاب کی بھی
عجب کہانی تھی سوکھے تالاب کی بھی
ہنستی گاتی آبادی کو اجاڑنے میں
حالت غیر ہوئی ہو گی سیلاب کی بھی

فریال صلاح الدین ـــــــ کراچی
نہ سننے میں نہ کہیں دیکھنے میں آیا ہے
جو ہجر و وصل مرے تجربے میں آیا ہے
جواز رکھتا ہے ہر ایک اپنے ہونے کا
یہاں پہ جو ہے کسی سلسلے میں آیا ہے

مدیحہ احمد ـــــــ کراچی
خوش ہے بہت وہ اپنے نئے ہم سفر کے ساتھ
اتنی ذرا سی بات پہ کیوں رو رہا ہوں میں

ذوباریہ خالد ـــــــ لاہور
یہ غم نہیں ہے کہ ہم دونوں ایک نہ ہو سکے
یہ رنج ہے کہ کوئی درمیاں میں بھی نہ تھا

عدیلہ شہزاد ـــــــ لیہ
اسے کہنا شام کی اداسیاں ہمیں اچھی نہیں لگتیں
اگر ہو سکے تو یہ جدائی تھوڑی مختصر کر دے

عائشہ، تحریم ـــــــ گوجرہ
نہ تھیں اور کوئی بھی رنجشیں صرف عادتوں میں تضاد تھا
کہ اسے پسند تھیں شوخیاں اور ہمیں سادگی پہ ناز تھا

اقرا نوید ـــــــ اوکاڑہ
وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
میرا علاج میرے چارہ گر کے پاس نہیں
تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
میرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں

زرتاشیہ شیرازی ـــــــ گوجرانوالہ
رو کے کہاں رکے ہیں محبت کے قافلے
بس یوں ہوا کہ دل نے زمانے بدل دیے
دیکھا تو اپنا آپ تھا نوکِ شکست پر
یوں وقت نے ہمارے نشانے بدل دیے

حنا کنول ـــــــ حویلی لکھا
سسکیوں کی تال پر ہیں آرزوئیں محوِ رقص
کس قدر ہے سوز ہماری زندگی کے ساز میں

حرا شاہ ـــــــ شجاع آباد
یہ میری زیست کی سب سے بڑی تمنا تھی
وہ میرے پاس میرے نام کی طرح رہتا

شازیہ رانا ـــــــ دیپال پور
دو گھڑی میسر ہو اس کا ہم سفر ہونا
پھر ہمیں گوارا ہے اپنا در بدر ہونا
اس گھڑی وصل کی ساعت ہم پہ آئی تو جانا
کس گھڑی کو کہتے ہیں خواب میں بسر ہونا

نمرہ، اقراء ـــــــ کراچی
دشمن کو ہارنے سے بچانا عجیب تھا
ترکِ مدافعت کا بہانا عجیب تھا
اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

ثمینہ اکرم ـــــــ لیاری کراچی
رونے والوں نے اٹھا رکھا تھا گھر سر پر مگر
عمر بھر کا جاگنے والا پڑا سوتا رہا
روشنی کو رنگ کر کے لے گئے جس رات لوگ
کوئی سایا میرے کمرے میں چھپا روتا رہا

عنوی اکرم ـــــــ کراچی
اگر سوختہ ساماں ہوں تو یہ روزِ سیاہ
خود دکھایا ہے مرے گھر کے چراغاں نے مجھے

فرح فاطمہ اشرف ـــــــ حویلی لکھا
کسی کا راز کسی سے نہیں کہتے
یہ احتیاط اندھیروں میں پائی جاتی ہے

آمنہ اجالا ـــــــ ڈہرکی
زندگی بھر کی شناسائی چلی جائے گی
گھر بسا لوں گا تو تنہائی چلی جائے گی

فوزیہ سعید ـــــــ کراچی
بہت گلہ مری تنہائیوں کو ہے مجھ سے
میرے سوا گھر میں کوئی نہیں رہتا

مہر گل ـــــــ کراچی
سلیم روشنی کو روشنی کہے
یہاں کسی کو یہ مجال نہیں

شمع مسکان ـــــــ جام پور
یہی سوچتا گھر سے دور آ گیا
کوئی روک لے گا تو رک جاؤں گا
کہ ہو راستہ واپسی کے لیے
میں دانستہ کچھ بھول کر جاؤں گا

یاسمین کنول ـــــــ پسرور
کتنی دلکش ہے تیری خاموشی
ساری باتیں فضول ہوں جیسے

مہر گل، دعا گل ـــــــ کراچی
آؤ چپ کی زبان میں محسن
اتنی باتیں کریں کہ تھک جائیں

مشعل جمانی ـــــــ ڈہرکی
کاش میرے بس میں بھی ہوتا تجھ سے غافل ہو جانا
ہم بھی سکوں سے رہتے بے خبر تیری طرح

انیلا ـــــــ ڈہرکی
ہم تو عرصے سے کبھی ان کے روبرو نہ ہوئے
صرف محسوس کیا ان کو اور طبیعت بہل گئی

فرحت بشیر ـــــــ نواب شاہ
جب اس کو جیتنا بھی ہار ٹھہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جوا کون
گزرتی رات نے چپ سادھ لی ہے
نہ جانے آتے آتے رک گیا ہے کون



رضیہ جمیل

خط آئے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔37۔ اُردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی سلامتی' عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو' ہمارے پیارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور جو لوگ ہمارے ملک کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ ان کے مذموم ارادوں کو ناکام بنائے۔ انہیں نیست و نابود کرے۔ آمین

پہلا خط کراچی سے رشک حبیبہ کا ہے' لکھتی ہیں

یوں تو میں نے آس نہیں لگائی کہ یہ خط شائع ہوگا مگر پھر بھی پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ کے مصداق کہیں درون قلب ننھا سا دیا ضرور ٹمٹما رہا ہے کہ شاید۔۔۔ ایک نظر میری طرف ہو ہی جائے۔ خیر نہ بھی ہو تو۔۔۔

کچھ غیر ہیں غیروں کا گلہ کس سے کریں ہم
کچھ اپنے ہیں اپنوں کی شکایت نہیں ہوتی

سب سے پہلے تو بے انتہا شکریہ کہ میری کہانی کو قابل اشاعت سمجھتے ہوئے شعاع کی زینت بنایا گیا۔ تھوڑا بہت تبصرہ کرتی چلوں۔ جناب "تجدید وفا" بہت زبردست تحریر ہے۔ سونیا نوید کے انداز تحریر کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ "سنہری دھوپ" صوفیہ امجد نے اچھا لکھا۔ کیپ اٹ اپ۔۔۔ افسانوں میں "یہی ایک کام کرنا ہے" پسند آیا "ذرا سنبھل کے" "فاطمہ عسکری کا بس سو سوچتا تھا" فراز' مختصر پیرائے میں لکھی حساس موضوع کی کہانی تھی جو نہایت ہلکی پھلکی تحریر تھی' معاشرہ ان جیسی معمولی خطاؤں سے ہی غلط طرز پر پروان چڑھتا ہے۔ مکمل ناول نمرہ احمد میں کیا کہوں؟ کچھ کہنے کے لیے لفظ نہیں۔ انداز تحریر سے لے کر اسلوب اور کہانی' کہانی کی سیٹنگ۔۔۔ ایک ایک چیز' ایک ایک نقطہ قابل تحسین ہے۔

سنا تو ہے کہ خط اشاعت میں نہ بھی شامل ہو تو پڑھا ضرور جاتا ہے اور تنقید بھی نوٹ کی جاتی ہے۔ تو جناب میرا خط بھی پڑھ لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے وگرنہ ہر بار کی طرح اس بار بھی محنت و محبت اکارت جانے کا افسوس تو ضرور ہوگا مگر۔۔۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

خود کو تسلی دے لوں گی۔ ڈونٹ وری۔

حبیبہ! آپ کو لفظوں کو برتنے کا ہنر آتا ہے۔ موضوعات بھی اچھے منتخب کرتی ہیں بس کہانیوں میں گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کہانی لکھنے کے لیے موضوع کا انتخاب کریں تو اس کا ہر پہلو سامنے آنا ضروری ہے۔ آفس کا فون خراب ہے۔ اگر آپ اپنا فون نمبر لکھ کر بھجوا دیں تو ہم آپ کو فون کرلیں گے۔

ثروت بانو نے گوجر خان سنجھوٹہ سے لکھا ہے

اس ماہ نمرہ احمد کا ناول بہترین تھا جس نے پورا مہینہ بہت انتظار کروایا۔ اس کے بعد بڑھتے ہیں "دیوار شب" کی طرف۔ عالیہ بخاری کا لکھنے کا انداز بہت متاثر کن ہے عالیہ جی حقیقت سے قریب تر لکھتی ہیں اور ان کا دھیما انداز بڑا ہی پر اثر ہے۔ آمنہ ریاض بھی اچھی رائٹر ہیں لیکن ان کی کہانی کے صفحات بہت کم ہوتے ہیں۔ آمنہ زریں بہت خوب صورت الفاظ میں تبصرہ کرتی ہیں۔ ان سے کوئی ناول وغیرہ بھی لکھوائیں ناں۔ اس کے علاوہ شعاع کے تمام سلسلے زبردست ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان' نگہت سیما' ناہا ملک' عنیزہ سید' در ثمن' مریم عزیز' فائزہ افتخار' عمیرہ احمد' سعدیہ عزیز آفریدی اور تنزیلہ ریاض سب کدھر غائب ہیں انہیں ڈھونڈیں اور شعاع کے لیے کچھ لکھوائیں تنزیلہ ریاض کا "مرگ برگ" ابھی تک یاد ہے۔

پیاری ثروت! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ جن مصنفین کے نام آپ نے لکھے ہیں' ان کی تحریریں ہمیں بھی بے حد پسند ہیں۔ اور ہم بھی چاہتے ہیں' وہ شعاع کے لیے لکھیں۔ عنیزہ سید کا ناول خواتین میں شروع کیا گیا ہے۔ عنیزہ سید کا ناول کتابی شکل میں آچکا ہے۔

یمنیٰ زاسید نے سرگودھا سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

شعاع کی عرصہ دراز سے خاموش قاری ہوں اور شاید آگے بھی لامحدود مدت تک اسی سنگھاسن پر جمی رہتی اگر جو محترمہ سائرہ رضا کے افسانے "پاؤں کی جوتی" نے میرے ذہن کو نہ جھنجوڑا ہوتا۔ دراصل مجھے اس افسانے میں کچھ باتوں پر اعتراضات ہیں اور کچھ پر میں سائرہ کو تنبیہہ کرنا چاہتی ہوں۔

سائرہ نے ایک جگہ اپنے افسانے کے ہیرو کی خوب صورت شخصیت ظاہر کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اگر سیب اور چھری دی جائے تو انگلیاں کٹ سکتی ہیں۔ پیاری سائرہ یہ واقعہ جس کی طرف آپ اشارہ کررہی ہیں وہ ایک جلیل القدر نبی سے وابستہ ہے۔ پلیز سوچ سمجھ کر واقعات سے مماثلت دیا کریں۔

ایک اور جگہ سائرہ نے وجیہہ پیرزادہ نامی کردار سے کچھ ڈائیلاگ کہلوائے جس میں وہ ملتانی مٹی کھانے سے متعلق کہہ رہی ہے کہ میں اپنے معیار سے نیچے کی چیز کس طرح کھا سکتی تھی۔ میری پیاری بہن ان الفاظ سے لگتا ہے کہ جیسے دوران حمل ملتانی مٹی کھانا تو ٹھیک ہے مگر آپ کے کردار نے اپنے اسٹیٹس کے زعم میں نہیں کھائی۔ اگر آپ اس بات کو اس طرح لکھ دیتیں کہ ملتانی مٹی اور دوسری چیزوں مثلاً" چھالیہ وغیرہ کا دوران حمل اور عام دنوں میں بھی کھانا خون میں کمی کرتا ہے اور کھانے والا اینمک ہو جاتا ہے تو بہت سی بہنوں کو بھی ایک اچھی بات پتا چلتی۔

اسی طرح ایک اور جگہ سائرہ نے لکھا ہے کہ میرذکاء اپنے والد سے اپنی علاقائی زبان میں بہت احترام سے بات کرتا ہے تو انیسہ کے والد اور گھر والوں کو برا لگتا ہے۔

میری بہن کیا اپنی علاقائی یا مادری زبان بولنا اور والدین سے احترام سے بات کرنا کوئی ناپسندیدہ بات ہے؟ اس کے والدین اس کو ایک غلط فیصلے سے بچانے کے لیے کچھ مثبت طریقہ بھی اختیار کرسکتے تھے جبکہ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے مرتبے اور رتبے سے تفاخر کا شکار ہیں اور اسی لیے اسے میرذکاء سے شادی کے لیے انکار کررہے ہیں۔

اعتراضات تو اور بھی ہیں مگر تھوڑے لکھے کو بہت جانیے۔ اس خط کے ذریعہ میں نے اپنی بات آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے اگر آپ کی یا سائرہ کی دل آزاری ہوئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

پیاری یمنیٰ! سائرہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں' آپ نے ان کا غلط مفہوم اخذ کیا ہے۔ بہرحال آپ کے اعتراضات ہم سائرہ رضا تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کا جواب موصول ہوا تو آئندہ ماہ شامل کریں گے۔ آپ کی نظم شامل اشاعت ہے۔ غزل بھی جلد شائع ہو جائے گی۔

ثمینہ اکرم نے کراچی سے لکھا ہے

اپریل کا شعاع ملا۔ سرورق پر سوچوں میں گم' اپنے آپ سے بے خبر پروقار سی ماڈل بہت اچھی لگی۔ خاص طور پر اس کا ڈریس بہت پسند آیا۔ یہ ماڈل شاید انیتا ایوب ہے۔ سرسری سی فہرست پر نظر ڈالی اور جھٹ سے عالیہ بخاری کا دیوار شب نظروں کے سامنے آگیا۔ میری دلچسپی اس ناول میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کی ساری اقساط اکٹھی ہی پڑھ لوں۔ سب سے زیادہ مجھے معاذ اور سالار کا کردار اچھا لگتا ہے۔

کہانی اپنے اختتام کی جانب رواں دواں ہے۔ "ستارہ شام" اپنی سست روی کے باعث مجھے اتنا خاص پسند نہیں

ہے "خط آپ کے" ہمیشہ ہی سے میری توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ کیونکہ باصلاحیت رائٹرز کی طرح ہماری قارئین بھی بہت ذہین ہیں۔ اس قدر جامع اور جاندار تبصرے پڑھ کر جتنی خوشی مجھے ملتی ہے اس سے زیادہ خوشی ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے خطوط پڑھ کر ہوتی ہے۔ بعض مقامات کا تو ہم نے نام تک نہیں سنا ہوتا اور خواتین ڈائجسٹ اور شعاع وہاں نہ صرف پڑھا جاتا ہے بلکہ پسند بھی کیا جاتا ہے۔

اب کچھ بات ہو جائے نمرہ احمد کے ناول "جنت کے پتے" کی۔ نمرہ احمد کے ناول انفرادیت کے لحاظ سے سب سے منفرد ہوتے ہیں جبکہ ان کے ناول کے نام بھی بہت مختلف منفرد اور قدرے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ وسیع مطالعہ' تحقیق اور ذخیرہ الفاظ کا خزانہ۔ نمرہ احمد میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ باقی آئندہ پڑھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔ اتنی کم عمری میں اتنی کامیابی پر نمرہ آپ کو بہت بہت مبارکاں۔۔۔ رشک حبیبہ کا ناولٹ "رفاقتوں کے بندھن" پڑھا۔ افسانہ سے ناولٹ لکھنا ان کی ایک اچھی کوشش ہے ان کا یہ ناولٹ سبق آموز بھی ہے۔ "سنہری دھوپ" صوفیہ امجد کی ہلکی پھلکی اور سادہ تحریر تھی۔ "شاعری سچ بولتی ہے" اور "شعاع کے ساتھ" دیکھ کر خوشی ہوئی اب پلیز انہیں بند مت کیجئے گا۔ "تجدید وفا" سونیا نوید کی کہانی مجھے خاص پسند نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں کئی دفعہ کے پڑھے پرانے موضوع پر دوبارہ لکھا گیا ہے بلکہ کئی ایک پرانے موضوع کو ملا کر ایک نیا موڑ دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ قانتہ رابعہ (ممتا) عنیقہ بیگ (جو تمہیں چاہیے) سلمیٰ فاروق اور فاطمہ عسکری نے بھی اچھی کوشش کی۔

پیاری ثمینہ! ہمیشہ کی طرح آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں ضرور لکھیں۔

اسوہ مریم' اقصیٰ مریم سی اسٹریٹ کوئٹہ سے تشریف لائی ہیں لکھتی ہیں

کافی دن بیت گئے' کتنے ماہ و سال' شاید گزشتہ پانچ سال سے شعاع' اور خواتین پڑھ رہی ہوں۔ ہر بار ایک عجیب سا خوش کن احساس گھیرے رکھتا ہے کہ میں ایک ایسے ادب کی قاری ہوں جو انمول نہیں بلکہ میرا اثاثہ ہے۔ نمرہ احمد کو مصحف کے بعد جنت کے پتے پر ویل ڈن!

سسپنس کی گرفت ایک جگہ بھی ڈھیلی نہیں پڑی۔ ویری گڈ "تجدید وفا" بھی زبردست تحریر ہے' سونیا نوید ایک اچھا اضافہ ہیں۔ افسانے بھی خوب تھے۔ سلسلے وار ناول بھی اچھے جا رہے ہیں۔ آپی میری اور اسوہ کی فرمائش ہے کہ فہد مصطفیٰ کا تفصیلی انٹرویو کریں۔

اسوہ اور اقصیٰ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ فہد مصطفیٰ کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی فرمائش پر انہیں دوبارہ سلسلے میں ضرور شامل کریں گے۔

آپ کتابیں منگوانے کا طریقہ:

قیمت اور دیگر تفصیلات درج ذیل نمبر پر فون کر کے پتا کر لیں۔ 021-32216361

شمع مسکان جام پور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

"پہلی شعاع" میں آپ ہمیں مختصر مگر جامع لفظوں میں جو آگاہی فراہم کرتی ہیں اور جو سبق اور نصیحت دیتی ہیں' اس سے ہم خود کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ماہ فیورٹ رائٹر نایاب جیلانی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور سب سے پہلے "دل کی بات" پڑھا۔ بہت خوب صورت انداز میں لکھا۔ شعاع کو سجانے سنوارنے میں ہماری دو رائٹرز "آمنہ ریاض اور عالیہ بخاری" کا بہت زیادہ ہاتھ ہے آج کل۔ ان کے ناولز کی یہ اقساط بہت زبردست تھیں۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ صبا طارق سے کہنا کہ "شاعری سچ بولتی ہے" میں ہمیں ویسے تو سارا انتخاب ہی اچھا لگا مگر "شکوہ" بہت بہت پسند آیا۔

آپ میری پارٹنر قارئین نعیمہ باجی اور صبا جاوید سے میری سفارش کریں کہ وہ دونوں کنجوس بھی کبھی رسالہ خرید لیا کریں۔ کیونکہ کیتی میں ہوں اور پڑھنے کی جلدی انہیں ہوتی ہے۔

پیاری شمع! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ اور معذرت کہ آپ کے پچھلے خط اور تحریریں شائع نہ ہو سکیں۔ نظموں غزلوں کے صفحات بہت محدود ہیں۔ اس لیے وہاں جگہ ملنا ناممکن ہی ہے۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔

گل ناز راشد نے گاؤں شنیکہ سے لکھا ہے

اس ماہ کا شعاع بیسٹ ہے' خاص طور پر نمرہ احمد کا مکمل ناول "جنت کے پتے"۔ میں شعاع کی پرانی قاری ہوں میں کیا میرے سب گھر والے۔ آپ کا رسالہ اتنا اچھا

ہے کہ اس کی تعریف لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی آپی میں نے ایک دو افسانے لکھے ہیں کیا وہ شائع ہو جائیں گے۔

گل ناز! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ افسانے بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

ذکیہ احمد جھنگ صدر سے لکھتی ہیں

اپریل کا شمارہ بہت ہی اچھا تھا۔ جتنی تعریف شائع کی جائے کم ہے۔ جیسے ہی اپریل کا شمارہ ہاتھ آیا۔ جمپ لگائی جنت کے پتے پر نمرہ احمد کیا کہنے آپ کے۔ بہت ہی اچھی کہانی ہے۔ "تجدید وفا" ہم سفر کی طرح چل رہا ہے "ستارہ شام" "دنیا گول ہے یہ محاورہ تو سنا ہی ہوگا" "ستارہ شام" بھی

اسی طرح گول ہے۔ ایک ہی منظر پر آکر ٹھہر جاتا ہے پلیز آمنہ آپی "ستارہ شام" کو کچھ تیز کریں۔ افسانے میں "فرار" اچھا لگا۔

پیاری ذکیہ! آپ کے دس عدد خط ہمیں موصول نہیں ہوئے ورنہ جواب ضرور دیتے۔ افسانہ بلا عنوان موصول ہو چکا ہے۔ ابھی پڑھا نہیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔

عائشہ نے ٹنڈو محمد خان سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ گرمی کے موسم کی مناسبت سے۔ سب سے پہلے عالیہ بخاری کا دیوار شب۔۔۔ اچھی قسط تھی۔۔۔ ستارہ شام میں صرف مادی کا ذکر تھا بس۔ سست روی سے چل رہی ہے کہانی۔ نمرہ احمد بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

فاطمہ عسکری کا "ذرا سنبھل کے" بہت اچھا لگا۔ قانتہ کا ممتا زبردست تھا۔ سب تحریریں اچھی تھیں۔ سونیا نوید "تجدید وفا" بہت اچھی جا رہی ہے۔ امثل عزیز شہزاد کا فرار آج کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک بات کہنی ہے صوفیہ امجد کے ناولٹ سنہری دھوپ میں زیبا کا بھائی زیبا کو حدیث سناتا ہے جسے سن کر وہ بیزاری سے کہتی ہے۔

"ایک تو سارے مبلغ ہمارے گھر میں ہی پیدا ہو گئے ہیں۔ زیبا کا بیزاری دکھانا برا لگا۔ ویسے تو نایاب اچھا لکھتی ہیں مگر اس مرتبہ کچھ خاص نہیں لگا امن کی فاختہ جھگڑے کی فاختہ بنی ہوئی تھی۔ "دستک" میں تجل اچھی لگی۔ ام ثمامہ کی نظم "تبدیلی" بہت زبردست لگی۔

میرے پاس بہت ساری کہانیاں ہیں لیکن مجھے کہانی لکھنا نہیں آتی کیا کروں۔

پیاری عائشہ! آپ لکھتی رہیں۔ خود بخود کہانی بن جائے گی "سنہری دھوپ" میں زیبا کا بیزاری کا اظہار وہ عمومی رویہ ہے جو ہمارے معاشرے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس ناولٹ میں صوفیہ امجد نے اس رویے کی مذمت کی ہے۔ اسے جائز نہیں قرار دیا۔

شائستہ کرن نے چنیوٹ سے شرکت کی ہے

ان کی فرمائش ہے۔ FM-94.60 کے ڈی جے عتیق الرحمان بھٹی کا انٹرویو بمع تصویر شائع کریں۔

شائستہ! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

آسیہ قادر کوئٹہ کینٹ سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا بس ذرا بال لمبے ہوتے تو بہت اچھا لگتا۔ سب سے پہلے دوڑ لگائی "تجدید وفا" کی طرف سونیا جی! پلیز جویریہ کے ساتھ اور ظلم مت کیجئے گا۔ "جنت کے پتے" نمرہ احمد صاحبہ کا بہت زبردست ناول ہے "سنہری دھوپ" اور "رفاقتوں کے بندھن" بس نارمل تھے۔

افسانے سارے ہی اچھے تھے لیکن "ممتا" ٹاپ آف دی لسٹ رہا۔

باقی تمام سلسلے بھی بہت خوب تھے۔ آپی پلیز فرحت اشتیاق کا تو انٹرویو شائع کریں۔

پیاری آسیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

فرحت اشتیاق کا انٹرویو خواتین ڈائجسٹ کے اپریل کے شمارے میں شامل ہے۔

پاکیزہ' مصباح نورین' سمیعہ' دعا' ندا' فاطمہ کنزیٰ' تحصیل صادق آباد ضلع رحیم یار خان سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

شعاع اور خواتین سے ہمارا بہت گہرا اور دل کا رشتہ ہے ہم سات کزنز بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ خریدتی ایک ہے لیکن لڑتی سب ہیں۔ ہمارے گھر والے ہماری لڑائی

سے تنگ ہیں۔

حمد و ثنا اور رسولؐ کے واقعات پسند آئے "تجدید وفا" اور "جنت کے پتے" زبردست جا رہی ہے اور "دل کی بات" میں عباس کا کردار پسند آیا ہمیں سب رائٹر پسند ہیں کسی ایک کی تعریف کرنا نا انصافی کی بات ہے۔ ہم بہت دور گاؤں میں رہتی ہیں خط بھیجنے میں دشواری ہوتی ہے خط اگر دیر سے پہنچے تو بھی ضرور شائع کیجئے گا۔

پلیز 105۔FM کے ڈی جے عثمان حبیب اور خرم طفیلی کا انٹرویو تصویر کے ساتھ لیں۔

آپ ساتوں کزنز کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع پڑھتی ہیں بہت اچھی بات ہے لیکن لڑنا چھوڑ دیں کہ لڑنے اور لڑوانے کا کام ہمارے سیاست دان بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فاروق آباد سے بنت سیٹھ محمد عباس رحمانی نے لکھا ہے

میں اپنے والد محترم کو ہی اپنی شناخت بنانا چاہتی ہوں اور بہت زیادہ ان کا نام روشن کرنا چاہتی ہوں۔ میرا تعلق فاروق آباد سے ہے میں حافظ ہوں میں نے 4 ماہ 2 دن میں قرآن پاک حفظ کیا ہے۔ میں شعاع کی بے قاعدہ قاری ہوں لیکن اب میں باقاعدہ ہو گئی ہوں آج تک میرے پسندیدہ ناول جو میں بار بار پڑھتی ہوں اور کبھی بھول نہیں سکتی وہ میرا نیا سویرا' کوئی دیپک ہو' ہے اللہ تعالیٰ ہمارے رائٹرز کو اور ترقی دے آمین۔ آپ مہربانی کر کے اعصام الحق کا انٹرویو شائع کریں اور ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں میں بیٹیوں کے حقوق کے بارے میں تفصیل سے شائع کردیں۔

بنت عباس! صرف چار ماہ میں پورا قرآن پاک حفظ کرنا! آپ نے قرآن پاک حفظ کیا ہے یا ناظرہ پڑھا ہے؟ اگر حفظ کیا ہے تو واقعی آپ غیر معمولی قوت حافظہ کی مالک ہیں۔ ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرمائے آمین۔

بیٹیوں کے حقوق کے بارے میں آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ روشن خیال اور اعتدال پسند پاکستان کا نعرہ لگانے والوں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ خواتین آج اس سے زیادہ مظالم کا شکار ہیں جو ان پر دور جہالت میں روا رکھے جاتے تھے۔

شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اعصام الحق کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فضہ' ملائکہ' زیور اور لائبہ لاہور سے شریک محفل ہیں۔ لکھتی ہیں

بہار کے رنگوں سے سجا خوب صورت سرورق روح تک کو نہال کر گیا۔ موتیا کے سفید پھول واہ دل ان ہی میں اٹک کر رہ گیا۔ "جنت کے پتے" نمرہ جی! آپ کے ناول کی ہیروئن بہت زیادہ خوب صورت ہے سوال یہ ہے کہ کیا محبت صرف خوب صورت لوگوں کی میراث ہے؟ میں نے آج تک اتنی خوب صورتی نہیں دیکھی ویسے آپ کی تحریر لاجواب ہے۔ عرصے تک نہ بھولی جانے والی۔ نایاب جیلانی کا ناول "دل کی بات" کا کیا کہنا۔ عباس کا کردار اپنے نام کی طرح ہی بہترین تھا بے شک غلط فہمی ایک ایسی دیمک ہے جو رشتوں کو کھوکھلا کردیتی ہے۔ "ستارہ شام" آمنہ جی! تحریر ابھی تک الجھی ہوئی ہے مگر انداز تحریر اس قدر شاندار ہے کہ توجہ کے سارے موتی سمیٹ لیتا ہے۔ راحت جبیں' فاخرہ جبیں خدا کے لیے ساون آنے سے پہلے کوئی تحریر لکھ ڈالیں کہ آپ دونوں کے بنا تو ساون بھی ادھورا ہے کہ جب آپ کی ہیروئن سرخ اینٹوں کے فرش والے صحن میں گھنے درخت کے سائے تلے پرات بھر کے آم کھاتی ہے اور وہ بھی گھر والوں سے چھپ کر تو ہم قاری بہنیں بھی خود کو اس کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ رفعت سراج' بشریٰ سعید جی!

غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے

آپی جی! آپ خود ہر سال بھیگے بھیگے دسمبر میں ایک بیسٹ ناول اور ایک بیسٹ رائٹر منتخب کریں اور ہر سال ان کے لیے ایک صفحہ مخصوص کیا جائے جس میں ہم قاری بہنیں اور ادارہ منتخب رائٹر کو اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کر سکے۔ شازیہ چوہدری کو دل سے نہیں بھلا سکی خدا ان کو جنت میں جگہ دے آمین۔ پلیز عدنان بھائی کا انٹرویو شائع کریں۔ آپی کیا آپ مجھے نبیلہ ابر راجہ کی تحریر "زرد زمانوں کا سویرا" بھیج سکتی ہیں؟ وہ کب شائع ہوئی تھی؟

فضہ' ملائکہ' زیور اور لائبہ! زرد زمانوں کا سویرا کتابی شکل میں آچکی ہے۔ آپ 200 روپے منی آرڈر کردیں۔ کتاب آپ کو بھجوا دی جائے گی۔ اپنا صحیح اور مکمل پتا ضرور تحریر یں۔ ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ ہماری بھی دلی خواہش ہے کہ یہ تمام مصنفین ہمارے پرچے میں لکھیں۔

یہ خط مہر گل کا ہے۔ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں

ہر روز کا تھکا دینے والا سفر آخر کار تین اپریل کو اختتام کو پہنچا اور وہ گھر آہی گیا' روشن روشن چہرے والا' دل خوش کر دینے والا۔

مگر یہ کیا' سارے خواب سراب ہوئے' آنکھوں میں پہلے بے یقینی چمکی اور پھر اداسی کی دھول اڑنے لگی' سپنوں کا خوب صورت تاج محل دھڑام سے گرا اور اس کی کرچیوں نے دل کو زخم زخم کر ڈالا' وہ آج بھی اتنا ہی حسین تھا' نمرہ کے "جنت کے پتے" اسے اور دیدہ زیب بنا رہے تھے' پیارے نبیؐ کی باتیں' حمد و نعت' اس کے چہرے کو تابناکی بخش رہے تھے تو نایاب' سونیا' صوفیہ اور رشک حبیبہ نے اسے سنوار کر اس کے ہر نقش کو دیدہ زیب بنا ڈالا تھا' قانتہ' عنیقہ' امت العزیز' فاطمہ اور سلمیٰ نے اس کے سنگھار میں اپنا حصہ بڑی خوبی سے ڈالا تھا' وہ آج بھی ویسا ہی تھا دل کو چھو لینے والا' نیند اڑا دینے والا' ہمارا اپنا شعاع مگر اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے بے مہری' اجنبیت اور بے گانگی کی وہی کہر تھی۔

آپی! مانا کہ ہر ماہ ہمارا خط چھاپنا لازمی نہیں مگر اتنے مان کے ساتھ جو افسانہ بھیجا تھا اس کے متعلق بھی کچھ درج نہ تھا۔

کیا خطوط کے علاوہ کسی بھی سلسلے میں ہم شامل نہیں ہو سکتے؟

"تجدید وفا" اور "جنت کے پتے" ٹاپ آف دی لسٹ رہے

اس ماہ کے شمارے کی جان "ممتا" اور "دل کی بات" تھے۔ فرار اور رفاقتوں کے بندھن ہمارے معاشرے کا کڑوا مگر عریاں سچ ہیں۔

مہر! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا اور آپ اپنے افسانے کے متعلق نہ جان سکیں۔

نازیہ اسلم نے بھاول پور سے لکھا ہے

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

تو جناب آرزو تو اب ہوئی ختم کہ 9 سال سے شعاع کو خط لکھ رہے ہیں۔ 9 سال میں صرف 3 خط شائع ہوئے۔ شکوہ تو خیر نہیں ہے پر آرزو بھی نہیں ہے۔ اب صرف انتظار ہے کہ یہ خط ردی کی ٹوکری میں جاتا ہے کہ شعاع میں۔ آ

اور کیا آپی بندھن کے لیے صرف معروف لوگوں کے شادی کے احوال ہی آپ شائع کرتے ہیں یا ہم جیسے عام لوگ بھی اس سلسلے میں شامل ہو سکتے ہیں۔

پیاری نازیہ! آپ نے یہ تو لکھا کہ نو سال میں صرف تین خط شائع ہوئے لیکن یہ نہیں بتایا کہ 9 سال میں آپ نے کتنے خط لکھے جو شائع نہیں ہوئے۔ پیاری بہن خطوط کا یہ سلسلہ ہم نے اپنی قاری بہنوں کے لیے شروع کیا ہے۔ اس میں آپ لوگوں کے خطوط ہی شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک دو خطوط شامل نہ ہو سکے ہوں لیکن یہ ممکن نہیں کہ قارئین ہمیں متواتر خط لکھتی رہیں اور ہم شامل نہ کریں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

جویریہ شریف لاہور سے شریک محفل ہیں

شعاع ہر بار ہی لاجواب ہوتا ہے۔ لیکن اس بار تو کمال ہی کر دیا۔ ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی۔ سب سے پہلے ستارہ شام پڑھا۔ کہانی میں سسپنس برقرار ہے لیکن پلیز اس کے صفحات بڑھا دیں۔ باقی نمرہ احمد میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ انہوں نے جتنا لکھا' لاجواب لکھا۔ پلیز نمرہ احمد کا انٹرویو ان کی تصویر کے ساتھ شائع کردیں۔

پیاری جویریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ نمرہ احمد کے انٹرویو کی فرمائش پوری کر سکتے ہیں لیکن تصویر کی اشاعت ممکن نہیں کیونکہ نمرہ احمد اس کی اجازت نہیں دیں گی۔

اقراء عبدالرشید' نعیمہ عبدالغفور اور صوفیہ ناز نے کراچی سے شرکت کی ہے لکھا ہے

ہم آپ کا شعاع ہر ماہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس کی کہانیاں بڑی اچھی ہوتی ہیں۔ ہم پہلی بار کسی کو خط لکھ رہے ہیں اور ہم ایک سچی کہانی لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہانی بہت امیزنگ ہے جس کو قارئین پڑھ کر بہت متاثر ہوں گے ہم میٹرک کی اسٹوڈنٹس ہیں اور ہمیں کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا بہت شوق ہے اور ہم پچھلے تین سال سے کہانیاں آپ کے شعاع رسالے سے پڑھ رہے ہیں۔ اپنے پیارے شہر کے نام ایک شعر پیش کرتی ہیں۔

اس کراچی میں جہاں طاقت ہے مال و زر کا نام
ایک صاحب نے قفس رکھا ہے اپنے گھر کا نام

اقراء نعیمہ اور صوفیہ! یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو شعاع بہت پسند ہے اور آپ کہانی لکھنا چاہتی ہیں۔ یہ وضاحت نہیں کی کہ آپ تینوں مل کر ایک کہانی لکھیں گی یا الگ الگ کہانی لکھیں گی بہرحال آپ کا خط اور شعر پڑھنے کے بعد ہمارا مشورہ ہے کہ فی الحال آپ کہانی لکھنے کے بجائے کہانیاں پڑھنے پر توجہ دیں۔ اچھی تحریریں پڑھیں، پھر لکھیں۔

رحمینہ تنویر نے جہلم سے لکھا ہے

میں اپنی کہانی آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے اس کا طریقہ نہیں پتا کہ کیسے بھیجوں۔

رحمینہ! آپ کہانی لکھ کر ایک لفافے میں ڈالیں لفافے پر ایڈریس لکھیں۔
ماہنامہ شعاع 37۔ اردو بازار۔ کراچی اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوادیں۔
کہانی پر اپنا نام پتا لکھنا نہ بھولیں۔

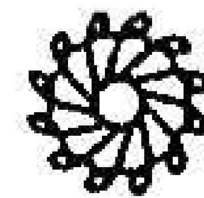
فرخ فاطمہ اشرف نے حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ سے لکھا ہے

نمو احمد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے تو الفاظ ہی نہیں ہیں۔ نایاب جیلانی اب اپنے مخصوص انداز فکر اور انداز بیان سے تھوڑا ہٹ گئی ہیں مگر ان کی تحریروں میں دلچسپی کا عنصر کم نہیں ہوا۔ کہانی کا موضوع نیا نہیں تھا مگر چونکہ بے حد خوب صورت پیرائے میں بیان کی گئی تھی لہٰذا رسالے کی رونق بڑھا گئی۔ نایاب جیلانی جی! ہم آپ کے بھائی کے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں۔

تجدید وفا میں اس دفعہ پہلے جیسی روانی نہیں تھی۔ رعنا بیگم جویریہ سے کچھ بھی جھوٹ بول دیتی ہیں اور وہ فوراً اس بات پر یقین کر کے چلی جاتی ہے جبکہ وہ جانتی بھی ہے کہ رعنا اس کی دشمن ہیں۔ جویریہ جیسی پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی کا یہ رد عمل کردار نگاری کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔ باقی کہانی کی بنت بے حد مہارت سے بنی گئی ہے۔ "رشک حبیبہ" بے حد منفرد سا نام اور ان کا افسانہ اس سے بھی منفرد اور جدید سوچ کی عکاسی کرتا ہوا تھا۔

صوفیہ امجد کا ناولٹ بھی بے حد اچھا لگا۔ افسانوں میں فرار "ٹاپ آف دی لسٹ تھا۔ اگرچہ اس موضوع پر بہت لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس افسانے میں ایک نیا خیال پیش کیا گیا۔ عنیقہ محمد بیگ کی تحریروں کا معیار کم ہو گیا ہے لیکن اگر "رائٹر" سے قطع نظر دیکھا جائے تو پھر افسانہ ٹھیک تھا۔ باقی افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ مجھے آٹھ نو ماہ ہو گئے ہیں افسانہ بھیجے ہوئے۔ پلیز اب تو بتا دیں کہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں۔

فرخ! معذرت کے ساتھ آپ کے افسانوں میں براہ راست نصیحت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات پر لکھے گئے یہ افسانے سنڈے میگزینز کے لیے زیادہ مناسب ہیں۔ شعاع کے لیے آپ باقاعدہ کہانی ترتیب دے کر لکھیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔



ذاتی اغراض کی حد بندی میں زندگی کو گزار دینا۔۔۔ ہمیں زندگی کے بلند آہنگ سے کوسوں دوری پر پھینک دیتا ہے۔۔۔ وہ غرض ضرورت سے لے کر ہوس تک کا مرحلہ طے کر لے۔۔۔ یا پھر وہ شہرت کا بخار ہو۔۔۔ معیار زندگی بلند کرتے جانے کا مرض ہو۔ یا پھر اقتدار کی غلام گردشوں کو کیے گئے سجدے۔ خود سے شروع ہو کر خود پسندی تک رہ جانے والی سطحیت، ہمیں ہماری تخلیق کے اعلیٰ مقصد سے کبھی بھی ہاتھ ملانے نہیں دیتی۔

خواب دیکھنا امید کی بدولت ہے اور تعبیر پانے کے لیے جدوجہد عملی ثبوت۔ تعبیر کیسی بھی کیوں نہ نکل آئے (جیسے 47ء کے خواب کی) لیکن کچھ حاصل کرنے کی لگن میں مبتلا زندگی کو نئے پنکھ عطا کیے جاتے ہیں اور وہ آرزوؤں کے بلند آسمان میں پرواز کا لطف اٹھاتی ہے۔

جو بہرحال۔۔۔ ریت میں دبے ہوئے سر کی نسبت ایک بلند درجے کی زندگی کہلانے کا حق رکھتی ہے۔

تو چلیے! ماں کی طرف جن کا نام "پلا گیا فلورنا" ہے۔۔۔ اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ کردار حقیقی ہیں۔۔۔ پاویل، ماں اور دیگر بھی۔۔۔ واقعات بھی حقائق پر مبنی ہیں۔

"پاویل ولاسوف اور اس کے ساتھیوں کو اپنی جماعت کا منشور بنانے اور جھنڈا لہرانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور محض پولیس ہی نہیں، باقاعدہ فوج مزدوروں کے اس جلوس کے استقبال کو موجود تھی۔

شہری ساتھیوں کو پاویل کا یہ پیغام پہلے ہی مل چکا تھا کہ گرفتاری کی صورت میں ماں کو شہر منتقل کر دیا جائے۔ سو، نکولائی ایوانووچ ماں کو اپنے گھر لے آیا۔۔۔ جہاں وہ اپنے بیٹے کے شروع کیے گئے کام میں حصہ لینے کے لیے پرجوش تھی۔

"اگر ہمارے بچے، ہمارے جگر کے ٹکڑے اپنے متعلق سوچے بغیر اپنی جانیں، اپنی آرزوئیں اور اپنی آزادی قربان کر سکتے ہیں تو مجھ سے ایک ماں سے کیا توقع نہیں کی جا سکتی؟" وہ چلا پڑی۔

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا

ماں

مصنف: میکسم گورکی

تبصرہ: آمنہ زریں

خوخول نے کہا تھا "بعض اوقات آگے بڑھنے کے لیے ہمیں خود اپنے خلاف جانا پڑتا ہے۔ اپنے مقصد کے لیے جان دینا آسان ہے، لیکن کچھ اس سے بھی زیادہ قربانی دینی ہوتی ہے اس چیز کی جو اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہو اور ایسی قربانی دے کر ہم اس صداقت کو اور زیادہ مستحکم کرتے ہیں جس کے لیے ہم لڑ رہے ہیں۔"

سامنے آنے والے ہر نئے کردار کو اس آزمائش سے گزرنا پڑا۔۔۔ نوجوانی کی امنگوں کو، جو ذاتی خوشی سے تعلق رکھتی ہیں۔۔۔ بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے سلا دینا۔۔۔ ماں باپ، آسائش سے دست برداری اختیار کرنا۔۔۔ صحت، خوراک، قید، سفر کی صعوبتوں سے گزرنا۔۔۔ یہ سب ہی مرحلے مادر وطن اور اس کے بہتر مستقبل کی خاطر، جدوجہد کرنے والے ہر انقلابی کو پیش آئے۔

سوفیا، نکولائی کی بہن۔۔۔ نو عمری سے تحریک میں شامل ہے اور بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو جانے کے بعد بھی اپنی توانائی اور جوش کو عظیم مقصد کے مصرف میں لا رہی ہے۔ وہ ایک نڈر خاتون ہے، جو بھیس بدلنے، چھپنے اور اپنے جیل سے بھاگے ہوئے ساتھیوں کو چھپانے میں ماہر ہے۔ ماں اور سوفیا، ریبن کے گاؤں میں پرچے پہنچانے کے لیے عازم سفر ہوئیں۔۔۔ ریبن، جو کسانوں میں بیداری مہم چلانے کا زوردار علمبردار ہے۔ پاویل نے اس کے کہنے پر کسانوں کے لیے خصوصی پرچے تیار کروائے۔

بھیس بدلے ہوئے ماں اور سوفیا گاؤں پہنچ گئیں۔

بیداری مہم کا مقصد صرف مزدوروں کو ان کی حالت زار کا ادراک فراہم کرنا نہیں تھا، بلکہ کمزوروں کو ان کی طاقت سے آگاہ کرنا اور اعتماد دلانا تھا کہ وہ اپنی حالت بدلنے پر قادر ہیں۔

ماں کی محبت بھری روح، سچائی اور معصومیت نے مل کر اسے باطنی روشنی عطا کی تھی۔ وہ جس کسی سے بھی ملتی۔۔۔ اس کا صحیح عکس پہچان لیتی اور اوپر پڑے ہوئے تکلف اور ضبط کے پردوں کے باوجود، تہہ میں چھپے دل کے جذبوں تک رسائی حاصل کر لیتی۔۔۔ اسی لیے سب ہی کردار اسے ماں ہی کہہ کر پکارتے اور اس کی معیت میں خوشی محسوس کرتے۔

ماں، کرداروں کا، صورت حال کا بالکل فطری انداز میں تجزیہ کرتی جو حقیقت سے قریب ہوتا اور ناول بھی چونکہ حقیقی واقعات اور کرداروں پر مشتمل ہے، اسی لیے فطری حسن لیے ہوئے ماں آج تک جاوداں ہے۔

"وہ (سوفیا) ہمیشہ محنت کے تقدس کا ذکر کرتی لیکن اپنے پھوہڑپن سے ماں پر کام کا بوجھ بڑھا دیتی۔ وہ آزادی کے متعلق بڑی زوردار باتیں کرتی لیکن ماں ہمیشہ یہ دیکھتی کہ وہ اپنے ضدی پن اور مسلسل بحث سے لوگوں کو سخت تکلیف پہنچایا کرتی ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک مجموعہ اضداد تھی۔"

"خوفناک سے خوفناک چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے بھی اس کے (نکولائی) ہونٹوں پر پیاس انگیز مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ مگر ساتھ ہی آنکھوں میں سخت اور سرد چمک بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ جب اس کی آنکھوں کی اس چمک کو دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ یہ شخص کبھی کسی کو معاف نہیں کرے گا۔"

قلم کی جزئیات جو کمرے میں موجود چیزوں کے علاوہ انسانی تاثرات اور دل میں اٹھنے والے مختلف خیالوں کو لفظ اوڑھا دیتی ہیں، کی بدولت ہم قیافہ شناسی اور مشاہدے کی اہمیت سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں کہ کس طرح ایک خاموش جائزہ ہمیں بہت کچھ جان لینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

"ماں پڑھنا نہیں جانتی۔۔۔ سیکھنے کی تھوڑی بہت کوشش کے ساتھ ساتھ نکولائی اسے تصویروں والی کتابیں لا کر دیتا ہے۔۔۔ ماں تصویروں میں آباد ایک نئے جہان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ خوش ہوتی ہے اور اخذ کرتی ہے۔

"یہ چیزیں خوب صورت نہیں ہیں کیا نکولائی ایوانوچ؟ ہر طرف کتنی خوب صورتی بکھری پڑی ہے۔ ہمارے پاس سے گزر جاتی ہے اور ہم دیکھ نہیں سکتے۔ ہم پر تو سارے دروازے بند ہیں۔ ایسی چیزوں پر نظر ہی نہیں جاتی جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچے۔ ان کے پاس نہ تو وقت ہے۔ نہ خواہش، اگر یہ جان گئے ہوتے کہ زمین کتنی مالدار ہے اور کتنی عجیب و غریب چیزیں یہاں ہیں تو نہ جانے ولوں کو کتنی مسرت حاصل ہوتی۔ سب چیزیں ہر شخص کے لیے اور ہر چیز سب کے لیے ہے۔"

چائے انڈیلتے ہوئے ماں سوچتی کہ یہ لوگ کس قدر جوش و خروش سے محنت کشوں کی زندگی اور ان کے مقصد کے متعلق باتیں کرتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ انہیں صحیح راستہ دکھانے اور پست ہمتی سے نکالنے کے طریقوں کو اور کس طرح بہتر بنایا جائے۔

لیکن اکثر و بیشتر اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر ایک دوسرے کو اکساتے اور اپنی گرم جوشی کو نمایاں کرتے ہیں، جیسے ان میں سے ہر شخص اپنے ساتھیوں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ دوسروں کے مقابلے میں حقیقت اس کو زیادہ عزیز اور اہم ہے۔ اس طرح تند و تیز بحث ٹھہر جاتی اور محسوس ہوتا کہ ہر شخص دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اونچا اچھلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں ایک پریشان کن افسردگی چھا جاتی۔"

"نتاشا نے سلائی سکول میں استانی کی نوکری کی۔۔۔ اور ماں نے لیس فیتہ پہنچانے کے بہانے پرچوں کی ترسیل کا کام سنبھالا۔ وہ سفر کرتی۔۔۔ لوگوں سے ملتی اور خوش رہتی۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ دھرتی پر کسی چیز کی کمی نہیں

ہے، لیکن زیادہ تر لوگ اس سے محروم ہیں اور افراط کی دنیا میں نیم فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ شہر کے کلیساؤں میں چاندی سونا بھرا ہوا ہے جن کی خدا کو کوئی ضرورت نہیں، لیکن گرجوں کے دروازوں پر فقیر سردی سے کانپ رہے ہیں اور معمولی سی بھیک کے انتظار میں کھڑے ہوئے ہیں۔"

روح، جسم سے برتر مقام رکھتی ہے۔ مگر صورت نہیں رکھتی۔ اس کے مقام سے بے خبری ہمیں، اکثر ہمارے مقام سے گرا دیتی ہے! دیکھیے! نکولائی نے کیسی پیاری بات کہی۔

"انسان کی ضرورتوں کی کوئی اتھاہ نہیں اور اس کی قوت لا انتہا ہے، لیکن ابھی دنیا اپنے آپ کو روحانی اعتبار سے مالا مال کرنے میں سست رفتاری سے کام لے رہی ہے، کیونکہ ابھی جو شخص خود مختار ہونا چاہتا ہے، وہ علم کے بجائے روپیہ حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔"

"یگور، جس کی خوش مزاجی موت سے چند لمحے پہلے تک بھی ماند نہیں پڑی جو حالات کی سختی، قید و بند کی صعوبتوں کا بہادری سے مقابلہ کرتا رہا، مگر صحت کی ابتر صورت حال نے اسے موت کی دہلیز پر پہنچا ہی دیا۔

"ایک اچھے انسان کے لیے زندہ رہنا مشکل، لیکن مرجانا آسان ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میں کس طرح مروں گی؟" اس نے سوچا۔

یگور کی تدفین ایک بڑے ہنگامے کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔"

"اگلی بار ماں کو دوبارہ گاؤں بھیجا گیا۔ اب کی بار ماں اکیلی تھی۔ سفر دور دراز کا اور خطرہ پہلے سے زیادہ۔

وہاں پہنچتے ہی ماں کو دھچکا لگانے والا منظر تیار تھا۔ کسان ریبن، پولیس کے نرغے میں، ہاتھ پاؤں بندھائے ہوئے، تشدد کا نشانہ بن رہا تھا، مگر چپ نہیں تھا۔

وہ سوٹ کیس یا کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔

جیسے تیسے۔۔۔ ماں نے اپنی باطنی فراست سے کام لیتے ہوئے ایک کسان کے گھر رات ٹھہرنے کی اجازت طلب کی۔۔۔ وہاں کسانوں سے بات کرتے ہوئے جب اس نے ان لوگوں کا ذکر کیا، جو اسے دل و جان سے عزیز تھے تو اس نے اپنے الفاظ میں اپنی اس محبت کی ساری توانائی اور شدت سمو دی، جو زندگی کے گوناں گوں مصائب کی وجہ سے عمر کے اس پختہ دور میں اس کے دل میں پھلی پھولی تھی۔

قوت کا اجتماع اپنے اندر عظیم طاقت رکھتا ہے اور عوام کو اسی لیے طاقت کے اس شعور سے محروم رکھا جاتا رہا ہے۔ بیداری مہم ہمیشہ لوگوں کو ان کے کچھ ہونے اور کر سکنے کا یقین دلانے کی مہم رہی ہے۔

گاؤں کے کامیاب سفر سے واپسی پر ماں روحانی طور پر خود کو توانا محسوس کر رہی تھی۔

شہر پہنچنے پر ماں نے ایک نئی مہم سر ہوتے ہوئے دیکھی۔ ریبن کو جیل سے فرار کروانے کا منصوبہ تیار کیا گیا جو کہ کامیاب ہو گیا۔ امید و بیم کے درمیان پادیل کو بھی فرار ہونے کی پیش کش کی گئی جو حسب توقع اس نے رد کر دی۔

مقدمے کی سماعت، دراصل پادیل کے لیے اپنے نظریات کے پرچار اور کھلم کھلا اعلان کا اہم اور نادر موقع تھی۔

مقدمہ کی سماعت کا دن آن پہنچا اور ماں اپنے ڈوبتے ابھرتے دل کو تھامے پیشی پر پہنچ گئی۔

یاس و ناامیدی سے وہ اتنی مغلوب ہو چکی تھی کہ جواب ہی نہ دے سکی۔ اسے توقع تھی کہ اس کے بیٹے اور اس پر الزام لگانے والوں کا غیر جانب داری اور ایمانداری کے ساتھ موازنہ کیا جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ لوگ اس کے تمام خیالات اور کارگزاریوں کو گہری نظر سے دیکھیں گے اور جب انہیں سچائی نظر آ جائے گی تو وہ لوگ واضح الفاظ میں اعلان کر دیں گے " یہ شخص بالکل سچ کہتا ہے۔"

وہی۔۔۔ ماں کی ازلی سادگی!

پادیل اور اس کے تمام ساتھیوں کو باری باری موقع

ملا۔ سب نے جرات اور بہادری کے کچھ نہ کچھ لفظ کہے۔ مگر پاویل نے راہ نما ہونے کی حیثیت سے سنجیدگی سے اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کیا۔

"وہ ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ ہم زار کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری نظر میں مطلق العنان حکمرانی وہ واحد زنجیر نہیں ہے جس نے ہمارے ملک کو جکڑ رکھا ہے۔ یہ تو سب سے پہلی اور سب سے نزدیک کی زنجیر ہے جس سے عوام کو نجات دلانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہم انقلابی ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک کچھ لوگ صرف حکمرانی کرتے ہیں اور دوسرے صرف محنت کرتے ہیں۔ ہم اس سماج کے خلاف ہیں جس کے مفاد کو بچانے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ تمہارے آقا اتنے طاقت ور نہیں جتنا کہ ان کا اپنا خیال ہے۔

عام لوگوں تک اپنے توانائی بخش الفاظ کی منتقلی کے بعد پاویل ساتھیوں سمیت مطمئن اور خوش نظر آیا۔ حتیٰ کہ جلاوطنی کی سزا (پہلے سے طے شدہ) سنادی گئی۔

سائبیریا۔۔۔ جہاں نوجوان ذہنوں کو صعوبتوں سے بھری زندگی سے لڑنے اور گھائل ہونے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔

راتوں رات پاویل کی تقریر کاغذ پر منتقل کر دی گئی اور ماں رومیلا کے پاس ٹائپ کے لیے پہنچی۔

آج کے انقلاب تیز رفتار ابلاغ سے رونما ہوتے ہیں (مصر، تیونس) اور ایک وہ زمانہ کہ ہاتھ سے لکھے پرچے۔۔۔ خفیہ چھپائی۔۔۔ خفیہ تقسیم۔

فخر اور کامیابی کے احساس سے دوچار ماں نے ہی اپنے بیٹے کی تقریر کی کاپیاں تقسیم کرنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

جبکہ وہ مسلسل کام کرنے کی وجہ سے پولیس کی نظروں میں آچکی تھی۔ گاڑی پکڑنے سے پہلے اسٹیشن پر ماں پکڑی گئی۔"

آخری منظر کی سادگی اور معنویت بے مثل ہے۔۔۔

کہ چند ہی ساعتوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔!

"پولیس والے نے چھوٹتے ہی ماں کو چور قرار دے دیا۔

"چڑیل۔۔۔ کتیا۔" مارا گیا۔۔۔ گھونسے۔۔۔ تھپڑ۔۔۔ ٹھڈے۔

لیکن ماں نے اپنا کام وہیں کر دیا۔

جلدی جلدی پرچے لوگوں کے ہاتھوں میں تھمائے، باقی کو ہوا میں بکھیر دیا اور گالیوں کی بوچھاڑ میں بھی اپنی بات لوگوں سے کہہ دی۔

کسی نے اس کے سینے پر مارا اور وہ بنچ پر گر پڑی، لیکن تکلیف پر قابو پاکر اس نے رہی سہی قوت سے چلا کر کہا۔

"لوگو! متحد ہو کر ایک مضبوط قوت بن جاؤ۔"

"خاموش!"

اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل پر خوف کا تند دھواں چھا گیا، لیکن جرات اور بے جگری کا شعلہ ایک بار پھر آب و تاب سے چمکا اور اس نے دھوئیں کو نکال باہر کیا۔۔۔

"خون کا ساگر بھی صداقت کو ڈبو نہیں سکتا۔"

آخری منظر، دراصل علامتی طور پر اس بات کا مظہر ہے کہ ماں اپنی کوشش میں کامیاب رہی اور اس کے پیغام کی بازگشت وسیع پیمانے پر پھیلتی گئی۔ الفاظ کی قوت، جذبوں کی حرارت اور مقصد سے وابستگی کے لطف کو محسوس کرنے کے لیے "ماں سے" ضرور ملیے گا جن سے ہم نے جانا کہ سچائی کے راستے کو اختیار کرنے کے لیے عمر کی قید نہیں اور روح کی سچائی میں جاوداں زندگی کا راز پنہاں ہے۔

اجتماع کو قوت اور قوت کو اعتماد عطا کرنا کہ وہ کچھ کرنے کے قابل ہے، قوموں کی خوش قسمتی کا لمحہ ہوتا ہے۔

کیا ہم کبھی یہ لمحہ محسوس کر پائیں گے؟ لیکن اس انتظار سے پہلے خود سے ایک سوال کیوں نہ کرلیں؟

کیا ہم ایک قوم ہی ہیں؟؟؟

✡

تبصیر نشاط





صلاحیت

حبہ علی نے کئی ڈراموں میں جاندار اداکاری کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے، تاہم اس کے باوجود بھی حبہ وہ نام نہیں بنا سکیں، جو اب تک بن جانا چاہیے تھا۔ حبہ خاصی باصلاحیت ہیں اور وہ فن اداکاری کا مستند نام قرار پاسکتی تھیں، اگر وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف اداکاری کے لیے وقف کرتیں تو۔ یہ خیال ہے ان ہدایت کاروں کا کہ جنہوں نے اب تک حبہ کو کاسٹ کیا ہے۔

چند سال پہلے حبہ کو ایک ٹیلی فلم کے لیے کاسٹ کیا گیا۔ رول بہت اچھا تھا، سو حبہ کو بے حد پسند آیا۔ حبہ نے اسکرپٹ لے لیا اور شوٹنگ کے لیے تاریخیں دے دیں۔ ہدایت کار نے مزید آرٹسٹ، لوکیشن اور دیگر انتظامات مکمل کر لیے۔ شوٹنگ سے دو دن قبل حبہ نے ہدایت کار کو فون کر کے معلوم کیا کہ کیا پہننا ہے۔ ریکارڈنگ والے دن سب لوگ پہنچ گئے، تاہم حبہ نہ آئیں۔ ہدایت کار نے فون کیا تو فون بند ملا۔ وہ سمجھے کہ کسی اور شوٹ پر ہوں گی، سو تھوڑی دیر بعد پھر کال کی۔ فون ہنوز بند تھا۔ یہاں تک کہ سارا دن گزر گیا، حبہ کا فون بند ہی ملا۔ رات ایک بجے اسسٹنٹ کے پاس کال آئی۔ نحیف آواز میں کہنے لگیں۔ "مجھے شدید بخار ہے، میں کل شوٹ پر نہیں آسکوں گی۔"

اسسٹنٹ نے کہا۔ "آپ یہ بات صبح بتا دیتیں۔ ہم کال کرتے رہے، مگر آپ کا فون مستقل بند تھا۔"

اس پر حبہ نے شان بے نیازی سے فرمایا۔ "ہاں! میں تو بے ہوش تھی۔ گھر والوں نے فون بند کر دیا تھا۔" یہ کہہ کر حبہ نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔

ہدایت کار صاحب نے اگلے دن دوسری اداکارہ لے کر شوٹنگ کرلی۔ بعد میں انہیں دوسرے لوگوں سے پتا چلا کہ حبہ اکثر ایسے "ڈرامے" کرتی رہتی ہیں۔ (ان ڈراموں کا اسکرپٹ کون لکھتا ہے۔)

ابھی حال ہی میں حبہ نے یہ ڈراما پھر دہرایا ہے۔ تاہم اس مرتبہ وہ شدید بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئی تھیں۔ (ہاں! ایک ہی اسکرپٹ پر کام کر کر کے اب تو منجھ گئی ہوں گی نا۔)

تباہ

فلم ساز فیاض خان کو فلم انڈسٹری سے جڑے تیس



سال سے زیادہ کا عرصہ بیت چلا ہے۔ معروف اداکارہ انجمن کی بطور ہیروئن پہلی فلم کے فلم ساز یہ ہی فیاض خان تھے۔ ان کے دل میں فلمی صنعت کی زبوں حالی کا بڑا درد ہے۔ فیاض خان کا کہنا ہے کہ ”فلم انڈسٹری کو تباہ کرنے میں سید نور کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک صائمہ کی خاطر انہوں نے پوری انڈسٹری کو داؤ پر لگا دیا۔ یہی سید نور تھے، جنہوں نے انڈسٹری کو کئی بڑے بڑے آرٹسٹوں کا تحفہ دیا، لیکن جب سے انہوں نے اپنی فلموں میں صائمہ کو ہیروئن لینا شروع کیا ہے، انہیں کوئی اور اداکارہ نظر ہی نہیں آتی۔“ (ائے ہئے! یہ گلہ تو رخسانہ نور کی طرف سے آنا چاہیے تھا۔)

فیاض خان کا دعوا ہے کہ خود صائمہ بھی ان کے خیال سے متفق ہیں۔ (لو جی! آپ نے تو گھر میں ہی پھوٹ ڈلوا دی۔) اس بیان سے قطع نظر فیاض خان کے صائمہ اور سید نور سے نہایت دوستانہ مراسم ہیں۔ فیاض خان نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ”میں ان دونوں کی شادی کے گواہوں میں بھی شامل تھا۔“ (اچھا!!!! تو وہ آپ ہیں جنہیں رخسانہ جی برسوں سے ڈھونڈ رہی تھیں۔۔۔ ویسے فلمی صنعت کی تباہی میں اس طرح تو آپ کا بھی حصہ ہوا ناں جی!)

ہنسی

مرزا غالب نے کہا تھا۔

”آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی“

بعض لوگوں سے ان کی زندگی کے حالات و واقعات ان کی ہنسی چھین لیتے ہیں مگر جناب! کچھ لوگ عادتاً ہی ہنسنے مسکرانے سے دور ہوتے ہیں جیسے اپنی بنجمن سسٹرز۔ پی ٹی وی کے مقبول پروگرام ”سلور جوبلی“ سے شہرت پانے والی بنجمن سسٹرز کو آج کم لوگ ہی جانتے ہیں۔ عام زندگی کا تو پتا نہیں مگر گانا گاتے وقت یہ بہنیں ہنسنے ہنسانے حتیٰ کہ مسکرانے تک سے گریز کرتی تھیں۔ خاص طور پر بینا اور نریسا۔ مقبول عام ملی نغمہ ”خیال رکھنا“ نریسا اور بینا کا دنیائے موسیقی میں پہلا قدم تھا۔ یہ نغمہ معروف گلوکار عالمگیر نے گایا تھا اور ان دونوں نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ تیسری بہن شبانہ اس نغمے میں شامل نہیں تھیں۔ یہ نغمہ معروف ڈائریکٹر شعیب منصور نے تیار کیا تھا۔

”خیال رکھنا“ کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ اس نغمے میں شعیب منصور نے عالمگیر اور بنجمن سسٹرز کی ویڈیوز الگ الگ ریکارڈ کی تھیں۔ عالمگیر اپنی ریکارڈنگ کرا چکے تھے۔ بنجمن سسٹرز کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بالکل سپاٹ چہروں کے ساتھ گا رہی تھیں۔ شعیب انہیں تھوڑا ہنسنے مسکرانے کو کہہ رہے تھے مگر وہ سنجیدہ ہی تھیں۔ شعیب جھنجلا گئے۔ (شعیب کو کہنا چاہیے تھا ناں کہ میں ’بول‘ رہا ہوں ”خدا کے لیے“ تھوڑا مسکرائیں۔)



عالمگیر نے شعیب سے کہا۔ ”تم ٹینشن مت لو۔ میں انہیں ہنساتا ہوں۔ تم بس یہ مجھ پر چھوڑ دو۔“

عالمگیر ایک طرف کھڑے ہو گئے اور مختلف طریقوں سے شکل بگاڑ کر اور ہل ہل کر انہیں ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر کار تھوڑی دیر میں بنجمن سسٹرز کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ ہی گئی۔

عالمگیر کہتے ہیں کہ ”میں آج بھی جب وہ وقت یاد کرتا ہوں تو ہنس پڑتا ہوں۔“

(عالمگیر جی! آج بنیادی ضروریات سے محرومی کے احساس تلے دبے مظلوم و بے بس عوام بھی ہنسنا مسکرانا بھول گئے ہیں۔ آپ کے پاس انہیں بھی ہنسانے کا کوئی طریقہ ہے کیا؟)

لوٹ کے بدھو....

کہتے ہیں کہ مشرقی معاشرے میں مرد کو گھر کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے۔ گویا اسے جسم میں ”سر“ کی جگہ سمجھا گیا ہے۔ تاہم جب کسی سیانے سے دریافت کیا گیا کہ ”اگر شوہر ”سر“ ہے تو بیوی کیا ہے؟“ اس پر اس نے کہا کہ ”بیوی وہ گردن ہے، جس کے زور پر وہ ”سر“ حرکت کرتا ہے۔“

ایک نجی ٹی وی سے نشر ہونے والے پروگرام ”موڈستان“ کے میزبان علی خان صرف کمپیئرنگ ہی نہیں کرتے، انہوں نے کئی بھارتی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ علی خان نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا ہے کہ وہ کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ تاہم پانچ سال کی عمر میں بھارت چلے گئے، پھر تعلیمی مراحل سے لے کر اب تک کی زندگی وہیں گزاری۔ (گویا گنگا الٹی بہہ گئی۔)

2004ء میں آنجہانی گلوکار جگجیت سنگھ کے ساتھ ایک شو کرنے کراچی آئے تو ان کی ملاقات ”چاندنی“ سے ہوئی۔ وہ انہیں بے حد پسند آئیں اور یوں دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے پانچ سال بعد بیگم کی خواہش پر علی خان اپنے جنم بھومی کراچی واپس آ گئے ہیں۔ (یعنی لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔)

کچھ ادھر اُدھر سے

تاثر یہ ہے کہ سارے کراچی کو لیاری کے بھتہ خوروں نے یرغمال بنا رکھا ہے مگر رازدانوں کا کہنا ہے کہ اصل بھتہ تو من کے کالے ”سیاسی بازی گروں“ کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

(نادر شاہ عادل۔ ایکسپریس نیوز)

صبح سے رات تک راگ لیاری کلیان سنانے کے لیے چھوٹے اسکرین پر اینکرز کے درمیان مقابلہ جاری ہے۔

(ایکسپریس نیوز)

بھارت میں صرف 50٪ گھروں میں ٹوائلٹ کی سہولت موجود ہے جبکہ اس کے مقابلے میں 60 فیصد کے پاس موبائل فون دستیاب ہے۔

(ٹائم میگزین)

امریکا کی روح میں خوں ریزی ہے۔
الحاد، غلام سازی اور خوں ریزی ہے۔

(اسلامک پارٹی نارتھ امریکا کے سربراہ مصطفیٰ)

کراچی میں چار پارٹیاں بھتہ وصول فرماتی ہیں اور یہ شہر پر قبضہ کی جنگ ہے۔

(چیف جسٹس)

امریکہ 160 کھرب ڈالر افغانستان اور عراق کے آتش کدوں میں پھونک چکا ہے۔ اور اپنی خوئے شرانگیزی کے باعث 160 کھرب ڈالر کے بھاری قرضے تلے آ چکا ہے تو میں اسے قدرت کی ایک سزا ہی خیال کرتا ہوں۔

(نقش خیال۔ عرفان صدیقی)

✿ ✿

بقیہ دستک

ہی ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ جلدی ہی مجھے اسکرین پہ دیکھیں گی۔"

"اداکاری خداداد صلاحیت ہے یا سیکھنی پڑتی ہے؟"

"خداداد صلاحیت تو ہوتی ہے مگر سیکھنی بھی پڑتی ہے۔ ہر اچھی چیز کے لیے پالش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھا ڈائریکٹر مل جائے تو بندہ پالش ہو ہی جاتا ہے۔"

"اس فیلڈ میں کس کو اپنا استاد مانتے ہو؟"

"میں اس فیلڈ میں آیا تو جس جس نے بھی مجھ سے کام لیا' ان سب سے میں نے سیکھا۔ قیصر خان نظامانی اور فضیلہ قیصر سے بہت کچھ سیکھا' سید عاطف حسین بہت اچھے انسان ہیں اُن سے بہت سیکھا۔ میں تو ہر ایک سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھتا ہوں۔ کیونکہ میری کہیں کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔"

"تم کیسے دریافت ہوئے؟"

"میں نے اپنے آپ کو دریافت کروایا ہے۔ بہت محنت کی ہے' بہت جدوجہد کی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ جس کو ڈائریکٹر نے دیکھا اور آفر دے دی۔ بڑی مشکل سے اپنی پہچان بنائی ہے۔"

"گھر والوں نے ساتھ دیا؟"

"گھر والوں نے ایک حد تک تو ساتھ دیا۔ پھر یہی کہا کہ اتنا ذلیل ہونے سے بہتر ہے کہ کوئی ڈھنگ کا کام کرلو۔ ان کے نزدیک یہ ڈھنگ کا کام نہیں تھا۔ گھر والوں کی وجہ سے میں نے بینک میں جاب کرلی اور اس کام میں بھی چپکے چپکے لگا رہا۔ آخر اللہ نے کامیابی دے ہی دی۔"

"اب تو زندگی بدل گئی ہے نا۔"

"جی اللہ کا شکر ہے کہ اب زندگی کافی بدل گئی ہے۔ اب گھر والے بھی خوش ہیں اور میں بھی۔ اب مجھے کافی کام ملنے لگا ہے۔ میں نے بینک کی جاب چھوڑ دی ہے اور اب یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔"

"فضیلہ قیصر کے سیریل "خواب آنکھیں' خواہش چہرے" میں تمہارا ایک بہت ہی مختلف رول تھا' کیا رسپانس ملا تھا؟"

"میں نے اس سیریل میں نگیٹیو رول کیا تھا اور اس رول کو کر کے مجھے احساس ہوا ہے کہ نیکی اور بدی کی لوگوں کو کتنی پہچان ہے اور لوگ کس طرح اس کو لیتے ہیں۔"

"مزید کیا ارادے ہیں؟"

"اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مزید ایسے رول کرنے چاہییں یا نہیں' تو اداکار کو تو ہر طرح کے کردار کرنے چاہییں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں کام کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ اس لیے مجھے جو بھی اچھا کردار ملے گا۔ خواہ وہ نگیٹو ہو یا پوزیٹو۔ میں ضرور قبول کروں گا۔"

"کون سی بات بعد میں تمہارے لیے پچھتاوے کا باعث بنتی ہے؟"

"میں ایک صاف گو انسان ہوں' جو بات ہوتی ہے منہ پر کہہ دیتا ہوں یہ نہیں سوچتا کہ سامنے والے کا دل برا ہوگا۔ مجھے اپنے غصے پر بھی کنٹرول نہیں ہے۔ بے شک بعد میں سوری کرلیتا ہوں' مگر ایک دفعہ بولنے سے باز نہیں آتا اور بلاوجہ غصہ نہیں آتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔"

"کون سے سیریل نے تمہیں پہچان دی؟"

"اے طائر لاہوتی' بہو رانی اور خواب آنکھیں خواہش چہرے" ایسے سیریلز ہیں جو بہت زیادہ پسند کیے گئے۔"

"چلو اجازت دو۔۔۔ نئی سیریل پہ نئی باتیں ہوں گی۔"

اظفر رحمان

"کیسے ہو۔۔۔؟"

"ارے آپا! آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی۔ بہت برسوں بعد آپ نے یاد کیا۔"

"میں تو یاد کرلیتی ہوں' تم بھول جاتے ہو۔ کیا کر رہے ہو آج کل؟"

"ابھی حال ہی میں "میرے چارہ گر" ختم ہوا ہے' جس کی رائٹر آپ کے ہی ادارے کی تھیں۔ کالا جادو' آن ایر ہے اور بھی دو تین ڈرامے انڈر پروڈکشن بھی ہیں اور آن ایر بھی ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سے مصروف رکھا ہوا ہے۔"

"تم نے بچپن لندن میں گزارا۔ ایڈورٹائزنگ میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی' کچھ کام آرہی ہے یہ تعلیم؟"

"کیوں نہیں' تعلیم تو تعلیم ہے کہیں بھی کام آسکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس مضمون میں ڈگری حاصل کی ہو اُسی میں جاب بھی کی جائے اور میں شوبز میں ہوں تو ایک لحاظ سے تو میڈیا سے تعلق ہے نا میرا۔"

"سارا دن کی کیا روٹین ہے تمہاری؟"

"روٹین کچھ یوں ہے کہ صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھتا ہوں اور نماز پڑھ کر سو جاتا ہوں' پھر ایک آدھ گھنٹے کے بعد اٹھ کر ایکسرسائز کے لیے جم جاتا ہوں' واپس آ کر ناشتا کرتا ہوں' شوٹ پہ چلا جاتا ہوں اور شوٹ سے واپس آنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں۔ کبھی جلدی فارغ ہو جاتا ہوں تو کبھی آدھی رات بھی ہو جاتی ہے۔"

"کیا اپنے آپ کو ڈراموں اور کمرشلز کے لیے محدود کرلیتا ہے' کوئی فلم وغیرہ نہیں کرنی؟"

"کیوں نہیں۔۔۔ مجھے تو خود بھی فلمیں دیکھنے اور فلم میں کام کرنے کا شوق ہے۔ مگر فی الحال اپنے آپ کو فلم کے قابل نہیں سمجھتا۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اداکاری میں مزید پختگی آجائے تو پھر فلم میں کام کروں گا۔ ویسے مجھے سید نور صاحب نے آفر دی تھی۔ مگر میں نے انکار کردیا۔"

"آپ چار بھائی ہیں' کسی اور کو بھی شوق ہوا اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"میرے چھوٹے بھائی کا بہت دل چاہتا ہے اس فیلڈ میں آنے کا اور اس میں ٹیلنٹ بھی ہے' مگر امی نے سختی سے منع کردیا ہے کہ تم اس فیلڈ میں نہیں آؤ گے۔ کیوں منع کیا' کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"ینگ آرٹسٹوں کے کردار "عموماً" ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کچھ ورائٹی لانا چاہتے ہو؟"

"میں تو ہر طرح کے کردار کرنا چاہتا ہوں اور کر بھی رہا ہوں۔ اگر کام میں ورائٹی نہ ہو تو شاید میں کردار کو قبول بھی نہ کروں۔"

"ڈرامے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں؟"

"بالکل کرتے ہیں۔ وہی کہانیاں ٹیلی پلے بنتی ہیں جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ "میرے چارہ گر" تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ اس میں جو کچھ دکھایا گیا' کیا وہ حقیقت نہیں ہے؟ جائیداد کے حوالے سے ہمارے معاشرے میں یہی تو ہو رہا ہوتا ہے۔ حقداروں کے حق پر قبضہ کرلیا جاتا ہے۔"

"یعنی جو آج کل ڈرامے ہو رہے ہیں۔ وہ تمہارے خیال میں حقیقت کے قریب اور معیاری ہوتے ہیں؟"

"جی بالکل۔۔۔ حقیقت سے بہت قریب اور کافی حد تک معیاری بھی اب کافی امپروومنٹ ہو گئی ہے ڈراموں میں۔ اب موضوعات بھی اچھے اور بولڈ ہوتے ہیں اور ڈائریکشن بھی کافی معیاری ہو گئی ہے۔"

"چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہو؟"

"عموماً" گھر پر رہنا ہی پسند کرتا ہوں۔ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے' خاص طور پر امی ابو کے روم میں سکون ملتا ہے' ان کے ساتھ وقت گزار کر' گپ شپ مار کر اور فرمائشیں کرکے' کچھ نہ کچھ ضرور پکواتا ہوں۔"

"آج کل ملک کے جو حالات ہیں اُس کو دیکھ کر کبھی باہر سیٹل ہونے کا سوچا؟"

"نہیں کبھی نہیں۔۔۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے لیکن اپنے ملک کو چھوڑ کر کہیں اور سیٹل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ جس ملک نے مجھے عزت' دولت اور شہرت دی اُس ملک کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا' کبھی نہیں۔"

امت الصبوح

عدالت علویہ

اصبغ بن نباتہ جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فوج کے سالار تھے بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے ایک فریادی کی ایسی داد رسی فرمائی کہ جو میں نے آج تک ایسا عجیب انصاف نہ دیکھا اور نہ میرے کانوں نے سنا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ایک دن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ تھا۔۔۔ آپ مسجد کوفہ میں داخل ہوئے۔ وہاں دیکھا کہ ایک نوجوان نالہ و فریاد کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر پڑی تو آگے بڑھ کر آپ کے قدم بوس ہوا۔ آپ نے اس سے گریہ وبکا کا سبب پوچھا۔ تو اس نے کہا۔

"کہ میں مسجد میں اس لیے آکر رو رہا ہوں کہ جب آپ مسجد میں تشریف لائیں تو میں قاضی شریح نے میرے دائر کردہ مقدمہ پر جو فیصلہ صادر کیا ہے۔ اس کے خلاف آپ کی خدمت میں اپیل پیش کروں کہ میری داد رسی فرمائی جائے۔"

حضرت نے فرمایا کہ "تیرا کیا معاملہ ہے؟ اس کی تفصیل بیان کر۔"

اس نے عرض کیا۔

"یا امیرالمومنین! میرا باپ کچھ لوگوں کے ساتھ سفر کو گیا۔ جب وہ لوگ سفر سے واپس آئے تو میرا باپ ان کے ساتھ واپس نہ لوٹا۔ جب میں نے ان سے پوچھا تو سب نے یہی جواب دیا کہ وہ سفر کے دوران فوت ہو گیا۔ پھر جب میں نے ان سے اپنے باپ کے مال کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس نے کوئی مال پیچھے نہیں چھوڑا حالانکہ مجھے اس بات کا پورا علم ہے کہ میرے باپ کے پاس کافی سے زیادہ مال تھا۔ ان کے انکار کے بعد میں نے اپنی حق رسی کے لیے قاضی شریح کی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کر دیا۔ انہوں نے ان لوگوں سے میرے باپ کے مال کے متعلق پوچھا۔ تو انہوں نے قاضی کو بھی وہی جواب دیا۔ اس کے بعد قاضی شریح نے ان کے اس بیان کی ان سے قسم لی۔

جو انہوں نے کھالی اور قاضی نے انہیں رہا کر دیا۔ مگر ان کا یہ فیصلہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں اپنے حق کے لیے اپیل کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔"

اس نوجوان کا بیان سن کر آپ نے فرمایا کہ۔

"میں اس مقدمہ کا وہ فیصلہ کروں گا جو آج سے پہلے سوائے حضرت داؤد علیہ السلام کے کسی نے نہیں کیا ہوگا۔" پھر قنبر سے فرمایا کہ چند آدمی پولیس کے میرے پاس بلا کر لے آؤ۔ جب وہ آگئے تو ان کو حکم دیا۔

اس کے باپ کے ساتھ جو سفر پر گئے تھے اس نوجوان سے پتا پوچھ کر ان کو میرے پاس لے آؤ' جب وہ آگئے تو آپ نے ان پر ایک گہری نظر ڈال کر فرمایا کہ۔

"کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ میں تمہاری حرکتوں سے واقف نہیں، ہوں اگر تم ایسا خیال کرتے ہو تو

سمجھو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" پھر شرطہ (پولیس) والوں سے کہا کہ ان کو مسجد کے ستونوں سے الگ الگ باندھ دو۔ جب اس حکم پر عمل ہو گیا۔ تو جو لوگ مسجد میں جمع تھے۔ ان سے فرمایا جب میں نعرہ تکبیر بلند کروں تو تم لوگ بھی زور سے نعرہ لگا دینا۔

ساتھ ہی اپنے کاتب کو بلا کر فرمایا کہ یہ ملزمان جو جو بیان دیتے جائیں انہیں تحریر کرتے جاؤ۔ اس کے بعد حکم دیا ان ملزمان سے ایک ملزم کو میرے پیش کرو۔ جب وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ۔

"تم کس روز گھر سے باہر سفر کے لیے گئے تھے؟"

اس نے جواب دیا کہ فلاں روز۔

پھر آپ نے پوچھا۔

"تم کل کتنے آدمی تھے جب سفر پر روانہ ہوئے' تمہارے سفر کا سال' مہینہ اور دن کیا تھے۔ تم گھر سے دن کے وقت نکلے تھے یا رات کو؟ اس جوان کا باپ کس منزل پر جا کر بیمار ہوا؟ اس کی بیماری کیا تھی۔ وہ کتنے دن بیمار رہا اور بیماری کے دوران اسے کیا دوا دیتے رہے۔ اس کی تیمارداری کون کرتا رہا۔ وہ کس دن مرا۔ اس کو غسل کس نے دیا اور کفن کس نے پہنایا۔ پھر کس نے اس کو قبر میں اتارا۔"

وہ آپ کے سوالات کے جواب کچھ نہ کچھ دیتا رہا۔ پھر جب سوال ختم گئے تو حضرت علی نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جس پر تمام حاضرین مسجد نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ جب یہ نعرہ ان باقی ملزمان نے سنا تو وہ شک و شبہ میں پڑ گئے بلکہ ان میں سے بعض کو یقین ہو گیا کہ ان کے ساتھی نے اقبال جرم کر کے ان کے ساتھ غداری کی ہے اور صحیح حالات حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے بیان کر دیے ہیں۔ سوالات مذکورہ بالا کے پوچھنے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ اس کو قید خانہ میں لے جا کر بند کرو۔

وہ چلا گیا تو آپ نے پولیس کے آدمیوں کو حکم دیا کہ دوسرے آدمی کو لے آؤ۔ جب اس کو لایا گیا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں حقیقت واقعہ سے بے خبر ہوں اگر ایسا ہو تو میں بہت غافل اور نادان ہوں۔ اب تو بتا کہ اس جوان کے باپ کی موت کیونکر واقع ہوئی۔"

اس نے جواب دیا۔

"یا امیرالمومنین! میں بھی ان لوگوں میں ہوں جو اس کے باپ کے ساتھ سفر پر گئے تھے ان میں میں صرف میں ہی واحد شخص تھا۔ جو اس کے باپ کے قتل پر رضامند نہ تھا بلکہ مجھے ایسا کرنے سے نفرت بھی تھی۔"

گویا اس نے یہ اقرار کر لیا کہ اس جوان کے باپ کو قتل کیا گیا ہے پھر باقی ملزموں نے بھی ایک دوسرے کے بعد اس جرم کا اعتراف کر لیا۔ آخر میں آپ نے پہلے آدمی کو بلا کر اس کے ساتھیوں کا اقرار نامہ جو کاتب تحریر کرتا گیا تھا اس کو دکھایا۔ اور اس نے بھی اس جوان کے باپ کے قتل کا اقبال جرم کر لیا۔ اس کارروائی کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس نوجوان کے باپ کا مال جس کے طمع میں اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس کے لڑکے کو واپس کرا دیا اور اس کے قتل کی دیت بھی ان سب سے وصول کر کے مقتول کے بیٹے کو دلوا دی۔

❋



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کیری کا شربت

اجزا:

کچے آم	1 کلو
کالا نمک	1 چائے کا چمچہ
چینی	3 پاؤ
دار چینی	1 چھوٹا ٹکڑا

ترکیب:

کچے آم یعنی نہ وہ کیری ہوں نہ بالکل پک چکے ہوں، دھو کر ثابت ابال لیں۔ ٹھنڈے ہونے پر صاف ہاتھوں سے اس کے چھلکے اور گٹھلیاں نکال کر گودا خوب مسل لیں۔ گرائنڈر میں چینی اور کالا نمک کے ساتھ خوب باریک گرائنڈ کریں۔ چار گلاس پانی شامل کر کے ایک بار پھر گرائنڈ کریں۔ جگ میں نکالنے کے بعد دار چینی کا ٹکڑا ڈال کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں پھر برف کی کیوبز ڈال کر پیش کریں۔

کیری کی چٹنی

اجزا:

کیریاں	آدھا کلو
لہسن	8 جوے
کلونجی	2 کھانے کے چمچے
ثابت سرخ مرچ	10 عدد
پودینہ	آدھی گٹھی
زیرہ	1 کھانے کا چمچہ
چینی	2 کھانے کے چمچے

نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

کیریوں کو چھیل کر باریک کاٹ لیں اور اچھی طرح دھو کر خشک کر لیں، پھر گٹھلیاں نکال کر سل پر باریک پیس لیں۔ ساتھ میں پودینہ بھی پیس لیں۔ باقی مسالوں کو صاف کر کے موٹا موٹا کوٹ لیں اور پسے ہوئے آمیزے میں ملا کر چولہے پر ہلکی آنچ پر چڑھا دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو چینی ملا کر مکس کریں اور اتار لیں۔ کسی بڑے برتن میں نکال کر محفوظ کر لیں۔ (مٹی کی ہانڈی میں رکھیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔) مزے دار چٹنی تیار ہے۔ احتیاط سے رکھیں تو پندرہ دن تک استعمال کی جا سکتی ہے۔

شلجم کا اچار

اجزا:

شلجم	1 کلو
ادرک	آدھی چھٹانک
لہسن	آدھی چھٹانک
کلونجی	آدھی چھٹانک
گڑ	3 پاؤ
رائی	آدھی چھٹانک
سرخ پسی مرچ	4 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

شلجم کو چھیل کر آٹھ ٹکڑے کر لیں اور اتنا ابال لیں کہ وہ گل جائیں مگر نرم ہو کر ٹوٹیں نہیں۔ خشک کرنے کے لیے کسی کپڑے پر پھیلا دیں۔ لہسن کے علاوہ تمام مسالوں کو کوٹ کر شلجم کے ٹکڑوں پر مل دیں۔ ٹکڑوں کو مسالے سمیت مرتبان میں ڈال دیں اور ساتھ ہی لہسن کے ثابت جوے بھی ڈال دیں۔ مرتبان کا منہ بند کر کے تین دن کے لیے دھوپ میں رکھ دیں۔ دن میں دو، تین مرتبہ مرتبان ہلائیں۔ دو گلاس پانی میں گڑ ڈال کر خوب جوش دے لیں۔ شیرہ ٹھنڈا ہو جائے تو شلجم کے ٹکڑے ڈال کر آٹھ دن کے لیے چھوڑ دیں۔ اس دوران چیک کرتے رہیں۔ آٹھویں روز اچار استعمال کیا جا سکتا ہے۔

افغانی گوشت

اجزا:

گوشت	1 کلو
لہسن ادرک پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
پیاز	1 پاؤ
ٹماٹر	1 پاؤ
آلو	1 پاؤ
مٹر	آدھی پیالی
گاجر	آدھی پیالی
ثابت دھنیا	2 کھانے کے چمچے
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہری مرچ	2 عدد
ہرا دھنیا	چند پتے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

بغیر ہڈی کے گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر لیں۔ تیل گرم کر کے لہسن ادرک کا پیسٹ، سرخ مرچ اور ثابت دھنیا کوٹ کر ڈالیں اور گوشت کی بوٹیاں ڈال کر اس قدر پانی ڈالیں کہ گوشت گل جائے اور پانی نہ رہے۔ مٹر، گاجر اور آلو ابال کر پیاز اور ٹماٹر کے ساتھ چوکور ٹکڑے کر کے پہلے انہیں الگ تیل میں اس طرح تل لیں کہ ٹماٹر بالکل گل نہ جائیں اور دیگر اشیا نرم پڑ جائیں۔ گوشت گلنے کے بعد یہ تلی ہوئی چیزیں گوشت میں ڈال دیں۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا اور کالی مرچ (ثابت بھی ڈال سکتی ہیں اور پسی ہوئی بھی) ڈال کر ہلکی آنچ پر روغن آنے تک دم پر رکھیں۔ گرم گرم نان کے ساتھ دسترخوان پر سجائیں اور خوب داد پائیں۔



ادارہ

خوبصورتی کے لیے

خوبصورت اور تروتازہ جلد چہرے کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ بلکہ جلد چمکتی دمکتی ہو تو چہرے کے نقوش پر توجہ کم ہی جاتی ہے۔ جلد کی دیکھ بھال مصنوعی اجزا پر مشتمل کریموں کے بجائے اگر قدرتی اجزا سے کی جائے تو اس کے نتائج خاصے حیران کن ہوتے ہیں' ۔قدرت نے تمام موسمی پھلوں کو ایسے خواص عطا کیے ہیں جو انسانی جلد کو موسم کے مضر اثرات سے حیرت انگیز طور پر محفوظ رکھتے ہیں۔

خربوزہ موسم گرما کا خاص تحفہ ہے۔ یہ جسم کو مضبوط کرکے گرمی کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس میں کیلشیم' پوٹاشیم' فاسفورس' نشاستہ' وٹامنز اے اور بی موجود ہوتے ہیں۔ گردے کی تکلیف اور قبض میں خربوزہ کھانا بے حد مفید ہے۔

☆ گردے کا درد ہو تو' بارہ گرام خربوزے کا چھلکا' تھوڑا سا کالا نمک' ایک گلاس عرق گلاب میں ابال لیں۔ چھان کر پی لیں۔ آرام آجائے گا۔

☆ خربوزے کا چھلکا اور بیسن برابر مقدار میں لے کر باریک پیس لیں۔ تھوڑی سی دہی میں ملا کر چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے چہرے کے داغ' دھبے' کیل اور مہاسے ختم ہوجاتے ہیں۔

☆ خربوزے کے چھلے ہوئے بیج چائے کا ایک چمچہ لے کر دو عدد بادام کے ساتھ باریک پیس لیں۔ چند قطرے لیموں کا رس اور پانچ چمچ بالائی والا دودھ شامل کرکے خوب اچھی طرح ملائیں۔ چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ تک لگا رہنے دیں' پھر ٹھنڈے پانی میں روئی بھگو کر اس سے چہرہ صاف کرلیں۔ یہ جلد کے لیے بہترین ماسک ہے۔

☆ تقریباً" سو گرام خربوزے کا گودا لے کر اس میں چائے کا ایک چمچہ شہد اور کھانے کے دو چمچے خشک دودھ شامل کرلیں۔ اچھی طرح ملا کر چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد نیم گرم پانی سے منہ دھولیں۔ یہ ماسک خشک جلد کے لیے اکسیر ہے۔ یہ جلد کو نمی فراہم کرکے اسے تروتازہ کرتا ہے۔ اگر آپ کی جلد چکنی یا نارمل ہے تو اس ماسک میں خشک دودھ شامل نہ کریں۔

☆ اگر آپ کے چہرے پر داغ' دھبے ہیں یا جلد دھوپ سے سنولا گئی ہے تو خربوزے کا تھوڑا سا گودا مسل کر چہرے پر لگالیں۔ ہلکے ہاتھوں سے چند منٹ تک ملیں' پھر خشک ہونے دیں۔ بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ یہ عمل نہایت سادہ ہے۔ آپ روزانہ بھی کرسکتی ہیں۔ چند ہی دنوں میں جلد پھول کی طرح کھل اٹھے گی۔

☆ خربوزے کا گودا اور کھیرا ہم وزن لے لیں۔ ایلوویرا کا عرق اور سبز چائے کی پتیاں تھوڑی مقدار میں شامل کرکے اچھی طرح پیس لیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر ملیں اور پانچ منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ جلد صاف ستھری اور نرم ملائم ہوجائے گی۔